عزیز ہندی

قیمت غیر مجلد تین روپے

یا

عزیز ہندی

دسمبر سنہ ۱۹۳۴ء

پہلا اڈیشن ——— تعداد ۲۰۰۰ ——— قیمت فی نسخہ تین روپیہ (۳)

تمہید

ہندوستان کے باشندے اپنے ہمسایہ ملک افغانستان کو شاہراہ ترقی پر گامزن دیکھ کر کچھ ایسے محظوظ و مسرور نظر آتے تھے۔ کہ ان کو افغانستان کا گذشتہ انقلاب از حد ناگوار خاطر گذرا سابق فرمانروائے افغانستان یعنی شاہ امان اللہ خان سے ان کی ہمدردی کا یہ عالم تھا۔ کہ جب وہ تخت افغانستان سے دستبردار ہو کر ہندوستان کی سرزمین کو روما جانے کے لئے عبور کر رہے تھے تو مشکل سے کوئی ہندوستانی بچا ہو گا جو یک نفس حیرت اور حسرت کی تصویر بن کر نہ رہ گیا ہو۔ ہندوستانی کیوں غازی امان اللہ خان کو اس قدر محبوب رکھتے تھے۔ اور ان کو افغانستان کی ترقی سے کیوں مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اس کو میں نے اس کتاب کے آخری باب میں علیحدہ رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر میری اصل غرض جو اس کتاب کے لکھنے کی باعث ہے۔ وہ اس حیرت اور استعجاب کو دور کرنے کی کوشش ہے۔ جو اس دفعتہً انقلاب نے ہندوستانی دل و دماغ پر مسلط کر رکھا ہے۔ واقعی اگر ایک طرف سو سالہ سلطنت کے ساز و سامان کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور دوسری طرف چوروں کے ایک بے دست و پا غول کو دیکھا جائے۔ تو مقابلہ میں کوئی نسبت ہی قرار نہیں دی جا سکتی۔ اور حیرت و استعجاب کا طاری ہو جانا ایک قدرتی امر بن جاتا ہے۔ ہندوستانیوں ہی پر کیا موقوف ہے۔ ان بڑے بڑے ممالک کے نمائندے بھی جو دوران انقلاب افغانستان کابل میں مقیم تھے کسی طرح بھی سقوط کابل کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اور چوروں کے ہاتھوں میں انقلاب کی کامیابی ان کے علم و تجربہ میں ایک بالکل انوکھا اضافہ تھا۔ مگر چونکہ وہ بذات خود وہاں موجود تھے۔ اور صحیح و اصلی حالات ان کے ہمہ وقت

پیش نظر تھے۔ اس لئے وہ نہ صرف اس تردد و حیرت کے رفع کرنے میں ہی کامیاب ہوئے۔
بلکہ وہ ان اسباب اور مواد کو بھی تحقیق کر سکے۔ جو اس انقلاب کو مدت سے متحرک کر رہے تھے۔
پس میں بھی چاہتا ہوں۔ کہ اپنے اہل وطن کے سامنے وہ تمام حالات و واقعات رکھ دوں۔
جو انقلاب افغانستان کے شروع ہونے سے لے کر شاہ موجودہ محمد نادر خان کے کابل پر
قبضہ کرنے تک وقوع میں آتے رہے۔ اور ان کے متعلق "اپنے دہ سالہ قیام افغانستان کی بنا پر"
وثوق و اطمینان کے ساتھ تشریح کرتے ہوئے ان کثیر ہندوستانیوں کی حسرت اور پریشانی کے
دور کرنے کا باعث ہوں۔ جو ابتک صحیح حالات نہ جاننے کے باعث مذبذب کی سی کیفیت رکھتے ہیں۔

میں کامل دس سال افغانستان میں رہنے کے بعد جب اپریل ۱۹۳۰ء میں ہندوستان واپس
آیا۔ تو صرف چار ماہ کے عرصہ میں یعنی جبتک میں ریگولیشن نمبر ۳ ۱۸۱۸ء کے ماتحت شاہی قیدی نہ
بنا لیا گیا۔ اگر لاکھوں نہیں۔ تو افغانستان کے انقلاب اور غازی امان اللہ خان کی ناکامی کے
متعلق مجھ سے ہزاروں سوالات ضرور پوچھے گئے ہونگے جن کا فرداً فرداً جواب دینا مجھ پر دوبھر تھا
لیکن ساتھ ہی ان سوالات کی نوعیت نے مجھ پر یہ حقیقت بھی منکشف کر دی تھی۔ کہ میرے
اہل وطن اب تک اصلی حالات سے بہت حد تک بے بہرہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس نے مجھے
جیل کی چاردیواری کے اندر اپنے فارغ وقت کو اس اہم کام پر صرف کر ڈالنے کی ترغیب
دی۔ مگر قارئین محترم کے یہ ملحوظ خاطر رہے۔ کہ وہ مصالحہ جو کسی کتاب کی تکمیل کے لئے ضروری
ہوا کرتا ہے۔ بوجہ نظربندی مجھے میسر نہیں۔ لہذا میں صرف اپنی یادداشت پر تکیہ کر رہا
ہوں۔ اس لئے اغلب ہے۔ کہ بعض واقعات تاریخوں وغیرہ سے معرا ہوں۔

ملتان سنٹرل جیل
مئی ۱۹۳۱ء

عزیز ہندی

گذارشِ ثانوی

میری کوشش تھی۔ کہ میں اس کتاب کو جیل کے اندر ہی سے اشاعت وطباعت کی غرض سے باہر بھیج دوں۔ لیکن گورنمنٹ نے اس قسم کی آسانی بہم پہونچانے سے قطعیاً انکار کر دیا فلہٰذا امر مجبوری تھا۔ کہ "زندانی زندگی" کے خاتمہ تک اس کو ملتوی رکھا جائے ؎

اور پھر جب میں اواخر ستمبر ۱۹۳۳ء میں جیل سے باہر نیم آزاد زندگی بسر کرنے پر قادر ہوا تو آئینِ حیات کا سب سے مشکل مرحلہ پیش پا تھا جس کی قربان گاہِ ناز پر ایک آدھ سال کی بھینٹ چڑھانی پڑگئی۔ "کار مانده" کی طرف نظر کی۔ تو وہ صرف ایک دو باب کی چند بند شعل پر اٹک رہا تھا۔ نہ معلوم اس کی باری بھی کب آتی۔ اگر میرے فرزند مسٹر اختر مسعود کا شدید اصرار مجھے اس کی تیاری و تکمیل پر مجبور نہ کر دیتا ؎

میں نے اس کتاب کو حقیقی و صدیقی رنگ میں لکھا ہے۔ غازی امان اللہ خان ہو یا غازی محمد نادر شاہ میں نے کسی ایک کی بھی طرفداری نہیں کی۔ بلکہ محض واقعات اور ان سے جو نتائج و اثرات میرا دل و دماغ اخذ و جذب کر سکا۔ اسے کما حقہٗ ان صفحات پر ترتیب دینے کی معقول اور مدلل کوشش کی گئی ہے۔ اور جہاں تنقید کا پہلو اختیار کیا گیا ہے۔ وہ میرے اس درد و سوزِ نہانی کا ایک بے نقاب شاہد ہے۔ جو میں خاکِ افغانستان کے متعلق اپنے سینہ و دل میں موجود پاتا ہوں ؎

برتر از جذبہ تفریق و حقارت میرا تنقیدانہ پہلو ذاتیات کی نبرد آزمایانہ جد و جہد سے بالکل غیر مانوس و مبرا ہے۔ بلکہ بغایت عمومیت کے ساتھ افغانستان کی موجودہ زندگی کی منازل و مدارج کو میں نے نوعِ انسانی کے ارتقاء و سکون سے اخذ و معلوم کر کے انہیں ایک نئے پیرایہ اور نئی دلبستگی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ جس نے اس کتاب کو انقلاب کے

واقعات کی تکرار محض سے کہیں زیادہ ملاکِ زیر بحث کے فلسفۂ تاریخ وحیات سے ہمدوش کر دیا ہے "

جہاں تک اس جدید راہ کی نشان دہی کا تعلق ہے، میں مطمئن ہوں، کہ ارباب ذوق وجستجو اسے کافی پائیں گے۔ تاہم جس طرح میرا اپنا خیال تھا میں اس کی تکمیل سے قاصر رہا ہوں؛

وقت کی قلت، کتاب کی ضخامت کے بڑھ جانے کا خیال اور سب سے بڑھ کر اربابانِ علم وذوق کے میلانِ طبیعت کی طرف سے بے خبری یہ سب اس باب میں میرے مانع راہ ثابت ہوئے۔ پھر بھی میں طبع ثانی کے وقت اس میں بہت کچھ اضافہ کرنے کی توقع رکھتا ہوں بشرطیکہ میرے طرزوروش کو عام استحسان کی نظر سے دیکھا گیا "

کتاب کی اشاعت میں خلافِ توقع بے حد تاخیر واقع ہوئی۔ خیال تو یہ تھا۔ کہ اکتوبر کے وسط تک شائع ہو سکے گی۔ مگر عین درمیان میں آکر کاتب کے ہاتھوں کے حادثاً کانٹوں میں اُلجھ کر زخمی ہو جانے کے باعث مہینہ بھر تک کتابت رُکی رہی۔ اسی سبب سے کتابت بھی اچھی نہ ہو سکی جس کا مجھے اور میرے کاتب کو بیحد قلق اور افسوس ہے۔ طبع ہوتے وقت بھی ایک زبردست مانع درپیش آگیا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ جو کاغذ کتاب کے لئے خریدا گیا تھا۔ وہ بوجہ تازہ ہونے کے مشین میں جا کر کناروں پر سے سُکڑنے لگ پڑا۔ اب جب تک نیا کاغذ مہیا نہ کر لیا جاتا۔ طباعت روک دینی پڑی "

بارے موفقیت نصیب اور کتاب قارئین کے ہاتھوں میں موجود ہے؛

فللہ الحمد

عزیز ہندی

اعتراف!

میدانِ تصنیف و تحریر میں یہ میرا پہلا قدم ہے
میں نہ کوئی ادیب ہوں نہ مشہور اہل قلم ہو سکتا ہے
کہ میرا قلم ادبی و تصنیفی اعتبار سے بالکل ناکام رہا ہو اسلئے
میں اپنے قارئین سے گذارش کروں گا۔ کہ اگر میری زبان اُن
کے دیدہ و دل کے لئے کیف و سرور کی دلپذیر
وادیاں پیشکار نہ کرسکے۔ تو اسے میری واجبی
کوتاہی پر محمول کیا جائے۔

عزیز ہندی

فہرست مضامین

ضروری تصحیح

صفحہ	سطر	غلط الفاظ	صحیح الفاظ
۵	۱	اگر	مگر
۶۶	۲	کدرہ	کہ وہ
۷۲	۱۶	سنہ ۱۹۳۰ء	سنہ ۱۹۲۰ء
"	۱۹	عارائے	عادات
۸۹	۱۱	اشکار	افکار
۱۱۰	۱۰	پڑتی ہے	پڑی ہے
۱۲۷	فٹ نوٹ	Common Sence	Common sense
۱۲۹	۱۵	اسکے مقابلتہً سے	اسکے مقابلتہً
۱۳۳	۸	توفیق نزپاکر	توفیق نہ پاکر
۱۳۴	۳	لینے کے	لینے کے لئے
۱۴۷	۱۰	اضمحال	اضمحلال
۱۶۴	۴	دُور رفتہ	دَور رفتہ
۱۸۹	"	تدبیریں	تدبیریں
۱۹۷	۸	جگڑ	جکڑ
۲۲۲	۷	عائد ہے	عائد تھا
۲۳۶	۸	کنز	کنز
۲۴۰	۱۲	وقفت کروں	وقف کردیں
۲۶۴	۱۷	معقول بہانہ بہی	معقول بہانہ بھی
۲۷۷	۴	پھوٹ پڑنے سے	پھوٹ پڑنے نے
۲۸۷	۶	عمال ہی غفلت	عمال ہی کی غفلت
۲۹۹	۵	ضرررساں ہوتا	ضرررساں تھا
۳۰۲	۲	اعلان کرا دینے	اعلان کر دینے
"	۱۵	پھٹنے والی	پھٹنے والے
۳۴۴	۱۷	ہیچوں	ہیجوں
۳۵۲	۷	شکست خورہ	شکست خوردہ
۳۹۳	۱۰	جا چکا ہوا تھا	جا چکے ہوئے تھے
۴۰۰	۵	جس نے	جنہوں نے
۴۰۸	۲	ناکندہ نتراش	کندۂ ناتراش

اللہ

باب اوّل

غازی امان اللہ خان

اور

سیاحتِ یوروپ

چونکہ شاہ امان اللہ خان کی واپسی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد شنواریوں نے بغاوت کردی تھی۔ جو انقلاب افغانستان کی سب سے پہلی کڑی کہی جاسکتی ہے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے ماقبل افغانستان کی حکومت کے خیالات و عزائم پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ تاکہ قارئین سہولت کے ساتھ واقعاتِ مابعد میں ربط ملاحظہ کرسکیں ؛

جہاں تک عزائم اور ملک کی ترقی و بہبودی کی آرزوؤں کا تعلق ہے۔ شاہ امان اللہ خان کے پاس ان کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ افغانستان کی حکومت کو ایک ایسے دستورالعمل کے ماتحت چلانا چاہتے تھے۔ جو ساحرانہ کرشمہ گری کیساتھ ایک نہایت ہی حقیر عرصہ میں ملک کو ترقیات کے میدان میں کہیں سے کہیں لیجائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے

نہ صرف غیر ممالک میں اپنی باقاعدہ سفارتیں ہی قائم کیں۔ بلکہ طلباء کی ایک بڑی تعداد فرانس۔ جرمنی۔ اٹلی۔ ٹرکی اور رُوس کے ممالک میں مختلف علوم وفنون کی تحصیل کے لئے روانہ کی تاکہ بہت ہی کم عرصے میں ان کا ملک جہاں تک ماہرینِ علم وفن کا تعلق ہے۔ اغیار کا دستِ نگر نہ رہے۔ محض اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے شاہ غازی نے مختلف وقتوں میں مختلف حیلوں اور بہانوں سے حکومت کے بہت سے کارپردازوں کو یوروپ کی سیاحت کا موقع دیا۔ تاکہ وہ اپنے کہنہ اور فرسودہ خیالات کو بدل سکیں۔ اور دنیا کے متمدن و مترقی ممالک کی طرز وروش کو دیکھ کر جدید اور تازہ سرگرمی و جوش کے ساتھ اپنے پس پا مُلک کی خدمت کرنے کا حوصلہ اور عزم پیدا کریں۔ اُن کا یہ اندازہ نہایت صحیح تھا۔ کیونکہ جب ایسے اشخاص واپس آتے تھے تو نئے خیالات و نئی تجاویز مُلک کی بہبودی اور تعالی کے لئے شاہ کے پیش کرتے تھے۔ حتےٰ کہ بعض ان میں سے ایسی بھی ہوتی تھیں جو خود غازی امان اللہ خان کو عجیب معلوم ہوتی تھیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ غازی امان اللہ خان نے محسوس کیا۔ کہ وہ خود جب تک ایک دفعہ یورپ کی سیاحت نہ کر آئیں۔ نہ تو ان پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنے رفقاء حکومت کی بات کو مسترد کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے دورِ حکومت کے آخری ربع میں اکثر یوروپ جانے کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مگر جہاں تک افغانی پبلک کا تعلق تھا۔ وہ ان کے اس خیال کو بے بنیاد تصور کیا کرتی تھی۔ کیونکہ افغانستان کی پوری تاریخ میں اس قسم کی ایک مثال بھی نہ تھی کہ اب تک کوئی افغانی بادشاہ اپنے تخت کو داخلی لوگوں کی حفاظت وصیانت میں چھوڑ کر اتنے طویل ودراز سفر کی جرأت کر سکا ہو۔ لیکن آگے چلکر واقعات نے ثابت کر دیا۔ کہ یہ انکی محض خام خیالی تھی۔ کم از کم عہد امانیہ میں اس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ کہ کوئی دوسرا دعویدار سلطنت اُٹھکر امان اللہ خان کی غیابت میں ان کو تخت سلطنت سے محروم کر سکے۔ گو غازی امان اللہ خان کو بعد میں اپنے تاج وتخت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مگر انہیں یہ روزِ بد دیکھنا کچھ

اس لئے نصیب نہیں ہوا ۔ کہ ان کے مقابل کوئی دوسرا سہیم و مدعی سلطنت موجود تھا۔ بلکہ یہ تو پبلک اور رعیت تھی ۔ جو ان کے مقابلے میں کامیاب ہوئی ۔ جیسا کہ قارئین پر بعد کے واقعات سے روشن تر ہوتا جائے گا ۔

غرضکہ دریں اثنا بعض ایسے اہم امور بھی حکومت امانیہ کے پیش نظر آ گئے تھے جنکا یک آن زود زیر بحث و تصفیہ پاجانا ضروری تھا ۔ اور جو براہِ راست ملک کی صنعتی اور تجارتی ترقی سے متعلق تھے ۔ مگر جن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خارجی سرمایہ ۔ اور علم و تجربہ کی ضرورت تھی ۔ جہاں تک خارجی سرمایہ کی تحصیل کا تعلق تھا ۔ یہ کام بے حد کٹھن تھا ۔ سیاسی نقطہ نظر سے ضروری تھا ۔ کہ یہ کم از کم ان ممالک سے لیکر نہ برتا جائے جن کے کسی نہ کسی طرح سیاسی مفاد افغانستان سے وابستہ ہیں ۔ اور دیگر ممالک سے بھی معاملہ کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا جائے ۔ کہ وہ ممالک جن سے سرمایہ لیا جا رہا ہے ۔ اہلِ غرض ممالک سے "تبادلہ مفاد سیاسی" کے اصول پر کوئی ایسی مفاہمت نہ کر سکیں ۔ جو افغانستان کے حق میں ضرر رساں یا غیر مفید ہو ۔ ظاہر ہے ۔ کہ افغانستان کے خاص حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس قسم کی گفت و شنید سفارتوں کے ذریعے سے خاطر خواہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچ سکتی تھی ۔ اگر غازی امان اللہ خان اس مدعا کے حصول کے لئے ان ممالک کی طرف جن سے سرمایہ لیا جانا زیر تجویز تھا ۔ خاص وفد مرتب کر کے روانہ بھی کرتے ۔ تو افغانستان کے لئے اپنا سرمایہ حوالہ کرنے کی شاید ہی کوئی حامی بھرتا ۔ ایک تو اس وجہ سے کہ افغانستان سے وہ ممالک بہت سا بُعدِ مسافت رکھنے کی وجہ سے اس کے داخلی نظم اور ساخت حکومت کے متعلق اپنی کوئی قطعی رائے نہیں رکھتے تھے ۔ اور انکو اسبارہ میں افغانستان کی ہمجوار حکومتوں کی رائے و خیال کا ایک حد تک لحاظ رکھنا ضروری تھا ۔ اور یہ امر اپنی آپ تشریح ہے ۔ کہ یہ ہمجوار سلطنتیں ان کیلئے کچھ زیادہ ہمت آفرین نہیں ہو سکتی تھیں ۔ دوسری وجہ یہ تھی ۔ کہ اگر افغانستان سے کوئی خاص وفد تشکیل کر کے بھیجا جاتا ۔ تو کابل سے

قبل از روانگی ہی اس کا سارا راز غرضمند سلطنتوں پر آشکارا ہو جانا ایک ناگزیر امر تھا۔ اور پیشتر اس کے کہ وفد ندکور اپنی منزلِ مقصود پر پہنچتا۔ وہاں کی زمین اس کے لئے سنگلاخ بن چکی ہوتی۔ اور گویا اس کی ناکامی مقدر تھی۔ تیسرے افغانی حکومت ابھی تک اس قابل نہ ہوئی تھی۔ کہ وہ ممالکِ دنیا کے سامنے اپنا "کریڈٹ" پیش کر سکتی۔ یہ اور ایسی ہی چند در چند وجوہات اور موجود ہو گئی تھیں۔ جنہوں نے غازی امان اللہ خان کے عزمِ سیاحتِ یوروپ کو بڑی تقویت پہنچا رکھی تھی۔ اور انہوں نے اپنا معاملہ اپنی پارلیمنٹ یعنی "ریاست شورائے ملی" کی تصویب و منظوری حاصل کرنے کے لئے پیش کر دیا تھا انہوں نے اپنے معترضین کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ ان کے بہ نفس نفیس جانے سے نہ صرف افغانستان کی عظمت و اہمیت زیادہ ہو جائے گی۔ بلکہ جملہ مطالب مذکورہ اور دیگر کئی ایک اہم سیاسی مفاد..... حاصل ہونگے۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہئیے۔ کہ گو غازی امان اللہ خان افغانستان کے خود مختار بادشاہ تھے۔ اور اپنے عزم و ارادہ کی تکمیل میں ان کا کوئی مزاحم نہ ہو سکتا تھا۔ تاہم غازئ موصوف ممالکِ دنیا کی نظروں میں اپنی حکومت کو ایک آئینی حکومت ثابت کرنے کے دعویدار تھے۔ اور اس لئے وہ قبل از روانگی یوروپ اپنے معترضین کو دلائل و براہین سے خاموش کرنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہوئے ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی یہ خواہش بھی تھی۔ کہ وہ دنیا کے سامنے اپنی ذات کو نہ صرف ایک بادشاہ کی حیثیت سے متعارف کریں۔ بلکہ ملّتِ افغانیہ کے واحد اور با اختیار نمایندہ ہونے کی حیثیت سے بھی دنیا ان کی ذات کو تسلیم کرنے میں متامل نہ ہو۔ چنانچہ مجلسِ وزراء کے علاوہ ریاست شورائے ملی سے یوروپ کی روانگی کے لئے اذن طلب کرنے کی یہی وجہ تھی۔ دراصل یہ ایک قسم کی رسمی (فارمل) کارروائی تھی۔ ورنہ "عزمِ امانی" اٹل اور مقدر ہو چکا تھا۔ سفراء دول سے استمزاج کیا جا چکا تھا۔ ہر ایک یورپی سلطنت سے قریب قریب دعوتیں موصول ہو چکی تھیں۔ اٹلی کے موسیولینی نے

سب سے پہلے دعوت بھیجی تھی اگر اس کی ایک خاص وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ کچھ ہی عرصہ پہلے اٹلی کا ایک باشندہ "پیپرنو" نامی جو سلطنت افغانستان کے محکمہ انجینئری میں ملازم تھا ایک افغانی سپاہی کے قتل کے جرم میں قصاص کے طور پر پھانسی دیا گیا تھا جس پر اٹلی اور افغانستان کے تعلقات بے حد کشیدہ ہو گئے تھے۔ اور اٹلی نے تیس ہزار پونڈ بطور تاوان ادا کرنے کا افغانستان کی حکومت سے مطالبہ کیا تھا۔ اور نیز رسمی معافی کے مانگے جانے کی خواہش کی تھی۔ یہ دونوں مطالبات کسی قدر ردّ و قدح کے بعد افغانستان کی حکومت کو منظور کرنے پڑے تھے۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ واقعہ موسیولینی کے ان کارہائے نمایاں میں سے ایک تھا جس نے یوروپ میں موسیولینی کی دھاک باندھ دی تھی۔ اور چونکہ موسیولینی کی دھاک بندھی میں افغانستان نے ایک طرح کی معاونت کی تھی اس لئے یہ موسیولینی کے لئے ضروری تھا۔ کہ ایسے رفیق ایشیائی بادشاہ کو اپنے ہاں آنے کی سب سے پہلے دعوت دے۔ القصہ یہ اب ایک فیصل شدہ امر تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان عنقریب سیاحت یوروپ کی غرض سے سفر کرینگے۔ مگر دو مسائل ہنوز تصفیہ طلب تھے۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا۔ کہ شاہ امان اللہ خان کے دورۂ یوروپ کے پروگرام کی نقل و حرکت کیا ہو۔ چنانچہ اسکے مرتب کرنے کا کام مجلس وزراء نے وزارت خارجیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اور دوسرا مسئلہ جو سب سے زیادہ اہم اور بنیادی مسئلہ تھا۔ شاہ کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ غازی موصوف کی غیابت میں سلطنت کے امور کو کون سر انجام دے۔ ملک کے اندر صرف دو شخصیتیں ایسی تھیں۔ جن کی طرف سے غازی موصوف کو کھٹکا ہو سکتا تھا۔ ایک تو ان کا اپنا بڑا بھائی سردار عنائت اللہ خان تھا اور دوسرا ان کا ماموں زاد بھائی اور بہنوئی علی احمد جان جو اس وقت کابل کا گورنر تھا اس ضمن میں شمار ہوتا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں پر اس سیماب پا شخصیت کا تھوڑا سا ذکر کر دیا جائے۔ جس نے میری اپنی رائے میں افغانستان کی کایا پلٹ میں ایک

مدہش ترین قمار صفت انسان کی طرح حصہ لیا۔ آہ! وہ میرا ایک صمیمی دوست تھا اور جبکہ میں اس کے متعلق کچھ لکھنے والا ہوں۔ اس کی وہ متحرک تصویر میرے تصور میں ہے۔ جب اُسے اس کی آخری ناکامی کے بعد پا بجولاں قندھار سے کابل میں لایا گیا۔ مجھے اس وقت بچہ سقاؤ کے جیلخانہ سے نجات پائے ہوئے ابھی دو ایک دن ہی ہوئے تھے۔ کہ سُنا گیا۔ کہ وہ کابل میں پہنچ گیا ہے۔ اور بچہ سقاؤ کے حکم سے اُسے بازاروں میں پھرایا جا رہا ہے۔ چونکہ اس کے ماتمی جلوس کے گذرنے کا وہی راستہ تھا۔ جہاں میں رہتا تھا۔ اس لئے مجھے اس کے دیکھنے کی فطری خواہش کو پُورا کرنے کیلئے گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ میں اپنی بیوی اور والدہ کو لیکر اپنے مکان کی اس کھڑکی میں کھڑا ہو گیا جس کا رُخ بازار کی طرف تھا۔ اب ہم بازار کے دونوں سرے دُور تک بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ میری والدہ زیادہ ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے پوری آزادی کے ساتھ اس افسوسناک جلوس کا گذرنا دیکھ سکتی تھیں۔ لیکن میری بیوی بچاری کو بے حد تکلیف تھی۔ اور وہ میرے جسم کی پناہ لے کر کھڑی ہوئی تھی۔ اتنے میں جلوس نزدیک آتا ہوا دکھائی دیا۔ آگے آگے گھوڑ سوار تھے۔ اور ان کے ہمراہ فوجی باجہ تھا۔ جو بچہ سقاؤ کے فتح و ظفر کے ترانے الاپ رہا تھا۔ اس کے بعد پیدل فوج تھی۔ اس کے دو حصے کئے گئے تھے۔ ایک حصّہ آگے تھا۔ اور دُوسرا پیچھے کی طرف۔ اور بیچ میں وہ مضطرب اور ناتسکین یا فتہ ہستی تھی۔ جو دنیا میں علی احمد جان کے نام سے مشہور و معروف تھی کبھی وہ دن تھا۔ کہ یہ شخص اس شان سے کابل کی سڑکوں پر نمودار ہوا کرتا تھا۔ کہ خود غازی امان اللہ خان پر رشک کی بجلیاں گر پڑتی تھیں۔ میں نے اب تک کسی دُوسرے انسان میں یہ صفت موجود نہیں دیکھی۔ جس کی اس طرح سے ساحرانہ کشش لوگوں کو خود بخود اس کے حامل کی تعظیم و تکریم کرنے پر مجبور کر دیتی ہو۔ یہ صفت اس شخص میں بدرجۂ کمال تھی۔ وہ جس راستہ سے گذر جاتا تھا۔ لوگ خواہ کتنے ہی

ضروری کام میں مصروف کیوں نہ ہوں۔ اپنا کام چھوڑ کر اس کی تعظیم کرنے کے لئے
سرو قد ہو جایا کرتے تھے۔ حالانکہ اس کے بالمقابل لوگ کبھی غازی امان اللہ خان کو
بھی اتنی اہمیت نہیں دیا کرتے تھے۔ یا آج وہ دن ہے۔ کہ وہی ساحر انسان زنجیر و
سلاسل میں جکڑا ہوا ایک دزد بے مایہ کے قیدی کی حیثیت سے پا پیادہ منظر عام پر
ہے۔ اس کے جسم پر سوائے ایک معمولی خاکی زین کی قمیص اور لٹھے کے ایک پاجامہ
کے اور کچھ نہیں ہے۔ پاؤں میں ایک پرانی چپلی ہے۔ دونوں پاؤں میں ڈنڈا بیڑی
پڑی ہوئی ہے ہاتھ کہنیوں سے کھینچکر پیچھے کی طرف کسے ہوئے ہیں۔ اور سر ننگا[1] ہے۔
اس نے دور ہی سے مجھے دیکھا۔ اور اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ دیں اُس
وقت نہ تو میری آنکھوں میں مجال رہی۔ کہ اس کے چہرے سے ہٹا لیتا۔ اور نہ ہی
وفور حسرت اور مصلحت وقتی نے اجازت دی۔ کہ اسکی اس مصیبت میں دو عدد تسکین
کے کلمات کہہ سکتا۔ مگر اس کی نگاہیں صاف کہہ رہی تھیں۔ کہ وہ کم از کم اپنی شجاعت
اور بسالت کی داد چاہنے کا مجھ سے بروقت طالب ہے۔ ہم دونوں اسی تکرار و اصرار نگاہی
میں مصروف ایک دوسرے کے قریب اور پھر مقابل تھے۔ پھر بتدریج دور ہونے
شروع ہو گئے۔ لیکن اب بھی گو علی احمد جان آگے کی طرف شیرانہ وار قدم اٹھائے
چلا جا رہا تھا۔ اس کا سر پیچھے کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں ہی
میں تھیں۔ کہ اتنے میں ایک تحکمانہ آواز اور اس کے ساتھ ہی میری بیوی کے یک لخت
جھٹکا دینے نے مجھے دفعتہً ایک خطرہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ میں کیا دیکھتا ہوں۔ کہ فوج کے
پچھلے حصے کے سقاوی سپاہی جو ہمارے اس عجیب فعل سے مشتعل ہو گئے تھے۔ مجھ پر
واہی تباہی بک رہے ہیں۔ اور ایک ستم ظریف نے تو بندوق کی نالی تک میرے
سینے کی طرف سیدھی کر دی ہے۔ اور عنقریب بندوق کو داغ دینا چاہتا ہے۔ مگر اتنے

[1] افغانستان کے ملک میں یہ رسم ہے۔ کہ جب کسی باغی یا گنہگار یا دشاہی کو دار الخلافہ میں لایا جاتا ہے تو اسکا سر ننگا کر دیتے ہیں۔

میں ایک دوسرے سپاہی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بول "یا چار یار" میں نے بیساختگی کے عالم میں "یا چار یار[1]" کا نعرہ تو لگا دیا۔ لیکن اب میرے ہوش و حواس یکسر رخصت تھے۔ اور انتہائی غصہ و جوش کے عالم میں میں کھڑکی میں سے ان سپاہیوں کے سروں پر کود جانا چاہتا تھا جن کی گولیاں ابھی ابھی میرے سینے کے پار ہونے کے لئے بیتاب ہو رہی تھیں۔ مگر جلدی ہی کسی نے پیچھے سے میرے دامن کو پکڑ کر اس زور سے کھینچا۔ کہ میں کھڑکی سے علیحدہ ہوگیا۔ اور میری والدہ نے خطرہ کو سر پر سے ٹلتا نہ دیکھ کر جھٹ کھڑکی بند کر دی۔ تھوڑی دیر تک دروازہ پر سپاہیوں کا شور و غل ہوتا رہا۔ لیکن بعد میں وہ افسروں کے آجانے پر بکتے جھکتے آگے چلے گئے۔

ہاں تو یہی وہ شخصیت تھی۔ جس سے غازی امان اللہ خان ہمیشہ کھٹکا کرتے تھے تیسری جنگ افغانستان کے خاتمہ پر یہی سردار علی احمد جان افغانی وفد کے سرکردہ بنکر راولپنڈی کانفرنس میں تشریف لے گئے تھے۔ جہاں ان کی بہادرانہ تقریروں کی وجہ سے پہلی بار ان کو افغانستان سے باہر شہرت نصیب ہوئی تھی۔

امیر حبیب اللہ خان مقتول کے عہد کے خاتمہ پر افغانستان میں پانچ زبردست خاندانی پارٹیاں موجود تھیں۔ ایک پارٹی سردار نصر اللہ خان برادرِ امیر مقتول کی تھی۔ دوسری پارٹی مستوفی الممالک محمد حسین خان کوہدامنی کی تھی۔ تیسری پارٹی لوہ ناب یعنی سردار علی احمد جان کے والد کی تھی۔ چوتھی پارٹی سردار محمد نادر خان موجودہ پادشاہ افغانستان کے خاندان کی تھی۔ اور پانچویں پارٹی سردار محمود خان طرزی کی تھی۔ جو ملک کے پیدا شدہ نوجوان طبقہ کی راہنما پارٹی کہلاتی تھی۔ ان میں سے دو پارٹیاں تو امیر حبیب اللہ خان کے قتل ہوتے ہی معدوم ہوگئیں یعنی مستوفی الممالک محمد حسین خان کی جماعت تو امان اللہ خان کے حکم سے اس کے پھانسی پا جانے کے ساتھ ہی تتر بتر اور منتشر ہوگئی تھی۔ اور سردار

[1] وہاں عام طور پر "اللہ اکبر" کی بجائے یہی نعرہ برزبان ہے۔

نصر اللہ خان کی پارٹی بھی اس کے اپنے زوال کے ساتھ ہی فنا ہو گئی۔ باقی تین پارٹیاں موجود تھیں۔ ان میں سے علی احمد جان کے والد کی پارٹی کا زور آغاز جلوس بادشاہی میں سب سے زیادہ تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ سردار علی احمد جان کو راولپنڈی کانفرنس کا صدر بنا کر بھیجا گیا۔ غازی امان اللہ خان کے نزدیک بھی اُس وقت یہ پارٹی اتنی معزز اور اہم سمجھی جا رہی تھی۔ کہ انگریزوں سے افغانستان کی خود مختاریت جیسا اہم کام بھی اس کے سپرد کیا گیا۔

سردار علی احمد جان راولپنڈی کانفرس میں افغانی نوجوان پارٹی کے نقطۂ خیال سے بالکل ناکام رہا۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ انگریزی حکومت سے افغانستان کی آزادی تسلیم نہ کروا سکا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ مذاکرات کے دوران میں اس نے افغانستان کیطرف سے ڈیورنڈ لائن کو افغانی اور ہندوستانی حد تسلیم کر لیا۔ پُرجوش افغان جو سردار محمود طرزی کی راہنمائی میں کام کر رہے تھے۔ اس امر کے جاننے سے سخت مشتعل ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ ہندوستان کی نظمی سرحد کے سوا اور کسی حد فاصل کو ان کے ملک اور ہندوستانی حدود کے درمیان تسلیم کیا جائے۔ ڈیورنڈ لائن کے تسلیم کرنے سے تمام آزاد قبائل عنواً انگریزی اثر و رسوخ کے ماتحت آ جاتے تھے۔ اور ان کے اندرون ملک میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کا حق افغانی حکومت کو نہیں رہ جاتا تھا۔ اور یہ چیز افغانی نوجوانوں کے نقطۂ خیال کے سخت برخلاف تھی۔ بعد میں حکومت ہائے برطانیہ اور افغانستان کے درمیان جو معاہدہ اس باب میں مرتب ہوا۔ تو اس میں باوجود افغانستان کی طرف سے اصرار شدید کئے جانے کے راولپنڈی کانفرنس میں جو کچھ طے ہو چکا تھا۔ نہ بدل جا سکا۔ اور افغانستان اور ہندوستان کی حد فاصل وہی ڈیورنڈ لائن ہی رہی۔ چنانچہ راولپنڈی کانفرنس سے واپسی پر علی احمد جان معتوب شاہی قرار دیئے جا کر اپنے محل میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ اور بالآخر علیا حضرت (والدۂ غازی امان اللہ خان جن کے سردار موصوف علاوہ بھتیجا ہونیکے داماد بھی تھے) کی سعی سے ۱۹۲۳ء میں قید نظر بندی سے

آزاد کر دیئے گئے ۱۹۲۴ء کی بغاوت منگل کے فرو کرنے میں انہوں نے بہت نمایاں حصہ لیا۔ اور اس مہم کے خاتمہ پر ان کا استقبال کابل میں "فاتح بغاوت منگل" کی حیثیت سے کیا گیا۔ زاں بعد یہ کابل کے گورنر قرار دیئے گئے۔ اور جس وقت اعلیحضرت سابق سفر یورپ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ اسی عہدۂ جلیلہ پر قائم تھے۔ بغاوت منگل کے فرو کرنے کے دوران میں ان کے دربار کی کرّوفر اور ان کی اپنی نقل و حرکت کچھ ایسا شاہانہ ٹھاٹھ اختیار کر گئی تھی۔ کہ غازی امان اللہ خان پر ان کا مافی الضمیر اچھی طرح روشن ہو چکا تھا۔ اور مخالف پارٹیاں بھی ہمہ وقت دراندازی کرنے میں کوتاہی نہ کرتی تھیں۔ گویا صاف طور پر یہ سمجھا جا رہا تھا۔ کہ سردار علی احمد جان خود عزم بادشاہی رکھتے ہیں۔ اور اگر انہیں کبھی فرصت میسر آ گئی۔ تو یہ موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے میں کوتاہی نہ کرینگے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ ان کی شخصیت ان دو خطرناک شخصیتوں میں سے ایک شمار ہوتی تھی۔ جن کا اندرون ملک میں غازی امان اللہ خان کو کھٹکا ہو سکتا تھا۔ لہذا کسی طرح مناسب نہ سمجھا گیا۔ کہ ایسی شخصیت کو ملک کے اندر چھوڑ کر باہر قدم نکالا جائے۔ چنانچہ ان کو بھی معیت بادشاہی میں یورپ چلنے کا حکم صادر ہو گیا۔

دوسری شخصیت سردار عنایت اللہ خان کی تھی۔ جو دستور بادشاہی کے مطابق افغانستان کے تاج و تخت کے حقیقی وارث تھے لیکن ان کی کوئی اپنی جماعت ہی موجود نہ تھی جس سے کسی قسم کا خوف کھایا جاتا۔ یہ اپنے والد یعنی امیر حبیب اللہ خاں کے قتل ہونے کے وقت انہی کی معیت میں تھے۔ اور اپنے چچا سردار نصر اللہ خان کے اثر میں تھے۔ غازی امان اللہ خان سے ان کو کوئی شکایت کا موقع ہی نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ اپنے چچا کے حق میں سلطنت افغانستان سے جلال آباد میں دست بردار ہو چکے تھے۔ اور براہ راست اپنے چچا کے مظلوم وستم دیدہ تھے۔ اگر سردار نصر اللہ خان کی بجائے یہ اس وقت خود بادشاہ بن جاتے۔ تو کم از کم غازی امان اللہ خان کی کامیابی کی بظاہر

کوئی اُمید نہ تھی۔ لیکن قدرت چونکہ افغانستان کی عنانِ حکومت غازی امان اللہ خان کو دینا چاہتی تھی۔ اس لئے واقعات بھی اسی طرح کے پیش آئے۔ غرضکہ سردار عنائت اللہ خان ایک کافی عرصے تک اپنے محل میں نظر بند رکھے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے ہمدردوں اور دوستوں کو اپنی جماعت بندی کا خیال تک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ ہی حکومتِ امانیہ ان کو ایسا کرنے کے لئے آزاد چھوڑ سکتی تھی۔ جب سردار عنایت اللہ خان کو نظر بندی کی قیود سے آزاد کیا گیا۔ تو وہ یکہ و تنہا تھے۔ اس عرصہ میں مُلک کے اندر جتنی جماعتیں بھی تھیں۔ وہ ان کی کسی طرح بھی حمایت نہ کرنا چاہتی تھیں۔ اور یہ خود کوئی نئی جماعت اپنی حمایت میں تشکیل کرنے سے معذور تھے۔ لہٰذا غازی امان اللہ خان کے عزمِ یوروپ کے وقت ان کی اہمیت کچھ ایسی نہ تھی۔ جو بادشاہ کے تشویش و اضطراب کا زیادہ باعث بن سکتی۔ مگر تاہم چونکہ دراصل وہی افغانستان کے تاج و تخت کے اصلی وارث تھے۔ اور امان اللہ خان کی غیابت میں ملک میں اگر کوئی بغاوت رونما ہوتی۔ تو سب کی نظریں لامحال انہی کی طرف اٹھ سکتی تھیں۔ اس لئے ایسی شخصیت کو خواہ وہ کسی حال میں کیوں نہ ہو بالکل ہی نظر انداز کرنا مصلحتِ ملکی کے سراسر منافی تھا۔ اب صرف دو ہی راہیں غازی امان اللہ خان کیلئے باقی رہ گئی تھیں۔ یا ان کو بھی اپنے ہمراہ یورپ میں لے جائیں۔ اور یا پھر ملک کا کاروبارِ سلطنت ایسے ہاتھوں میں چھوڑ جائیں۔ جو نہ صرف مُلک میں امن و امان قائم رکھ سکیں بلکہ خود ان کی ذات سے بھی کسی قسم کی غداری نہ کر سکیں۔ پہلی تجویز غازی امان اللہ خان کے سخت ناپسند خاطر تھی۔ کیونکہ وہ دنیا کے ممالک پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ کہ محض قوت عسکری کے بل بوتے پر وہ افغانستان پر حکومت نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ملتِ افغانستان دل سے ان کی والہ و شیدا ہے۔ اور وہ لوگوں کے نہ صرف بادشاہ بلکہ نمایندہ بھی ہیں۔ لہٰذا اگر نہ سردارِ موصوف کو

اپنے ہمراہ لیجاتے ۔ تو یہ نمائش پوری نہیں ہو سکتی تھی ۔ اور صرف دوسری راہ ہی اس باب میں بادشاہ کی خاطر جمعی کے سامان فراہم کر سکتی تھی ۔ بشرطیکہ اس راہ کی تکمیل میں کوئی ایسا نقص نہ رہ جائے ۔ جو امن کی بحالی اور قائمی میں سد اور روک ہو ۔ یا جوان کی غیابت میں امور سلطنت کے سرانجام دینے والوں کو خیانت کاری کا موقع دے ۔ اس نازک ترین مہم کے سر کرنے میں غازی امان اللہ خان کو بہت سی دقتیں نظر آتی تھیں ۔ لیکن بالآخران پر غلبہ پا لیا گیا ۔ ان سب میں نمایاں دقت جو تھی ۔ وہ یہ تھی ۔ کہ ملک بھر میں کوئی ایسی پارٹی موجود نہ تھی ۔ جسکو غازی امان اللہ خان کا پورا اعتماد حاصل ہو تا شروع سلطنت سے لیکر اب تک قدیم پارٹیوں میں جو تغیرات رونما ہوئے تھے ۔ وہ حسب ذیل تھے :۔

اوّل ۔ غازی محمد نادر خان سپہ سالار عساکر افغانیہ کی پارٹی کا زور و شور اور عروج بغاوت منگل کے رونما ہونے سے پہلے تک رہا ۔ قریب قریب ملک کے تمام جنگی اور ملکی محکموں پہ ان کے خاندان کا قبضہ و اثر تھا ۔ اور غازی امان اللہ خان کبھی کبھی اس غلبہ واثر سے پریشان ہو جاتا تھا ۔ وہ دل سے چاہتا تھا ۔ کہ کہ کسی طرح اس پارٹی کا زور توڑا جائے ۔ (یہاں یہ ذہن نشین کر دینا میں اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں ۔ کہ میں غازی امان اللہ خان کی اس خواہش کو کسی طرح بھی ملزم نہیں گردانتا ۔ کیونکہ شخصی حکومتیں فطرۃً اس خصوص میں کمزور ہوتی ہیں ۔ وہ کسی کا اثر و رسوخ برداشت نہیں کر سکتیں ۔ جو اس اندازے سے بڑھ جائے جس سے بادشاہ کی اپنی پوزیشن نازک ہو جائے) اس مطلب کے حصول کیلئے وہ سردار محمود طرزی کی پارٹی کی طرف اس لئے امید ہیں نہیں باندھ سکتا تھا ۔ کہ سردار محمود طرزی اس کا اپنا خسر تھا ۔ اور سردار موصوف کی ایک لڑکی سردار عنائت اللہ خان کی بیوی تھی ۔ پس اگر سلطنت کی غالب طاقت اس کو سونپی جاتی تو غازی امان اللہ خان کی اپنی وضعیت ان دو لومڑیوں میں سے ایک کی سی ہوتی ۔

جو اپنی ساری متاع کو بندر کے عدل وانصاف کے حوالے کر بیٹھی تھیں۔ پس سردار محمد نادر خان کی پارٹی کا بڑھتا ہوا زور توڑنے کے لئے غازی موصوف کو ایک جدید پارٹی تشکیل کرنی پڑی۔ اس کے لئے اس وقت فضا بھی موافق تھی۔ محمد ولی خان جو افغانی وفد کے سرکردہ کی حیثیت سے افغانستان کی حکومت کی طرف سے یوروپ سے سیاسی تعلقات پیدا کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے ۱۹۲۲ء میں کامیاب واپس آچکے تھے۔ اور چونکہ یوروپ کا دورہ کرتے ہوئے انہوں نے افغانستان کی آبرو کی پورے طور پر حفاظت کی تھی۔ اس لئے نوجوانوں نے ان کو محبت کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور غازی امان اللہ خان بھی ان سے بہت مسرور تھے۔ چنانچہ سردار محمود طرزی کی جگہ انہیں افغانستان کا وزیر خارجہ بنا دیا گیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے اس زمانۂ وزارت میں نوجوانوں کے دل میں ایک طرف اور بادشاہ کے دل میں دوسری طرف بہت عزت ووقار پیدا کر لیا ہوا تھا۔ لہذا منگل کی بغاوت کا ہنوز آغاز ہی ہوا تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان نے جو محمد ولی خان کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ .... ہی سردار محمد نادر خان سے دن بدن بدظن ہو رہا تھا۔ دفعتہً جرأت سے کام لیکر سردار محمد نادر خان کو وزارت حربیہ کے عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش کر دیا تو ان کی جگہ محمد ولی خان کو وزیر حربیہ مقرر کر دیا اور پھر اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد محمد نادر خان کو سردار محمود طرزی کی جگہ فرانس کا سفیر بنا کر یوروپ بھیج دیا۔ اور سردار موصوف کو وہاں سے واپس بلوا کر از سر نو وزارت خارجہ کے عہدے پر فائز کر دیا۔

اس طرح گویا

غازی امان اللہ خان کے عزم سیاحت کے وقت غازی محمد نادر خان کی پارٹی کمزور اور منتشر ہو چکی تھی۔ اور اس کی جگہ محمد ولی خان کی پارٹی کا دور دورہ تھا۔ جو غازی

امان اللہ خان کی اپنی پیدا کردہ پارٹی تھی۔

دوم۔ سردار محمود طرزی کی پارٹی امیر حبیب اللہ خان کے عہد سے چلی آتی تھی جبکہ وہ مشہور اخبار "سراج الاخبار" کی ادارت کرتے تھے۔ اپنے شروع سلطنت میں امیر حبیب اللہ خان بہت بڑے ترقی خواہ تھے۔ اور پہلے پہل انہوں نے ہی افغانستان میں "مجلس شورے" کی طرح ڈالی تھی۔ اور اس مجلس شوریٰ کی صدارت وہ بنفس نفیس خود فرمایا کرتے تھے ان ایام میں دربار کابل میں بعض معزز ہندوستانی بھی موجود تھے۔ جن میں ڈاکٹر عبد الغنی اور ان کے برادر بزرگ مولانا نجف علی اور پروفیسر محمد حسین بی۔ اے علیگ وغیرہم کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔ دراصل انہی حضرات نے امیر مقتول کی توجہ مجلس شورے کے انعقاد کرنے کی طرف مبذول کی تھی۔ مگر افسوس تھوڑے ہی عرصہ بعد امیر حبیب اللہ خاں درباری سازشوں کی وجہ سے اس نام نہاد مجلس شورے سے سخت بدظن ہو گیا۔ اور اس نے نہ صرف بیک جنبش قلم مجلس مذکور کو محو کر دیا۔ بلکہ بہت سے عالی خیال اور حریت پسند افغانی نوجوانوں کو نا معلوم مدت تک کے لئے زندان بلا میں ڈال دیا۔ اور یہ سارے کے سارے حضرات کامل گیارہ برس اس مصیبت کبریٰ میں مبتلا رہے اور ان بیچاروں کو کہیں اس وقت جا کر خلاصی نصیب ہوئی۔ جب امیر حبیب اللہ خان "کلہ گوش"[ف] میں مقتول ہوا۔ اور غازی امان اللہ خان نے کابل میں اپنی امارت کا اعلان کیا۔ ان نوجوانوں میں بہت سے سردار محمود طرزی کی زیر قیادت تھے۔ اور یہاں یہ بات ملاحظہ کے قابل ہے۔ کہ سردار موصوف اپنے دونوں دامادوں یعنی (سردار امان اللہ خان بعد میں شاہ امان اللہ خان اور سردار عنایت اللہ خان جائز وارث تخت افغانستان) میں سے پہلے کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ شاہ امان اللہ خاں کو عالی خیال اور حریت پسند اور سردار عنایت اللہ خان کو رجعت پسند شہزادہ

ف۔ "کلہ گوش" نعمان (جلال آباد) کا ایک فرحت بخش مقام ہے۔

خیال کیا کرتے تھے۔ اسی لئے شہزادہ امان اللہ خان ان سے اپنے باپ کے عہد ہی میں ملا ہوا تھا۔ اور ان کی اوران کی پارٹی کی مال وزر سے مدد کیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی وہ کابل کا گورنر مقرر[1] ہوتا تھا تو نوجوانوں کو خفیہ خفیہ ایجی ٹیشن کرنے کی ترغیبات دیا کرتا تھا۔ اب جبکہ امان اللہ خان افغانستان کے خود بادشاہ بنے۔ تو ان کی پیٹھ پر سارے کے سارے سرگرم اور پر جوش افغان موجود ہو گئے تھے۔ جن سب کو غازی ممدوح نے اعلیٰ عہدوں پر سرافراز کر دیا ہوا تھا۔ اور اس لئے سردار محمود طرزی کی پارٹی دراصل بہت سے مختلف حصوں میں تقسیم ہو چکی ہوئی تھی۔ اور ہر ایک اعلےٰ عہدہ رکھنے والا نوجوان اپنی پارٹی کو مضبوط کرنے کی خود فکر میں تھا۔ اسی ٹوٹتے ہوئے گروہ کا ایک غالب جزو محمد ولی خان کی واپسی یوروپ پر ان کی قیادت میں آچکا تھا۔ اور یہ سب کچھ درپردہ غازی موصوف کی اپنی مرضی سے ہو رہا تھا۔ جو اپنے خسر کو زیادہ طاقتور اور امورات سلطنت میں دخیل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ الغرض اس وقت جب کہ سیاحت یوروپ کی صلاح ٹھہر چکی تھی۔ سردار محمود طرزی کی پارٹی اتنی مضبوط نہ تھی۔ کہ اس پر ملک کے امن و امان کا انحصار کیا جائے۔ اور اگر ہوتی بھی۔ تو غازی امان اللہ خان اپنی سلطنت اپنے خسر کی تحویل میں چھوڑ کر افغانستان سے باہر قدم نہیں نکال سکتا تھا۔ لہٰذا جہاں اس نے یہ فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ کہ سردار عنایت اللہ خان کو افغانستان میں چھوڑ جانا ہی اسکے پسندیدہ خاطر ہے۔ وہاں اس کا یہ فیصلہ بھی تھا۔ کہ وہ سردار محمود طرزی کو اپنے ہمرکاب رکھے گا مگر اس فیصلہ کرنے میں صرف ایک ہی غرض مقصود نہ تھی۔ بلکہ کچھ سیاسی مقاصد بھی پیش نظر تھے۔ علاوہ براں چونکہ غازی موصوف کو توقع تھی۔ کہ وہ ممالک خارجہ سے دوران سیاحت میں بعض عہدنامے بھی مرتب کرینگے۔

[1] جب کبھی امیر حبیب اللہ دار السلطنت سے باہر جایا کرتا تھا۔ تو وہ اپنے بیٹوں کو باری باری کابل کی گورنری پر مقرر کیا کرتا تھا۔

اور محمود طرزی ایک بہترین سیاست دان شمار ہوتا تھا۔ لہٰذا اس کا ساتھ رکھنا یوں بھی ضروری تھا۔

سوئم۔ سردار علی احمد جان کی پارٹی کا زور راولپنڈی کانفرنس کی ناکامی کے بعد ان کے اپنے معتوب اور نظر بند ہو جانے کی وجہ سے بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ اور ان کی رہائی پر انہیں اتنا کافی وقت ہی نہیں ملا۔ کہ وہ اپنی پارٹی کو از سر نو تشکیل کرتے باوجودیکہ ان کی رہائی کی ایک خاص سیاسی وجہ بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ ان کی پارٹی اور سردار محمد نادر خان کی پارٹی میں سخت باہمی رقابت تھی۔ اور غازی امان اللہ خان ان مخالف طاقتوں کو برسر شہود لانا چاہتا تھا۔ جو محمد نادر خان کی پارٹی کا زور کم کرنے میں ان کی معاونت کریں۔ لیکن یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم دیتی ہے۔ کہ سردار علی احمد جان سے غازی امان اللہ خان نے اس وقت تک کوئی کام نہیں لیا۔ جب تک سردار محمد نادر خان کو فرانس نہیں بھیجدیا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو۔ کہ غازی ممدوح اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ کہ خواہ سردار علی احمد جان حکومت کے عہدیدار ہوں یا نہ ہوں۔ وہ سردار محمد نادر خان کے زور توڑنے کے لئے خود بخود ریشہ دوانیاں کرنے پر مجبور ہونگے۔ تاکہ اپنی پارٹی کی مضبوطی پر وہ آئندہ کسی عہدۂ وزارت کی توقع کر سکیں۔ اور ساتھ ہی غازی امان اللہ خان نہیں چاہتے تھے۔ کہ سردار علی احمد جان کو حکومت کے کسی عہدۂ جلیلہ پر فائز کرکے ان کی جماعت کو جلد پھولنے اور پھلنے کے مواقع دئے جائیں۔ بہرحال جو سیاست بھی در پردہ کارفرما تھی۔ یہ واضح ہو چکا ہے۔ کہ سردار علی احمد جان کی پارٹی بھی سیاحت یوروپ کے وقت کمزور تھی۔ اور خود سردار مظلوم بھی مشتبہ نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

ان تینوں پارٹیوں کے علاوہ سیاحت یوروپ کے موقع پر ایک چوتھی پارٹی بھی

تھی۔ جو اپنے عروج میں محمد ولی خان کی پارٹی کے مثل بلکہ چند ایک لحاظ سے طاقت میں اس سے بھی زیادہ تھی۔ اور وہ بادشاہ کی اپنی پارٹی تھی۔ جو شاہ پسند یا شاہ پرست پارٹی کہلاتی تھی۔ یہ دو اہم حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک حصہ محمد عزیز خان وزیر داخلہ و وکیل وزیر حربیہ کے سپرد تھا۔ اور دوسرا محمود خان یاور رئیس محکمہ سرحدات و نگران محکمہ کار خاص و رئیس تعمیرات افغانستان کے تفویض تھا۔ گویا بادشاہ اپنے ان دو خاص معتمد کارکنوں کے ذریعہ سے ملک کے کل سیاہ و سفید کی خبر رکھتا تھا۔ محمد عزیز خان آغاز عہد امانیہ میں اعلیحضرت غازی امان اللہ خان کا یاور یعنی پرائیویٹ سیکرٹری تھا۔ اور اس کے علاوہ کابل کا ماشین خانہ بھی اسی کی زیر نگرانی کام کرتا تھا۔ پھر بعد میں یہ وزیر داخلہ بنا دیا گیا تھا۔ اور جب منگل کی بغاوت کی سرکوبی کے لئے محمد ولی خان وزیر حربیہ کو خوست کے علاقہ میں خود جانا پڑا۔ تو بادشاہ نے اس کو وزارت حربیہ کا وکیل[1] بھی بنا دیا۔ منگل کی بغاوت فرو ہو چکنے کے تھوڑی مدت بعد جب اعلیحضرت امان اللہ خان نے اندرون ملک کا دورہ اختیار کیا۔ تو انہوں نے محمد عزیز خان کو اپنا وکیل منتخب کر کے ان کو اور بھی عروج دیا۔ دوسرا معتمد خاص محمود خان یاور تھا۔ شروع شروع میں اس کو اتنی اہمیت حاصل نہ تھی۔ لیکن بعد میں یہ بہت زیادہ زور پکڑ گیا۔ کل تعمیرات افغانستان کا کام اسی کے ہاتھوں میں تھا۔ اور بادشاہ کا عظیم الشان دار الامان بھی اسی کی زیر نگرانی تعمیر ہو رہا تھا علاوہ برآں ایک نہایت ہی اہم کام خاص طور پر اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ اور وہ خفیہ نگاری کا کام تھا۔ ہر ایک سلطنت میں خفیہ محکمہ کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس کی اہمیت شخصی ملکوں میں بہت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ یہ محکمہ عہد ملوکیت میں جس کے سپرد ہو۔ وہ بادشاہ کا خاص الخاص معتمد ہوتا ہے۔ اور تمام ملک کے چھوٹے بڑے افراد اس سے خوف کھاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مستقبل اس کی گردش قلم پر بہت کچھ موقوف ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ

---

[1] فرانسیسی میں اس کو شاذ دے فر کہتے ہیں۔

اس سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ اور ایسے شخص کو اپنا دائرۂ اثر وسیع کرنے کے بہت سے مرغوب مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ محمود خان یاور کے ہاتھ میں ایک اور خاص محکمہ بھی تھا۔ جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے کسی طرح پہلے سے کم نہیں تھا۔ یہ محکمہ ریاستِ سرحدات کا محکمہ کہلاتا تھا۔ یہ تمام ان قبائل کے متعلق تھا۔ جو اندرون سرحد افغانستان اور ماوراے سرحد پر آباد ہیں۔ افغانستان کی حکومت سرحدات پر امن قائم رکھنے اور بین الاقوامی سیاسی اغراض کے مدِّنظر ان قبائل پر اپنا اثر رکھنے کی ہمیشہ آرزومند رہتی ہے۔ ان قبائل کی باقاعدہ سالانہ تنخواہیں مقرر ہوتی ہیں جن کو مواجب کہتے ہیں۔ عام طور پر ہر سال ان قبیلوں کے نمائندے دربار کابل میں اپنی تنخواہیں لینے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ آزاد سرحدات کے رہنے والے قبیلوں میں سے جو افغانستان میں بود و باش اختیار کرنا چاہیں۔ ان کو آبادکاری کیلئے زمینیں دی جاتی ہیں۔ آڑے وقت میں یہ قبائل ہر طرح سے افغانستان کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ اور کثرت سے والنٹیز پیش کرتے ہیں۔ گویا یہ قبائل افغانستان کی ریڑھ کی ہڈی شمار ہوتے ہیں۔ یہ جنگی اور سیاسی اہمیت رکھنے والا محکمہ پہلے پہل غازی محمد نادرخان سپہ سالار (حال بادشاہ افغانستان) کے ماتحت تھا۔ پھر جب غازی امان اللہ خان کو ان کا اقتدار گھٹانا مقصود ہوا۔ تو یہ محکمہ ان سے لیکر وزارتِ خارجہ کے سپرد کر دیا گیا۔ اور بعد میں شاہ نے سیاستاً اس محکمہ کو ایک جداگانہ محکمہ قرار دے دیا۔ اور اپنے خاص معتمد محمود خان یاور کے ہاتھوں سونپ کر ہمیشہ کیلئے اس کو اپنی زیرِ نگرانی کر لیا۔ تاکہ کوئی وزیر اس محکمہ کے ذریعہ اتنی اہمیت اور طاقت حاصل نہ کر سکے۔ جو بعد میں خود ان کی شخصیت کے لئے ایک خطرہ اور دھمکی بن جائے۔ (جیسے غازی امان اللہ خان محمد نادرخان سپہ سالار کے خطرہ کو محسوس کرنے لگ گئے تھے)۔

الغرض اعلیٰحضرت کے یہ دونوں معتمد ان کے یورپ جانے کے وقت ان کے

پارٹی کے سرگردہ اور راہ نما تھے۔ اور جیساکہ مذکورہ بالا بیان سے واضح ہے۔ اعلحضرت سابق کے دورۂ یورپ کے وقت یہی دو پارٹیاں اوج کمال پر تھیں۔ اور اعلحضرت کو ان پارٹیوں میں سے کسی ایک کو سلطنت کا کاروبار تفویض کرنا تھا۔ لیکن چونکہ شخصی وہم اور تاثرات کسی ایک کو انتخاب کرنے میں رہ رہ کر رکاوٹ ڈال رہے تھے۔ اس لئے پہلے پہل اعلحضرت نے چاہا۔ کہ محمد ولی خان اور محمد عزیز خان دونوں کو مشترکہ طور پر وکالت پادشاہی کا عہدہ سپرد کردے۔ جب اعلحضرت نے اس خواہش کا اظہار کیا تو نوجوانوں میں غایت درجہ کی بددلی اور ناراضگی پھیل گئی۔ اور محمد ولی خان وزیر حربیہ نے صاف طور پر حضور میں عرض کردیا۔ کہ یا تو مجھ پر کامل اعتماد کیجئے۔ اور وکالت کا بار سارے کا سارا مجھ پر ڈال دیجئے۔ اور یا اسے کسی اور کے سپرد کردیجئے۔ اور مجھے اپنے ساتھ یورپ لیتے جائیے۔ اس صاف جواب پر اعلحضرت امان اللہ خان کو اپنے فیصلہ میں ترمیم کرنی پڑی اور اب انہوں نے جو فیصلہ کیا۔ وہ محمد ولی خاں کے حق میں تھا۔ اعلحضرت کو اس شخص سے بہ نسبت محمد عزیز خان وزیر داخلیہ کے کم خطرہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ محمد عزیز خان ایک تو "محمد زائی" خاندان سے تھا۔ دوسرے اعلحضرت کا دور سے کچھ رشتہ دار بھی ہوتا تھا۔ اور قندھار میں اس کا قومی اثر و رسوخ زیادہ تھا۔ اور اس کی پشت پر ایک زبردست طاقت تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ جب بعد میں اعلحضرت امان اللہ خان کو افغانستان سے خاسر و ناکام نکل جانا پڑا۔ تو ان کے چلے جانے کے بعد قندھار میں اہل قبائل کی جو ایک مجلس مشاورت بدیں غرض منعقد ہوئی تھی۔ کہ بچہ سقاؤ سے جنگ جاری رکھنے اور اس سے پایہ تخت واپس چھیننے کے لئے کسی ایک شخص کو بادشاہ چُنا جائے۔ تو اس چناؤ میں سب سے پہلے محمد عزیز خان کا نام ہی بادشاہت افغانستان کے لئے پیش ہوا تھا۔ مگر اس کے انکار کرنے پر لوگوں نے سردار علی احمد جان کو اپنا بادشاہ قرار دیا تھا۔ غرضیکہ محمد ولی خان کی نسبت محمد عزیز خان صاحب قوم اور صاحب طاقت شخص تھا۔ اس کے

بالمقابل محمد ولی خان کی قومی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی۔ کیونکہ یہ شخص افغان قوم میں سے نہ تھا۔ امیر عبدالرحمن خان مرحوم کے دربار میں جو غلام بچے فراہم کئے جاتے تھے۔ یہ اُن میں سے ایک تھا۔ اور اس کی تربیت عام دستور کے مطابق شہزادوں کی سی ہوئی تھی۔ افغانستان میں بادشاہ اس خوف سے کہ ملک کا کوئی سردار یا خان اس کے برخلاف علمِ بغاوت نہ بلند کرے۔ ان کے لڑکوں کو بطور یرغمال اپنے دربار میں رکھا کرتے تھے۔ اور مثل اپنے عزیزوں کے ان کی پرورش و تربیت کرتے تھے۔ ایسے لڑکے بادشاہی اصطلاح میں "غلام بچے" کہلاتے تھے۔ وہ جب تربیت پاکر جوان ہوتے تھے۔ تو ان کو عہدے اور جاگیریں عطا ہوا کرتی تھیں۔ محمد ولی خان گو ترکستان کے ایک علاقہ کے سرکردہ خان کی اولاد میں سے تھا۔ تاہم افغانوں کے زاویہ نگاہ سے صاحبِ قوم[1] شمار نہیں ہوتا تھا۔ اعلیٰحضرت بھی اس حقیقت کو خوب جانتے تھے۔ اور ان کو محمد ولی خان کی ذات سے یہ خطرہ واقعی بہت کم تھا۔ کہ وہ ان کی غیبت میں افغانستان کی سلطنت میں خیانت کرنے کی جرأت یا اقدام کرسکیگا۔ بایں ہمہ انہوں نے بہت سی حفاظتی تدابیر کر لینے کے بعد "فرمانِ وکالت بنام محمد ولی خان" پر اپنی آخری مہر ثبت کی۔ اُن میں سے چند اہم ترین مندرجہ ذیل تھیں:۔

اوّل۔ تمام دول خارجہ سے اس بات کا وعدہ لے لیا گیا تھا۔ کہ مملکت افغانستان میں شورش داخلی رونما ہو جانے کی صورت میں وہ اعلیٰحضرت کے وجود کو کم سے کم عرصہ میں بہ سلامتی تمام ان کی سرحد پر پہنچا دینے کا اہتمام و انتظام بین الملی ذمہ داری پر کریں گے۔

---

[1] چونکہ ملک کی سلطنت افغانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور افغان ہی ملک کے جنگجو قبائل گنے جاتے ہیں۔ اس لئے جو شخص افغان قوم کا نہ ہو۔ اس کو اب تک باعتبار قوم کے صاحب قوم یعنی قوت والا تسلیم نہیں کیا جاتا۔

دوم۔ داخلی انتظامات :۔ (الف) محمود خان یاور کو ولایت کابل کا گورنر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں علاوہ ان اہم محکموں کے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مرکزی صوبہ بھی تھا۔ اور اسے تاکیدی حکم مل گیا تھا۔ کہ علاوہ ملک کے حالات کی خفیہ تفصیلی رپورٹوں کے جو اعلحضرت کی خاص ڈاک میں ان کے نام ترسیل ہوتی رہینگی۔ روزانہ بذریعہ بے سیم (وائرلیس) ملک کی عام خیریت کی اطلاع انہیں بھیجا کرے۔ (ب) محمد عزیز خان کو جو اس وقت وزیر داخلہ تھے۔ ان کو اس عہدے سے سبکدوش کر کے وزیر حربیہ بنا دیا گیا۔ اور اپنے برادر خورد سردار حیات اللہ خان کو وزارت عدلیہ سے وزارت داخلہ میں منتقل کر دیا۔ (سردار حیات اللہ خان کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ یہ وہی شہزادہ ہے۔ جس کو بچہ سقاؤ نے خفیہ پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ اور جس کی لاش محمد نادر خان کی کامیابی پر قلعہ کی ایک دیوار کے نیچے سے برآمد ہوئی تھی)۔

ان ترتیبات اور انتظامات کی موجودگی میں غازی امان اللہ خان بیشک کسی قدر بے فکری کے ساتھ چند ماہ کے لئے یوروپ کی سیاحت کیلئے جا سکتے تھے۔ سردار محمود طرزی اور سردار علی احمد جان ان کی معیت میں جا رہے تھے۔ سردار عنایت اللہ خان کو اب کابل میں چھوڑ جانے میں کوئی اندیشہ نہ تھا۔ فوجوں کا وزیر اس کی اپنی پارٹی کا ایک رکن تھا۔

کابل کا صوبہ جو سلطنت افغانستان کی کلید ہے۔ ایک ایسے گورنر کی ماتحتی میں دیا گیا تھا جو عزت وجاہ شخصی کی خاطر بادشاہ کی اندھا دھند پیروی کرنا ہی اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین سمجھتا تھا۔ وزارت مالیہ میر محمد ہاشم خان ایک ہاشمی مدبر کے ہاتھوں میں تھی۔ جو بادشاہ کا بہت بڑا خیرخواہ شمار ہوتا تھا۔ وزیر داخلیہ سردار حیات اللہ خان ان کا اپنا بھائی تھا۔ اور سلطنت کا رب سے بڑا کارفرما محمد ولی خان منتخب ہو چکا تھا۔ جو افغانوں کی

اپنی قوم میں سے نہ تھا۔ اور جس کے ہاتھ میں نوجوان تعلیم یافتہ گروہ کی اس "نونہال طاقت" کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جو ملک کی بنیادی طاقتوں یعنی وہ طاقتیں جو افغانستان جیسے ناتجربہ کار اور نا تعلیم یافتہ ملک میں قابل اعتنا ہوسکتی تھیں کے بالمقابل فعلاً کوئی چیز شمار ہوسکتی ملک میں بظاہر شورش کے کوئی اسباب نہ تھے۔ مجلس وزراء جوان مختلف عناصر سے مرکب تھی یہ نظامنامۂ ملک کیمطابق اہم امورات سلطنت کو عمل میں لائے جانے سے پہلے ان پر بحث وفکر کرنے کے لئے مکلف تھی۔ ہر وزارت میں بادشاہی جاسوس موجود رہتے تھے۔ جو وزراء کی شخصی نقل وحرکت اور روابط ومراسم تک کی خبریں لکھا کرتے تھے۔ ہمسایہ سلطنتوں سے خوشگوار تعلقات قائم تھے۔ دول خارجہ میں سے ہر ایک دولت چاہتی تھی کہ "مترقی افغانستان" سے اپنے تعلقات اور بھی مضبوط اور خوشگوار بنائے۔ تاکہ اسے اقتصادی اخلاقی اور سیاسی فوائد حاصل ہوں۔ غرضکہ جہاں تک داخلی معاملات کا تعلق تھا۔ اعلیحضرت امان اللہ خان کی روانگئ یورپ کی راہ میں کوئی رکاوٹ موجود نہ تھی دریں اثنا وزارت خارجہ اعلیحضرت کی سیاحت کا پروگرام مرتب کرچکی ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں اس میں کسی قدر ترمیم کرنی پڑ گئی۔ افغانستان کے لئے یہ مسئلہ قدرے نزاکت کا پہلو رکھتا تھا۔ کہ اعلیحضرت پہلے روس کے مہمان ہوں یا انگلستان کے۔ ان دونوں ممالک کی حکومتیں اپنی اپنی جگہ کوششیں کررہی تھیں۔ کہ یہ اعزاز پہلے انہی کو حاصل ہو۔ اس وقت سویٹ روس کے ساتھ چونکہ افغانستان کے تعلقات بہ نسبت انگلستان کے زیادہ گہرے تھے۔ لہذا غالب خیال یہی کیا جاتا تھا۔ کہ اعلیحضرت پہلے روس ہی کو تشریف لے جائیں گے۔ لیکن بعد میں یہی مناسب معلوم ہوا۔ کہ پہلے انگلستان جایا جائے ــــ غازی امان اللہ خان کی یہ دلی خواہش تھی۔ کہ وہ درہ خیبر سے گزرتے ہوئے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے راستہ سے ساحل بمبئی کی طرف جائیں مگر یہ بات انگلستان نے یہ کہ کر منظور نہ کی۔ کہ یہ میزبان کا فرض ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے معزز

مہمان کی جس راستہ سے آسان اور مرغوب تر سمجھے اپنے گھر تک رہبری کرے۔ کچھ دن
تو وزارت خارجہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شاید غازی امان اللہ
خان اپنا راستہ ہی بالکل بدل لیں۔ اور انگلستان سب سے آخر جائیں۔ لیکن پھر مفاہمت سی
ہوگئی۔ لہٰذا اب پروگرام کی یہ صورت تھی۔ کہ غازی امان اللہ خاں بمعہ اپنی پارٹی پہلے
براہ قندہار وچمن کوئٹہ اور کراچی اور وہاں سے بمبئی کی طرف جائینگے۔ اور پھر مصر ہوتے ہوئے
انگلستان پہونچینگے۔ پھر تمام یوروپ کا دورہ کرنے کے بعد سویٹ روس اور سب سے
آخر میں ایران جائینگے۔ اور پھر وہاں سے ہرات کے راستے ہوتے ہوئے اپنی مملکت
کی حدود میں داخل ہوجائیں گے۔

تخمینہ لگایا گیا تھا۔ کہ کوئی سات سے نو ماہ تک میں یہ دورہ ختم ہوجائے گا۔

"علیاحضرت کا اثر"

اب صرف علیاحضرت یعنی اعلیحضرت غازی امان اللہ خان کی والدہ ہی ایک ایسی
شخصیت رہ گئی ہیں۔ جن کے ذکر کے بغیر موجودہ باب کی تکمیل ادھوری شمار ہوگی۔ لہٰذا
مختصراً ان کا بیان بھی یہیں قلمبند کئے دیتا ہوں۔ آپ قندہار کے ایک قوی الاثر خاندان
کی چشم وچراغ اور امیر حبیب اللہ خان مرحوم کی چہیتی بیوی تھیں۔ دوران حکومت حبیبیہ میں
ان کو بہت سا اثر واقتدار حاصل تھا۔ مگر امیر مقتول کے آخری عہد میں یہ ان کی نظروں
سے گر چکی تھیں حتے کہ انہوں نے ان کو شاہی محل سے بھی نکلوا دیا تھا۔ سنا جاتا ہے۔ کہ
اپنی اس بےعزتی کو برداشت نہ کرتے ہوئے آپ نے امیر مقتول کے برخلاف سازشیں
شروع کردی تھیں۔ جن کا انجام بالآخر امیر حبیب اللہ خان کے خاتمۂ حکومت اور ان کے
اپنے بیٹے کی تخت نشینی کی صورت میں منتج ہوا۔

آپ شروع شروع میں اپنے بیٹے کے کاروبار حکومت میں بہت دخیل رہیں۔ اور

اپنے اثر و رسوخ کو اس کی حکومت کے استحکام میں صرف کرتی رہیں۔ آپ کی لڑکیوں میں سے بڑی لڑکی سردار علی احمد جان ان کے بھتیجے سے بیاہی گئی تھی اور منجھلی لڑکی کا بیاہ سردار شاہ ولی برادر خورد سردار محمد نادر خاں سپہ سالار افغانستان سے ہوا تھا۔ ظاہر ہے۔ کہ ان فرزندی تعلقات کی وجہ سے علیا حضرت کا میلانِ طبع علی احمد جان اور غازی محمد نادر خان کے خاندانوں کی طرف زیادہ ہوتا اور وہ ان کے اثر و رسوخ بڑھانے میں ہمیشہ مدد و معاون رہتیں چنانچہ اگر وہ سردار علی احمد جان کے اثر و رسوخ کے برقرار رکھنے یا اس کو زیادہ ترقی دینے میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکیں تاہم جہاں تک غازی نادر خان سپہ سالار کے خاندان کا تعلق تھا۔ ان کے عروج کے اسباب میں سے ایک اہم سبب انہی کی ذات تھی ؛؛

انہیں سردار محمود طرزی کے خاندان سے کچھ کد بھی تھا۔ اس لئے وہ ان کے اثر و رسوخ کے مقابلہ میں مذکورہ بالا شخصیتوں کو بغیر از تعلقات دامادی وغیرہ سرافراز دیکھنے کی آرزومند تھی۔ اور اگر شہزادہ خانم (یعنی ملکہ ثریا کو جو محمود طرزی کی بیٹی تھیں) کا اثر غازی امان اللہ خان پر ان کی ماں کی نسبت سے زیادہ نہ ہوتا۔ تو یقیناً سردار محمود طرزی سیاسیات افغانستان میں اس قدر اہم حصہ نہ لے سکتا۔ علیا حضرت کی سردار محمود طرزی کے خاندان سے مخالفت بڑھنے کی اصل وجہ ملکہ ثریا کا وجود تھا۔ جو بحیثیت بادشاہ کی ملکہ ہونے کے علیا حضرت کے دباؤ میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ شدہ شدہ غازی امان اللہ خان پر بھی ملکہ ثریا کے خیالات کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ اور وہ بھی علیا حضرت کے مشوروں کو جو وہ دربارہ سیاستِ ارکان حکومت اُسے وقتاً فوقتاً دیتی رہتی تھیں۔ بار تصور کرنے لگ گیا تھا۔ غرضکہ علیا حضرت اور ملکہ ثریا کے درمیان جو مخالفت اور کشمکش موجود تھی۔ وہ اندرون محل کے امورات تک محدود نہ رہ سکی۔ بلکہ اس کا اثر ملک کی سیاسی جتھہ بندیوں کے اُتار چڑھاؤ میں

دخل انداز ہونے کی حد تک وسیع ہو گیا تھا - ایک طرف علیا حضرت سردار محمود خان طرزی اور اس
کی جماعت کا زور توڑنے میں مشغول رہتی تھیں - تو دوسری طرف سردار محمود خاں طرزی ملکہ
ثریا اور ان کے طرف دار انتہائی شدومد اور خصوصیت کے ساتھ علیا حضرت سردار
سپہ سالار محمد نادر خان اور سردار علی احمد جان کے برعلیہ غازی امان اللہ خان کے کانوں میں صور
پھونکنے میں منہمک رہتے تھے - مگر چونکہ دونوں گروہ زور آور تھے - اس لئے اعلیحضرت
غازی کی طبیعت دونوں کا اثر قبول کر رہی تھی - لیکن بالآخر انجام یہ نکلا - کہ آخر عہد امانیہ
میں سردار سپہ سالار محمد نادر خان اور انکی جماعت کا کہیں نام بھی نہ تھا - اور سردار
علی احمد جان بھی صحنۂ نمائش (سٹیج) پر بحالت اشتباہ بُری طرح دم توڑ رہا تھا - دوسری
طرف سردار محمود خاں طرزی کا جادو بھی غازی امان اللہ خان کے دل و دماغ سے اتر چکا تھا -
اور اس کی جگہ خود غازی کا اپنا تخیّل کارفرما تھا - وہ اب اپنی مرضی سے پارٹیوں کے آثار
چڑھاؤ عروج و زوال اور ان کی تخلیق و امحاد کے متعلق تدابیر اختراع کرتا اور ان کو عمل میں
لاتا تھا - وہ چند سالوں کے تجربہ کے بعد ہر قسم کی لالہ گری[۵] سے بیزار ہو چکا تھا - نہ اب اس کو
اپنی ماں کی راہنمائی کی ضرورت تھی - اور نہ محمود طرزی کے سیاسی تدبر کی - وہ اب اپنا
نیک و بد اور اپنی داخلی و خارجی سیاست کو خود سمجھ رہا تھا - اس پر اب اگر کسی کا
کچھ اثر قائم تھا - تو وہ اس کی اپنی ملکہ ثریا خانم تھی - لیکن یہ اثر بھی اب صرف انہی امور
تک محدود رہ گیا ہوا تھا جنہیں غازی امان اللہ خان دیدہ و دانستہ ملک میں ثریا خانم کے
ذریعہ سے رواج دینا چاہتا تھا - مثلاً تعلیم نسواں عورتوں کے حقوق اور ان کی آزادی وغیرہ
وغیرہ - اب ملکہ ثریا بھی اپنے والد کے لئے کچھ اثر نہ ڈال سکتی تھی - اور بادشاہ

---

[۵] لالہ گری ایک خدمت ہے - جو کسی بڑے شخص کو بچوں کی حفاظت و پرورش کرنیکے متعلق سپرد کی جاتی ہے
جو شخص لالہ مقرر ہوتا ہے - اس کے بچوں پر کامل اختیارات ہوتے ہیں - اسی کی راہنمائی میں بچے ایک وقت
تک سونپے جاتے ہیں - اور وہ زدو کوب وغیرہ بھی کر سکتا ہے - عام اصطلاح میں یہ "ہنیچ" کے معنی دیتا ہے -

کی طبیعت کو سمجھ کر خاموش تھی۔ اس کے لئے تو یہی غنیمت ہو رہا تھا۔ کہ وہ علیا حضرت
یعنی اپنی ساس کے اثر و اقتدار سے آزاد ہو چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ علیا حضرت
کا مقصد در اصل یہ تھا۔ کہ وہ بحیثیت ملکہ ماں (queen mother) کے رہے۔ وہ
اپنے آپ کو اس عہدے کا مستحق سمجھتی تھی۔ اس لئے کہ اسی کی دوڑ دھوپ اور ریشہ دوانیوں
کی بدولت غازی امان اللہ خان کو تختِ افغانستان نصیب ہوا تھا۔

اگرچہ غازی امان اللہ خان نے اپنی والدہ کے احترام بجا لانے میں کوئی کوتاہی نہ کی
تھی۔ اس کو ایک عالیشان محل رہنے کے لئے دے رکھا تھا۔ وہ علیا حضرت کا خطاب
رکھتی تھی۔ اس کو اپنے محل پر جھنڈا لہرانے کی اجازت تھی۔ اور خزانہ عامرہ سے ایک
کثیر رقم سالانہ مصارف کے لئے اس کو ملا کرتی تھی۔ مگر وہ اس پر قانع نہ تھی۔ وہ اس سے
کچھ سوا چاہتی تھی۔ وہ علاوہ اس امر کے کہ بادشاہ صرف اسی کے مشوروں پر عمل کرے۔
(علی الخصوص جہاں تک درباری سیاست اور ملک کے بعض اندرونی مسائل کا تعلق ہے)
یہ بھی چاہتی تھی۔ کہ شاہانہ رسومات کا وہ حصہ جو زنانہ سے تعلق رکھتا ہے صرف اسی کی صدارت
و راہنمائی میں انجام پائے۔ مگر بیٹا اپنی ماں کے اس مطالبہ کو ناجائز اور ناحق قرار دیتا تھا۔
اور وہ اکثر جواب میں کہا کرتا تھا۔ کہ آپ اپنے زمانہ بادشاہ بیگمی میں ایسے تمام فرائض و
تقریبات کو جی کھول کر انجام دے چکی ہیں۔ اب شاہ خانم یعنی ملکہ ثریا کو یہ حق پہنچتا ہے
علاوہ اس مسئلہ کے علیا حضرت اور ملکہ ثریا کے درمیان مسئلہ ولیعہدی پر بھی اختلاف
تھا جس کا ذکر آگے آئیگا۔

غرضکہ چھوٹے بڑے تقریباً تمام امور میں علیا حضرت کی اپنے بیٹے سے ناچاقی
بڑھتی ہی جاتی تھی۔ اور جس وقت غازی امان اللہ خان یورپ کی سیاحت کے لئے تیاریوں
میں مصروف تھا۔ وہ اس سے ناراض تھی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی۔ کہ اس کا بیٹا اپنی
بادشاہت کو خطرہ میں ڈال کر کہیں باہر جائے۔ غازی موصوف اگرچہ جانتا تھا۔ کہ اس کی

والدہ اس سے ناراض ہے۔ تاہم اسے اس خیال سے انتہائی خاطر جمعی نصیب تھی۔ کہ اس کی والدہ کا وجود اس کی عدم موجودگی میں ہر قسم کے خطرات کے بالمقابل جو اس کی بادشاہت کو لاحق ہو سکتے ہوں گے۔ ایک سنگین و مضبوط ترین سپر ثابت ہوگا۔

اول اول تو علیا حضرت نے اپنے بیٹے کو یہ دھمکی دے کر روکنے کی کوشش کی۔ کہ وہ اس کے زمانہ غیر حاضری میں دارالسلطنت میں رہیگی ہی نہیں۔ بلکہ قندہار جا کر سکونت اختیار کر لے گی۔ لیکن بعدازاں بادشاہ کے بے حد اصرار کرنے پر اس کی مامتا جوش میں آہی گئی۔ اور وہ کابل رہنے پر راضی ہوگئی۔ تاکہ اگر امان اللہ خان کی عدم موجودگی میں اس کی بادشاہت پر کوئی آڑا وقت آجائے۔ تو وہ اس کے سامنے سینہ سپر کر کے کھڑی ہو جائے۔

ان حالات کی روشنی میں افغانستان کے بادشاہ کا بکمال اطمینان خاطر سیاحتِ یوروپ کو جانا ایک نہایت معمولی سا واقعہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا غازی امان اللہ خان کی سیاحتِ یوروپ کو افغانستان کے انقلاب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

باب دوم

واپسی اور مزید حالات

چونکہ اس کتاب کے لکھنے کی اصل غرض وغایت یہ ہے ۔کہ افغانستان کے صحیح حالات قارئین کرام کی خدمت میں تقدیم کئے جائیں ۔اور وہ اسباب ومواد بھی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے جائیں ۔جو اس انقلاب کو کامیاب بنانے میں ممد ہوئے اسلئے ہم شاہ امان اللہ خان (سابق) کے دورۂ یوروپ کے حالات قلم بند کرنے سے قصداً پہلوتہی کرتے ہیں ۔اور ان کی واپسی پر حکومت افغانستان کی داخلی سیاست میں جو جو تغیرات واقع ہوئے ۔یہاں ان کا خلاصہ مع ان کے اثرات ونتائج کے بیان کرتے ہیں ۔لیکن اس سے پہلے اگر مختصراً ان جذبات وحسیات کا بھی ذکر کر دیا جائے ۔جو غازی امان اللہ خان کی روانگی یوروپ کے وقت عام طور پر ملتِ افغانستان میں پائے جاتے تھے ۔تو کسی طرح موزونیت سے خارج نہ ہوگا ؎

جیسا کہ اوپر کسی جگہ ذکر آ چکا ہے ۔ شروع شروع میں غازی امان اللہ خان کے عزمِ سیاحت کا کسی کو بھی یقین نہیں آتا تھا ۔اور عام لوگ تو افغانستان کے مخصوص حالات کی بنا پر اُسے ایک ان ہونی سی بات سمجھتے تھے ۔لیکن جب سفر کی تیاریوں کے چرچوں [illegible] اس امر کا پورا یقین دلا دیا ۔کہ ان کا بادشاہ سچ مچ سیاحت کی غرض سے ملک سے باہر جانا چاہتے ۔ تو قدامت پسند اور جہلائے ملک کی کثیر تعداد اپنے بادشاہ کی اس کارروائی کو بہت ہی مذموم خیال کرنے لگ پڑی ۔علے الخصوص اُس وقت تو ان کی شعلہ

دامانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب غازی امان اللہ خان نے ملکہ ثریا اور دیگر شاہی بیگمات کو بھی اپنے ہمراہ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ عام لوگوں میں دفعتہً یہ افواہ پھیل گئی۔ کہ شاید امان اللہ خان ملک کی ساری دولت سمیٹ کر اپنے اہل و عیال سمیت افغانستان سے کوچ کر جانا چاہتا ہے۔ ان عوام الناس کے نزدیک کسی افغانی بادشاہ کا مصیبت کے وقت ملک سے بھاگ نکلنا ایک عام دستور رہا ہے۔ اور وہ ہر اس بادشاہ کو برا بھلا کہتے سنے گئے ہیں۔ جو ان کو بے سہارا اور دوسروں کے رحم و کرم کے حوالہ کر کے آپ نکل جاتا رہا ہو۔ لیکن چونکہ اس وقت اس قسم کی کوئی آفت یا مصیبت ملک یا بادشاہ کے سر پر مسلط نہ تھی۔ اس لئے چند سے مختلف قسم کی چہ میگوئیوں کے بعد ایسی افواہیں خود بخود دب گئیں۔ اور ان کی بجائے گورنمنٹ کی کوشش سے عوام الناس کی ذہنی جولانگاہ کے لئے نئے پیرایہ میں مسرت و افتخار افزا خیالات پیش کر دیئے گئے۔ اب لوگ ناراض ہونے کے بجائے خوشی سے جامے میں پھولے نہ سماتے تھے۔ اور غازی امان اللہ خان کی ذات پر فخر و مباہات سے اترا رہے تھے وہ خیالات جن کا ہر صوبہ و ولایت میں تقریباً پرچار جاری تھا یہ تھے۔ کہ :۔

"شکر ہے۔ کہ ہمارا ملک بھی دنیا کے اہم ترین ممالک میں شمار ہونے لگا ہے۔"

"تقریباً دنیا کے تمام ممالک اور بڑی بڑی سلطنتیں اس آرزو میں چشم براہ ہیں کہ کب افغانوں کا غیور اور نامور بادشاہ ان کی دعوت کو قبول کرتا ہوا ان کی سرزمین پر قدم رکھے"

"نامِ خدا[۱] ! ہمارا بادشاہ دنیا میں ملتِ افغان کا نام بلند و روشن کر رہا ہے۔ اور عنقریب ہم دنیا کی ممتاز ترین ملتوں میں شمار ہونے لگینگے" وغیرہ وغیرہ!

۱؎ "نامِ خدا" ایک فخریہ اور دعائیہ جملہ ہے۔ جو ایسے موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں نہ صرف فخر کا اظہار ہی مطلوب ہو۔ بلکہ شخص متعلقہ کو نظرِ بد سے بچانا بھی مقصود ہو۔

ملکہ ثریا کو اپنے ہمراہ لے جانے کے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے غازی امان اللہ خاں نے اپنی ایک تقریر میں لوگوں پر واضح کر دیا تھا۔ کہ چونکہ وہ نوجوان ہیں۔ اور ان ممالک کی سیاحت کو جا رہے ہیں۔ جہاں اس سے پہلے کئی مشرقی تاجدار اپنا ناموسِ ملک و ملت کرشمہ ہائے حسن و عشرت کی نذر کر بیٹھے ہیں۔ اس لئے یہ ان کے قومی وقار و ناموسِ افغانی کی حفاظت و صیانت کے لئے لابُد ہے۔ کہ وہ اس ضمن میں کامل احتیاط کو مدِنظر رکھیں۔ اور اپنی خانم کو اپنے ہمراہ لے جائیں۔

اس توضیح کا اثر لوگوں پر حسب دلخواہ پڑا۔ اور انہوں نے غازی امان اللہ خاں کی پیش بندی کو بہت سراہا۔ لوگوں کو یہ وقت یاد آگیا۔ کہ امیر حبیب اللہ خاں جو کہ مجرّدانہ حال میں ہندوستان کی سیاحت کو گئے تھے۔ واپسی پر رنگین مزاج بن آئے تھے۔ اور یہی رنگین مزاجی بعد میں ان کے قتل کا باعث بن گئی تھی۔

غرضکہ غازی امان اللہ خاں کے برخلاف اس کے یوروپ جانے کے وقت لوگوں میں کسی قسم کی برہمی یا ناراضگی موجود نہ تھی۔ بلکہ جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے۔ لوگ بادشاہ کے اس سفر کو اپنے ملی غرور و افتخار کو دوبالا کرنے والا تصور کرنے لگ گئے تھے۔

ابھی غازی امان اللہ خاں یورپ ہی میں تھا۔ کہ پایہ تخت کابل کے مرکزی سنیما نے ان کی وہ فلمیں جو دورانِ سیاحتِ مصر و انگلستان لی گئی تھیں۔ دکھلانی شروع کر دی تھیں۔ جن کو دیکھ دیکھ کر افغانی قوم میں مسرت و شادمانی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ غازی امان اللہ خاں کا ہر وہ قدم جو پردۂ سنیما پر اُوپر کو اٹھتا اور پھر زمین پر پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی حرکت کی تکمیل کے ساتھ بیک وقت ہزاروں افغانی دلوں کی نیاز حاصل کر رہا ہے۔ اس وقت کسے خبر تھی۔ کہ ابھی پورا ایک سال بھی گذرنے نہ پائے گا۔ کہ یہی محبوب القلوب بادشاہ انتہائی مایوسی اور حرمان نصیبی کے ہجوم میں اپنے پیارے وطن سے (شاید) ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیگا۔

قارئین کے ملحوظ خاطر رہے۔ کہ یہ افغانوں کا ایک ملّی خاصہ ہے۔ کہ ان کا عصبی غرور ذرا سی تحریک پر پارہ کی طرح اوپر چڑھنے لگ جایا کرتا ہے۔ لہٰذا جب ان کی طبائع پر یہ عمل ہو رہا ہو۔ تو ان میں فیاضی بے پرواہی تغافل عفو اور درگذر کی طاقتیں ایک ساتھ غلبہ پانے لگ جاتی ہیں۔ اور یہ حالت عمل کے جاری رہنے تک برابر موجود رہتی ہے۔

چنانچہ اس کیفیت مظاہرہ کو ہم نے اس وقت ملاحظہ کیا۔ جب یوروپ سے اول بار ملکہ ثریا اور دیگر بیگمات شاہی کی نقاب کشائی کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ اور جب اس پر انتہا پسند ملّاؤں نے چپکے چپکے زہر چکانیاں شروع کیں۔ تو افغانستان کی کثرت آبادی نے اس زہر کے اثرات کو قبول نہ کیا۔ کیونکہ اس وقت وہ افتخار اور غرور قومی کی انتہائی بلندی پر تھے۔ اور اس لئے امان اللہ خاں کی یہ فروگذاشت یا خطا نظر انداز کی جا رہی تھی۔ اگر غازی امان اللہ خان یوروپ سے واپس آکر برہنہ روئی پر بضد نہ ہو جاتا۔ تو اس کے برخلاف ہونے والے انقلاب کے دوران میں یہ حربہ کارگر طور پر استعمال نہ ہو سکتا۔ اور کیا عجب تھا۔ کہ انقلاب اتنی جلد واقع نہ ہوتا۔

اوپر کہا جا چکا ہے۔ کہ غازی امان اللہ خان ملک کو ترقیات کی شاہراہ پر سرپٹ دوڑانا چاہتا تھا۔ اور وہ اپنی زندگی ہی میں افغانستان کو ایشیا کا ایک قوی اور توانا ملک دیکھنے کا آرزومند تھا۔ یوروپ کی سیاحت کی بھی یہی غرض تھی۔ کہ وہ اپنی آنکھوں سے جملہ مترقی ممالک کو دیکھ آئے۔ اور ان کے آئین و عمل اور علم و نظام کا چربہ جہاں تک ممکن ہو۔ اپنے ملک کے لئے اتار لائے۔ اے کاش قدرت نے اس کو بادشاہت عطا کرنے سے پہلے اس نظام عالم کو وسعت نظری کے ساتھ مطالعہ کرنے کی توفیق عنایت کی ہوتی۔ تو اس صورت میں کچھ شک نہ تھا۔ کہ وہ نہ صرف اپنے ملک

ہی کو معراج کمال پر پہونچا ہوا دیکھتا۔ بلکہ ایشیا کے کمزور و ناتواں ممالک کے لئے بھی مسیح الصفت ثابت ہو سکتا۔ لیکن افسوس کہ اسے یہ فرصت ہی نصیب نہیں ہوئی۔ اس نے ابھی مشکل سے بلوغت کی چند منزلیں طے کی تھیں۔ کہ سلطنت کا بارِ گراں اس کے دوش پر تھا۔ ایسی حالت میں لازمی تھا۔ کہ اس کی بڑھی ہوئی تمنائیں اور جذبات ہمیشہ اس کے تدبر اور دوراندیشی پر غالب رہیں۔ اور کبھی کبھی اس پہ ایسا وقت بھی آئے۔ کہ وہ اپنی اولوالعزمی کے طوفانوں میں کشتی کے کھینے والے چپوؤں کو حقارت کے ساتھ غصیلے دریا میں پھینک دے۔ اور تنہا اپنی حرارتِ عزم ہی کو کشتی کے ساحل مراد تک لے آنے کے لئے کافی سمجھے۔

علم و عرفان کی تیز روشنی کی عدم موجودگی میں اس کے "جذبات" عمل گاہِ ترقیات میں ہیجان و تذبذب آفریں تھے۔ اور اس کیفیت کو وہ خود محسوس کر رہا تھا فلہٰذا اس کے پیش نظر ترقیات کا جو نقشہ تھا وہ چاہتا تھا۔ کہ اس کو جامۂ عمل پہنانے سے پہلے اپنے اس تذبذب کو رفع کرلے۔ اور یہ محض ایک تماشائی کی حیثیت سے یوروپ میں پھر آنے سے نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ ازالۂ شکوک و شبہات اور رفعِ تردد و ہچکچاہٹ کے لئے یہ امر بمنزلۂ لزوم کے تھا۔ کہ وہ اس خصوص میں کسی ایسے انسان سے مل کر مشورہ کرے۔ جو خود اس کے اپنے نزدیک اس سے کامل تر ہو۔ اور جس پر اس کی ذات ہر طرح کا اعتماد کر سکتی اور اس کو ہر حال میں اپنا مونس و ہمدرد سمجھ سکتی ہو۔ شاہ امان اللہ خاں کی خوش نصیبی سے ایسا شخص یوروپ میں موجود تھا۔ اور وہ مصطفےٰ کمال پاشا صدر جمہوریہ ترکیہ تھا۔

افغانستان اس وقت تک درحقیقت اپنی ترقی کا دورِ اوّلیں طے کر چکا تھا۔ وہ اب ایک باآئین سا ملک تھا۔ اگرچہ اختیارِ پادشاہی کی وسعت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ تاہم قانونی حکومت کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ حکومت جدا جدا محکموں میں تقسیم تھی۔ ہر محکمہ

ایک ضابطہ اور قانون کے ماتحت چل رہا تھا۔ سلسلۂ مراتب وضوابط کی پاسداری و پابندی آئینی خیال کی جاتی تھی مجلس شورئے ملّی (قانون ساز جماعت) دن بدن اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما رہی تھی۔ اور حکومت کی ایگزکٹو باڈی یعنی مجلس وزرا اپنے امورات کو نہایت انضباط و ترتیب کے ساتھ عمل میں لانے لگ گئی تھی۔ اصولاً لوگ زور آور کی لاٹھی اب نہیں ہانکے جاتے تھے۔ ان میں قانونی زندگی بسر کرنے کا پرچار جاری تھا۔ اور ایک عام بیداری کی لہر پبلک کے اندر اٹھ چکی تھی۔ ملک کے محصولات ادا کرنے والے عنصر میں محصول کے ادا کرنے کی غرض وغایت کا احساس دن بدن مترقی تھا۔ اور حکومت تیزگامی کے ساتھ "ذمہ دار حکومت" کی طرف جا رہی تھی۔ دارالسلطنت اور اس کے گرد ونواح میں اور جہاں جہاں صوبوں کے مرکز تھے۔ ان میں "کام" بڑی سرعت کے ساتھ پیدا ہو رہا تھا۔ اور ملک کے اطراف واکناف سے لوگ سمٹ سمٹا کر ان مرکزوں میں جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ملکی صنعت وحرفت کو فروغ دینے اور تجارتی گرم بازاری کے لئے کمپنیوں پر کمپنیاں قائم ہو رہی تھیں۔ غیر ملکی سرمایہ کی آورد کی طرف بھی توجہ بٹ رہی تھی۔ دو ایک خارجی کمپنیاں بھی موجود ہو گئی تھیں۔ اور افراد اجنبیہ عام حفاظت اور اطمینان کے امکانی خطرات میں کمی واقع ہوتے دیکھ کر ملک کی ترقیات کے لئے کسی قدر کڑی شرائط پر اپنا اپنا سرمایہ اشتغال (Invest) کرنے پر رضامند ہوتے نظر آرہے تھے۔ تقریباً یوروپ کے ہر بڑے ملک سے سیاسی تعلقات قائم تھے اور افغانستان کے آرپار روسیوں اور انگریزوں کی دو بڑی زبردست طاقتیں موجود تھیں۔ جو اس چھوٹے سے مگر نہایت اہم ملک کی ترقیات میں اپنے اپنے مفاد کی خاطر نمایاں دلچسپی لینے پر مجبور تھیں۔ اور افغانستان ان دونوں کے ساتھ نبھائے بغیر اپنی زندگی کے خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا ان مذکورہ بالا حالات کے ماتحت افغانستان کے دورِ ثانی کی ابتدا اسی وقت فائدہ رساں ثابت ہو سکتی تھی۔ جب کہ

ایک طرف اس کی اندرونی ترقیات کا پروگرام بنیادی اغلاط سے معرا ہو۔ اور دوسری طرف اس کے خارجی تعلقات کی حکمت عملیاں انتہائی حزم و احتیاط اور تدبر و دوراندیشی کا دستور پیش کر رہی ہوں۔ اور ظاہر ہے۔ کہ افغانستان کے برسرکار مدبرین اس خصوص میں وافر علم و تجربہ رکھنے کے بغیر اپنی موجودہ استعداد و قابلیت کے مظاہروں سے اپنے اولوالعزم بادشاہ کے اطمینان طبیعت کا کسی طرح باعث نہیں بن سکتے تھے۔ پس غازی امان اللہ خان کے لئے جس کی فطرت میں ازل سے امنگ پروری موجود تھی۔ یہ ایک ناگزیر امر تھا۔ کہ وہ کسی نہایت ہی تجربہ کار اور صاحب تدبر و کامیاب شخصیت سے افغانستان کے ملکی معاملات کے متعلق اپنی گذشتہ اور آئندہ حکمت عملیوں کی روشنی میں ایک صحیح اور معقول مشورہ حاصل کرے۔ . . . چنانچہ اس امر کے لئے اس کی نگاہِ انتخاب مصطفٰے کمال پاشا پر پڑ چکی تھی۔ اور سیاحتِ ترکیہ کی خاص غرض و غایت بھی یہی کچھ تھی۔ کہ وہ صدر جمہوریہ سے مل کر اپنے ان شبہ و تردّدات کے رفع کرنے کی کوشش کرے۔ جس کو وہ اپنی خواہشات متعلقہ ترقیٔ افغانستان کی راہ میں حائل دیکھتا تھا۔

کسی ملک کی مادی ترقیات کے لئے مقدم ترین ضرورت یہ ہوتی ہے۔ کہ اولاً (اول اول) اس ملک کے حالات کو عمل ترقی کے مساعد و موافق بنایا جائے۔ اور اس لئے دائماً (ہمیشہ) حقیقی دور ترقی کے شروع کرنے سے قبل دورِ اصلاحات میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ جس میں لوگوں کی ذہنی، تمدنی، معاشرتی اور مذہبی اصلاح کرنی پڑتی ہے۔ افغانستان کے پیش نظر بھی اسی مرحلے کا طے و عبور تھا۔ اور اقوام و ملل کی زندگی میں یہی منزل سب سے زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔ جہاں پرانے دستور کو نئے دستور سے بدلنا پڑتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس امر کے شاہد ہیں۔ کہ نئے دستور کو متعارف (انٹروڈیوس) کرنے والے مصلحین اگرچہ تعداد میں کثیر در کثیر پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن یہ معیار ہرگز قرار نہ پاسکا۔ کہ ہر نئے دستور سے آشنا کرنے والا بذاتِ خود کامیاب بھی

ہوتا رہے۔ بلکہ ایسا سلسلہ تدریج کے ساتھ دراز تر ہوتا گیا۔ تا آنکہ دستورِ نو کے مروجین میں سے کسی ایک متاخرترین کو کامیابی سے ہمکنار ہونا نصیب ہوا۔ غازی امان اللہ خان سابق فرمانروائے افغانستان میدان ترقیات میں دنیا کی سریع الرفتاری سے اتنا متاثر و مشتعل ہو چکا تھا۔ کہ یا تو اس نے تاریخ کے اس اہم سبق کو اپنی ذہنی یادداشت کے اوراق پر کسی جانب نظر روشناسی سے قلم بند کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ اور یا یہ تحریر کسی نہ کسی طرح بروقتِ ضرورت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو ہو جاتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ دورِ اصلاحات کی ان صعب ترین منازل کو ایک ہی جست میں پھلانگ جانے کا عزم بالجزم کر بیٹھا۔ چنانچہ اس کے متعلق غازی مصطفٰے کمال سے جو بات چیت اس نے کی۔ وہ اس امر کی شاہد حال ہے۔

واقعیت کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ ان دو شخصیتوں کے درمیان اس وقت کن کن امور پر گفت و شنید ہوتی رہی۔ لیکن جہاں تک افغانستان میں اصلاحات کے رائج کرنے کے مسئلہ کا تعلق ہے۔ مجھے نہایت ہی معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے۔ اسے میں اپنی زبان میں اختصار کے ساتھ بصورت مکالمہ ذیل میں پیش کرتا ہوں:۔

غازی مصطفٰے کمال:۔ اگر آپ ترکیہ کیطرح اپنے ملک میں اصلاحات نافذ کرنے کا خیال رکھتے ہیں۔ تو اعلیحضرت میرے بھائی کو کامل احتیاط کے ساتھ بہت سے امور متعلقہ کی نسبت پہلے اپنا اطمینان حاصل کر لینا ضروری ہے۔

غازی امان اللہ خان: بیشک بیشک! یہ امر تو بمنزلہ اساس کے ہے۔ اور میں اسی لئے اپنے معزز بھائی "صدر جمہوریہ" سے قبل از رواج اصلاحات مشورہ کر رہا ہوں۔

غازی مصطفےٰ کمال: امید ہے کہ اعلیحضرت اس مسئلہ کی نزاکت کو اچھی طرح محسوس کرتے ہونگے۔ کہ جب عام ناپسندیدگی کی وجہ سے اصلاحات ناکام ہو رہی ہوں۔ تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ پبلک کی مزاحمت شورش اور بغاوت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ لہذا سب سے مقدم اس بات کو دیکھا جائیگا۔ کہ اصلاحات کا جاری کرنے والا ہر دلعزیزی کے اعتبار سے عام پبلک میں کیا درجہ رکھتا ہے۔ آیا اس کی ہر دلعزیزی اور محبوبیت اس کے لوگوں یا رعیت کے نزدیک اس درجہ مسلّم ہے کہ وہ اس سے ناراض و برگشتہ ہوجانے پر بھی شرارت وفتنہ انگیزی پر جرأت نہ کرسکیں۔ لہذا کیا اعلیحضرت اپنے ملک میں اس قدر مقبول و محبوب ہیں۔ کہ اصلاحات کی مخالف سرگرمیاں بغاوت کی شکل نہ اختیار کرسکیں گی؟

غازی امان اللہ خان: میں بغاوت منگل کے دوران میں بہت حد تک ملّاؤں کا زور توڑ چکا ہوں اور میرے ملک میں ملّا ہی ایک زبردست عنصر ہیں۔ جو لوگوں کو حکومت کے برخلاف برانگیخت کرنے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے ہیں لیکن اب اس گروہ میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ وہ حکومت کے برخلاف سر اٹھا سکے۔

غازی مصطفےٰ کمال: لیکن اگر یہ گروہ لوگوں کو اعلیحضرت کے برخلاف اکسانے میں کامیاب ہو جائے۔ تو کیا اعلیحضرت اس کو اپنی قوت سے کچل سکیں گے؟

غازی امان اللہ خان: ہاں میں اپنی فوج کے ذریعہ سے بآسانی ایسی شورشوں اور فتنوں کے دبانے میں کامیاب ہو جاؤنگا۔

غازی مصطفےٰ کمال: کیا اعلیحضرت کی شاہانہ شفقت و محبت کا احساس فوجیوں کے دلوں پر

غالب و مسلط ہے۔ اور کیا اعلحضرت اپنی فوج کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں۔ کہ وہ انتہائی ترغیب و اشتعال پر بھی اپنا ضبط و ربط (ڈسپلن) قائم رکھتے ہوئے آپ کی وفا شعار رہے گی؟

غازی امان اللہ خان:۔ ہاں میں اپنی فوج میں بے حد ہر دلعزیز ہوں۔ اور مجھے اپنی فوج کی وفا شعاری پر پورا پورا اعتماد ہے۔

غازی مصطفے کمال:۔ اگر اصلاحات کے دوران میں ملک کے کسی حصہ میں شورش واقع ہو جائے۔ اور بدقسمتی سے حکومت کی کمزوری یا سوء تدبیر سے شورش کا حلقہ یہاں تک وسیع ہو جائے۔ کہ ایک عام بغاوت کی شکل اختیار کر لے۔ تو ایسی صورت میں احتمال ہے۔ کہ

(الف) حکومت ان حصص ملک میں مالیات اور ٹیکس وصول نہ کر سکیگی۔ جہاں پر باغیوں کا قبضہ ہوگا۔

(ب) ملک کی بڑی بڑی شاہراہوں کے مخدوش و غیر محفوظ ہو جانے کے سبب تجارتِ ملک میں مندی بھی واقع ہو جائے گی۔ اور جس صورت میں باغیوں کا ان پر قبضہ ہوگا۔ ایک حصہ کا دوسرے حصہ ملک سے انقطاع ہو جانا اک امر بدیہی ہوگا۔

اندریں صورت حالات ظاہر ہے۔ کہ حکومت کی آمدنی یا تو بالکل ہی رک جائے گی۔ اور یا اس میں نمایاں کمی واقع ہوگی۔ اور اس کے بالمقابل افواج کی نقل و حرکت اور شورش و بغاوت کے فرو کرنے کے اخراجات بڑھ جائیں گے۔ اور پھر یہ امکان ہو سکتا ہے۔ کہ بغاوت ایک مدت دراز تک دبائی نہ جا سکے۔ تو کیا ان صورت حالات میں اعلحضرت کی مالی حالت اتنی قوی ہے۔ کہ استیصالِ بغاوت تک وہ اسکو نبھا سکینگے

غازی امان اللہ خان: ۔ ہاں میری حکومت میں اس کی استعداد موجود ہے ؟

غازی مصطفےٰ کمال: ۔ کیا اعلیٰحضرت کی سلطنت کے تعلقات دولِ خارجہ خصوصاً اپنے دول ہمجوار کے ساتھ ناخوشگوار تو نہیں ہیں ؟

غازی امان اللہ خان: میری حکومت کے تعلقات عام طور پر ہر ایک دول سے نہایت خوشگوار اور ترقی پر ہیں ۔ اور جہاں تک میری ہمجوار سلطنتوں کا تعلق ہے ۔ ——— میری حکومت ان سے نہایت دوستانہ تعلقات قائم رکھنے اور ان کو نبھاہنے میں ہرگز کوتاہی نہیں کرتی ؟

غازی مصطفےٰ کمال: ۔ (مزید وضاحت کرتے ہوئے) کیا افغانستان میں بغاوت رونما ہو جانے کی صورت میں آپ یقین رکھتے ہیں کہ ہمسایہ ممالک اعلیٰحضرت کی حکومت کے برخلاف ریشہ دوانیوں میں مشغول نہیں ہو جائیں گے ؟

غازی امان اللہ خان: مجھے اس امر کا اطمینان و یقین ہے کہ ایسی صورت میں انگریز اور روس دونوں ہی اپنے معاہدات و مواعید کا احترام ملحوظ رکھیں گے ۔ اور میری حکومت کے برخلاف ایسا کوئی معاندانہ رویہ اختیار نہیں کرینگے جو بعد میں ان کے لئے خجالت و خسارت کا موجب بنے ۔ بلکہ ——— یہاں تک کہ میری حکمت عملیاں[1] ان کو ایسا کرنے سے باز رکھینگی ۔

غازی مصطفےٰ کمال: ۔ کیا ضرورت لاحق ہونے کی صورت میں اعلیٰحضرت اپنے دول متعاہدین سے مالی امداد و اعانت کی توقع کر سکتے ہیں ؟

غازی امان اللہ خان: ۔ اوّل تو افغانستان کو اس کی ضرورت ہی لاحق نہ ہو گی ۔ لیکن اگر صورتاً حالات ایسے ہی ناگزیر ہوئے ۔ تو میری حکومت اپنی اس خواہش کی تکمیل میں اپنے آپ کو مایوس نہ پائے گی ؟

---

[1] غازی امان اللہ خان کو اپنی خارجہ حکمت عملیوں پر بہت ناز و غرّہ تھا ؟

غازی مصطفےٰ کمال: "جب یہ ساری صورتیں اعلیحضرت کی موافقت میں ہیں۔ تو بسم اللہ میرا مشورہ بھی یہی ہے۔ کہ یک آن زود تر اپنے ملک میں اصلاحات نافذ کیجئے"

ترکیہ میں اصلاحات کو کبھی بھی خوش آمدید نہیں کہا گیا۔ بلکہ ہم نے بہ نوکِ سنگین ان کو رائج کیا ہے۔ کسی ملک کے باشندے اپنے پرانے عقاید و خیالات اور رسم و رواج کی پابندیوں کو از خود خیرباد نہیں کہا کرتے۔ تاآنکہ حکومتِ وقت ان کے برعلیہ جبر و قوت کو استعمال نہ کرے ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ

ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ

ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ

مذکورہ بالا مشاورت کے بعد اعلیحضرت غازی امان اللہ خان پہلے سے زیادہ اپنے عزم و ارادہ میں مضبوط ہو چکا تھا۔ اور اب اس کی قطعیت کے ساتھ یہ رائے قرار پا چکی تھی۔ کہ وہ افغانستان پہنچتے ہی بزورِ قوت اصلاحات کو رائج کر کے رہیگا۔ غازی مصطفےٰ کمال کے سوالات کے جوابات میں جو کچھ غازی امان اللہ خان نے فرمایا۔ وہ کہاں تک حقیقت یا مبالغہ کا پہلو لئے ہوئے تھا۔ ہم اس بحث و تحقیق کے فرض کو اپنے سلسلۂ تحریر میں جا بجا انجام دیتے رہیں گے۔ یہاں ہم غازی امان اللہ خان کی صرف اس پالیسی کی تشریح کرینگے۔ جو یوروپ سے واپس آن کر اس نے پیشہ و اختیار کی ۔

یوروپ کی سیاحت نے غازی امان اللہ خان کے پہلے خیالات میں ایک عظیم تغیر و انقلاب واقع کر دیا تھا۔ اب وہ معاملات و مسائل ملکی کو کسی اور ہی نظر و انداز سے دیکھنے لگ گیا تھا۔ یوروپ نے جس شان و شکوہ کے ساتھ اس کا استقبال کیا تھا ۔

اس کا قدرتی طور پر اس کی ذات پر جو اثر پڑا...... وہ یہ تھا۔ کہ وہ اب پہلے کی نسبت سے بہت زیادہ اپنی ذہانت و قابلیت اور اصابت رائے کا مدعی بن بیٹھا تھا۔ اور اسی نسبت سے ملک کی بہتری و تعالی کے متعلق جو دعاوی اور تجاویز وہ رکھتا تھا۔ وہ اسکی اپنی نگاہ میں اٹل اور ناقابل ترمیم قرار پا چکے تھے۔ اس نے یوروپ سے واپس آکر مختلف مواقع پر جو تقاریر کیں۔ ان سے اور دیگر امور سے جنہیں ہم تفصیل کے ساتھ اب بیان کرنے والے ہیں۔ اس امر کا بخوبی پتہ چلتا ہے ۔

وزارت خارجہ میں ایک تقریر کے دوران میں غازی امان اللہ خان نے ان فوائد ملی و سیاسی کا ذکر کرنے کے بعد جو سیاحت یوروپ کے نتیجہ کے طور پر ملک و ملت افغانستان کو حاصل ہونے والے تھے۔ اپنی نسبت یوں فرمایا کہ "وہ ایک انقلابی بادشاہ ہے۔ اور اس لئے وہ اپنے ملک کی اصلاحی مہم کو انقلابی جد و جہد کے ساتھ سر کرے گا"۔

غالباً غازی امان اللہ خاں کی مراد اس سے یہ تھی۔ کہ وہ اصلاحات ملک کو آہستہ اور سلامت روی سے عمل میں لانے کا حامی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس دشوار ترین وادی میں سے ہر ایک فرضی یا احتمالی خطرہ سے لاپرواہ ہو کر باد و برق کی سی تیزی کے ساتھ گذر جانا چاہتا ہے۔ اور اپنی ملت افتادہ کی مذہبی اور سوشل زندگی میں دفعتہ ایک انقلاب رونما ہوتے دیکھنے کا آرزومند ہے ۔

اسی طرح ایک اور موقع پر وزارت حربیہ میں اس نے نوجوان فوجی افسروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں جس انقلاب کے دیکھنے کا اس ملک میں خواہشمند ہوں وہ اگر ضرورت پڑی تو تمہاری سنگینوں کے زور و قوت سے پیدا کیا جائیگا"

ایک اور موقع پر جب کہ محمود خان یاور اس کے حضور میں موجود تھا۔ اور جسے اعلیحضرت نے قبل از روانگی یوروپ ایک خاص رقم اس غرض و مطلب کے لئے علیحدہ دے رکھی تھی۔

کہ وہ اس کے یورپ سے واپس آنے تک اسے آزاد خیالی اور برہنہ روئی[۵۱] کے پروپیگنڈا اور حمایت میں صرف کرتا رہے۔ اور اپنی کارگذاری کی ایک باقاعدہ رپورٹ اس کے حضور میں پیش کرے۔ غازی امان اللہ خان نے یہ کہہ کر اسے اپنی رپورٹ پیش کرنے سے روک دیا۔ کہ "بس بس محمود جان رپورٹ رہنے دو۔ یہ باتیں اس طرح حاصل نہیں ہو سکتیں مصطفٰے کمال نے مجھے کہا ہے۔ کہ انہیں محض سنگین کی نوک سے رائج کیا جا سکتا ہے۔ اور میں اب انہیں بنوک سنگین رائج کر کے رہونگا"۔

ملک کے مُلّانوں کے برخلاف غازی امان اللہ خان کی رائے اب بہت کچھ پلٹ چکی تھی۔ وہ ان کو اپنی ملّت کی ذہنی اور معاشرتی ترقی کی راہ میں سدّ سکندری کی طرح حائل پاتا تھا۔ فلہذا ان کا زور یک لخت توڑ دینا چاہتا تھا۔ جب وہ یورپ سے واپس وطن لوٹنے کو تھا۔ تو پایۂ تخت میں اس کا شاندار خیر مقدم کرنے کے لئے پیشتر ہی سے بڑے بڑے رؤساء و عمائدین اور مُلّاں و خوانین کو ہر گوشۂ ملک سے فراہم کر لیا گیا تھا۔ ان میں ایک کثیر تعداد داخلی اور سرحدی مُلّانوں کی بھی تھی۔ جن کا اندرون و ماورائے سرحد اپنے اپنے قبائل پر پورا پورا اثر تھا۔ وزارتِ خارجہ نے جب اپنی باری[۵۲] سے غازی امان اللہ خان کیخدمت میں ایڈریس پیش کرنے کی تقریب پر جملہ سفراء دول خارجہ اور دیگر اجنبی مہمانوں کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ تو سیاستاً ان بڑے بڑے مُلّانوں کو بھی جن کا داخلی

۵۱ بچّہ سقاؤ کے راج میں محمود خان یاور اور میں ایک ہی کوٹھڑی میں مقید تھے۔ وہاں خود اس کی اپنی زبانی مجھے اس روئداد کا علم حاصل ہوا۔ فارسی میں اعلیٰحضرت امان اللہ خان کے الفاظ تقریباً یہ تھے:۔ "بس بس محمود جان ایں را بان (رہان) من حالا ایں طور نے کنم مصطفٰے کمال مرا گفتہ۔ کہ ایں چیزہا تنہا بنوکِ برچہ حاصل میشوند۔ من اینہا را بزور نوکِ برچہ رواج خواہم داد۔"

۵۲ غازی امان اللہ خان کی واپسی پر ملک کی ہر وزارت نے باری باری سے شاہ کے حضور میں ایڈریس پیش کئے تھے یعنی رسمی طور پر وزارت نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔

وخارجی سرحدی قبائل پر گہرا اثر تھا۔ بدیں مضمون دعوتی رقعے بھیج کر بلوایا۔ کہ اعلیٰحضرت ان کو وہاں یعنی وزارت خارجہ میں شرف باریابی بخشینگے۔

اور جب یہ قدیم الخیال ملانوں کا گروہ وزارت خارجہ کے ایک بڑے ہال میں اعلیٰحضرت کی پذیرائی کے لئے جمع ہوا۔ تو اعلیٰحضرت مع اپنے جملہ خدم وحشم اور سفراء و مہمانانِ دول خارجہ کے ٹھیٹھ یورپین لباس میں ہال میں داخل ہوا۔ اور دستور ملی کے عین برخلاف بجائے ان سے علیک وسلیک کہنے اور مصافحہ ومعانقہ کرنے کے سر سے ہیٹ اتار کر ان کے سلام کا جواب دیا۔ اور بعدہٗ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بالکل اروپائی طرز میں ہر ایک سے خشک مصافحہ کرتا ہوا گذر گیا۔ یہ چیز اس گروہ کے لئے ایک بالکل ہی نئی اور انتہائی طور پر ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے اپنے پرانے خیالات وعقائد کے ماتحت اس کو لامذہبیت شمار کیا ہیں بدقسمتی سے ایک اور واقعہ بھی پیش آیا۔ جو بعد میں اپنے نتائج کی رو سے بیحد زبون ثابت ہوا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ اسی ملّانوں کے گروہ میں ملّاں صاحب چکنور بھی تھے۔ جن کا افغانستان کے مشرقی قبائل پر بے حد اثر و رسوخ قائم تھا۔ اور جن کے نام سے ہندوستان کی اخباری دنیا نا آشنا نہیں ہے۔ سوء اتفاق سے اُس وقت ان کے ہاتھ میں ایک موٹے دانوں کی لمبی تسبیح تھی جس کو وہ پھیرتے جاتے تھے۔ جب غازی امان اللہ خان مصافحہ کرتا ہوا ان تک پہونچا۔ تو تسبیح کو دیکھتے ہی اس کی بھویں کھنچ گئیں۔ اور بے تحاشہ تمسخر اور تحقیر کے انداز سے ملّاں صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ کہ "ایں چہ کتی پشقل شتر بازی میکنی"۔ یعنی یہ کیا تو اونٹ کی لینڈنیوں سے کھیل رہا ہے؟ جب یہ کہکر وہ اس کے پاس سے گذر گیا۔ تو مصاحبوں میں سے کسی نے عرض کیا کہ اعلیٰحضرت نے یہ کیا کہہ دیا۔ یہ تو ملّاں صاحب چکنور تھا۔ تو اس پر ترش رو ہو کر غازی امان اللہ خان نے فوراً یہ جواب دیا۔ کہ [illegible] اکہ باشد باکے نیست

من اینہارا ابرودوی آدم مے سازم" یعنی کوئی سارے کچھ بھی ہو کچھ ہرج نہیں ۔ میں ان سب کو بہت جلد آدمی بنا دوں گا ۔

یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے خیالات جو خلوت اور جلوت میں غازی امان اللہ خان نے ظاہر کرنے شروع کر دیئے تھے ۔ ان سے صاف ٹپک رہا تھا ۔ کہ وہ ملک میں عنقریب اصلاحات کی مہم بڑے زور شور سے شروع کرنے والا ہے ۔ اور اس باب میں جو کچھ اس کی رائے قرار پا چکی ہے ۔ اس میں تغیر و تبدل ناممکن ہے ۔

اعلحضرت اب تک اپنی حکومت کے دس سال پورے کر چکا تھا ۔ اور عنقریب جلوس استقلال کا گیارہواں سال پغمان میں منایا جانے والا تھا ۔ اس نے یہ طے کر رکھا تھا کہ ہونے والے جشنِ استقلال کے فوراً بعد اصلاحات کی مہم کا آغاز کر دیا جائے ۔ اور اس دَور کو دَورِ جدید یا دورِ دوّمین کہہ کر پکارا جائے ۔ اور چونکہ وہ اپنی حکومت کو ممالک خارجہ کی نظروں میں ایک آئینی حکومت ثابت کرنے کا ویسا ہی خواہشمند تھا ۔ جیسا اپنی ملّت کی ذہنی کایا پلٹ دینے کا ۔ لہٰذا اس نے یہ تجویز سوچ رکھی تھی ۔ کہ اسی موقع پر "لوئے جرگہ" طلب کر کے ایک تو ان کے سامنے اپنی سیاحت کے حاصلات و ثمرات رکھ دے ۔ اور دوسرے جو اہم تغیّرات وہ عنقریب ملک کے اندر کرنے کا عزم و ارادہ کر چکا ہے ۔ ان کے متعلق اہل جرگہ سے استصواب رائے کر لے ۔

"لوئے جرگہ" یعنی جنرل اسمبلی کے مدعو کرنے کا رواج خود غازی امان اللہ خان ہی نے جاری کیا تھا ۔ اول اول اس کی ضرورت بغاوت منگل کے دوران میں محسوس کی گئی تھی ۔ اور جیسا کہ قارئین میں سے بہتوں کو معلوم ہو گا ۔ کہ اس بغاوت کا مرکز خوست کا صوبہ تھا ۔ جو افغانستان کے جنوب میں واقع ہے ۔ اور مشہور ملائے لنگ اس کا سرغنہ اور راہ نما تھا ۔ اس بغاوت کا عام سبب ملک میں قانون کے ذریعہ سے

حکومت کئے جانے کی ابتدا تھی۔ اس مطلب کے لئے جو نظامنامہ بنایا گیا تھا۔ اس میں چند دفعات ایسی بھی تھیں۔ جن کی نسبت ملاؤں کا دعوےٰ تھا۔ کہ وہ شریعت اسلامیہ کے خلاف ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کے بعض مواد خود ان ملانوں کے اقتدار پر بھی حرف زن تھے۔ اس لئے انہوں نے نظامنامہ مذکور کو اپنے مفاد اور مذہبی اعتقادیات کے خلاف پاتے ہوئے ملک میں آتشِ فساد برپا کردی تھی۔ اور یہ آگ مذہب کے نام پر لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتی جاتی تھی۔ اور بجا طور پر یہ خوف لاحق ہو چکا تھا۔ کہ کہیں حکومت ہی سقوط نہ کر جائے۔ لہٰذا اس مدہش خطرہ سے بچنے کے لئے غازی امان اللہ خان نے ملک بھر کے مؤثر و مقتدر اشخاص کو عین بغاوت کے شباب میں پایہ تخت میں طلب کرکے ان کے سامنے نظامنامہ رکھ دیا تھا۔ تاکہ وہ حسب دلخواہ اس میں ترمیم و تنسیخ کرلیں۔ اور سب کے سب یکدل ہو کر بغاوت کے فرو کرنے میں منہمک ہو جائیں ؏

رعایا کی مزید طمانیت کے لئے ٹھیک اسی موقع پر حکومت کی طرف سے یہ وعدہ بھی دیا گیا تھا۔ کہ آئندہ ہر تین سال کے بعد ایک "لوئے جرگہ" منعقد ہوا کرے گا۔ جس میں حکومت کی گذشتہ اور آئندہ حکمت عملیوں اور دستورِ کار پر جرح و تنقید کی جایا کرے گی۔ تاکہ لوگوں پر ان کی مرضی و منشاء کے مطابق حکومت کی جاسکے ؏

اگرچہ اس اعلان کے مطابق لوئے جرگہ کا دوسرا اجلاس غازی امان اللہ خان کی سیاحتِ یوروپ سے پہلے پہلے انعقاد پاجانا چاہئے تھا۔ تاہم اس وقت ایسا نہ ہو سکا۔ اور اب غازی کی واپسی پر مذکورۃ الصدر اغراض کی تکمیل کے لئے اس کے منعقد کرنے کی ضرورت سمجھی گئی ؏

اندریں فرصت ایک اور خاص سبب بھی پیدا ہو چکا تھا۔ اور وہ یہ کہ وزرا حکومت کے برعلیہ وکلا ملت کی ایک ایسی جماعت تیار کی جانی مقصود تھی۔ جو بادشاہ کے ہر خیال ورائے کی تائید و حمایت کرے۔ اور اب یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی۔ کہ غازی امان

کی یوروپ سے واپسی پر اس کے اور اس کے وزراء کے درمیان باہمی ناچاقی رونما ہو گئی تھی۔ اور بادشاہ اس لئے بھی وکلاء ملّت کی حمایت حاصل کر کے وزراء سے اپنی غیر مشروط اور حسب دلخواہ متابعت کروانا چاہتا تھا ؞

اس امر کے لئے صوبوں کی حکومتوں کو ہدایات ارسال کر دی گئی تھیں۔ کہ وہ مناسب اشخاص کو لوئے جرگہ میں بطور نمایندہ یا وکیل ملّت کے شامل ہونے کے لئے نامزد کریں۔ اور ان کی فہرستیں مرکزی حکومت کو بغرض منظوری بھیجدیں۔ اعلحضرت غازی امان اللہ خان اپنے ملک کا خود بھی واقفِ حال تھا۔ اور اس کو شخصاً مختلف عناصرِ ملک کے متعلق کافی معلومات تھیں۔ اور وہ بآسانی ایسی فراہم شدہ فہرستوں میں سے ایسے اشخاص کو چھانٹ سکتا تھا۔ جو خواہ دل سے اس کے مؤیّد نہ بنیں۔ تاہم رعب و ترغیباتِ حکومت میں آکر اس کی حمایت ضرور کرنے لگ جائیں ؞

لوئے جرگہ میں شامل ہونے والے وکلاء ملّت کے استقبال و پذیرائی اور ان کے پایہ تخت میں قیام و رہائش کا انتظام نہایت اعلےٰ پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ اور ایک خاص ندرت یہ تھی۔ کہ ان وکلاء کو جو تعداد میں کئی سو تھے۔ حکومت نے اپنی طرف سے "پارلیمنٹری یونیفارمز" مہیا کی تھیں۔ ان کی خاطر و تواضع کے لئے مہماندار مقرر کئے گئے تھے۔ اور ان کے لئے تازہ فواکہات و ماکولات کے بہم پہونچانے کا اہتمام قابل رشک طریق پر کیا گیا تھا۔ وہ ہر صبح و شام سرکاری موٹروں پر جو ان کے لئے مخصوص کر دی گئی تھیں ہوا خوری کے لئے نکلا کرتے تھے۔ ان کی آمد و رفت کے جملہ اخراجات حکومت کے ذمہ تھے۔ اور علاوہ بریں ان کو ایک مناسب رقم جیب خرچ کے طور پر روزانہ دی جاتی تھی ؞

ان بیحد نوازشات کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔ اور وہ یہی کہ کسی طرح اس مقتدر گروہ وکلاء میں سے ایک زبردست جماعت ایسی پیدا کی جائے۔ جو بادشاہ کے نئے خیالات

کی ہر طرح تائید و حمایت کرے۔ آہ! اس وقت کسے خبر تھی۔ کہ یہی وکلاء جن کی اس قدر عزت و توقیر ہو رہی ہے۔ جب یہاں سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو واپس لوٹینگے۔ تو ہر جگہ اپنے بادشاہ کے برخلاف دہریت اور لامذہبیت کے الزام لگا لگا کر عامۃ الناس میں ایک ایسا جوش بھر دینگے۔ جو بالآخر حکومت کی تباہی کا موجب ہو کر رہیگا۔ اس کی تہ میں در اصل وزراء کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ جو غازی امان اللہ خان سے اس وقت تک روٹھ چکے تھے۔ مگر جو خود اس وقت یہ اندازہ بالکل نہیں لگا سکتے تھے۔ کہ ان کی یہ کارروائیاں حکومت اور خود ان کے اپنے حق میں کس قدر ہولناک اور تباہی آور ثابت ہونگی۔ وہ تو اپنی دانست میں محض اپنے شخصی حقوق و اقتدار کی مدافعت میں ایک قسم کی ڈپلومیٹک جنگ جو عام طور پر ہر جگہ مخالف جماعتوں کے درمیان ہوتی رہتی ہے۔ اپنے بادشاہ سے لڑ رہے تھے۔ اس باہمی رنجش و ناچاقی کی کیفیت یوں تھی۔ کہ:۔

غازی امان اللہ خان جہاں اور بہت سی باتیں یوروپ سے سیکھ کر آیا تھا۔ وہاں ایک یہ بھی تھی۔ کہ وہ انگلستان کی طرزِ حکومت کو بہ نسبت دیگر قسم کے نظامِ حکومت کے اپنے مُلک کے لئے مناسب الحال پاتا تھا۔ اس لئے اس نے پہونچنے کے ساتھ ہی اپنے ملک کے نظام حکومت کی داغ بیل اسی طرز پر رکھنی چاہی۔ اور وزارتِ عظمےٰ کا نیا عہدہ قائم کرنا چاہا۔ اب تک افغانستان میں وزارتِ عظمےٰ کا عہدہ عملاً موجود نہ تھا۔ اور صرف بادشاہ ہی اپنی حسب پسند وزراء کو نامزد کیا کرتا تھا۔ علاوہ براں صوبوں کے گورنر مالیات کے افسر اضلاع کے حاکم اہل قضاۃ جنگی و خزانوں کے مہتمم و محافظ شہروں کے کوتوال مدیرینِ محاکم و شعائب سفراء اور فوجی عہدیداروں وغیرہ کا تقرر خود بادشاہ ہی کیا کرتا تھا۔ اور آئینی طور پر وزراء ان اعلیٰ عہدوں کے لئے کسی کی سفارش نہ کر سکتے تھے۔ وزیر حربیہ جو درجہ میں جملہ وزراء سے مقدم شمار ہوتا ہے

کپتانی کے سوا اور کسی بڑے عہدے کے لئے بادشاہ کے حضور میں شفیع نہیں بن سکتا تھا۔ اعلےٰ عہدوں کا تصویب و منظور کرنا محض بادشاہ کے اختیارِ خصوصی میں سے تھا اسی طرح جملہ وزراء، ماموّرین، معاونینِ ادارت، چھوٹے درجے کے حاکموں اور علاقہ داروں کی تقرریوں کے لئے سفارش تو کر سکتے تھے۔ مگر ان کا از خود مقرر کرنا ان کے اختیارات سے باہر تھا۔ پھر یہی نہیں بلکہ ہر وزارت کی ایک علیحدہ مجلسِ مشاورت ہوتی تھی۔ جس میں مدیر تک کے عہدے کے منصبدار شامل ہو سکتے تھے۔ اور جس کسی کی سفارش کرنی مقصود ہوتی تھی۔ اس کو یہ مجلس پہلے تصویب کیا کرتی تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ نظامِ کار بے حد مستبدانہ اور ترقیاتِ ملکی کے لئے زہرِ قاتل تھا۔ گویا بادشاہ کسی افسر کے مقرر کرنے میں دوہرا حصّہ لیتا تھا۔ ایک براہِ راست اور دوسرے بواسطہ مجلس شورائے وزارت، وزراء کے اختیارات بہت ہی محدود تھے۔ اور وہ اپنے ارد گرد کارکنانِ ملکی کا ایک ایسا حلقہ پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ جو ان کی اپنی طبیعت و پسند کے موافق ہو۔ لہٰذا لازمی تھا۔ کہ عام ترقی و تعالیٔ ملک میں ان وزارتوں کی قابلیت و استعدادمیں کوئی اضافہ نہ ہو۔ اور وزراء اور ان کے ماتحت دائرے نیز صوبہ جات کی حکومتیں وغیرہ حبس وقبض کے مرضِ دوام میں مبتلا رہیں۔ نہ ان میں اصلاحات و ترقیات کا جوہر پیدا ہو۔ اور نہ وہ اس خصوص میں کوئی اہم کارگذاری دکھلا سکیں۔ پس بادشاہ اگرچہ ذرہ بھر اپنے ان اختیارات کو کم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم وہ دوسری طرف دنیا کو یہ دکھلائے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ کہ وہ اپنے ملک کی سوشل و مذہبی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنے نظامِ حکومت کی بھی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اور بوجہ آزاد خیال ہونے کے وہ ملک میں ذمہ دار حکومت کی بنیادیں قائم کر رہا ہے۔ جس کی اوّلین خشت وزارتِ عظمےٰ کے عہدے کا قیام ہے۔

اب اودھر تو غازی امان اللہ خان کے پیشِ نظر یہ مسئلہ تھا۔ کہ وہ وزیرِ اعظم یا صدرِ

کابینۂ وزارت کے مسئلہ کو قبل از قیام لوئے جرگہ طے کر دے۔ تاکہ بعد میں اگر اس کی مجوزہ اصلاحات کے سبب ملک میں کوئی شورش وغیرہ رونما ہو۔ تو اس کی مسئولیت سے وہ خود ہر طرح بری الذمہ رہے۔ اور سارا نزلہ وزارتِ عظمےٰ کے سر گرے۔ اور ادھر چوٹی کے وزیروں میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا۔ کہ وزارتِ عظمےٰ کا قلمدان سب سے پہلے اسی کو ملے۔ اور اس سے بھی کہیں زیادہ یہ کہ یہ عہدہ محض برائے نام نہ ہو۔ جیسا کہ بادشاہ کی اصل مرضی تھی۔ بلکہ وزراء کی طاقت میں حقیقتاً اضافہ کرنے والا ثابت ہو۔ اربابِ بصیرت اب خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ یہ مہم کیسی کشاکش سے پُر تھی۔ اور طرفین کے زاویۂ نگاہ میں کسقدر بُعد و تفاوت تھا۔

وزراء ایک اور طرح بھی اپنے اس مطالبۂ اضافۂ اختیارات کو حق بجانب ثابت کر رہے تھے۔ وہ بیان کرتے تھے۔ کہ انہوں نے اعلیحضرت کی غیابت میں کمال خوبی کے ساتھ اس کی سلطنت کو سنبھالے رکھا ہے۔ اور وہ اب ہر طرح سے اس بات کے اہل ہیں۔ کہ انہیں اپنی ملّی حکومت میں وسیع اختیارات کے ساتھ عمل و دخل کی توفیق دی جائے۔

لوگوں میں جب اعلیحضرت کے اس خیال کا اوّل اوّل چرچا ہوا۔ تو وہ یہی سمجھے۔ کہ یہ عزت محمد ولی خان وکیل اعلیحضرت ہی کو ملے گی۔ کیونکہ جس تدبّر و دانائی سے اس نے وکالتِ بادشاہ کے فرائض انجام دیئے تھے۔ اور جو نمایاں خدمات ملک میں امن قائم رکھتے ہوئے اس نے بادشاہ کی غیر حاضری میں کی تھیں۔ وہ اس شایاں تھیں۔ کہ ان کے صلے میں اس کو افغانستان کا سب سے پہلا وزیر اعظم بنایا جائے۔ لیکن غازی امان اللہ خان سیاستِ پادشاہی کے اصول کے ماتحت نہیں چاہتا تھا۔ کہ ہر دلعزیزی اور اقتدار کی شاہراہ پر محمد ولی خان کی مزید راہنمائی کرے۔ مقابلۃً سردار محمد نادر خان کے محمد ولی خان کا معاملہ دیگر قسم کا تھا۔ جہاں سردار محمد نادر خان کے افزودِ رسوخ کی زیادتی اس کے بذاتِ خود

قوم دار ہونے کی بنا پر امان اللہ خان کے تخت کے لئے ایک واجب خطرہ بن سکتی تھی۔ وہاں محمد ولی خان کے قوت و اقتدار میں اضافہ اس کے پارلیمنٹری حکومت مانگنے والے نوجوان گروہ کا سرکردہ ہونے کے سبب بادشاہ کے لئے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پرخطر تھا۔ اس لئے محمد ولی خان باوجود اہل اور مستحق ہونے کے صدارتِ عظمےٰ کے عہدہ سے محروم رکھا گیا۔ باقی وزرا میں سے سردار محمد عزیز خان وزیر داخلہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ مستحق سمجھتا تھا۔ اور بادشاہ کا مخصوص ہوا خواہ ہونے کی بنا پر وہ یہ سمجھ رہا تھا۔ کہ یہ آسمانی حلہ شاید اسی کو پہنایا جائیگا۔ لیکن بادشاہ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ سردار محمد عزیز خان کی دارالسلطنت میں کافی طاقت موجود نہ تھی۔ اور وہ سخت رشوت خوار ہونے کی بنا پر لوگوں میں نہایت بُری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی غالباً یہ امر بھی غازی امان اللہ خان کے ملحوظ خاطر تھا۔ کہ اگر وہ محمد ولی خان کو محروم رکھ کر سردار محمد عزیز خان کو وزیر اعظم بنا دیگا تو شاید کوئی وزیر بھی اس کے ساتھ مل کر کابینہ کے تشکیل کرنے پر راضی نہ ہوگا۔ لہٰذا ان حقائق کو پیش نظر رکھتا ہوا غازی امان اللہ خان اس بات کا اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ وہ وزراء موجودہ میں سے کسی کو بھی اس عہدے کے لئے انتخاب نہیں کرے گا۔

اس کو یہ خیال بھی تھا۔ کہ اگر وہ کسی دوسرے شخص کو جو وزراء میں سے نہ ہوگا وزیر اعظم بنائے گا۔ تو پھر سارے وزراء خاموشی کے ساتھ "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کہتے ہوئے نئے وزیر اعظم کے ساتھ تعاون کرنے لگ جائیں گے۔ مگر جیسا کہ واقعات ظاہر کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ ادھر غازی امان اللہ خان نے شیر احمد خان کو جو مجلس شوریٰ ملی کا صدر یا رئیس تھا۔ اور بادشاہ کے خاص

حواریوں میں شمار ہوتا تھا۔ وزیراعظم نامزد کرکے امر دیا کہ کابینۂ وزارت کو تشکیل کرے۔ ادھر سارے وزراء کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اور انہوں نے اپنے باہمی اختلافات کو طاق نسیاں پر رکھ کر محمد ولی خان کی سرکردگی میں جھٹ اپنے استعفے داخل کردیئے۔ بادشاہ بہتیرا سٹ پٹایا۔ شیر احمد خاں نے ایک ایک کے ہاں جاکر بہتیری منتیں اور کوششیں کیں لیکن وزراء کے متحدہ محاذ کے آگے ایک پیش نہ چل سکی۔ وہ اسے اپنی انتہائی توہین خیال کرتے تھے۔ کہ سردار شیر احمد خان کے تلے رہ کر کام کریں۔ اور دوسری طرف یہ بادشاہ کی جرأتِ سیاسی سے باہر تھا۔ کہ وہ ان کی جگہ نئے وزیروں کو بھرتی کرے، اسے کاش! وہ ایسا کرسکتا۔ تو اس کے زوال کا وقت شاید نہ آتا۔ اور اگر اس نے آنا ہی تھا۔ (جیسا کہ مصنف کو یقین ہے) تو اتنی جلد اور دفعتہً واقع نہ ہوتا۔ میں غازی امان اللہ خان کی اس غلطی کو اس کے زوال کی اہم بنیادی غلطیوں میں سے ایک شمار کرتا ہوں اوّل تو اُسے یہ ہرگز نہ چاہئے تھا۔ کہ وہ وزراء کی جماعت سے باہر کسی کو وزیراعظم بناتا۔ کیونکہ یہ صلۂ خدمت کے اصول کے یکسر منافی تھا۔ اور سیاست وقتی بھی اس کی موافقت نہ کرتی تھی۔ اگر انصاف کی نظروں سے دیکھا جائے۔ تو اس کے وکیل محمد ولی خاں نے نہایت ہی اہم اور مہتم بالشان خدمات انجام دی تھیں۔ اور اس نے بادشاہ کی غیابت میں افغانستان جیسے ملک میں پُرامن حکومت قائم کرکے دنیا پر ثابت کردیا تھا۔ کہ وہ بجا طور پر ہر طرح عزت کا مستحق و اہل ہے۔ غازی امان اللہ خان کی واپسی پر وہ بجا طور پر اس کی ذات سے یہ توقع کرسکتا تھا۔ کہ اس کی خدمات کی شایان شان قدر و توقیر کی جائے۔ مگر عین سب کی توقعات کے برخلاف جب اس کی جگہ ایک ایسے شخص کو وہ اعزاز دیا جانے لگا۔ جو کسی طرح اس کا اہل و مستحق نہ تھا۔ تو قدرتی امر تھا۔ کہ سارے وزراء کو بحیثیت [illegible] فریق کے رنج پہونچتا۔ اور

کے برخلاف بلند آہنگی کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتے۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ انہوں نے فوراً اپنے استعفے پیش کر دیئے۔ اور بادشاہ کی ایک بھی چلنے نہ دی۔ نوبت بایں جا رسید۔ کہ غازی امان اللہ خان کو بالآخر یہ اعلان کرنا پڑا۔ کہ وہ اپنا پہلا حکم واپس لیتا ہے۔ اور ملک کے پہلے کابینہ کا وہ خود پہلا صدر اعظم ہوگا۔

اس اعلان کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ وزراء کی اکثریت اپنی ذات کے متعلق بادشاہ کے طرز عمل کو مشکوک و مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگ گئی۔ اور اس شک کو اور بھی تقویت مل گئی۔ جب تھوڑے ہی دنوں بعد بادشاہ نے محمد ولی خان کو مشورہ دیا۔ کہ وہ اپنے پاؤں[1] کے علاج کے لئے حکومت کے خرچ پر بہت ہی جلد یوروپ چلا جائے اور وہاں اطمینان کے ساتھ اپنی اس دیرینہ مرض کا علاج کرائے۔

درحقیقت غازی امان اللہ خان کو انتہائی غصہ تھا۔ کہ اس کے وزراء نے بالاتفاق اس کی بات کو مسترد کر دیا ہے۔ اور اگر ضروری اقدامات نہ کئے گئے۔ تو یہ گروہ اور بھی تقویت پا کر آئندہ کے لئے ہمیشہ اس کی راہ میں مزاحمتیں پیش کرتا رہیگا لہٰذا اس کا حل اس نے یہی سوچا۔ کہ وزراء کے بالمقابل مجلس شورائے ملی کو مستحکم کیا جائے۔ اور لوئے جرگہ میں سے اس مجلس کیلئے ارکان چن لئے جائیں۔ اسی طرح وہ چاہتا تھا۔ کہ وزراء پر اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کر دے۔ کہ وہ ہر طرح بادشاہ کے محتاج و دست نگر ہیں۔ وزراء بھی اس پیش آیند خطرے کو تاڑ گئے تھے۔ اور وہ بھی اپنی جگہ غازی امان اللہ خان کو ایک نہ بھولنے والا سبق دینے کی تیاریاں کر رہے تھے انہوں نے لوئے جرگہ کے اس اجتماعِ عظیم سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی ہوئی تھی۔

اے کاش اگر انہیں اپنی عاقبت و انجام کی خبر ہوتی اور وہ حکومت کے عبرت خیز سقوط کی ایک جھلک پہلے سے دیکھ لیتے۔ تو وہ ہرگز ایسا رویہ اختیار نہ کرتے۔ جسے وہ نادانستہ طور پر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے تیر بہدف سمجھ رہے تھے۔

[1] محمد ولی خان کے پاؤں میں ایک قسم کی بیماری تھی۔ جس کے سبب وہ کسیقدر لنگڑا کر چلا کرتا تھا۔

وزراء اگر اپنی پیش آمدہ مشکل کا سیاسی حل سوچنے کی کوشش کرتے۔ تو وہ اسے بلا تکلیف سوچ سکتے تھے لیکن ان کی باہمی تفریق اور کمی تدبر نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ وہ یہ نہ جانتے ہوئے کہ ان کا رُخ کس طرف کو ہے۔ برابر اپنی اور اپنے ملک کی تباہی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ مانا کہ غازی امان اللہ خان کا یہ فعل ان کے حق میں اس کی ناانصافی اور کوتہ چشمی پہ مبنی تھا۔ تاہم اگر وہ تحمل بردباری اور دوراندیشی سے کام لیتے۔ تو نہ صرف وہ اپنے اقتدار رفتہ ہی کو بحال کر سکتے۔ بلکہ ساتھ ہی اپنے ملک کو بھی آنے والے خطرات ومصائب سے بچا لیتے۔ اگر وہ تھوڑی سی زحمت گوارا کر کے مسئلہ زیر بحث کا پہلے تجزیہ کر لیتے۔ تو وہ صاف دیکھ سکتے۔ کہ ان کو اپنے مقصد سے ہمکنار ہونے کے لئے کسی دوسری راہ پر چلنا چاہئے۔ غازی امان اللہ خان اس وقت ان سے صرف یہی چاہتا تھا۔ کہ وہ سردار شیر احمد خان کو اپنا وزیر اعظم مان لیں اور اس کو کابینہ وزارت کے تشکیل کرنے میں مدد دیں۔ یہ صاف طور پر واضح ہو چکا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو کوئی وزارت دینے کا خیال نہیں رکھتا۔ جو موجودہ گروہ وزراء میں سے نہ ہو۔ لہٰذا اس امر کی تو کسی وزیر کو فکر تک نہ ہو سکتی تھی۔ کہ وہ جدید کابینہ وزارت میں شامل نہ ہو سکیگا پس ان وزراء کو اس غیر معمولی مگر ساتھ ہی غیر اہم تبدیلی کی چنداں پرواہ نہ کرنی چاہئے تھی۔ بلکہ مآل کار پر اپنے افکار کو مجتمع رکھ کر کسی مناسب وموزوں موقع کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔ ایسا موقع بہت ہی جلد مستقبل قریب میں آنیوالا تھا۔ اور وہ اس سے حسب منشا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ وہ اپنے بادشاہ کے افکار وعزائم سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان پہ خوب روشن تھا۔ کہ ان کا بادشاہ عنقریب ملک میں ایسی اصلاحات نافذ کرنا چاہتا ہے۔ جو ملک کے طول وعرض میں نہایت غصہ اور نفرت کی نگاہ سے دیکھی جائینگی حکومت کے برخلاف زور شور سے پروپیگنڈا ہوگا۔ کہیں کہیں معمولی شورشیں بھی ہونگی۔ اور چونکہ حکومت کی پالیسی کی ساری ذمہ داری

نئے وزیر اعظم پر ہو گی۔ ملک بھر میں وہی بدنام ہو گا۔ اس وقت ایسے حالات آسانی سے پیدا کئے جا سکینگے۔ جن کی بنا پر بادشاہ کو ملک سے عام ناراضگی رفع کرنے کے لئے رجعت پر آمادہ کیا جا سکے۔ اور اس کی رجعت و واپسی لامحال نئے وزیر اعظم کے تشکیل دادہ کابینۂ وزارت کی شکست سے ہی تکمیل پا سکے گی۔ تاکہ بادشاہ اپنی رعیت کی خفگی کو یہ کہہ کر دور کر سکے۔ کہ اس نے وکلاء ملت کی تصویب پر حکومت کی ساری ذمہ داری اپنے کابینۂ وزارت کے سر ڈالی تھی۔ اب چونکہ اس کابینۂ وزارت نے ملک کی غلط طریق پر راہنمائی کرنی چاہی ہے۔ جس سے میری رعیت متاثر ہو رہی ہے۔ اس لئے میں اپنے خصوصی اختیارات بادشاہی کو استعمال کرتا ہوا موجودہ وزیر اعظم کو برطرف کرتا ہوں۔ اور اس کی جگہ فلاں وزیر کو حکم دیتا ہوں۔ کہ وہ جدید کابینۂ وزارت کو مرتب کرکے میری رعایا کی مرضی کے مطابق حکومت کو چلائے اس طرح سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔ وزراء کا مطلب بھی بر آتا۔ اور حکومت پر بھی زوال نہ آتا۔ کیا عجب ہے۔ کہ سردار شیر احمد خان کے وزیر اعظم بنانے میں غازی امان اللہ خان کا ایک مطلب یہ بھی ہو۔ اگرچہ بظاہر اس امر کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ تاہم وزراء اگر اس سے تعاون کرتے تو وہ بہت جلد شیر احمد خاں کو نیچا دکھا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس کے بالکل ہی برعکس طرز عمل اختیار کیا۔ اور ارادہ کر لیا کہ جن وکیلوں کی جماعت کو بادشاہ ان کے برخلاف کھڑی کرنا چاہتا ہے۔ انہی وکیلوں میں گھس کر اپنا محاذ قائم کیا جائے۔ اور انہی کو اپنا آلۂ مطلب برآری قرار دیتے ہوئے بادشاہ کو مرعوب کیا جائے۔

جن اشخاص نے افغانستان کو دیکھا ہے۔ اور جن کو وہاں کے باشندوں کی طبیعتوں سے آشنا ہونے کا اچھی طرح موقع ملا ہے وہ بیک نظر معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ افغان کتنی جلدی اپنے حریف مقابل کے برخلاف محض اس غرض سے ہیبت اندازی کے مظاہروں پر اتر آتے ہیں۔ کہ کسی طرح ان کا حریف ان حیلوں سے جلد

مرعوب ہو جائے۔ اور ان کے منشاء و مرضی کے موافق عمل کرنے لگ جائے۔ یہ تو ایک عام معیار ہے۔ لیکن جب ان کا مدمقابل درجہ میں ان سے برابر یا اونچا ہو۔ تو وہ خفیہ خفیہ اس کے برخلاف سازشوں کا جال پھیلا کر اس کے گرد و پیش ایک ایسا عالم پیدا کر دیتے ہیں۔ جس کی تاب نہ لا سکتا ہوا وہ لاعلمی میں وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے۔ جو اس کے حریف گروہ کا منشاء و مقصود ہوتا ہے۔

اسی عادت جاریہ کے ماتحت وزراء افغانستان نے بھی باوجود یہ ہمہ کہ ان میں آپس میں کوئی اتحاد نہ تھا۔ اپنے مستقبل سے بے پرواہ ہو کر اپنی غرض کو پورا کرنے کے لئے ایک ایسا قدم اٹھایا۔ جو بے حد خطرناک اور ملک پر تباہی لانے والا تھا اس کے خوفناک نتائج و انجام کو دیکھتے ہوئے ہم اس کو اصطلاحاً سازش کا نام دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گو حقیقت نفس الامری یہ ہے۔ کہ اس سازش کا مقصد حکومت کو برباد کرنا یا بادشاہ کی شخصیت کے برخلاف کوئی انقلاب و بغاوت پیدا کرنا نہ تھا۔ بلکہ محض بادشاہ کو ڈرا دھمکا کر اسے وزراء کی طاقت کو توڑنے کے فعل سے باز رکھنا تھا۔ اور جیسا کہ میں اوپر کسی جگہ کہہ آیا ہوں۔ کہ یہ ایک قسم کی بادشاہ اور اس کے وزراء کے درمیان ڈپلومیٹک جنگ تھی۔ بادشاہ اپنے وزراء کے برخلاف ایک سازش کر رہا تھا۔ اور وزراء اپنے بادشاہ کے برخلاف سازش کر رہے تھے۔ وزراء کے برخلاف جو سازش ہو رہی تھی وہ اوپر بیان ہو چکی ہے۔ یعنی بادشاہ ان کے متوازی الطاقت مجلس شورائے ملی کو مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ اور اس مطلب کے لئے اس نے ملک کے طول و عرض سے وکلاء ملت کو طلب کیا تھا تاکہ ان میں سے اپنی رغبت و پسند کے موافق چن کر انہیں مجلس شورائے ملی کا رکن منتخب کرے۔ اور اس طرح وزراء کی آئے دن کی نازبرداریوں سے بے نیاز و مطمئن ہو جائے۔

مگر وزرا، بادشاہ کے برخلاف جس سازش کو شروع کر رہے تھے۔ وہ یہ تھی۔ کہ وہ ابھی وکلاء ملت کو کسی نہ کسی طرح اپنا ساجی و طرفدار بنالیں۔ گویا بادشاہ اور وزراء دونوں کی نظریں رقیبانہ انداز میں وکلاء ملت پر مرکوز تھیں۔ وزراء میں باہمی اتحاد مفقود تھا۔ مگر وہ انفرادی طور پر وکلاء ملت کی حمایت حاصل کرکے اپنے آپ کو قوی تر اور موثر تر ثابت کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی اپنی جگہ اپنے ہوا خواہوں اور کارندوں کے ذریعہ سے ان پر ڈورے ڈالنے شروع کر رکھے تھے۔ اور بمجرد اس کے کہ ان کا اجتماع پغمان میں ہوچکا۔ ——کیونکہ پغمان ہی میں لوئے جرگہ منعقد ہونے والا تھا—— ہر ایک وزیر ان کی خاطر و تواضع میں مشغول و مصروف دیکھا گیا۔

بادشاہ کی نسبت وزراء کو کثرت اور آزادی کے ساتھ ان وکلاء سے میل جول نصیب تھا۔ اس لئے وہ اپنے آراء و افکار کو نہایت اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر سکتے تھے۔ غازی امان اللہ خان کے آئندہ اقدامات کے متعلق ان بیچارے وکلاء کو خاک بھی خبر نہ تھی۔ کیونکہ ان میں سے اکثر بالکل نئے بھرتی شدہ اور کورے تھے۔ ان کو اپنے عہدۂ وکالت کا نہ واقفیت کے ساتھ کچھ احساس تھا۔ اور نہ تجربہ۔ اندریں حالات وہ خود اس بات کی اشد ضرورت محسوس کرتے تھے۔ کہ کوئی انہیں گرد و پیش کے حالات سے واقف بنائے۔ تاکہ جس غرض و مدعا کے لئے انہیں طلب کیا گیا ہے۔ وہ اسے تھوڑی بہت قابلیت کے ساتھ پورا کر سکیں۔ ان کمیوں کو پورا کرنے کے لئے ان کو وزراء دولت سے بہتر مشاور اور کون مل سکتا تھا فلہذا نتیجہ یہ تھا۔ کہ جس جس وزیر کے ساتھ جس جس کسی کو کچھ نہ کچھ تعلق یا مناسبت تھی۔ وہ گویا اسی کے پلہ پر تھا۔

وکلاء کو ایک تشویش پہلے سے ضرور تھی۔ یعنی وہ وکالت کے لئے منتخب

کئے جانے سے پہلے ہی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ عورتوں کے پردے کے متعلق غازی امان اللہ خان کے خیالات بالکل پھرے ہوئے ہیں۔ اور نیز یہ کہ وہ اپنے مذہب سے کسی قدر لاپرواہ ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ وہ خود نہ تو کسی تنظیم کے ماتحت تھے۔ کہ ان امور کے متعلق اپنی رائے کا کھلے بندوں اظہار کر سکتے۔ اور نہ ہی وہ فرد واحد کی حیثیت میں بادشاہ کی ذات کے متعلق اس قسم کے اظہار بیان کی جرأت ہی کر سکتے تھے۔ مگر اب جب کہ وہ ملک کے مختلف قطعات سے اپنے اپنے قبائل کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے پایہ تخت میں جمع تھے انہیں آپس میں تبادلۂ خیالات کرنے کے پورے پورے مواقع حاصل تھے۔ وزراء سے وہ بادشاہ کے آئندہ اقدامات کے متعلق ہر قسم کی اطلاعات و معلومات فراہم کر سکتے تھے۔ خود پایہ تخت میں ان دنوں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کا لمحہ بہ لمحہ مشاہدہ اُن کی حالتوں کو ہراساں و متغیر کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کئے ہوئے حالات کو جب وزراء کے بیانات سے تطبیق دیتے تھے۔ تو ان کو اپنے ملک کی دنیا عنقریب بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ صریحاً دیکھ رہے تھے۔ کہ کابل اور پغمان میں عورتیں نہایت ہی منقش لباس پہنے ہوئے بے باکانہ ادھر اُدھر بازارو باغات میں سیر کناں ہیں۔ ان کا لباس یوروپین طرز کا ہے۔ اور ان کے منہ بالکل ننگے ہیں۔ اور غازہ روئی نے ان کے حسن کو اور بھی دوبالا کر رکھا ہے اور وہ اس قدر دقت نظری کا باعث ہو رہی ہیں۔ کہ اگر پیر صد سالہ بھی انہیں اس حال میں دیکھ پائے۔ تو اسے بھی اپنی گئی گذری ہوئی جوانی کے چند لمحے یاد آ جائیں۔ یہ خواتین سب کی سب شاہی خاندان کی چشم و چراغ تھیں یا وہ تھیں جن کے مرد برہنہ روئی کو دل سے یا مصلحتِ وقتی کے سبب جائز و ضروری خیال کر رہے تھے اور اگرچہ اس بارہ میں حکومت کی طرف سے اب تک کوئی خاص حکم نافذ نہ ہوا تھا۔ پھر بھی برہنہ روئی

کا مرض تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اور سب کے تئیں یہ خوف لگ رہا تھا۔ کہ بہت ہی جلد اس قسم کے احکام کو قانونی شکل دے دیجائے گی۔ کیونکہ بعض وہ اصلاحی باتیں جنہیں غازی امان اللہ خان کم درجہ کا خیال کرتا تھا۔ لوئے جرگہ کے قیام سے پہلے ہی جاری کر دی گئی تھیں۔ مثلاً

عام مردوں کو حکم مل چکا تھا کہ وہ مغربی لباس پہننا شروع کر دیں ہیٹ کو مغربی لباس کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا تھا۔ پہلے پہل صرف چند خاص تفرج گاہیں سوٹ و ہیٹ نہ پہننے والوں پر بند کی گئی تھیں۔ پھر جلدی ہی پولیس کے سپاہیوں کو جو بازاروں کے ناکوں پر تعینات ہوتے تھے حکم مل گیا تھا۔ کہ وہ ہر آئندہ و روند سے جو مغربی لباس میں نہ ہو ایک پیسہ جرمانہ کے طور پر وصول کیا کریں ؛

عورتوں کے لباس کے متعلق پہلا قدم یہ اٹھایا گیا تھا۔ کہ ان کے مخصوص شہری لباس کا جو برقعہ و دلاق کہلاتا تھا۔ ایک جز یعنی دلاق پہننا موقوف و ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ محلوں کے چودھریوں کو یہ احکام دئے گئے تھے۔ کہ وہ احتیاط رکھیں کہ ان کے محلے کی کوئی عورت دلاق پہنے ہوئے گھر سے باہر نہ جایا کرے بصورتِ عدمِ تعمیل احکام ان سے سخت باز پرس کی جانے کی تاکید بھی کر دی گئی تھی ؛

ہم قارئین کے معلومات و دلچسپی کے لئے یہاں اس لباس کی تھوڑی سی تشریح کئے دیتے ہیں :۔

افغانستان کی شہری عورتیں مختلف رنگوں کے برقعے اوڑھتی ہیں۔ عموماً سرمئی نیلگوں اور سیاہ برقعوں کا رواج زیادہ ہے۔ زرد رنگ ہندو عورتوں کا من بھایا پہناوا ہے۔ عموماً جس رنگ کا برقعہ ہوتا ہے۔ اسی رنگ کی دلاق جو ایک قسم کا پاجامہ ہے۔ پہنی جاتی ہے۔ یہ کوئی دس بارہ گز میں بنتی ہے پھیلاؤ میں اچھی خاصی ہوتی ہے۔

ٹخنوں کے نیچے سے موری کو گول دائرہ کی شکل میں بخیہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ پاؤں کی جراب جو اسی کپڑے کی قطع کی ہوئی ہوتی ہے۔ سی دی جاتی ہے اس دلاق کے نیچے لٹھے کا پاجامہ لازمی طور پر پہنا جاتا ہے۔ عورتیں گھٹنوں کے نیچے تک کا لمبا کُرتہ پہنتی ہیں۔ اور اس کُرتے کو دلاق کے نیچے کر لیتی ہیں۔ سر پر زری کی ٹوپی اور اس کے اوپر سے دو اڑھائی گز کا آبِ رواں کا ململی دوپٹہ پہنا جاتا ہے۔ اور پاؤں میں پشاور کی زرکار جوتی یا کابل کا بنا ہوا اونچی اڑی والا بوٹ ہوتا ہے۔ یہ لباس باہر کی آمد و رفت کے لئے مخصوص تھا۔ (اور اب بھی ہے) اور گویا عورتوں کی حیا و عفت کا معیار شمار ہوتا تھا۔ غریب سے غریب اور نادار سے نادار گھرانوں کی عورتیں بھی دلاق پہنے بغیر گھر سے باہر نہ جا سکتی تھیں +

ظاہر ہے کہ حفظانِ صحت کی رو سے یہ پہناوا غیر ضروری طور پر بوجھل ہونے کے علاوہ صحت کے لئے بہ غایت مضر تھا۔ مگر قدیم الایام سے رسم و رواج کی پابندی نے اس لباس کو نیم شرعی حیثیت دے رکھی ہوئی تھی۔ لہٰذا دلاق کے ترک کر دینے کے حکم نے کابل کے غریب و متوسط اور قدیم الخیال طبقوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اور ابھی چند ایام اس حکم کو نہیں گذرنے پائے تھے۔ کہ ایک اور اسی قسم کا حکم نافذ کیا گیا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ ایک معین وقفہ کے بعد سے جس کی مدت بہت قلیل تھی پایہ تخت میں کوئی عورت بغیر مکتبی برقعہ پہننے کے نہیں نکل سکے گی۔ یعنی اب وطنی برقعہ پہننا بھی ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ یہ جدید برقعہ دراصل ایرانی برقعہ کی نقل تھا۔ اور پہلے پہل مکتبِ نسواں کی طالبات کے لئے متعارف کیا گیا تھا۔ اس کا نچلا حصہ گون کی طرز کا تھا۔ کمر پر کپڑے کو جھالر کی صورت میں اکٹھا کر کے کندھوں پر اوڑھے جانیوالے حصہ کے ساتھ ٹانک دیا جاتا تھا۔ یہ اوپر کا حصہ کہلاتا تھا۔ مگر اس کا سامنے کا حصہ گون کے ساتھ نہیں سیا جاتا تھا۔ بلکہ کُھلا اور آزاد رہنے دیا جاتا تھا۔ ا

دوپٹہ کی طرح سر پر رکھ کر اوپر سے نقاب باندھ لی جاتی تھی۔ اس برقعہ کے ساتھ زنانہ لمبی جرابیں پہنی جاتی تھیں۔ اور پاجامہ یا تو بِرَگر کی قسم کا ہوتا تھا۔ اور یا اگر ٹخنوں تک لمبا ہو تو جرابوں کے نیچے کر لیا جاتا تھا۔

ایک اور حکم جاری کیا گیا تھا۔ اس کی رو سے جشن استقلال کی تقریبات میں نہ تو وہ مرد ہی شامل ہو سکتا تھا۔ جو یوروپین طرز کا لباس زیبِ تن کئے ہوئے نہ ہو۔ اور نہ وہ عورت ہی پغمان کی حدودِ خاص میں داخل ہو سکتی تھی جس نے کم از کم مکتبی برقعہ نہ پہن رکھا ہو۔ لطفاً قارئین کو یہ خیال رہے۔ کہ اس وقت تک اعلے گھرانوں کی عورتوں میں یوروپین طرز کے لباس کا رواج عام ہو چکا ہوا تھا۔

غرضکہ یہ اور اسی قبیل کے کئی احکام بہت جلد جلد اوپر تلے جاری ہو رہے تھے۔ اور طرفہ ہے۔ کہ اسی سرعتِ رفتار سے عوام الناس کی طبیعتیں بھی مکدر و متوحش ہو رہی تھیں۔ لہٰذا وکلاءِ ملت کے لئے ان امور کا مشاہدہ کرنا اور انہی کی بناء پر آئندہ کے لئے قیاسات دوڑانا کچھ مشکل نہ تھا۔ وہ بیچارے دوسرے اضطراب و تشویش کی حالت میں مبتلا تھے۔ اگر وہ بادشاہ کے ان اقدامات کے برخلاف کچھ کہنے سننے کا خیال کرتے۔ تو اس کی ناراضگی برداشت کرنیکی اپنے اندر قدرت و سکت نہ پاتے تھے۔ اور اگر وہ چپ رہتے۔ تو ان کا اپنا وجدان و ضمیر اس امر کو گوارا نہیں کرتا تھا۔ نیز چپ سادھ رکھنے میں انہیں اپنے قبائل کی لعنت و ملامت کا بھی ڈر لگ رہا تھا۔

اندریں اثنا بادشاہ کے جواسیس اور کارندے جو ہر جگہ ان کے درمیان پھر رہے تھے۔ ان کے خیالات کے آثار چڑھاؤ سے ہر آن بادشاہ کو خبردار کر رہے تھے۔ اور با ایں ہمہ کہ غازی امان اللہ خان اپنی مجوزہ اصلاحات کے بالمقابل ہر ایک قیمت ادا کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ پھر بھی وہ لوئے جرگہ میں اپنی کھلم کھلا مخالفت

سے ڈرتا تھا۔ آئینی طور پر چاہئے تو یہ تھا کہ لوئے جرگہ کے سامنے ہر چھوٹی بڑی بات پیش کر دی جاتی۔ مگر مخالفت کے ڈر سے بادشاہ کو ایسا کرنے کی جرأت نہیں پڑی چنانچہ فہرست مضامین میں بہت سی قطع و برید کی گئی۔ اور بعض نہایت اہم مسائل و امور کے سوا باقی تمام چھوٹی موٹی باتوں کو غیر ضروری کہکر بحث و تنقید سے خارج کر دیا گیا۔ لیکن وقت ہاتھ سے جا چکا تھا۔ اثرات دلوں کی گہرائیوں میں جانشین ہو چکے تھے۔ وزراء و وکلاء میں باہمی اتحاد قائم ہو چکا تھا۔ اور ان میں ایک آخری بات بھی طے پا چکی تھی۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے چپکے چپکے اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ لوئے جرگہ میں وہ سب کے سب بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیں گے۔ اور بظاہر یکسو ہو کر کسی ایک بات کی بھی مخالفت نہ کریں گے۔ لیکن لوئے جرگہ سے فارغ ہو کر جب وکلاء اپنے اپنے علاقوں میں واپس پہونچیں گے۔ تو عامۃ الناس میں غازی امان اللہ خان کے خلاف زور شور سے ایجی ٹیشن شروع کر دیں گے۔ اور پھر وزراء کی ہدایات کے منتظر ہو رہیں گے ؛

وزراء کا خیال تھا۔ کہ جب ملک میں بادشاہ کے برخلاف غم و غصہ کا اظہار ہوگا تو وہ وکلاء کو اپنے پتے پر دکھلا کر بادشاہ کے حضور سے ملک میں اس آتش فساد کو فرو کرنے کا بیڑا اٹھائیں گے۔ اور پھر اپنی کارگذاریوں سے اس پر یہ ثابت کرینگے۔ کہ اسے ہر حال میں ان کی ضرورت و احتیاج باقی ہے۔ یہ بات کسی کے بھی وہم و گمان میں نہ تھی۔ کہ ملک کا کوئی علاقہ کھلم کھلا بغاوت پر بھی اتر آئے گا۔ اور اگر بفرض محال کسی نے اس اندیشہ کو اپنی دوررس نگاہی کی بنا پر دیکھا بھی ہو۔ تو وہ اس بغاوت اور حکومت کی طاقتوں کے درمیان کوئی تناسب ہی نہ پاتا تھا۔ افغانستان کے پاس حربی طاقت ملک میں امن بحال رکھنے کے لئے نہایت کافی تھی۔ بلکہ بیشمار ذخائر حرب کی موجودگی میں یہ باطمینان تمام اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگر

افغانستان کسی بڑی سے بڑی سلطنت کے ساتھ چھ ماہ تک بلا امداد غیرے مقابلہ کرنے کی استعداد اور قوت اپنے اندر موجود رکھتا تھا۔ لہذا وزراء کا گروہ کسی حصۂ ملک میں بدامنی پیدا ہو جانے کی حالت کو کچھ بھی اہمیت نہ دیتا تھا۔ بلکہ اس کے واقع ہو جانے کی صورت میں اس کو اپنی مطلب براری کا ایک موزوں آلہ سمجھے ہوئے تھا۔ الغرض اس وقت تک بادشاہ اپنی جگہ وزرا اپنی جگہ اور وکلائے ملت اپنی جگہ کامیاب تھے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی کامیابی کا یقین ہو چکا تھا۔ وزراء نے اپنا کھیل عملی طور پر ختم کر دیا تھا۔ اور اب ان کے حصّے کا صرف اتنا ہی کام باقی تھا۔ کہ وہ لوئے جرگہ کے قیام کے دوران میں ایک طرف وکلاء کو خاموش رکھیں۔ اور دوسری طرف بادشاہ کو ان کے خاموش رہنے کا یقین دلاتے ہوئے اس کی استرضاء حاصل کرتے رہیں۔ باقی امور انہوں نے مستقبل کے واقعات و حالات پر محوّل کر رکھے تھے۔ مگر بادشاہ اور وکلاء کو ابھی لوئے جرگہ کے مرحلہ سے گزرنا باقی تھا۔ یہ منزل بھی قریب ہی تھی۔ چنانچہ جشن استقلال[1] سے کچھ دن پہلے ہی لوئے جرگہ شروع ہو گیا تھا۔ تاکہ جشن کے اختتام تک اس کے اجلاس بھی ختم کر دیئے جائیں ؎

خود بادشاہ لوئے جرگہ کا صدر تھا۔ اور جملہ تجاویز حکومت کے اراکین کی طرف سے پیش ہو کر منظور ہوتی تھیں۔ ناظم جرگہ کی اجازت سے وکلاء ملّت بھی حکومت کی خیر و بہبودی کے لئے اپنی اپنی تجاویز پیش کرنے کے مجاز تھے۔ اس جرگے میں بعض اہم اور دلچسپ تجاویز جنکو قدرت نے عملی جامہ پہنانا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر جنہوں نے عوام الناس کے خیالات کو حکومتِ وقت کے برخلاف بھڑکانے میں اور بھی مدد دی۔ قارئین کی اندیاد معلومات کیلئے ذیل میں رقم کیجاتی ہیں:۔

[1] افغانستان کا جشن استقلال " انڈی پینڈنٹ سیریمنی " آٹھ دن تک ہوتا رہتا ہے ؎

(۱) **بیرق کی تبدیلی** - حکومتِ افغانستان کا عَلَم آجتک سیاہ رنگ کا چلا آتا تھا جس پر مسجد و محراب و منبر کا نقشہ موجود ہوتا تھا۔ اس نشان کے سبب علم مذکور کو عوام الناس کے نزدیک ایک طرح کا مذہبی تقدس حاصل تھا۔ یہ کچھ اس وجہ سے بھی کہ سیاہ جھنڈے کے متعلق شاہ نعمت اللہ ولی کی جو مشہور پیشینگوئی تھی۔ وہ ابھی تک افغانستان کے جاہل طبقہ کے اعتقادات میں داخل تھی۔ جس کی رو سے کہا جاتا تھا۔ کہ ترکستان کے اطراف سے ایک قوم نمودار ہوگی۔ جو سیاہ جھنڈوں کی مالک ہوگی۔ اور اہل فرنگ پر خروج کرکے ان کے ساتھ دریائے اٹک پر جنگ کرے گی۔ اور یہ جنگ اتنی خونریز واقع ہوگی۔ کہ کشتوں کے خون کی آمیزش سے دریائے اٹک کا پانی تک سرخ ہو جائے گا۔ اور یہ بھی اسی مذکورہ پیشینگوئی کا ایک حصہ تھا۔ کہ اس قوم کے امیر یا سردار کا نام حبیب اللہ ہوگا۔ اب چونکہ افغانوں کی قوم اپنے آپ کو وہی قوم تصور کئے ہوئے تھی اس لئے اپنے اعتقاد کی رو سے وہ اب تک اس جھنڈے کو اپنی عظمت و ظفریت کا ایک مقدس نشان یقین کرتی رہی۔ اور یہ ایک دلچسپ بات تھی۔ کہ ان کے اس اعتقاد نے "بچہ سقا" کو جس کا نام سوء اتفاق سے حبیب اللہ تھا۔ نہ صرف آخر دم تک افغانوں کی متفقہ یورش سے بچائے رکھا۔ بلکہ پیشینگوئی کے مطابق اس کو فرنگیوں کا سرکوب ازلی قرار دیتے ہوئے اس کے برخلاف ہتھیار اٹھانے کو بغاوت اور عصیان خیال کیا۔ اور افغانوں کی غالب اکثریت نے تو اسی وجہ سے اس کی بیعت بھی جلد قبول کرلی۔ ان کی سادہ لوحی کا یہ عالم ملاحظہ ہو۔ کہ انہوں نے بہت ہی جلد بچہ سقاؤ کو خادم دین رسول اللہ کے خطاب سے بھی پکارنا شروع کردیا تھا۔ الغرض افغانستان کے سیاہ جھنڈے کو کچھ تو مسجد و محراب و منبر کا اس پر نقشہ ہونے کے سبب اور کچھ پیشینگوئی

کے باعث سے بہت بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بادشاہ اس کو بالکل بدل دینا چاہتا تھا۔ لوئے جرگہ نے بعد ردّ و قدح بسیار ظاہری دل سے بادشاہ کی حسب منشا اس کی منظوری دے دی تھی۔ اب اس کی بجائے تین رنگا جھنڈا بغیر کسی قسم کے نقش کے تجویز کیا گیا تھا۔ مگر وکلاء کے بے حد اصرار پر مسجد و محراب و منبر کی بجائے "اللہ" کا اسم منقوش کرنے کی ترمیم کو بادشاہ نے قبول کر لیا تھا۔ وکلاء تو جھنڈے پر "محمدؐ" کا نام بھی چاہتے تھے۔ جس کو بادشاہ نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ اس واقعہ سے بادشاہ کے مذہبی امور کے برخلاف دلی رجحان کا صاف پتہ چلتا تھا۔ اور وکلاء پر اس کی دہریت اور مسلمہ ہو گئی تھی ۔

(۲) واحد بیوی۔ بادشاہ کا مدت سے خیال تھا۔ کہ وہ اپنے ملک کی معاشرتی زندگی میں اصلاح کرے۔ اور مرد کے لئے ایک بیوی رکھنے کا رواج دے اس سے اگلے بادشاہوں کے عہد میں لوگ دو دو تین تین چار چار بیویوں کے علاوہ اپنے حسب مقدور بہت سی لونڈیاں گھر میں رکھا کرتے تھے۔ اور یہ عجیب بات تھی۔ کہ افغانستان میں اس کو مذہب اسلام کی رو سے جائز سمجھا جاتا رہا۔ مگر یہ شرف غازی امان اللہ خان کو حاصل ہے۔ کہ انہوں نے تختِ سلطنت پر متمکن ہوتے ہی عام اعلان کر دیا تھا۔ کہ من بعد افغانستان میں لونڈی رکھنے کا دستور منسوخ کیا جاتا ہے۔ ملک بھر میں اس وقت جس قدر لونڈیاں تھیں سب کو انہوں نے آزادی بخش دی تھی ۔

عموماً اہلکاروں اور اہل ثروت میں یہ مرض زیادہ پایا جاتا تھا۔ کہ جہاں ان کو ذرا سی فراغت نصیب ہوئی۔ یا کوئی اتفاق یا بہانہ موجود ہو گیا۔ جھٹ بیویوں پر بیویاں کرنے بیٹھ گئے۔ یوروپ جانے سے پہلے ہی بادشاہ نے حکومت کے ملازمین کو حکم دے رکھا تھا۔ کہ کوئی سرکاری ملازم ایک سے زیادہ بیوی نہ

کرے۔ اور جن اشخاص کی ایک سے زیادہ بیویاں پہلے سے موجود بھی ہوں۔ وہ ایک بیوی کے سوا سب کو طلاق دے دیں۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق سب سے پہلے شاہی خاندان کے شہزادوں نے عمل کیا۔ اور ان کے بعد وزراء اور بڑے بڑے اہلکاروں نے بادشاہ کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے کیلئے اپنی زائد بیویوں کو طلاقیں دیدیں۔ لیکن اب تک اس حکم کے اثرات بادشاہ اس کے خاندان اور حکومت کے بڑے عہدیداروں تک نفاذ پذیر تھے۔ رعیت کے لئے شدید ممانعت نہ تھی۔ اور نظامنامہ کی رو سے رعیتی لوگ اپنی پہلی بیوی کی رضامندی سے دوسری بیوی کرنے کے اب تک مجاز تھے تاہم مرکزی علاقوں کے سوا باقی تمام جگہوں میں زائد بیویاں نکاح میں لائی جارہی تھیں۔ اس لئے بادشاہ چاہتا تھا۔ کہ لوئے جرگہ کی منظوری سے ایک ایسا قانون بنایا جائے جس کی رو سے کوئی مرد کسی حالت میں ایک سے زائد بیوی کرنے کا مجاز نہ ہو۔ اور جو اس قانون سے روگردانی کرے۔ اس کو سخت سزا دی جائے۔ چنانچہ بادشاہ کے اس اصلاحی کیف کو بھی لوئے جرگہ میں مذہب اسلام کی کھلی توہین اور مخالفت پر محمول کیا گیا۔

(۴) **ولیعہد کی تقرری۔** غازی امان اللہ خان کا بڑا لڑکا جو فرانس میں تعلیم پارہا تھا۔ ایک کنیز کے بطن سے تھا۔ غازی امان اللہ خان صرف یہی ایک کنیز رکھتے تھے۔ جو زمانہ شہزادگی میں ان کو اپنے باپ کی طرف سے انعام میں ملی ہوئی تھی۔ آپ نے کنیزوں کی آزادی کا اعلان کرتے ہی اس اپنی کنیز کو بھی بالکل آزاد کردیا تھا۔ اور اسے اختیار دیدیا تھا۔ کہ اگر وہ چاہے۔ تو کسی سے شادی کرلے۔ مگر بوجہ صاحب اولاد ذکور ہونے کے کنیز نے اس کو اپنی شان کے شایاں نہ سمجھا۔ اور غازی امان اللہ خان کی ماں علیا حضرت کے

محل میں اپنے بیٹے کے مستقبل سے آس لگائے الگ تھلگ رہنے لگ گئی۔
علیا حضرت یعنی غازی امان اللہ خان کی ماں اس کو بہت عزیز رکھتی تھی۔
اور ایک گروہ جس کی سرکردہ وہ خود ہی تھیں۔ چاہتا تھا۔ کہ اس بڑے شہزادہ
کو ولیعہد سلطنت بنایا جائے۔ مگر دوسرا گروہ جو محمود طرزی کے خاندان سے
تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس پر مصر تھا۔ کہ شہزادہ خانم یعنی ملکہ ثریا کے بطن سے جو
بڑا لڑکا ہے۔ بادشاہ اسے ہی اپنا ولی عہد نامزد کرے۔ یہ جنگ مدّت سے
علیا حضرت اور ملکہ ثریا میں چلی آ رہی تھی۔ مگر آخر کار اس جنگ میں علیا حضرت
کو شکست اٹھانی پڑی۔ اور لوئے جرگہ میں ملت کی طرف سے بادشاہ کی خدمات
کے معاوضہ میں قبول کر لیا گیا۔ کہ صرف شہزادہ ہدایت اللہ (جو بادشاہ کا جائز لڑکا ہے)
افغانستان کا آئندہ تاجدار ہوگا۔ اور افغانستان کی بادشاہت ہمیشہ امان اللہ
خان کی نسل میں قائم رکھی جائیگی ٭

ولیعہد کے تقرر پانے کی رسم بڑی مسرّت و شادمانی سے منائی گئی۔ اور گو اس
چیز کو انقلاب افغانستان سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاہم ایسے موقع
پر جبکہ بادشاہ کی جدید الخیالی ملت کے قلوب پر یکے بعد دیگرے پیہم اور
متواتر اصلاحات کے چرکے لگا رہی تھی۔ ایک با اثر جماعت کے افراد کو
بادشاہ کا ناراض کر دینا دانائی نہیں کہلا سکتا تھا۔ خود بادشاہ کی ماں اس
کارروائی کے سخت خلاف تھی۔ اور یہ جو عام طور پر ملکہ ثریا کی جانب منسوب
کیا جاتا ہے۔ کہ وہ انقلاب افغانستان کے واقع کرنے میں ایک بڑا سبب
تھی۔ یہ درحقیقت اسی پروپیگنڈا کا اثر ماندہ ہے۔ جو دو عورتوں میں بوجہ
باہمی رقابت کے ایک دوسرے کے برخلاف کیا جا رہا تھا۔ جیسا کہ قارئین
علیا حضرت کے بیان میں بخوبی ذہن نشین کرا آئے ہونگے ٭

یہ اور دیگر اسی قسم کے کئی مسائل جو لوئے جرگہ میں حکومت کی طرف سے پیش کئے گئے۔ وکلاء کے دلوں پر حکومت کے برخلاف یہ نقش کئے بغیر نہ رہ سکے۔ کہ وہ لامذہبیت کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اور عنقریب ان کے قدیمی رسم و رواج اور روایات و اعتقادیات بالکل محو ہو جانے والے ہیں۔ ابھی لوئے جرگہ ختم نہ ہونے پایا تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان سے ایک اور زبردست غلطی سرزد ہو گئی۔ وہ یہ تھی کہ جشن استقلال کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر اس نے ایراد کی۔ وہ یکسر تدبّر و سیاست سے عاری اور کلیتہً افغانستان کے باشندوں کے طبائع کے خلاف تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ بادشاہ اپنے اور اپنی رعایا کے تعلقات کی نزاکت کو اچھی طرح وزن نہ دیتے ہوئے نہایت بے پروایانہ اصلاحات کے جوش و خروش کی سب سے اونچی فضا میں پرواز کناں ہے۔ اے کاش افغانستان اپنے پرانے اور دقیانوسی خیالات کو تہ کر کے نئے خیالات کا چولہ اچھی طرح زیب بدن کر چکا ہوتا تو بلا شک قریب یہی تقریر مُلک کے باشندوں کے اندر تغیر عظیم برپا کرنے کی توفیق اپنے اندر مستور دیکھتی۔ مگر بدقسمتی سے دنیائے خیالستان میں ابھی شجر افغانستان نارسیدہ تھا۔ اور اس لئے یک ساعت پیشتر ثمر حاصل کرنے کی غرض سے غازی امان اللہ خان جو پیوند اس میں لگانا چاہتا تھا۔ اس کا وقت ہنوز نہیں آیا تھا۔ اور قبل از وقت کی کارروائی نے ردعمل کا دور جیسا کہ لازمی تھا۔ بہت ہی جلد شروع کر دیا ۔ ہم غازی امان اللہ خان کی اس تقریر کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں :۔

"افغانستان اپنا دس سالہ دَور ختم کر چکا ہے۔ اور آج جب کہ ہم اس جشن کا افتتاح کر رہے ہیں میں اس کے دَور دوئم کے آغاز کا اعلان کرتا ہوں۔ ہم نے ختم ہونے والے دَور میں بہت کچھ حاصل کیا

ہے۔ لیکن با این ہمہ ابھی ہم اس کا عشرِ عشیر بھی تکمیل نہیں کر سکے جو میرے پیشِ نظر ہے۔ میرے عزائم میرے پہاڑوں کی مانند بلند ہیں۔ اور میرا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں۔ کہ میں ملتِ افغان کو دنیا کی عظیم الشان ملتوں کے دوش بدوش لے آؤں۔ وہ صرف اس کے قابل ہی نہیں۔ بلکہ بہت بڑی حد تک اس کی مستحق بھی ہے۔ میں نے ان گذشتہ دس سالوں میں افغانستان کے فرزندوں کو تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یوروپ بھیجا تھا۔ اب میں آئندہ سے اس ملک کی بچیوں کو بھی کثیر در کثیر تعداد میں مغربی ممالک کو حصولِ تعلیم کی غرض سے روانہ کروں گا۔ تاکہ نہ صرف ہمارے بچے ہی بلکہ ہماری لڑکیاں بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ پیراستہ ہو کر اپنے ملک و ملّت کی خدمت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ کوئی قوم بغیر تعلیم کے ترقی نہیں کر سکتی۔ پس افغانستان کی ترقی بھی ہماری ہر دو صنف کے تعلیمیافتہ ہونے پر موقوف ہے۔ اس لئے میں لڑکیوں کے والدین سے توصیہ کرتا ہوں۔ کہ وہ اس مبارک اور اہم کام میں اپنی حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ اور جس وقت حکومت ان کو اپنی لڑکیوں کے یوروپ بھیجے جانے کے لئے کہے۔ تو وہ ہرگز ہرگز پس و پیش نہ کریں۔ لڑکیوں کا پہلا گروہ عنقریب حکومت کے خرچ پر ترکیہ بھیجا جائے گا۔ اور بعد ازاں تھوڑے تھوڑے وقفوں سے مزید گروپ بھی بھیجے جائیں گے۔"

"دوسرا مسئلہ جس کی طرف میں آج آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ وہ ایک سے زائد بیویاں کرنے کا مسئلہ ہے۔ میں نے حکم دیدیا ہے۔ کہ

آئندہ اس شخص کو حکومت کی ملازمت میں نہ لیا جائے۔ جس نے ایک سے زائد بیویاں کر رکھی ہوں۔ کیونکہ وہ شخص جو دو یا زیادہ بیویاں رکھتا ہو گا۔ لامحال رشوت کے ذریعہ سے روپیہ حاصل کرنے پر مجبور ہو گا۔ تاکہ وہ ان بڑھتی ہوئی سوشل و معاشرتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔ جس کو اس نے خود اپنے سر مول لیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شریعت میں دو سے لیکر تین چار بیویاں کرنے تک کی اجازت ہے۔ پھر کیا سبب ہے۔ کہ حکومت ہمیں اس امر سے منع کرتی ہے جس کی ہمیں شریعت نے اجازت دے رکھی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن میں صرف ایک ہی بیوی کرنے کا حکم آیا ہے۔ اور دو یا اس سے زیادہ بیویوں کے رکھنے کے لئے ایک ایسی کڑی شرط لگا دی گئی ہے۔ جو کم از کم انسان کے اپنے بس کی بات نہیں۔ کہ وہ اس شرط کو نباہ سکے۔ اور وہ شرط یہ ہے۔ کہ "بشرطیکہ تم اُن میں عدل قائم رکھ سکو" لہٰذا دراصل خدا کی مرضی یہی تھی۔ کہ ایک مرد ایک وقت میں ایک ہی بیوی پر قانع رہے"

مردوں کو غور کرنا چاہیئے۔ کہ جس طرح وہ دو دو تین تین اور چار چار بیویاں رکھنے کے مشتاق ہیں۔ اسی طرح اگر عورتیں بھی دو دو تین تین اور چار چار شوہروں کے رکھنے کا خیال ظاہر کریں۔ تو کیا وہ اس حالت کو برداشت کر سکیں گے۔ پس اگر وہ اپنی عورتوں کے اس فعل کو برداشت نہیں کر سکتے۔ تو عورتیں بھی ان کے اس فعل کو ہرگز برداشت نہ کریں۔ میری حکومت میں عورتیں آج سے بالکل آزاد ہیں۔ اور میرا قانون ہر طرح سے ان کے حقوق و آزادی کی حفاظت کرنے کے لئے

تیار ہے۔ مردوں کا ظلم ثابت کر کے وہ عدالت سے اپنے ظالم شوہروں کے برخلاف طلاق حاصل کر سکتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ"

یہ تقریر جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ یا تو صریح طور پر غازی امان اللہ خان کی اپنی ملّت کی مزاج ناشناسی پر مبنی تھی۔ اور یا پھر یہ کہنا صحیح ہوگا۔ کہ وہ اپنی قوت و طاقت کے زعم میں اس کو بالکل ہی نظر انداز کر گیا تھا۔ اس تقریر کے فوراً ہی بعد ہر جگہ و ہر مقام پر بہت سی چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اور ہر ایک شخص ذہنیت کے عام معیار سے اس کی تفسیر کر رہا تھا۔ ظاہر ہے۔ کہ ایسے اشخاص کی چنداں کمی نہ تھی۔ جو خاص اغراض کے ماتحت اس تقریر کے الفاظ کو بالکل ہی دوسرے معنی پہنا رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ بادشاہ اپنے دین سے بالکل گمراہ ہو چکا ہے۔ وہ ہمارے ناموس یعنی ہماری لڑکیوں کو فرنگیوں کے ممالک میں بیدینی کفر اور الحاد کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجنا چاہتا ہے۔ وہ شریعت کے حکم در بارہ تعدد ازدواج کی نئی تفسیر و تشریح کر رہا ہے۔ اور خدا کے حکم کی صورت کو مسخ کر دینا چاہتا ہے۔ وہ اب ہماری عورتوں کو براہ راست ہمارے برخلاف کھڑا کر رہا ہے۔ اور احکام دین کے بالکل برخلاف ان کو مردوں سے طلاق حاصل کرنے کے حقوق دینا چاہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان تاویلات کے ساتھ ساتھ یہ افواہیں بھی اڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ کہ فلاں وقت بادشاہ بیگم نے اپنی کسی خواص کو جس کے ہاتھ سے اتفاقاً قرآن کریم گر گیا تھا۔ اور جو اُسے احتراماً عجلت سے اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگائے ہوئے چوم رہی تھی۔ ڈانٹ کر کہا۔ کہ

این چیست ؟ کہ تو آں را این قدر تقدیس مے کنی!

ترجمہ:۔ یہ کیا ہے۔ کہ تو جس کی اس قدر حرمت کر رہی ہے۔

خواص :- ووئی ! بلا گردانت شوم ! قرآن شریف بود - کہ از دستم افتاد ؛
ترجمہ :- اوئی ! تیری بلائیں لوں - یہ قرآن شریف تھا - جو مجھ سے گر گیا ؛
اس پر اپنی خواص کے جاہلانہ عقیدہ[۱] کو حقارت آمیز تبسّم کی نذر کرتے ہوئے ملکہ نے جھنجلا کر کہا - کہ
" آیا نمیدانی ؟ کہ ایں چند اوراق کہنہ اند و بس و بوسیدنِ اینہا تو ہیچ فائدہ نے رسد - دریں دنیا ازیں کردہ خوب خوب کتابہا نوشتہ شدہ و نوشتہ خواہند شد - ایں عقائد خود ہا را در حال بگذارید و آدم گری را یاد بگیرید "
ترجمہ :- کیا تو نہیں جانتی - کہ یہ چند پرانے اوراق ہیں اور بس - اور ان کے چومنے سے تجھے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا - اس دنیا میں اس سے کہیں بڑھ بڑھ کر کتابیں لکھی گئی ہیں - اور آئندہ بھی لکھی جائیں گی - اب ان عقائد کو تہ کر رکھو - اور آدمیت سیکھو ؛
اسی طرح غازی امان اللہ خان کی نسبت بھی کہا گیا - کہ وہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر و نبی نہیں مانتا - اور قرآن کریم کو ان کی اپنی تصنیف کہتا ہے ؛
غرضکہ ان افسانوں اور حقیقتوں نے مل جُلکر وکلائے ملّت اور عامۃ الناس پر غازی امان اللہ خان کے برخلاف اپنا پورا پورا اثر کر رکھا تھا - لہٰذا جب وکلاء ملت کی واپسی پر ایک نہایت قلیل عرصہ میں ان افواہات و حقائق کی رَو نہایت شد و مد کے ساتھ افغانستان کے طول و عرض میں دوڑ گئی - تو سارے ملک میں ایک عام اضطراب اور بے چینی پھیل گئی - لوگوں کے اشتعال کی کوئی حد نہ تھی - اور وہ بیک جنبش حکومت کے برخلاف اقدام کرنے پر تلے ہوئے تھے - اب انہیں صرف کسی بہانہ کی تلاش تھی - تاکہ اس کے ہاتھ لگتے ہی وہ حکومت کے برخلاف بزن عام بول دیں ؛

[۱] کیونکہ ملکہ کے نزدیک یہ جاہلانہ عقاید ہی تھے - جیسا کہ اس کے جواب سے ظاہر ہے - اور جیسے افواہاً سُنا اور راوی نے عیناً نقل کیا گیا ہے ؛

باب سوم

پیشِ نظر ترقیات

کا

ایک مختصر خاکہ

ہم نے گذشتہ باب میں ان تمام اسباب اور علتوں کو بیان کیا ہے۔ جو اپنے اخلاقی و سیاسی رنگ میں افغانستان میں ہونے والے انقلاب کو جلد واقع کرنے میں معاون تھیں۔ ہم نے اپنے قارئین پر یہ واضح کرنے کی کسی قدر تفصیل کے ساتھ کوشش کی ہے۔ کہ کس طرح غازی امان اللہ خان یوروپ سے واپس آ کر اپنے ملک کی حالت کو یک لخت بدل دینا چاہتا تھا۔ اور پروگرام کے اس حصّہ کو سب سے پہلے تکمیل کرنا چاہتا تھا۔ جو ملک کے اخلاقیات و اعتقادیات سے متعلق تھا۔ اب اگر یہ نظریہ صحیح ہے۔ کہ دنیا میں خیالات کی حکمرانی ہے۔ تو پھر قارئین بغیر کسی تذبذب اور ہچکچاہٹ کے اس نتیجہ پر پہنچینگے۔ کہ غازی ممدوح نے جدید خیالات کی طاقتوں کو وسیع اور منظم کرنے کے بغیر پُرانے خیالات کے کوہ وقار قلعوں پر دھاوا بول دیا تھا جس کا انجام لازمی طور پر وہی کچھ ہوا۔ جو ہونا چاہئیے تھا مگر اہی اور جہالت تلوار کی مدد سے قطعیاً گم نہیں ہوسکتی۔ جب تک

علم کی روشنی میں اس کو استعمال نہ کیا جائے ؛

افغانستان میں تعلیم ابھی عام نہ ہوئی تھی - اس کا گوشہ گوشہ انوار تعلیم سے محروم تھا - اور خود پایہ تخت میں اس سلسلہ میں جتنا کچھ ہو رہا تھا - وہ اگرچہ در خور اعتنا تو تھا - تاہم ابھی اس کے اثرات کہیں مستقبل بعید میں جا کر ظاہر ہونے والے تھے - اس میں ذرا بھی شک نہیں - کہ اگر اسی تحریک اصلاحات کو چند سال بعد ملک میں عملاً متعارف کیا جاتا - تو غازی امان اللہ خان سہولت کے ساتھ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا - کیونکہ ملک کے اندر تعلیم کا جو وسیع جال پھیلایا جا رہا تھا - اس کا یہ اثر لازمی تھا - کہ عامۃ الناس کی دماغی قوتیں تخیلات کی دنیا سے نکل کر غور و فکر کرنے کے عالم میں منتقل ہونی شروع ہو جاتیں - اور جہالت پر اڑے رہنے کی ہٹ لوگوں میں کمزور ہونی شروع ہو جاتی - دوسری طرف طلباء کی وہ جماعت جو بہت بڑی تعداد میں یورپ کے ممالک میں مختلف علوم وفنون کی تکمیل کی غرض سے گئی ہوئی تھی - ملک میں واپس آ کر تہذیب جدید اور حریت و مساوات کے انوکھے جذبات سے عوام کی فرسودہ ذہنیت پر پے در پے حملے کرتی - اور جہالت اور گمراہی کا طلسم آناً فاناً توڑ کر رکھ دیتی ؛

افغانستان میں خارجی اثرات بھی اپنا عمل و دخل زور شور سے کر رہے تھے - اور جنہوں نے سنہ ۱۹۲۰ء اور پھر سنہ ۲۸-۱۹۲۷ء میں افغانستان کو دیکھا ہے - وہ نہایت صاف صاف اس نمایاں ترقی کو دیکھ سکتے تھے - جو تقریباً ہر شعبہ زندگی میں رونما ہو رہی تھی - پایہ تخت میں لوگوں کی کایا ہی پلٹ چکی تھی - ممالک اجنبیہ کے افراد سے میل جول کرنے کے سبب سے ان کی عادات و خیال اور طرز بود و باش میں نمایاں فرق پڑ چکا تھا - اپنے اپنے حلقوں میں فرانسیسی، جرمنی، ترکی، روسی اور ایرانی تہذیبیں اپنا اپنا اثر کر رہی تھیں - اور اس امر کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی -

کہ چند ہی سالوں میں کیوں یہی تہذیبیں مرکز سے چھوٹ کر ملک کے دوسرے اقطاع میں اپنا رنگ نہ جماتیں۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی ملک کی عام حالت میں خودبخود ایک انقلاب وارد ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لوگوں کا طرز زندگی بلند ہو رہا تھا۔ اور حکومت اور ملت کی روز افزوں ضروریات نے پیشتر کی نسبت سے درآمد ملک میں بے حد اضافہ کر دیا تھا۔ سرمایہ دار طبقہ کنج عزلت سے نکل کر منصۂ شہود پر آ رہا تھا۔ اور تاجروں کا درمیانی گروہ اپنی گری ہوئی حالت سے اوپر اٹھ رہا تھا۔ حکومت کی سودیشی تحریک نے طبقۂ اہل حرفہ میں ایک جان ڈال دی ہوئی تھی۔ اور گاؤں گاؤں اور گھر گھر دستکاری کو فروغ ہو رہا تھا۔ حمل و نقل کی سہولتیں دن بدن زیادہ ہو رہی تھیں۔ پہلے کبھی پشاور اور کابل کے درمیان کوئی سواری کی موٹر مشکل سے چلتی نظر آتی تھی۔ اب یہ حال تھا۔ کہ گھوڑا گاڑی کو کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ کابل میں باقاعدہ موٹروں کی ایک کمپنی بن چکی تھی۔ جس کی ایک شاخ پشاور میں بھی تھی۔ یہ کمپنی نہ صرف سواریوں کے لئے موٹریں بہم پہنچاتی تھی۔ بلکہ کابل اور پشاور کے درمیان تجارتی مال کی حمل و نقل کا انتظام بھی موٹر لاریوں کے ذریعہ سے کرنے میں مصروف تھی۔ صرف اسی سڑک پر نہیں بلکہ کابل جبل السراج۔ کابل غزنی و قندھار۔ کابل گردیز وغیرہ سڑکوں پر بھی موٹروں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ اور ہندوستان کے راستہ سے باہر جانے والا مال زیادہ تر موٹروں پر ہی کابل میں لا کر جمع کیا جاتا تھا۔ قندھار کا میوہ جو اس سے پہلے قندھار سے چمن اور چمن سے کوئٹہ و پشاور ہوتا ہوا جلال آباد کے راستہ سے کابل میں لایا جاتا تھا۔ اب براہ راست قندھار سے کابل لایا جانے لگ گیا تھا۔ قندھار اور چمن کے درمیان بھی وہاں کی مقامی موٹر کمپنیوں کے ذریعہ مال کی حمل و نقل دن بدن ترقی کر رہی تھی۔ حکومت کی طرف

سے ان موٹر کمپنیوں کو خاص اختیارات وحقوق ملے ہوئے تھے۔ اور سڑکوں کو باقاعدہ اور درست حالت میں رکھنے اور پلوں کی مرمت وغیرہ کا ذمہ بھی کمپنیوں کے سر تھا۔ غرضکہ ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کی وجہ سے درآمد وبرآمد ملک میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اگرچہ کابلی روپیہ کی قیمت پیشتر کی نسبت بتدریج گر رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ملک کی وہ بنیادی امتع جو کثیر تعداد میں برآمد ہوتی تھیں۔ مثلاً قالین قرہ قولی پوست روباہ وغیرہ ان کی قیمتوں میں دو سو سے لے کر تین ساڑھے تین سو فیصدی اضافہ ہو چکا ہوا تھا۔ اس لئے روپیہ کی قیمت میں گراوٹ چنداں محسوس نہ ہوتی تھی۔ حکومت نے ذرائع حمل ونقل کو مزید ترقی دینے اور اقطاع دور ودراز کو باہم مربوط کرنے کے لئے سڑکوں کے جال کو وسیع پیمانہ پر بچھا دینے کی تجویز سوچ رکھی تھی۔ اور ملک کے اکثر حصوں میں اس پر عملدرآمد بھی ہو رہا تھا۔ مثلاً کابل اور جلال آباد کے درمیان ایک نہایت وسیع اور کشادہ سڑک تعمیر ہو رہی تھی۔ جس کو آخر میں تورخم تک وسعت دی جانے والی تھی۔ یہ سڑک ایک اور لحاظ سے بھی بہت اہم تھی۔ اور وہ یہ کہ بجائے اسکو پہاڑوں کے درمیان سے پیچ در پیچ صورت میں گذارنے کے سُرنگوں کے اندر سے لیجایا جانا تھا۔ جس سے جلال آباد اور کابل کا درمیانی فاصلہ نصف کے قریب رہ جاتا۔ اسی طرح کابل اور گردیز کی سڑک کو خوست اور پاڑہ چنار تک وسیع کیا جانے والا تھا۔ اور اس پر بھی برابر کام ہو رہا تھا۔ ادھر قندھار اور ہرات کے درمیان ایک مستقل سڑک کی تعمیر جاری تھی۔ اور مزار شریف اور کابل کو سڑک کے ذریعہ سے ملانے کیلئے بھی کام جاری ہو چکا تھا۔ ایک اور سڑک مزار شریف کو ہرات سے ملانے کے لئے زیر تجویز تھی۔ جب افغانستان میں ان سڑکوں کا ایک وسیع جال پھیل جاتا اور اونٹوں اور خچروں وغیرہ

پر مال لاد کرلے جانے کی بجائے موٹروں اور ریل کے ذریعہ سے افغانستان کے طول و عرض میں تجارتی اموال و اجناس کو پہنچایا جانا شروع ہو جاتا۔ تو لازمی طور پر ملک کی اقتصادی زندگی پر اس کا انقلابی اثر نمودار ہوتا۔ روپیہ کا دور تیزی سے چلنا شروع ہو جاتا۔ اور ساتھ ہی کرایہ اور وقت کی تخفیف کے سبب ملکی اور غیر ملکی اشیاء کی قیمت گھٹ جاتی۔ اور روپیہ کی قوتِ خرید میں اضافہ ہو جاتا۔ فاصلہ کے کم ہو جانے اور مانگ کے بڑھ جانے سے صنعتی و حرفتی طبقات میں بیکاری گھٹتی جاتی۔ اور کام کی بہتات ان اشخاص کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی۔ جو آج سے قبل محنت مزدوری نہ ملنے کے سبب ملک میں بدامنی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ حکومت کا زراعتی پروگرام بھی پہلے سے موجود تھا۔ افغانستان کو سب سے زیادہ چائے اور شکر کی ضرورت تھی۔ جو بہت بڑی مقدار میں باہر سے منگوائی جاتی تھیں۔ یہ دونو اشیاء ترکستان اور بخارا کو کابل ہی سے جاتی ہیں۔ گویا یہ اشیاء نہ صرف افغانستان کی اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے درآمد کی جاتی تھیں۔ بلکہ اس کے ہمجوار شمالی ممالک کی طرف برآمد کرنے کیلئے بھی اُن کو کثیر مقدار میں منگوانے کی ضرورت موجود تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ اگر افغانستان کے اندر خود یہ چیزیں پیدا کی جا سکتیں تو ملک کی عام ثروت پر ایک پائدار اور خوشگوار اثر پڑتا۔ غازی امان اللہ خان کی حکومت نے ان دونوں اشیاء کی طرف اپنی غایت توجہ مبذول کر رکھی تھی۔ چائے بونے کے تجربات جلال آباد کی نواحی میں جاری تھے۔ اور اگرچہ ان میں اب تک کامیابی نہ ہوئی تھی۔ تاہم متخصصین ابھی نا امید نہیں ہوئے تھے۔ اور غالب احتمال تھا۔ کہ ان کی کوششیں کسی نہ کسی حد تک ضرور ثمر لا کر رہتیں۔ اسی طرح شکر یعنی چینی بنانے کے لئے جلال آباد کے اطراف میں نیشکر کو

زیادہ رقبہ میں کاشت کرنے کی ترغیب دی جا رہی تھی۔ اور حکومت مستقبل قریب میں ایک شکر سازی کا کارخانہ وہاں قائم کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ علاوہ برآں افغانی حکومت کا خیال تھا۔ کہ وہ تبلبو (ایک قسم کا شیریں پھل ہوتا ہے) اسے بھی شکر تیار کرے۔ یہ پھل کابل اور اس کے نواحی میں دُور دُور تک بکثرت و بافراط ملتا تھا۔ اسی پھل سے یوروپ میں بھی شکر بنائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ کام جرمن ماہرین فن کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ تاکہ وہ اس پھل کی مٹھاس کی مقدار کا اندازہ لگا کر بتائیں۔ کہ کہاں تک اس سے مختلف اقسام کی شکر بنائی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ترکستان قندہار اور شمالی کوہستان کے علاقہ میں روئی بکثرت پیدا ہوتی تھی۔ اور آج تک افغانستان اپنی موسمی احتیاجات کو اپنی ملکی پیداوار ہی سے پورا کر رہا تھا۔ اب خیال کیا جا رہا تھا۔ کہ ترکستان کی وسیع زمینوں میں روئی کی کاشت بہت بڑھا دی جائے۔ اور دھاگہ بنانے کے کارخانے خود ملک کے اندر قائم کئے جائیں۔ تاکہ لٹھہ ململ اور رنگین بزازی وغیرہ کی بابت ملک ہی میں کیجا سکے۔ اب تک افغانستان میں جو سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ اس کے لئے دھاگہ تمام تر بدیشی استعمال ہوتا تھا۔ اور صنعت پارچہ بافی بھی ابھی اپنے عہد طفولیت میں تھی۔ اور لوگ انفرادی حیثیت میں اس صنعت کو فروغ دے رہے تھے۔ اُون کے عمدہ اور کثیر مقدار میں پیدا کئے جانے کی طرف بھی دن بدن توجہ مبذول کی جا رہی تھی۔ بھیڑوں کے چرانے کے لئے بڑی بڑی وسیع چراگاہیں قائم ہو رہی تھیں۔ اور ترکستان کی حکومت کو خاص ہدایات ملی ہوئی تھیں۔ کہ وہ بھیڑوں کے بڑے بڑے سوداگروں کی توجہ کو ان کی اقسام کی دیکھ بھال اور ان کی عملی طریق پر نگہداشت

کرنے کی طرف منعطف کرتی رہے۔ ترکستان، ہرات و قندھار و ہزارہ جات میں پشم کی پیداوار زیادہ تھی۔ جس کا کثیر حصہ ہر سال براہ قندھار کراچی میں برآمد کیا جا رہا تھا۔ لیکن پشم کی صفائی و دھلائی کا کام بوجہ مشینیں نہ ہونے کے اعلےٰ طریق پر نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہر سال افغانستان کے سوداگروں کو کم دام ملنے کے سبب کافی نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس کی تلافی کرنے کے لئے اگر ایک طرف مشینیں منگوائی جا رہی تھیں۔ تو دوسری طرف اس پشم سے ملک کے اندر ہی کپڑا بنانے کی ضرورت پر بے حد زور دیا جا رہا تھا۔ پشمی کپڑے، کمبلوں اور گلموں وغیرہ کی مانگ افغانستان جیسے سرد ملک میں جسقدر ہو سکتی ہے مخفی نہیں۔ ہر سال بیشمار گرم کپڑا درآمد ہوتا تھا۔ اگرچہ کابل میں پشم سے کپڑا بنانے کا ایک سرکاری کارخانہ موجود تھا۔ مگر وہ ابتک فوجیوں کی سالانہ ضروریات کے لئے اور کچھ تھوڑا سا سرکاری خدام کے لئے کپڑا مہیا کرنے سے زیادہ پیدا نہ کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس کارخانے کو بہت زیادہ وسیع کیا جانا زیر تجویز تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ حکومت کا خیال تھا۔ کہ پشم سے کپڑا تیار کرنے والے لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کی شرکتیں قائم کی جائیں۔ اور ان کو گورنمنٹ کی طرف سے تقاوی کے طور پر روپیہ قرض دیا جائے جس کے ذریعہ وہ مشینیں منگوا کر علیحدہ کارخانے چلا سکیں۔ ہزارہ جات میں اُون سے گلمیں بنانے کی صنعت اپنی کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ وہاں کے لوگوں سے جتنی دستی مشقت ہو سکتی تھی۔ وہ ملک کی مانگ کو پورا کرنے کے لئے صرف کرتے تھے۔ حتےٰ کہ ان کی عورتیں بھی شب و روز اسی کام میں مشغول رہتی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ ملک کی مانگ کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ غریب سے غریب افغان شہریوں کے گھروں میں بھی ہزارہ کی بنی ہوئی گلموں کے فرش ہوتے

تھے۔ اور بھی بہت سی مفید مطلب اور نافع پیداوارِ زرعی مثل تریاق و انگور وغیرہ کی طرف خاص توجہ مبذول ہو رہی تھی۔ کوشش کی جا رہی تھی۔ کہ خشک میووں کی برآمد کے لئے یوروپ کی طرز پر ایسے کارخانے بنائے جائیں۔ جو ان کو صاف کرکے اور مختلف اوزان کے خوبصورت ڈبوں میں بند کرکے باہر بھیجیں۔ مگر تجربہ کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ جب تک جدید ذرائع حمل و نقل میسر نہ ہونگے۔ یہ تجارت فائدہ مند نہیں ہو سکتی۔ ریل کی ضرورت کو اسی قسم کی زیادہ جگہ گھیرنے والی اور بھاری تجارتی اشیاء کی حمل و نقل کے لئے نہایت ہی اشد ضروری خیال کیا جا رہا تھا۔ تازہ پھل جو ملک میں اس قدر کثرت سے ہوتے تھے کہ موسم پر ان کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔ حمل و نقل کے جدید ذرائع نہ ہونے کے سبب لاکھوں روپیہ کا سالانہ نقصان افغانستان کو پہنچا رہے تھے۔ ورنہ لاکھوں منوں پھل روزانہ ہندوستان بھیجا جا سکتا تھا۔

اب تک وسیع قطعات اراضی بالکل بنجر اور غیر آباد پڑے تھے۔ اور صرف پانی کی کمی کی وجہ سے افغانستان کی ثروت میں اضافہ نہ کر سکتے تھے۔ غازی امان اللہ خان نے اپنے شروع سلطنت میں کابل سے چند میل مشرق کی طرف ایک بند تعمیر کیا تھا۔ جو بعد میں بند غازی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس جگہ سیلوں اطراف سے پہاڑوں کا پانی سمٹ سمٹا کر ایک جھیل کی شکل میں اتنی زیادہ مقدار میں اکٹھا ہو جاتا تھا۔ کہ ہزاروں ایکڑ اراضی کی کاشت کے لئے کافی تھا۔ ان اطراف میں زمینیں جو سالہا سال سے خشک اور ویران پڑی ہوئی تھیں۔ برائے نام قیمتوں پر لوگوں کے حوالے کر دی گئی تھیں۔ اور تین تین سال تک کا مالیہ بھی ساتھ ہی معاف کر دیا گیا تھا۔ تاکہ جلد آبادکاری کی ترغیب موثر ثابت ہو سکے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک وسیع رقبہ زیر کاشت آ چکا تھا۔ جلال آباد کے صوبہ میں بعض ایسے بڑے بڑے

قطعات اراضی پانی کی کمیابی کی وجہ سے اب تک خشک پڑے ہوئے تھے۔ جن کا مجموعی رقبہ لاکھوں ایکڑ تک پہنچتا تھا۔ اس کے لیئے ایک عظیم الشان نہر کی کھدائی کا کام چند سالوں سے برابر جاری تھا۔ اور باوجود دو دفعہ اس نہر کی کھدائی کے کام میں جس کا نام نہر کریم والا تھا۔ نقص واقع ہوجانے کی وجہ سے حکومت کو لاکھوں روپیہ کا خسارہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ پھر بھی حکومت اس کام کی اہمیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس کی تکمیل پر مصر تھی۔ غزنی کے اطراف میں قدیم الایام سے ایک بند چلا آتا تھا۔ جو "بند سلطان" کے نام سے مشہور تھا۔ جب غزنی عروج پر تھی۔ تو سلطان محمود غزنوی نے زرِ کثیر صرف کرکے اس بند کو وسیع اقطاع اراضی کی زراعتی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے تعمیر کیا تھا۔ مرورِ ایام سے یہ بند بیکار ہوچکا ہوا تھا۔ غازی امان اللہ خان نے اس کو ازسرِنو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اور سالانہ بجٹ میں سے ایک کافی رقم اس پر صرف کی جانی منظور فرمائی۔ تاکہ غزنی کے جن بلند علاقوں میں پانی کی قلّت کی وجہ سے آباد کار زمینیں بے پایاں دشت بن چکی ہیں۔ پھر حیاتِ تازہ سے دوچار ہوں۔ کابل کے شمالی کوہستان میں کاریزی[1] اور دریا کا پانی بافراط تھا۔ لیکن پھر بھی نصف سے زیادہ رقبہ پانی کی قلت کا شاکی تھا۔ اس علاقہ میں زیادہ تر انگور پیدا ہوتا ہے۔ اور زمین کے نشیب و فراز کی وجہ سے بہت سا رقبۂ زمین جو عام سطح سے بلند واقع ہوا ہے پانی نہ ملنے کے سبب انگور پیدا نہیں کرسکتا تھا۔ علاوہ اس کے اور بھی کئی جہت سے پانی کو کثیر مقدار میں ضروری علاقوں میں منتشر کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی

---

[1] کاریزی پانی۔ افغانستان میں زیرِ زمین نہروں کا بہت رواج ہے اور یہ نہریں بڑی بڑی طویل ہیں۔ اور بڑی مشقت اور عرق ریزی سے سرنگوں کی شکل میں کھودی جاتی ہیں۔ یہ کاریزیں افغانستان کے تقریباً ہر علاقہ میں موجود ہیں۔ اور بہت سی بیکار بھی ہوچکی ہیں لیکن ان سے ایک قلیل گروہ کا مقصد حاصل ہوتا تھا۔

ایک تو یہ کہ اس علاقہ میں اگر پانی عام اور ہر ایک بلند جگہ پر چڑھ سکے۔ تو زرعی پیداوار خشک اور تر بہت کثیر مقدار میں حاصل کی جا سکتی تھی۔ دوسرے ایندھن کی لکڑی جو ہزاروں ٹنوں کی مقدار میں یہاں سے ہر سال کابل کو جاتی تھی۔ نہ ختم ہونے والے جنگلوں کی شکل میں اُگائی جا سکتی تھی۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حکومت نے دریائے چارپکار اور دریائے استالف وغیرہ سے نہریں کاٹ کر منتشر کرنے کی تجویز کے علاوہ مختلف ضروری جگہوں پر پانی کو بندوں کی شکل میں فراہم کرنے کا خاکہ کھینچ رکھا تھا۔ اور اس عظیم الشان کام کی ابتدا ہونے ہی والی تھی۔ اسی طرح جنوب کی طرف دریائے لوگر کے ذرائع آبپاشی کو وسیع کرنے کی تجویز تھی وہاں ایک بڑا منصوبہ بھی زیرِ دقت تھا۔ وہ یہ کہ علاقہ جاجی کے اس پار جہاں انگریزی علاقہ میں توری آباد ہیں۔ دریا پہاڑی نشیب و فراز اور بہت سے پیچ در پیچ موڑوں کے سبب افغانی علاقہ کی بہت سی زمینوں کو سیراب کرنے کے بغیر ہی ملک کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے۔ اور اس طرف کے ان قبائل کو جو دُور دُور تک اس کے چاروں طرف آباد ہیں۔ زراعتی پیداوار سے محروم کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ قبائل جن میں منگل جدران جاجی سبھی کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہے۔ اپنی گذر اوقات کا اور کوئی ذریعہ نہ پا کر ڈاکہ زنی کو اپنا شعار بنائے رکھتے ہیں۔ اب خیال یہ تھا۔ کہ کسی طرح افغانی حدود میں ایک ایسا بند لگایا جائے جس سے اس دریا کی سمت اس طرز پر تبدیل کر دی جائے۔ کہ بجائے انگریزی علاقہ کی طرف بہنے کے یہ پہلے گھوم کر اپنی زمینوں کو سیراب کرنے لگ جائے۔ ظاہر ہے۔ کہ اس عظیم الشان تجویز کو اگر عملی جامہ پہننا نصیب ہو جاتا۔ تو نہ صرف اقتصادی فوائد ہی حاصل ہونے لگتے۔ بلکہ معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی فوائد سے افغانستان کا یہ حصہ مالا مال ہونے لگ جاتا۔

اسی طرح کی دیگر ترقیات کے لاتحات عمل تقریباً ہر حصہ ملک کے لئے حکومت کے

پیش نظر تھے۔ یوروپ سے امان اللہ خان کی واپسی پر اس میں بہت کچھ اضافہ ہونے والا تھا چند فرانسیسی کمپنیوں کے نمائندے کابل میں پہنچ چکے تھے۔ تاکہ کابل سے قندہار اور کابل سے ڈکہ تک ریل کی پیمائش کریں۔ ایک سٹیٹ بنک کے اعلیٰ پیمانہ پر کھولے جانے کی سکیم مرتب ہو رہی تھی۔ تاکہ ملک کو بوجہ "تبادلہ" کے منظم نہ ہونے کے جو نقصان روپیہ کی قیمت گرتے جانے کی صورت میں پہونچ رہا ہے۔ اس کا واجبی انسداد کیا جا سکے۔ مزید برآں مختلف قسم کے صنعتی و حرفتی کارخانوں کے قیام کے لیے جو مشینیں امان اللہ خان یوروپ میں خرید چکا تھا۔ وہ عنقریب پہونچنے والی تھیں۔ اور ان کے پہونچنے پر افغانستان میں چند ایک کارخانے اعلےٰ پیمانہ پر جاری ہونے والے تھے۔ غرضکہ یہ سب چیزیں جن کو میں نے نہایت اختصار کے ساتھ اوپر جمع کیا ہے۔ قارئین کی توجّہ اچھی طرح اپنی طرف جذب کرنے کو کافی ہیں۔ اور وہ بیک نگاہ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اگر افغانستان میں اغتشاش داخلی رونما نہ ہوتا۔ اور چند سال حالت پُرسکون رہتی۔ تو افغانستان واقعی ایک قلیل مدّت میں وسط ایشیا کی ایک زبردست طاقت شمار ہوتا۔ لیکن جس منزل پر پہونچکر وہ گرا ہے۔ وہ منزل کئی مناسبات کے لحاظ سے اب وہ منزل نہیں ہے۔ جہاں سے اس نے انقلاب کے بعد اپنی ترقی کا سفر پھر شروع کیا ہے۔ بلکہ اب کئی منزلیں اس کو اور طے کرنی پڑیں گی۔ اور پھر کہیں وہ اس پہلی منزل پر جا کر پہونچے گا۔ جہاں پر وہ داخلی شورشوں کی نذر ہو گیا تھا۔ آپ آگے چل کر اگلے بابوں میں اس تاریک منزل کا خاکہ کھنچا ہوا بھی پائیں گے۔ جس سے وہ تنہا غازی ہی کے پائے ہمّت اور تندہی و ثابت قدمی کی بدولت نکلا تھا۔ لہذا ایسے نقصان کے اندازہ کرنے کی حدود معین ہی نہیں ہو سکتیں۔ اور یہ افغانستان کی صریح بدقسمتی ہے۔ کہ وہ ایسے نقصان سے دوچار ہوا۔ غازی امان اللہ خان نے صمیم دل سے چاہا تھا۔ کہ وہ افغانستان کو ایک زبردست مُلک

بنادیں۔ اور اس کے لئے انہوں نے بے انتہا کوششیں بھی کی تھیں۔ لیکن انہوں نے اپنی تمام جانفشانیوں اور عرقریزیوں کو خود ہی اکارت بھی کر دیا۔ اگر وہ مختلف علوم حیات میں ماہر ہوتے۔ تو جو کچھ وہ اپنے ملک کی زراعتی۔ صنعتی۔ تجارتی اور مالی ترقی کے لئے اب تک انجام دے چکے تھے۔ وہ سکون اور عمل کے ساتھ ان کے اثرات عوام کی طبیعتوں پر ہونے دیتے۔ اور خود ان کی سوشل اور مذہبی زندگی میں بالکل مداخلت نہ کرتے۔ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں مسرت کے ساتھ اس حقیقت کو دیکھنے لگ جاتے۔ کہ جو کچھ ان کی دلی خواہشات تھیں۔ اسی کے مطابق لوگ اپنی حالتوں کو سنبھال رہے ہیں۔

افغانستان کے لوگ بیحد مفلس تھے۔ ان کی مفلسی اور تہیدستی نے ان پر بہت بُرے اور زبون اثرات ڈال رکھے تھے۔ جن کا مختصر سا نقشہ آنکھوں کے سامنے لانے کے لئے ہمیں ایک دو قرن پہلے کی حالت پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی۔ تاکہ قارئین اپنے ذہن میں اس وقت کی حالت کا تصوّر باندھ سکیں۔ جبکہ افغانستان کی عنانِ حکومت امان اللہ خان کے ہاتھ آئی تھی ۔

قدیم الایام سے افغانستان کا مُلک مفلسی کی لعنت میں گرفتار چلا آرہا تھا۔ اور باوجودیکہ ہر سال وہاں کا محنت کش طبقہ ہزاروں کی تعداد میں انتہائی فاقہ کشی سے بچنے کے لئے دوسرے ممالک میں کوچ کر جایا کرتا تھا۔ پھر بھی ہر چہار طرف بیکاری ہی بیکاری نظر آتی تھی۔ جہالت کے غلبہ نے ملّت کے اخلاق کو بے حد کمزور اور ضعیف کر رکھا تھا۔ اور یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ کہ جتنا کسی ملّت میں علم کا چرچا زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی اس ملک کا بیکار عنصر ایک منظم اور آئینی طریق پر ملکی حکومت سے

"کام" مہیا کئے جانے کا مطالبہ کرے گا۔ اور اس کے بالمقابل ایک آئینی حکومت بھی اس ملک کے بیکار طبقہ کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ایسے وسائل و ذرائع مہیا کرنے کی طرف ہمہ تن مصروف رہے گی۔ جن کی بدولت ملک کی بیکاری میں معتد بہ کمی واقع ہو سکے۔ لیکن جہاں حالت اس کے بالکل ہی برعکس ہو۔ یعنی نہ تو ملک میں علم کے انتشار کے ذرائع ہی موجود ہوں۔ اور نہ حکومت ہی آئینی ہو۔ وہاں قدرتاً ملک کا جاہل اور بیکار طبقہ اپنی گذران کے لئے مضرِ اخلاق اور پُر از معصیت وسائل سوچنے کی طرف طبعاً مائل و راغب ہو گا۔ اب چونکہ عہدِ امانیہ سے پہلے افغانستان کی حکومت نام کو بھی آئینی نہ تھی۔ اور نہ ہی جہل کو علم سے بدلنے کے وسائل ہی موجود تھے۔ بلکہ ہر چہار طرف جبر و استبداد اور جہالت و بربریت کی حکمرانی تھی۔ اس لئے ان مخصوص حالات کے ماتحت ایسے واقعات کا تواتر و تسلسل کے ساتھ معرضِ وقوع میں آتے رہنا جن کے سبب سے ہمیشہ کے لئے ملک کا امن مخدوش رہے۔ ایک قدرتی امر بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہم افغانستان کی تاریخ میں داخلی شورشوں، قبائل کی باہمی جنگوں اور قتل و فساد کی خوفناک داستانوں اور ڈاکوؤں کے ہوشربا افسانوں کو پیہم اور کثرت سے دیکھتے چلے آتے ہیں۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ سیاسی نقطۂ نظر سے امیر عبدالرحمٰن خان نے ملک میں اس عنصر کا قریب قریب خاتمہ کر دیا ہوا تھا۔ جو ملک کی عام رعیت کو حکومت کے برخلاف ورغلانے کی استعداد اپنے اندر رکھتا تھا۔ تاہم خود جمہور ابھی اپنے دیرینہ دل و دماغ کے ساتھ علےٰ حالہٖ قائم و برقرار تھا۔ اور گو امیر عبدالرحمٰن خان کا عہدِ حکومت افغانستان کے لئے ایک نہایت ہی جابرانہ اور آہنی عہد تھا۔ جس میں لاکھوں افراد بیک گردشِ چشم بیدریغ موت کے گھاٹ اتار دئے گئے تھے۔ لیکن اس پر بھی وہ ذہنیت جو ملک کی اقتصادی قلاشی مذہبی عصبیت عام سوء اعتقادی اور فرسودہ روایاتِ قدیمہ کے ماحول میں نشوونما پائی ہوئی تھی کسی

طرح سے بھی اس جبر و استبداد کی شدت سے کم نہ ہو سکتی تھی۔ یہاں تک کہ "پاداشِ خواب"[۵] جیسی تعزیری کارروائیاں بھی اس کو بدل نہ سکی تھیں۔ ہاں اس میں ذرا بھی کلام نہیں۔ کہ اس قسم کے جبر و تشدد کی بدولت کچھ عرصہ تک کے لئے ذہنیت متشکلہ کے طبعی رجحان کو عام تعطل میں رکھا جا سکتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ امیر عبدالرحمن خان اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو گیا ہو۔ لیکن خود اس کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی سرگذشت میں ہم ان وقائع کی کمی نہیں پاتے۔ جو اس ذہنیت کا جس کا ہم یہاں تشریح کے ساتھ ذکر کرنے والے ہیں۔ خاکہ پیش کرتے ہوئے رقم کئے گئے ہیں۔

[۵] "پاداشِ خواب" کا واقعہ امیر عبدالرحمن کے عہد کا ایک مشہور ترین واقعہ ہے۔ روایت ہے۔ کہ امیر مذکور نے تین سگے بھائیوں کو محض اس جرم کی پاداش میں دار پر لٹکا دیا تھا۔ کہ ان میں سے ایک بدبخت نے عالم خواب میں اپنے آپ کو بادشاہ بنا ہوا دیکھا تھا۔ اس شامت کے مارے نے صبح اٹھ کر اپنے دوسرے بھائی سے اس خواب کا ذکر کیا تھا جس نے اپنے بھائی کے خواب سے مطلع ہو کر اسے تاکید کر دی تھی کہ وہ کسی دوسرے کے سامنے اپنے خواب کے ذکر کرنے میں بغایت محتاط رہے۔ تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ امیر مستبد کے ہاتھوں ہلاکت کو پہونچے۔ مگر شومئی قسمت! کہ یہ خبر کسی نہ کسی طرح امیر عبدالرحمن تک جا پہونچی۔ اس کے سنتے ہی اس نے فی الفور دونوں بھائیوں کو گرفتار کروا منگوایا۔ اور ان کے تیسرے بھائی کو جو کابل سے کالے کوسوں دُور تھا۔ نیز اپنے دربار میں پابجولاں طلب کروا لیا۔ جب تینوں اسکے سامنے پیش ہوئے تو اس ایک کی زبانی جس نے درحقیقت خواب دیکھا ہوا تھا۔ ساری کیفیت دوہرا کر جلاد کو حکم دیدیا۔ کہ تینوں بھائیوں کے سر قلم کر دے۔ اس پر جس بھائی نے خواب سنا تھا۔ اس نے کہا کہ خدا کیلئے مجھے تو نہ مارو میرا تو گناہ ہی صرف اتنا ہے۔ کہ میرے کانوں نے اپنے بھائی کی زبانی اس خواب کی کیفیت سنی ہے۔ اور تیسرے نے جسکو اس تمام واقعہ کی خبر تک نہ تھی امیر کے تاج و تخت کی دوہائی دیتے ہوئے عرض کیا۔ کہ میں کمبخت تو کابل تک میں موجود نہ تھا میرا قتل

امیر حبیب اللہ خان کے عہد حکومت میں ملک کا سیاسی نقشہ کسی قدر بدل چکا تھا۔ اب وہ ذی استعداد قبائل کے سرکردہ وخوانین قریب قریب کہیں موجود نہ تھے۔ جو حکومت کے برخلاف آئے دن خروج و بغاوتیں کرسکتے۔ ساتھ ہی امیر عبدالرحمن خان نے جن ہولناک اور سخت بے رحمانہ سزاؤں کے ذریعہ سے ملک کے طول وعرض میں دہشت زدگی طاری کردی ہوئی تھی۔ اس کی کوفت کچھ ایسی نہ تھی۔ جو باقیماندہ خاندانوں میں اب تک محسوس نہ کی جاتی۔ لہذا امیر حبیب اللہ خان کو خوانین اور سرکردگانِ قبائل کے برخلاف مہمات روانہ کرنے یا عبدالرحمن خانی سخت پالیسی برتنے کی ضرورت ہی لاحق نہ تھی۔ اور جیسا کہ میں پہلے کسی جگہ کہہ آیا ہوں۔ اس کا ابتدائے عہد حریت پرور معلوم ہوتا تھا۔ حبیبیہ کالج کا افتتاح مجلس شورے کا قیام اور "سراج الاخبار" کا اجراء ووقوع وغیرہ یہ امورات صاف صاف طور پر اس کے عہد کے رفق و ملائمت کو ظاہر کر رہے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ امیر کے حسن نیت سے جرأت پاکر پایہ تخت میں مصلحین کا پہلا گروہ ازخود جنم پاچکا تھا۔ تاہم اس گروہ کے زور پکڑ جانے کیساتھ ہی اسکے عہد کی پہلی خصوصیات میں نمایاں تبدیلی واقع ہوچکی تھی یہاں تک کہ جب امیر حبیب اللہ خان سیاحتِ ہندوستان سے واپس گیا ہے۔ تو وہ پہلا امیر حبیب اللہ خان نہ رہا تھا۔ بلکہ اب اس کا مقصدِ حیات بجائے ملک و ملّت کی اصلاح کے اپنی ذات کے عیش وآرام تک محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ اب خالی از شر و غوغا عیش ونشاط کی زندگی بسر کرنے کا طالب تھا۔ اور اس لئے وہ چاہتا تھا کہ اس کے عیش میں مخل ہونے والی ایک بھی آواز ملک بھر میں سنائی نہ دے۔ ملک کے خوانین اور سرکردہ لوگوں کی طرف سے تو وہ اپنے باپ کی بدولت کامل مطمئن

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵

کس شریعت وسیاست کی رو سے روا ہوسکتا ہے۔ مگر امیر نے ذرا بھی التفات نہ کی۔ بلکہ نفرت وحقارت سے ان کی طرف سے منہ پھیرلیا۔ اور جلّادنے ان بیچاروں کا یکے بعد دیگرے خاتمہ کردیا۔

ہو چکا ہوا تھا۔ مگر ان کی بجائے اب یہ چند تازہ واردان یعنی اصلاح چاہنے والا گروہ اس کی تشویش قلبی کا باعث بن رہا تھا۔ اور کوئی عجب نہ تھا (یعنی اسے یہ خوف دلایا گیا تھا)۔ کہ تھوڑی سی مدت اور مل جانے پر یہ گروہ اور زیادہ منظم اور طاقتور ہو کر کہیں بے سر عوام کی قیادت کرنے نہ لگ جائے۔ اور بادشاہ کی طاقت کم ہو کر حمیدیہ[51] طاقت کے ہم مثل نہ رہ جائے۔ لہٰذا اگر باپ نے جمہور کے سرکردہ طائفہ کی سرکش گردنوں سے مینار[52] تعمیر کروائے تھے۔ تو بیٹے نے حریت خواہانِ ملک و ملت کو ہمیشہ کے لیئے زندان بلا میں ڈال کر سنتِ آذری کو پورا کر دکھایا تھا۔

مُلک کی عام رعیت جو آج سے پہلے خوانین کے ہاتھ تلے رہنے کی عادی ہو رہی تھی۔ امیر حبیب اللہ خان کے عہد میں بوجہ پرانے خاندانوں کے گم و نیست ہو جانے کے سبب سے بے سر تھی۔ اس کو قبضہ میں رکھنے والی ایک ہی طاقت خوانینِ ملک کی تھی۔ جس کو امیر عبدالرحمٰن خان نے بُری طرح پائمال کر دیا ہوا تھا۔ اور اب جب تک نئے خاندان بنتے۔ اور اپنا اثر اچھی طرح قائم کرتے۔ ملک کے عام افراد کو سنبھالنے والا بجز ان کی رسم و رواجی یا قبائلی پابندیوں کے اور کوئی نہ تھا اور اگر دریں اثنا رکابل کے جدید الخیال گروہ کو اپنے پر و پُرزے نکالنے کا کچھ وقفہ مل جاتا۔ تو افغانستان کی قومی تاریخ میں یہ بمنزلہ ایک نقطۂ تغییری[53] کے ہوتا۔ اور اور ذرا آگے چل کر جنگ عظیم کے دوران میں ترکوں کی انگریزوں کے برخلاف جرمنی کے ساتھ شمولیت اس جدید گروہ کو عام پبلک سے ملا دینے کا ایک بھاری سبب

---

۵۱ عبدالحمید خان سلطان ترکی کی طرف اشارہ ہے۔

۵۲ امیر عبدالرحمٰن خان کے عہد میں بھی شنواریوں نے بغاوت کی تھی جس کو بُری طرح کچل دیا گیا تھا امیر کے حکم سے ان قبائل کے سرکردوں کے سروں سے ایک مینار تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔

۵۳ میں نے یہاں Turning point کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

بن جاتی۔ اور اس طرح افغانستان کے مختلف القبائل اور پاشان و منتشر باشندے پہلی دفعہ ملک کے سیاسی سرکردوں کی راہنمائی میں متحد و شیرازہ بند ہو جاتے۔ اور شاید اپنی داخلی اور خارجی آزادی دونوں کو پا بھی جاتے۔

جمہور پہلی دفعہ اپنی طاقت کی ثقالت و گرانی کو اپنے موجودہ اور مستقبل میں ہونے والے حکمرانوں کے بالمقابل وزن کرتا اور کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اس احساسِ حقیقت کا نتیجہ اس کی ذہنیت فرسودہ کی پامالی اور اس کی بجائے ایک ذہنیتِ تازہ کی شکل میں موجود نہ ہو جاتا۔ جو اپنی خصوصیاتِ جدیدہ کی رُو سے ملت کے جہل کو علم ان کی بربریت اور وحشت کو شائستگی ان کی خونخواری و بہیمیت کو رحیمیت و انسانیت اور ان کے شقاق و نفاق کو اتفاق و وحدت سے بدل کر ان کو ایک ایسی قوم کے سانچہ میں نہ ڈھال دیتی۔ جو زحمت کشی مستقل مزاجی اور شائستۂ حال و اعمال کی جملہ قوتوں کی مالک ہوتی ہے۔ مگر آہ! افغانستان کی قسمت میں ہنوز یہ ساعت سعید دور تر تھی۔ ان مٹھی بھر حریت کیشانِ وطن کو قید و بند میں ڈال دینے کے بعد امیر حبیب اللہ خان تو مطمئن اور بےفکر ہو کر اپنے عیش و نشاط میں مشغول و محو ہو گیا۔ مگر جمہور ایک بے سری کے عالم میں فضول و مضر مذہبی اعتقادیات کے ماحول اور ملک کی عام مفلسی جہالت اور جبر و استبداد کی طاقتوں سے برابر دبتا چلا گیا۔ اب وہ مداخلت بھی موجود نہ تھی۔ جو قومی اور جابر خوانین کی موجودگی کی وجہ سے اہل جمہور کی انفرادی زندگی پر پوری طرح سے اپنا قبضہ کئے ہوئے تھی۔ اور جو اگرچہ ان کی مظلومانہ اور بیکسانہ حالتوں میں ایک ذرہ کمی واقع نہ کر سکتی تھی۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ مآل کار ان کے اعمال میں اجتماعیت اور ایک قسم کا ضبط قائم رکھے ہوئے تھی مثال کے طور پر ان ایام میں قبیلہ قبیلہ کی آپس میں جنگ و خونریزی ایک خان کی سرکردگی و معیت بھی دوسرے خان سے پرخاش و نبرد آزمائی یا پھر چند قبائل کا باہم متحد ہو کر

حکومت وقت کے برخلاف محاذ آرائی کرنا اور بالآخر فرنگیوں سے سودائے غزا کیلئے ان کا آپس میں یکجہت ہو کر لڑنے مرنے کے لئے مستعد و تیار ہو جانا ان کی ذہنیت کے اجتماعی خصوص کا مظہر عینی تھا۔ اور چونکہ ایسے واقعات کثرت سے وقوع میں آتے رہتے تھے۔ اس لئے ان کا ذہن برابر انہی سازشی امور کی جانب مشغول رہتا تھا۔ اور گویا ان کی زندگی کا بہترین شغل اور سہارا بنا ہوا تھا۔ اگر آج ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے ہاتھوں پس گیا ہے۔ تو فتحمند قبیلہ کے ہاتھ بہت سا مال غنیمت چڑھ گیا ہے۔ جس کو اس قبیلہ کی جنگ کرنے والی طاقت نے آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ اور کل جب دوسرے قبیلہ کو غلبہ حاصل ہوا ہے۔ تو اس نے بھی لوٹ کے مال سے اپنی عسرت کی پیاس بجھا ڈالی ہے۔ پس اس قسم کے واقعات کا مسلسل اعادہ زر و دولت قومی کے دور کو ڈھلتی چھاؤں یا چڑھتی دھوپ کی طرح تیزی سے حرکت میں رکھے ہوئے تھا۔ جس کے سبب سے انفرادی و شخصی افکار کی ہجوم آوری عوام پر محسوس نہیں ہوتی تھی۔ فلہذا انفرادی حیثیت یا چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورتوں میں رہزنی اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں جن کے ملک میں عام ہو جانے کے متعلق آپ آئندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ پڑھیں گے۔ بہت کم واقع ہوتی تھیں۔ لیکن امیر عبدالرحمٰن خان کی پالیسی کے ماتحت ملک کی مختلف طاقتوں کو مرکزی حکومت کے تابع فرمان بنانے کی غرض سے سرکش خوانین کی تباہی نے جمہور کے عام ضبط یعنی ڈسپلن کا ستیاناس کر دیا ہوا تھا۔ اور اب جوں جوں جمہور اپنی انفرادیت کو محسوس کرنے لگ گیا تھا۔ دوں دوں اسے ملک کی عام مفلسی ہراساں کر رہی تھی۔ اور ملک کے وسائل و ذرائع آمدنی کی کمی ہر فرد پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اور یہ ہر شخص محسوس کر رہا تھا۔ کہ اُسے کچھ نہ کچھ فکر کرنا چاہیئے۔ مگر اب وہ پہلے کی طرح اجتماعاً کچھ نہ کر سکتے تھے۔ حکومت مرکزیت پیدا کر چکی تھی۔ خوانین کے پرانے خاندان نابود

ہو چکے تھے ۔ اور نئے خوانین کا زاویہ نگاہ ہی اب کچھ مختلف ہو رہا تھا۔ اس لئے وہی پرانی وحشیانہ ذہنیت جو اب تک ان میں علے الاصل قائم تھی ۔ انہیں اب اسی قماش کے انفرادی اقدامات کی طرف پوری طاقت سے دھکیل رہی تھی ۔ بیکار گروہ کا ایک کثیر حصہ مختلف جتھہ بندیاں بنا کر رہزنی کا پیشہ اختیار کئے رکھتا تھا۔ اور مسافروں اور تجارتی قافلوں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی معاش پیدا کرتا تھا ۔ دیہاتی آبادی کا صرف وہ حصہ جن کے پاس اپنی گذران کے لئے کافی زمینیں تھیں ۔ یا جو بڑے بڑے خوانین اور ملکوں کے پاس بطور کاشتکار کے زندگی بسر کرتا تھا ۔ کسی حد تک ان جرائم پیشہ اشخاص سے ملوث نہ تھا ۔ باقی تقریباً تمام آبادی رہزنی اور ڈاکہ زنی کی خاصیت اپنے اندر پیدا کر چکی تھی ۔ چونکہ یہ ایک اہم مضمون ہے ۔ اس لئے ہم اسے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے پر مجبور ہیں :۔

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ۔ کہ افغانستان کا ملک بے حد غریب اور نادار تھا ۔ یہ ظاہر ہے کہ جسقدر مفلسی زیادہ ہو گی ۔ اسی قدر بیکاری بھی زیادہ ہو گی ۔ اور جتنی بیکاری شدید ہو گی ۔ اتنے ہی جرائم زیادہ سنگین قسم کے اور کثیر تعداد میں واقع ہونگے ۔ ڈاکہ زنی ایک سنگین جرائم میں سے ہے ۔ اور ہم افغانستان میں اس کی کثرت اور بہتات دیکھتے ہیں ۔ میں نے اوپر کہا ہے کہ دیہاتی آبادی کا صرف وہ حصہ جن کے پاس گذران کے لئے کافی زمینیں تھیں ۔ یا وہ طبقہ جو ملک اور خوانین پر مشتمل تھا ۔ یا جو ان کے ساتھ بطور ان کے کاشتکار کے رہتا تھا ۔ ایسے جرائم سے تقریباً پاک کہا جا سکتا تھا ۔ اس صف میں دیہاتی آبادی کا وہ حصہ بھی شمار ہو گا ۔ جس کا گذران گھریلو صنعت پر تھا ۔ اور وہ بھی جو نقل و حمل کی خدمات انجام دیتا تھا ۔ باقی سب کا سب بیکاری کی لعنت میں گرفتار تھا ۔ اب بیکار طبقہ میں سے ایک قلیل حصہ فوج میں چلا

جاتا تھا۔ ایک حصہ موسم زمستان میں ہندوستان کی طرف کوچ کر جاتا تھا۔ ایک حصہ افغانستان کے ان شہروں میں نقل کر جاتا تھا۔ جہاں انہیں حمالی وغیرہ مل سکے۔ اور مابقی مختلف جتھوں میں تشکیل ہو کر ملک کے طول و عرض میں ڈاکے ڈالنے میں شب و روز مشغول رہتا تھا۔ ایک قلیل ترین گروہ ملانوں کا بھی تھا۔ جو طالب علموں کی حیثیت میں سارے ملک کی ادھر سے ادھر خاک چھانتا رہتا تھا۔ اور شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ خیرات پر اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ اسی بیکار طبقہ میں وہ گدا بھی شمار کر لیئے جائیں۔ جو افغانستان کے چند شہروں میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ اور جو بوجہ کمزور اور نااہل ہونے کے ڈاکہ زنی کی بجائے گداگری کا پیشہ اختیار کر لیتے تھے۔ افغانستان کی دیہاتی آبادی کو اس طرح تقسیم[۱] کر کے اب ہم اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں *

اس وقت ہمارے پیش نظر صرف ایک ...... یہی مقصد ہے۔ کہ آیا ڈاکہ زنی کی خاصیت قریب قریب ساری دیہاتی آبادی میں پیدا ہو چکی تھی۔ اور اگر وہ پیدا ہو چکی تھی۔ تو وہ کس طرح اور کیونکر بڑھتی اور پھولتی پھلتی رہی خیال رہے کہ اس کی اصل جڑ بیکاری تھی۔ اور ہو سکتا تھا۔ کہ ایک ناساز ماحول میں یہ جڑ بجائے سرسبز ہوتی رہنے کے اپنی اصل جگہ ہی سے اکھڑ جاتی۔ مگر جیسا کہ آپ ابھی پڑھ آئے ہیں۔ اور آگے چلکر مزید پڑھیں گے۔ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ماحول ہمیشہ اس کا سازگار رہا۔ اور حکومت کی انتظامی خرابیاں اس ماحول کی سازگاری کے لئے عام طور پر ممد حیات ثابت ہوتی رہیں۔ شروع میں فاقہ کشی سے بچنے اور تھوڑی سی محنت سے بہت سا مال و زر اکٹھا کر لینے کی طمع میں یہ پیشہ اختیار

[۱] ہمارے پاس افغانستان کے اعداد و شمار بالکل نہیں ہیں۔ جن سے ہم یہ واضح کر سکیں۔ کہ شہری اور دیہاتی آبادی میں کیا نسبت تھی۔ اور دیہاتی آبادی کا کل کتنے فیصدی کام کر کے اپنی معاش پیدا کرتا اور کتنا بیکار رہتا تھا۔

کیا جاتا تھا۔ گمشدہ شدہ ہر وہ شخص جس کے سامنے کرنے کو نہ کوئی کام تھا۔ اور نہ گھر پر بیکار پڑے رہنے سے روٹی مل سکتی تھی۔ اور جو طبعی طور پر مضبوط بھی واقع ہوتا تھا ڈاکہ زنی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ وہ اپنے بچپن ہی سے قصوں اور افسانوں کی شکل میں اپنے آبا کی لوٹ کھسوٹ کے واقعات سنتا چلا آتا تھا۔ اور پھر جب اس کو اپنی ضرورتوں کی وجہ سے روزی کمانے کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ تو اسے ملک بھر میں یعنی اس کی رہائشی جگہ کی اردگرد بستیوں میں۔ بیکاری ہی بیکاری نظر آتی تھی۔ کوئی پیشہ موجود نہ ہوتا تھا۔ جسے وہ اختیار کرکے اپنا پیٹ پال سکے ایک زراعت ہی ملک کا پیشہ تھی۔ سو اگر وہ ہل چلانا جانتا بھی ہوتا تھا تو زمینداروں کے پاس فالتو زمین نہ ہوتی تھی۔ جو اس کو مل سکتی۔ علم اور دولت اس کے پاس نہ تھی۔ کہ وہ اس کے زور سے اپنے لئے کوئی نیا کام اختراع کرسکے۔ غرضیکہ ان تمام شعبہ ہائے زندگی سے مایوس ہوکر جہاں اسے کچھ کام مل سکتا تھا۔ وہ بالآخر یہ محسوس کرنے لگ جاتا تھا۔ کہ اس کے لئے صرف چار راہیں کھلی ہیں :۔ اول یہ کہ یا تو وہ اپنے ملک سے ہی نکل جائے۔ دوئم یہ کہ وہ طالب[1] علمی اختیار کرلے

[1] طالب علمی کی اصطلاح عام طور پر علم دین کے حاصل کرنے والوں کے متعلق استعمال کی جاتی تھی۔ اور چونکہ افغانستان میں علم دین کے حاصل کرنیکی کوئی باقاعدہ درسگاہ نہ تھی۔ لہٰذا جس کسی کو علم کا شوق ہوا کرتا تھا۔ وہ کسی شہر کے ملّاں کے پاس چلا جاتا تھا۔ اور کسی مسجد میں بیٹھ کر چند کتابیں علم حدیث کی پڑھ کر اپنے گاؤں میں آکر ملّاں بن جایا کرتا تھا۔ ملّاں بننے تک اس کو کئی مراحل طے کرنے پڑتے تھے یعنی اگر اس کو کسی شہر میں پناہ نہ ملتی (پناہ سے میرا مطلب روٹی کا انتظام ہے) تو وہ ایک سے دوسرے شہر جانے پر مجبور ہوتا تھا۔ اور اس سفر کو وہ منزل بہ منزل مختلف گاؤں میں سے ہوتا ہوا قطع کرتا تھا۔ گاؤں والے اسکو طالب علم سمجھ کر روٹی دیدیا کرتے تھے :۔

سوئم یہ کہ گدائی کرنے لگ جائے۔ اور چہارم یہ کہ ڈاکہ زنی کے پیشہ کو سب دوسری چیزوں پر ترجیح دے۔

افغانستان کے لوگ بہت ہی مجبوری کی حالت میں اپنا وطن چھوڑ کر کسی غیر ملک کو جانا پسند کرتے ہیں۔ یعنی جب تک ان کو اپنے ہلاک ہو جانے کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ وہ گھر چھوڑنے کو ترجیح نہیں دیتے۔ یہ جو ہر سال ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہندوستان کی طرف کوچ کر جاتے ہیں، محض بیکاری کی ضرورت ہی سے خانہ بدوشی اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ موسم کی سختی بھی ان کو بُری طرح اپنا مسکن چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے۔ یونہی اپنے مسکن کو چھوڑ جانا ایک طعنہ بن گیا ہے۔ اور چونکہ افغانوں میں طعنہ سننے کی برداشت بہت کم ہے۔ اس لئے وہ شخص بھی جو اپنی معاش کی خاطر گھر چھوڑ جاتا ہے۔ اپنے ہمچشم قبائل کے طعنوں سے بچنے کے لئے اپنی پیدائشی جگہ پر پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ اس دائمی فراق کے پیش نظر بیکار طبقہ کے خال خال اشخاص ہی پہلی قسم کی راہ پر چلنا پسند کرتے تھے۔ مگر چونکہ طالب[۵] علمی کے لئے گھر سے نکلنا کوئی طعنہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے طبقہ مذکور میں سے ایسے افراد جن میں کچھ نہ کچھ مذاق تعلیم ہوتا تھا۔ اسی راستہ کو اختیار کرتے تھے۔

تیسری راہ یعنی پیشہ گداگری کو صرف وہی لوگ ترجیح دیتے تھے۔ جو طبعی طور پر بالکل کمزور یا ڈرپوک واقع ہوتے تھے۔ ورنہ باقی سارے کے سارے رہزنی ہی کو

۵ـ اس طبقہ میں ایک ایسا گروہ مستقل طور پر پیدا ہو گیا تھا۔ جو اسی طرح شہر بہ شہر اور گاؤں بہ گاؤں پھر کر اپنی بغل میں دو کتابیں اٹھائے اپنی معاش حاصل کرتا تھا۔ یہ گروہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ہر جگہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ان ٹولیوں کے سرکردہ عام طور پر وہ ملاّں ہوتے تھے جو ملاّئی حاصل کر چکنے پر بھی بوجہ ملانوں کی افراط و بہتات کے اپنے گاؤں میں کھپ نہ سکتے تھے۔

اپنی زندگی کا آئندہ شغل قرار دیتے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ ڈاکہ زنوں کا یہ سارا طبقہ باغیوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ یا حکومت ان کی تعداد سے تمام و کمال باخبر ہوتی تھی۔ صرف وہی چند افراد باغیوں کی زندگی اختیار کرتے تھے۔ جو ڈاکہ زنی کے پیشہ کو مسلسل جاری رکھنے کی وجہ سے شہرت اور نام پیدا کر لیتے تھے۔ اور حکومت کے علم میں آجاتے تھے۔ وگرنہ اس طبقہ سے متعلقہ افراد عام طور پر اپنے دیہات ہی میں رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی مہینہ دو مہینہ کے بعد ڈاکہ زن گروہوں میں شامل ہو کر کسی جگہ جا کر ڈاکہ مار آتے تھے۔ اور اپنے حصہ کا مال بٹوا کر پھر سیدھے اپنے گھر آ رہتے تھے چونکہ عام طور پر ہر بستی میں ایسے اشخاص کی تعداد دس بیس سے متجاوز ہوتی تھی۔ اور وہ قریب قریب ایک ہی قوم سے ہوتے تھے۔ لہذا ان کا راز مقامی افسروں پر افشا نہیں ہوتا تھا۔ اور ہوتا بھی ہو۔ تو وہ ان کے برخلاف کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے تھے۔ بعض حالتوں میں وہ ان سے چشم پوشی کرنے پر بھی مجبور ہوتے تھے اس کی کیفیت یوں ہے۔ کہ افغانستان کے باشندے مختلف قبیلوں میں منقسم ہیں۔ ہر ایک قبیلہ اپنی مخصوص روایات اور رسم و رواج کی سختی سے پابندی کرتا ہے۔ اور اپنے بالمقابل دوسرے قبیلوں کو ہیچ اور کہتر سمجھتا ہے۔ پھر ان قبیلوں کی کئی کئی شاخیں ہیں۔ یہ شاخیں اپنے آگے کئی کئی اور شاخیں رکھتی ہیں۔ جس طرح قبیلوں میں ذرا سے روایتی یا رسمی اختلاف کی بنا پر باہمی رقابت اور ہمچشمی موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح رقابت اور ہمچشمی کا یہ سلسلہ ان شاخ در شاخ طبقات میں بھی سرایت کرتا چلا گیا ہے۔ ایک قبیلہ کی مختلف شاخیں آپس میں عداوت رکھتی ہیں عداوت محض رقابت یا ہمچشمی کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر ایک شاخ کے کسی فرد نے دوسری شاخ کے کسی فرد کو قتل کر دیا ہے۔ یا کسی گھریلو معاملہ پر ایک شاخ

دوسری شاخ سے بگڑ بیٹھی ہے۔ یا ایک شاخ نے دوسری شاخ کے دشمنوں سے اتحاد پیدا کر لیا ہے۔ تو ان میں عداوت مضبوطی سے جڑ پکڑ جاتی ہے۔ اور نسلاً بعد نسلاً وراثتاً آنے والی نسلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ۵ اس طرح دیہات مختلف فریقوں سے آباد ہیں۔ مثلاً اگر پانچ پانچ یا دس دس میل کے فاصلہ پر چند دیہات ہیں۔ تو گو ان تمام میں ایک ہی قبیلہ کے لوگ بستے ہونگے مگر دو باہم رقیب شاخیں ایک ہی موضع میں آباد نہ ہونگی۔ اس طریق پر آباد ہونیکی ایک وجہ تو یہی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے ایک ہی جگہ پر اکٹھا رہنے پر مجبور تھے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ ملک میں حکومت ایسی نہ تھی۔ جو ضرورت کے وقت ان کی مدد کو معاً پہنچ سکتی۔ پس تقریباً ہر گاؤں کے خان و زمیندار جو اہل ثروت شمار ہوتے تھے۔ ضرور اپنے مدمقابل کا کوئی نہ کوئی دشمن کسی دوسرے گاؤں میں رکھتے ہوتے تھے۔ اور اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لئے انہیں اپنے کاشتکار اور مزارع کے علاوہ ایک ایسا گروہ اپنے ہاتھ تلے رکھنا پڑتا تھا۔ جو شب و روز ان کی حفاظت کی غرض سے پہرہ چوکی دیتا رہے۔ چنانچہ افغانستان میں ہر خان یا ملک اپنی حسب استطاعت دس بیس تیس پچاس یا سو بندوقچی اپنے ہاں ملازم رکھنے پر مجبور ہوتا تھا۔ اس کو یہ خرچ[۱] اپنے خان یا ملک ہونے

---

[۱] عام طور پر ایک خان یا ملک کے پاس جس قدر بندوق بردار ہوا کرتے تھے۔ صرف کھانے اور معمولی سی ایک آدھ جوڑے سالانہ کپڑے پر اس کے پاس ملازم ہوتے تھے۔ بندوقیں خان یا ملک کو خود خرید کر دینی پڑتی تھیں اور یہی اسکی طاقت شمار ہوتی تھی۔ اس گروہ میں ایسے بھی افراد ہوتے تھے۔ جنکے پاس اپنی بندوقیں بھی ہوتی تھیں خان یا ملک کو ایسے افراد سے کچھ بہتر سلوک کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ کسی حد تک اپنے فعل میں آزاد بھی ہوتے تھے۔

. . . .

کے ثبوت کے طور پر بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ان بندوقچیوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں
ایک وہ جن کے پاس خان یا ملک کی بندوقیں ہوتی تھیں۔ اور دوسرے وہ جن
کے پاس اپنی بندوقیں ہوتی تھیں۔ مگر یہ پچھلا گروہ تعداد میں بہت قلیل ہوا کرتا تھا
اور عام طور پر ڈاکہ زن طبقہ سے متعلق ہوتا تھا۔ اس طبقہ کے افراد کچھ اس وجہ سے
بھی خانوں اور ملکوں کی ملازمت (اگرچہ وہ برائے نام ہی ہوتی تھی) اختیار کر لیتے
تھے۔ کہ وہ اور ان کے ہم قماش اشتباہ سے بچے رہیں۔ اور کچھ اس وجہ سے
بھی کہ وہ اپنے دیگر ساتھیوں کو ضروری اطلاعات بہم پہونچاتے رہیں۔ ادھر خوانوں
اور ملکوں کو جو آئے دن ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ مگر کمی
آمدن کی وجہ سے خاصی تعداد میں لڑوئیے ملازم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اپنی قوم
کے ڈاکوؤں کی ٹوہ رکھنی پڑتی تھی۔ تاکہ مصیبت کے وقت وہ ان کی امداد کو پہونچنے
سے نہ رکیں۔ ان کو اپنے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے زیادہ تگ و دو کرنی
نہیں پڑتی تھی۔ کیونکہ ان کے ملازموں کے اس گروہ میں سے جس کا ذکر ابھی اوپر
ہو چکا ہے۔ کوئی نہ کوئی ضرور ان کا درمیانی واسطہ بن جاتا تھا۔ اس طرح ڈاکہ زن
طبقہ اپنی پشت پر اپنے خان یا ملک کی اس قدر طاقت موجود پاتا تھا۔ جو مقامی
حکومت کی طاقت سے زیادہ ہوتی تھی۔ خان اور ملک بھی اسی طرح اپنی اصلی
قوت میں اضافہ کر لیتے تھے۔ اور اس کو اپنے قبیلہ کی طاقت شمار کرتے تھے۔
ان مفاد کے زیر اثر ان میں قومی رواداری کی روح تقویت پاتی رہتی تھی۔ اور
چاہے وہ خود آپ اپنی قوم کے غریب و کمزور افراد کے ساتھ کیسا ہی ظلم روا رکھیں
مگر وہ یہ کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے۔ کہ کسی دوسرے کے ظلم کا تختہ مشق بنانے کے
لئے اس کو غیر کے حوالے کر دیں۔ لہذا جب کبھی عمال حکومت کی طرف سے ان سے
یہ مطالبہ کیا جاتا۔ کہ وہ اپنے قوم کے مشتبہ یا بدمعاش گروہ کو حوالہ کریں۔ تو وہ اس سے

ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ اور آئندہ کے لیئے اس مطالبہ سے بچنے کے لیئے وہ اپنے مقام میں امن کے قیام کا آپ ذمّہ اٹھالیتے تھے۔ حکومت اپنے آپ کو اس مقامی طاقت کے مقابل کمزور دیکھ کر انہی کو ان کے علاقۂ اثر کا ذمّہ دار بنا دیتی تھی۔ اب ان خوانین اور ملکوں کی خوب بن آتی تھی۔ یہ اب اپنی قوم کے ڈاکو طبقہ سے جس کی نسبت ان کو کم وبیش علم ہوتا تھا۔ خوب اچھی طرح سے استفادہ کرتے تھے۔ گویا ڈاکو طبقہ اور ان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہو جاتی تھی۔ خان اس شرط پر ان کو حکومت کے ہاتھ سے بچانے کا ذمہ لے لیتے تھے۔ کہ ایک تو وہ ان کے اپنے حلقہ میں ڈاکہ زنی اور دھاڑ مارنہ کریں۔ اور دوسرے ان کے رقیب اور دشمن خانوں پر چھاپے ڈالیں۔ شدہ شدہ خان یا ملک خود بھی ان کی لوٹ کھسوٹ کے حصہ دار بن جاتے تھے۔ اس طریق کار کے نتائج بے حد وخیم ہوتے تھے۔ ہر ایک خان و ملک اپنے علاقہ کو بچاتا ہوا دوسروں کے علاقوں پر چھاپے ڈلواتا تھا۔ اور جب حکومت کی طرف سے پوچھ ہوتی تھی۔ تو دوسروں پر الزام دھرتا ہوا دوسرے علاقوں کے مجرموں کو پکڑنے کے لیئے حکومت کی مہم کے ساتھ اپنے گروہ کو لیتے ہوئے شریک ہو جاتا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی مہیں آپس میں بغض وعداوت کی آگ کو شدت کے ساتھ تیز کرتی رہتی تھیں۔ اور ملک بھر میں کینہ وفریب بدامنی قتل وغارت گری کا بازار گرم کیئے رکھتی تھیں۔ حاکم طبقہ بھی اس میں ملوث ہونے سے نہ بچ سکتا تھا۔ طبعاً یہ لازمی تھا۔ کہ ہر مقام کا افسر اپنے علاقہ کو معصوم ثابت کرے۔ اور اس طرح اپنے علاقہ میں بدامنی یا قتل کی وارداتیں واقع ہونے کے الزام کو دوسرے علاقہ کے بدمعاش گروہ کی کارروائی بتلائے۔ ادھر اس علاقہ کا حاکم اپنی مدافعت میں اسی طرح کا الزام اس پہلے گروہ پر دھرنے لگ جاتا تھا اس کشمکش باہمی کے نتیجہ کے طور پر وہ بجائے کوئی متحدہ کارروائی کرنے کے آپس ہی میں دشمن ہو جاتے تھے۔ اور اپنے اعلےٰ حاکموں کے پاس اپنے آپ کو حق بجانب ثابت

کرنے کے لئے مختلف حیلہ و حوائل سے کام لیتے تھے۔ ادھر اعلیٰ حاکموں کا یہ حال تھا۔ کہ وہ ایسے مواقع کو مغتنم شمار کرتے ہوئے ان مقامی حاکموں کی کشمکش باہمی سے خوب ہی مستفید ہونا چاہا کرتے تھے۔ اور ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کر لیتے تھے اب مقامی حاکم یہ بڑی بڑی رقمیں کہاں سے لائیں۔ ایک تو وہ پہلے ہی سے بدیں سبب قرض کے بار کے نیچے دبے ہوتے تھے۔ کہ ان کو اس حاکمی کے بدلے پایہ تخت میں ان کی سفارش کرنے والوں کو بہت سا سیم و زر دینا پڑا تھا۔ اور دوسرے جس مقام پر وہ بطور حاکم کے مقرر ہو کر آئے تھے۔ اس کے باشندوں پر اپنی حاکمی کا رعب ڈالنے اور اپنے آپ کو خان زادہ یعنی عالی نسب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی کثیر رقم خرچ ہو چکی ہوتی تھی۔ گو ان بیچاروں کو خبر نہ ہوتی تھی۔ کہ کتنے دنوں کے لئے وہ حاکم رہیں گے۔ ان تمام حقیقتوں کے زیر اثر یعنی یہ کہ انہوں نے وہ روپیہ جو رشوت کے طور پر حاکمی کا فرمان لیتے وقت دیا تھا۔ اسے رشوت ہی کے ذریعہ سے واپس لینا ہے۔ اور وہ کثیر اخراجات جو اپنی پوزیشن کو قائم رکھنے کے لئے وہ اب صرف کر رہے ہیں۔ یہیں کے لوگوں کی جیبوں سے نکالنے ہیں۔ اور وہ بیش قیمت تحفے تحائف جو سالانہ یا ششماہی انہوں نے اپنے اعلیٰ حاکموں کی نذر کرتے رہنا ہے۔ یہیں سے حاصل کر کے دینے ہیں۔ اور وہ تمام ضرورت کے موقعوں پر رشوت کی بڑی بڑی رقمیں جو مذکورہ بالا الزامات سے بچنے کے لئے غیر معمولی طور پر اپنے افسران بالا کے ہاتھ پر رکھنی ہیں۔ یہیں سے فراہم کرنی ہیں۔ اور سب سے آخر یہ کہ چند ہی دن میں ملازمت سے برطرفی اور پھر نہ معلوم کئی سال تک دوبارہ کوئی عہدہ[1] نہ ملنے کا قوی خطرہ لاحق ہے۔ لہذا

[1] افغانستان میں عہدے بڑی قیمت پر ملتے ہیں۔ اور چونکہ عہدوں کی کمی کی وجہ سے مانگ بے حد ہے۔ اس لئے عہدیدار حق و ناحق جلد جلد تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ایک

برطرفی کے وقت ان آئندہ کے چند سالوں کا خرچ بھی گرہ میں ضرور باندھنا ہے وہ بُری طرح رشوت کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑے ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی تنخواہ تو بالکل ہی معمولی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کا تو ذکر ہی کیا۔ ان کی آمدنی کی بڑی بڑی مدّوں میں حسب ذیل صیغے قابل ذکر ہیں:۔

(۱) زمین کا مالیہ[1] جو جنس کی شکل میں لیا جاتا تھا؛

(۲) تارتق یعنی تحائف جو دوروں پر وصول کئے جاتے تھے۔ یا جب کوئی حاکموں سے ملنے کے لئے آتا تھا۔ ان کے لئے گھی، مویشی، قالین، گلم اور نقدی وغیرہ کی صورت میں پیش کرتا تھا؛

(۳) کسی کو خاص مراعات دینے کا عوضانہ؛

(۴) محصلی یعنی وہ تاوان جو مقروض سے قرضخواہ کو اس کا قرضہ دلوانے کے عوض میں حکومت کے نام پر وصول کیا جاتا تھا؛

(۵) مقدمات کو فریقین میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنے کی اُجرت یعنی رشوت؛

(۶) سرکاری خزانہ میں غبن اور اگر براہ راست ممکن نہ ہو سکے۔ تو اشیاء کا خورد بُرد؛

(۷) سرکاری ضروریات کے لئے جو مال و اسباب خریدا جاتا تھا۔ اس میں خیانت کاری؛

اگر ایک حاکم ان مدّات سے پیدا کردہ آمدنی پر بھی اپنی ضروریات سے عہدہ برآ

---

[1] امان اللہ خان کے اوائل عہد حکومت میں بھی مالیہ جنس ہی کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ بعدہٗ نقد کر دیا گیا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸۔ شخص جو ایک عہدہ رکھتا ہے۔ جب تک اس سے اس کا اعلیٰ حاکم خوش ہے وہ برسرِکار ہے ورنہ برطرفی یقینی ہے۔ اور برطرفی کے بعد دو چار سال بیکار پڑے رہنا ایک عام بات ہے؛

نہیں ہو سکتا تھا۔ تو وہ یقیناً مقامی ڈاکوؤں سے ساز باز رکھنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اور ان سے اپنا پورا حصہ بٹواتا تھا۔ یہ وبا چھوٹے درجہ کے حاکموں تک محدود نہ تھی بلکہ جیسا کہ آپ آگے چل کر ملاحظہ کریں گے۔ بڑے درجہ کے حاکموں تک نیز سرایت کر چکی تھی ؛

میرا خیال ہے کہ مذکورہ بالا حالات کو پڑھ کر قارئین یہ اندازہ لگانے کے قابل ہو گئے ہونگے۔ کہ مفلسی اور بیکاری نے رہزنی کی صفت کو ملک میں کس طرح عام کر رکھا تھا اور ماحول کس طرح اس کی ساز گاری کر رہا تھا۔ مزید برآں یہ کہ حکومت جو کہ خود ایک فیوڈل سسٹم اور ملوکیت کا خمیرہ تھی۔ کس طرح ایسا ماحول پیدا کرنے میں اپنے عمال کے ذریعہ سے مشغول تھی۔ بس یہ جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے۔ کہ تقریباً تمام دیہاتی آبادی رہزنی اور ڈاکہ زنی کی خاصیت اپنے اندر پیدا کر چکی تھی۔ تو اس میں یک ذرہ مبالغہ نہیں فارسی میں یہ ضرب المثل عام ہے۔ کہ "مرد بیکار یا غر شود یا بیمار"۔ یعنی بیکار مرد یا چور و رہزن بنتا ہے۔ یا ہمیشہ بیمار رہتا ہے ؛

ملک کی آبادی پر مفلسی نے اپنا جو رنگ جما رکھا تھا۔ اور بیکاری نے قوم کے ایک بڑے حصہ پر جو برائیاں مسلط کر رکھی تھیں۔ ان کو میں نے کسی قدر وضاحت کے ساتھ اوپر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں ان عناصر اور اسباب پر ایک نظر ڈالوں گا۔ جو مفلسی کو مٹانے یا کم کرنے کے بجائے الٹا اس کے بڑھانے میں ممد و محرک ثابت ہو رہے تھے۔ اس طرح قارئین کی آنکھوں کے سامنے وہ پورا نقشہ کھنچ جائیگا۔ جو غازی کے عہد حکومت کے آغاز کے وقت ملک کا ہو سکتا تھا ؛

میرے نزدیک وہ بڑے بڑے عنصر جو ملک کی قسمت پر کلاًّ اثر انداز تھے۔ تعداد میں تین تھے۔ اولؔ عمال حکومت۔ دومؔ خوانین و ملک۔ سومؔ ملّانے ؛

آپ قبل ازیں باب اول میں اعلےٰ ترین عمال حکومت کی نسبت پڑھ آئے ہیں

کہ وہ کس طرح پارٹیوں اور جماعتوں میں منقسم تھے۔ اور بادشاہ کے نزدیک اپنے آپ کو منظور نظر بنانے کے لئے وہ کس کس قسم کی سازشوں اور حیلوں سے کام لیتے رہتے تھے۔ ان کی نسبت کچھ تو آپ اسی باب میں اور پڑھ لینگے اور کچھ باقی کا حصہ میں نے سلسلہ کی مناسبت کے لحاظ سے اس باب کے لئے وقف کر رکھا ہے جس میں انقلاب کے واقعات بیان ہونگے۔

یہاں ان کے متعلق صرف اس حد تک بیان کیا جائیگا۔ جس حد تک کہ وہ ماحول اور وقتی ذہنیت کے زور سے ملک کے تروتی ذرائع کے کم کرنے میں مشغول نظر آتے تھے۔ پہلی بات یہ ہے۔ کہ جو دولت وہ مختلف وسائل سے جمع وفراہم کرتے تھے۔ وہ کسی طرح سے بھی ملک کا سرمایہ نہیں کہلا سکتی تھی کیونکہ نہ وہ اسے کھلے بندوں برت سکتے تھے۔ اور نہ ہی بنا بر خوف حکومت یا عدم اطمینان کسی دوسرے کے پاس بطور امانت رکھ سکتے تھے۔ امیر عبدالرحمن خان نے جہاں خوانین اور ملکوں کو اچھی طرح جھنجوڑا تھا۔ وہاں اس سے یہ گروہ بھی نہ بچ سکا تھا۔ اس کا قاعدہ تھا۔ کہ جونہی اس کے کانوں میں بھنک پڑ جاتی۔ کہ فلاں کس نے کافی مال و دولت جمع کرلی ہے۔ یا فلاں کی طرز معاشرت میں نمایاں تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ تو وہ جھٹ ایسے شخص کو بلا کر قید خانہ میں بھجوا دیتا تھا۔ اور اس کا کل مال و منال ضبط کر لیتا تھا۔ کیونکہ وہ اسے ناجایز لوٹ اور رشوت خواری کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ بدیں خوف اس کے عہد میں کوئی شخص اس قسم کی نمائش نہ کر سکتا تھا۔ جس سے اس کا صاحب مال ہونا ثابت ہوتا ہو۔ ایسے اشخاص اپنا مال و متاع زمین کے اندر دفن کئے رکھتے تھے۔ اور حسب ضرورت وہاں سے تھوڑا تھوڑا نکال کر خرچ کیا کرتے تھے۔ وہ دولت کو جائداد کی صورت میں بھی منتقل نہ کر سکتے تھے۔ اور نہ ہی اپنے رہنے

سہنے کی جگہوں کو آرائش دے سکتے تھے۔ جن لوگوں کو امیر حبیب اللہ خان کے شروع عہد میں افغانستان جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے طرزِ زندگانی اور وہاں کی تمدنی حیات کے سکون کے متعلق متفق البیان پائے گئے ہیں۔

غرضیکہ اعلےٰ درجہ کے عاملین حکومت کے پاس اگرچہ کافی دولت جمع رہتی تھی لیکن وہ اس سے نہ تو خود ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اور نہ عدم اطمینان کی وجہ سے اسے کسی دوسرے کے حوالے کر سکتے تھے۔ اب رہا یہ امر کہ وہ اتنی وافر دولت پیدا کس طرح کر لیا کرتے تھے۔ سو اس کے لئے ان کے پاس بیشمار مدات موجود تھیں۔ جن میں سے چند ایک کو میں یہاں اس غرض کیلئے قلمبند کرتا ہوں۔ تاکہ قارئین ان دوررس اثرات کو معلوم کر سکیں۔ جو ان کے باعث ملک کی اس تندرست آبادی پر پڑ رہے تھے۔ جو ملک کے اندر اقتصادی زندگی کا واحد سبب بن سکتی تھی۔

ان کا سب سے بڑا ذریعۂ آمدنی ملک کے مختلف حصوں میں افسروں۔ حاکموں اور عہدیداروں کا تقرر و تعیین کروانا تھا۔ ایام قدیم سے ان عہدوں کا نرخ و قیمت معلوم تھا۔ اور اعلےٰ منصبدار حکومت جو بادشاہ کے حضور میں کچھ کہنے سننے کی مقدرت رکھا کرتے تھے۔ موقع پا کر اپنے اپنے امیدواروں کی سفارشیں کرتے تھے۔ اور ان کی تقرری کا فرمان حاصل کر کے ان سے بڑی بڑی رقمیں معاوضہ کے طور پر اینٹھ لیتے تھے۔ ملک میں بیکاری اور مفلسی کی آگ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ اشخاص جو زبان کی چالاکی اور لسانیت کی بدولت دوسروں پر فوقیت رکھتے ہوتے تھے۔ جلد کسی سے ساز باز کر کے کسی سفارش کرانے والے تک جا پہونچتے تھے۔ اور وہاں ایک دوسرے سے بڑھ کر معاوضے پیش کرتے تھے جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا تھا۔ کہ نہ صرف اس خاص عہدے کی قیمت ہی بڑھ جاتی تھی۔ بلکہ اگر اتفاق سے جگہ خالی نہ ہوتی تھی۔ تو پہلے کو موقوف کر کے خالی کروا لی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ جو اشخاص بھی

عہدوں پر مقرر کرکے بھیجے جاتے تھے۔ وہ اس خوف سے کہ مبادا کل کو ان کی موقوفی کا فرمان نہ پہونچ جائے۔ آستینیں چڑھا کر دولت سمیٹنے لگ جاتے تھے۔ اور اس عرصہ میں جتنی دولت ان سے سمیٹی جا سکتی تھی۔ سمیٹ لیتے تھے۔ نہ ان کے مقرر کرانے والوں کو چنداں پرواہ ہوتی تھی۔ کہ وہ کیوں اتنی جلدی موقوف ہو گئے۔ اور نہ ہی موقوف ہونے والوں کو اپنی موقوفی کا زیادہ ملال ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اتنے عرصہ میں اپنے دئے ہوئے دام بھی وصول کر لئے ہوتے تھے۔ اور آئندہ چند سالوں کی گذران کے لئے بھی کچھ روپیہ پس انداز کر لیا ہوتا تھا۔ الغرض جتنا کوئی شخص بادشاہ کے زیادہ قرب میں ہوتا تھا۔ اتنی ہی اس کی آمدنی زیادہ ہوتی تھی۔ عہدوں کی یہ خرید و فروخت امیر عبدالرحمٰن اور امیر حبیب اللہ خان کے زمانہ تک ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ غازی کے عہد میں بھی جاری تھی۔ اور اب بھی یقیناً جاری ہوگی۔ اور اس وقت تک برابر جاری رہیگی۔ جب تک مفلسی کا حقیقی طور پر سدِّباب نہیں ہو چکے گا۔

غازی کے عہد میں تو اس تجارت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اس عہد میں حکومت کا ہر ایک شعبہ جداگانہ طور پر قائم ہو چکا تھا۔ اور حکومت کو پہلے کی نسبت سے بہت زیادہ تعداد میں ملازمین رکھنے کی ضرورت درپیش تھی۔ اور اس پر یہ امر مستزاد تھا۔ کہ اس ذریعہ سے دولت فراہم کرنے والوں کو حکومت وقت سے کسی قسم کا خوف بھی نہ تھا۔ یعنی اب وہ اپنی جمع کردہ دولت کو کھلے بندوں خرچ کر سکتے تھے۔ زمینیں اور جائدادیں خرید سکتے تھے۔ اور اپنی رہائش کیلئے عالیشان عمارتیں تعمیر کر سکتے تھے۔ وہ اب کسی دوسرے کے نام سے تجارتی کاموں میں روپیہ بھی لگا سکتے تھے۔ اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

ان کی آمدنی کی دوسری بڑی مد یہ ہوتی تھی۔ کہ حکومت کی سالانہ ضروریات جو اندرون ملک اور خارج سے حاصل کی جاتی تھیں۔ مثلاً فراہم شدہ مالیات کا نقدی کی صورت میں انتقال شاہی خاندان کے استعمال اور پوشش کا سامان واسباب فوج کے لئے خیمہ وخرگاہ گھوڑوں کی زینیں سپاہیوں کے کمربند وبوٹ اور ان کی وردیوں[1] کے لئے بنات وغیرہ اور دیگر کئی قسم کی چیزیں جن کی وقتاً فوقتاً ضرورت پڑا کرتی تھی۔ بڑے بڑے مقامی تاجروں کے ذریعہ سے مہیا کی جاتی تھیں۔ ہر ایک تاجر کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی۔ کہ کسی طرح حکومت کی فرمائش (آرڈر) اسے ہی ملے۔ اس کے لئے وہ متعلقہ اشخاص کو جوان کی سفارش کرسکیں۔ بڑی بڑی رقوم پیش کرتے تھے۔ اور فرمائش کی تعمیل کے احکام صادر ہوجانے پر ان رقوم کا بہت بڑا حصہ اسی وقت ادا کردیتے تھے۔ اس طرح ان امیدوار تاجروں میں مدام ایک مقابلہ جاری رہتا تھا۔ جو نتیجتاً اعلےٰ منصبداران حکومت کی آمدنی کی تزئید کا باعث بنتا رہتا تھا۔

امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ سے گذر کر جب ہم عہد امانیہ میں آتے ہیں۔ تو ملک کی ضروریات میں اضافہ واقع ہونے کے ساتھ ساتھ ہم اس طریق میں بھی بیحد وسعت پاتے ہیں۔ جہاں پہلے حکومت چند لاکھ روپیہ کا مال اپنی سالانہ ضروریات کے لئے منگوایا کرتی تھی۔ وہاں اب کروڑہا روپیہ کا مال ہر سال ہندوستان اور یورپ سے خریدا جاتا تھا۔ اور چونکہ مالیات اراضی اور حکومت کے جملہ رسوم نقدی میں ادا ہوتے تھے۔ اس لئے فوج اور حکومت کی ضروریات کے لئے لاکھوں من غلہ اور اور چیزیں وغیرہ داخل سے بھی خریدنی پڑتی تھیں۔ لہذا مقامی اور خارجی تاجروں کا بازار بہت گرما

[1] عام فوجیوں کی باقاعدہ وردی کوئی نہ ہوا کرتی تھی۔ مگر فوج کا وہ حصہ جو شاہی خاندان کیلئے مخصوص ہوتا تھا۔ مثلاً شاہی گارڈ تو اس کیلئے زنگارنگ کی وردیاں ہوتی تھیں جو قیمتی لباس سے تیار ہوتی تھیں۔

گیا تھا سا سوا اس کے بعض اہم چیزوں کی خریداری کے لئے متعلقہ وزارتوں کے معتمدین اب براہِ راست یوروپ میں خریداری کے لئے بھیجے جاتے تھے۔

اس موضوع کو بیان کرتے ہوئے میں کسی قدر تفصیل سے کام لونگا۔ کیونکہ اس سے اس کتاب کے قارئین پر ایک نہایت ہی دلچسپ حقیقت روشن ہو گی۔ اور وہ یہ کہ وہ تمام بڑے بڑے منصبدارانِ حکومت جن کو بادشاہ ملک وملّت کے نام پر اتنی بڑی عزت بخشتا تھا۔ کس طرح مال ودولت کے جمع کرنے کی حرص وہوس میں اپنی عاقبت سے بے خبر ملک وملّت پر دودھارا چلا رہے تھے۔ اور کس طرح شب وروز ملک وقوم کی غارت گری اور لوٹ کھسوٹ میں مشغول تھے۔

حکومت نے یہ قاعدہ باندھا ہوا تھا۔ اور یہ قاعدہ کسی قدر تغیر کے ساتھ قدیم ہی سے چلا آتا تھا۔ کہ جب کبھی حکومت کو کسی چیز کی خریداری کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ ایک اعلان شائع کرتی تھی جس میں ٹھیکہ کرنے والے تاجروں کو اطلاع دی جاتی تھی۔ کہ وہ اس قدر تعداد یا مقدار ووزن کی اشیاء کی بہم رسانی کے لئے اپنے نرخ سے اطلاع دیں۔ اس کے بعد جب کسی ایک ٹھیکیدار تاجر کا نرخ محکمہ متعلقہ میں موصول ہو جاتا تھا۔ تو پھر دوبارہ اعلان شائع ہوتا تھا۔ کہ فلاں ٹھیکہ دار نے اپنا نرخ اتنا دیا ہے۔ اب اگر دوسرے ٹھیکہ دار اس کو کم کرنا چاہیں۔ تو فلاں تاریخ کو محکمہ میں حاضر ہو کر داوطلبی[1] کر سکتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر بہت سے ٹھیکیدار تاجر جمع ہوتے تھے۔ اور نرخ کو کم کرنا شروع کرتے تھے۔ بعض اوقات نرخ شرح بازار سے بھی کم کر دیا جاتا تھا۔ اور جس کا شرح سب سے زیادہ کم ہوتا تھا۔ اسی سے معاہدہ ہو جاتا تھا۔ اس طریقہ اجراء کو اگر میں شرح وتفصیل سے لکھنے بیٹھوں۔ تو کتاب کے حجم میں نامناسب طوالت کے واقع ہو جانیکا خوف ہے۔ لہٰذا اس سے عمداً پہلو تہی کرتے ہوئے صرف اسیقدر

---

[1] اس طریق سے نرخ کے کم کرنے کو داوطلبی کہتے ہیں۔

بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ کہ کسی ٹھیکہ دار سے قرار داد طے پاتے وقت تک حلقۂ تجار اور محکمہ متعلقہ کے درمیان کئی قسم کی سازشیں ہو ہو کر رہ جاتی تھیں۔ جب کہیں جا کر کسی ایک سے معاملہ ہوتا تھا۔

نرخ جو کچھ مقرر ہوتا تھا۔ وہ اپنی حالتِ ظاہری کے لحاظ سے ٹھیکہ دار کے لئے سوائے نقصان رساں ہونے کے کسی صورت میں بھی فائدہ مند نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پھر بھی یہی نرخ ہوتا تھا جس سے ایک طرف حکومت کا گھر بھی پورا کر دیا جاتا تھا۔ محکمہ متعلقہ کو بھی فرمائش کی قدر و قیمت کے اندازہ سے معقول کمیشن مل جاتی تھی۔ اور سوداگر یا ٹھیکیدار بھی مالا مال ہو جاتا تھا۔ محکمہ متعلقہ کے قریب قریب تمام اشخاص چھوٹے سے لے کر بڑے تک اپنا اپنا حصہ کمیشن لیتے تھے۔ کاتب یعنی میرزا جس نے قرار داد کو لکھا۔ مدیر جو محکمہ کا افسر ہے۔ وزیر جس کی وزارت کے ماتحت یہ محکمہ کام کرتا ہے محاسب جس نے وزارت مالیہ پر روپیہ حوالہ کرنا ہے۔ اور ٹھیکہ دار سے ضمانت لینی ہے۔ بجٹ کے افسران جنہوں نے بجٹ کی اس مد کو تحقیق کرنا ہے۔ جس مد میں روپیہ دیا جانے والا ہے۔ خزانچی جس نے روپیہ گن کر ٹھیکہ دار مذکور کو دینا ہے۔ تحویلدار جنسی جس نے ٹھیکیدار سے آرڈر کے مطابق مال اپنی تحویل میں لینا ہے وغیرہ وغیرہ۔ سب کے سب اپنے رتبہ اور اہمیت کار کے لحاظ سے مناسب معاوضے وصول کرتے تھے۔ اور ابھی ان کا یہ احسان کہ انہوں نے ٹھیکہ دار کو آرڈر دیا ہے۔ اس بیچارے کی گردن پر باقی رہتا تھا۔ غالباً یہ امر قارئین کرام کی حیرانی کا باعث ہوا ہو گا۔ کہ ٹھیکہ دار کس طرح ان سب کو راضی کر کے اپنے لئے کافی گنجائش نکال سکتا تھا۔ یقیناً مال یا جنس کی خریداری میں تو اس کے لئے کسی قسم کی گنجائش کا نکالنا ناممکنات میں سے تھا۔ اس کو متاع مذکورہ نرخ روز بازار پر ہی خریدنی پڑتی تھی۔ اور نقل و حمل کے کرایوں میں بھی

کسی معتدبہ تخفیف کا ہونا محالات سے تھا۔ بلکہ بعض اوقات اس کے قیاس اولین سے زیادہ کرایہ اس کو دینا پڑتا تھا۔ خرید مال اور نقل مال پر روپیہ صرف کرنے کے بعد اب اُسے صرف ایک جگہ اور روپیہ دینے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور روپیہ کی یہ مقدار بعض حالتوں میں نصف اور اکثر حالتوں میں اس ساری رقم کے ایک ثالث کے برابر ہوتی تھی۔ جو وہ اب تک خرچ کر چکا ہوتا تھا۔ یہ حکومت کا محصول درآمد ہوتا تھا۔ جو اسے مال کو کسٹم ہوس سے چھڑانے کے وقت ادا کرنا ہوتا تھا۔

مثالاً۔ ایک سوداگر نے اگر ایک لاکھ روپیہ کا مال ہندوستان سے خریدا ہے۔ اور اس کے کابل تک لیجانے میں بیس ہزار روپیہ اور صرف آگیا ہے۔ تو تقریباً تیس چالیس ہزار روپیہ اسے اور چاہیئے تاکہ مال کو کسٹم ہوس سے چھڑا کر محکمہ متعلقہ میں تحویل کر سکے۔ افغانستان میں کم سے کم محصول درآمد بیس سے تیس فیصدی تک تھا۔ اب وہ کسٹم ہوس کے افسران سے سازباز کر کے اور ان کو تین چار ہزار روپیہ بطور رشوت کے دیکر دس پندرہ ہزار روپیہ کی گنجائش نکال لیتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ اس بچت سے اس کا گھر پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ اور وہ ابھی گھاٹے ہی گھاٹے میں ہوتا تھا۔ اب وہ تحویلدار جس نے مال کو پورا کرکے اپنی تحویل میں لینا ہے۔ اور جس کے ساتھ اس کی گفتگو پہلے ہی سے طے پا چکی ہوتی تھی۔ اس کا سارا بار اپنی گردن پر اٹھانے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ اگر مال وزن کے لحاظ سے جانچا جاتا ہے۔ یا اعداد کے لحاظ سے شمار ہوتا ہے۔ تو اپنے اصلی وزن و تعداد سے بہت کم تحویلدار کے سپرد ہوجاتا تھا۔ ٹھیکیدار کو باقاعدہ رسید مل جاتی تھی۔ اور تحویلدار اس مال کے مصرف پا جانے تک کمی کو پورا کرکے دکھلا دیا کرتا تھا۔

عہد امانیہ کے شروع ہونے سے پہلے تک تو ملک میں تحویلداری خواہ وہ نقدی

کی ہو۔ یا جنسی کی۔ بہت ہی بُرے طرز پر قائم تھی۔ تحویل خانوں کا حساب پرانے طریق پر رکھا جاتا تھا۔ جس کو طومار بندی کہتے تھے۔ ایک ہی کاغذ پر حساب لکھا جانا شروع ہوتا تھا۔ اور جب وہ ختم ہو جاتا تھا۔ تو اس کے نیچے ایک دوسرا کاغذ چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ اب اس کی طوالت ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ اور یہ سلسلہ چل سو چل کے مصداق اپنی انتہا کے تعاقب میں درازتر ہوتا چلا جاتا تھا۔

امیر حبیب اللہ خاں کے عہد میں لمبے لمبے طوماروں کے ساتھ ساتھ رجسٹروں پر بھی حسابات لکھے جاتے تھے۔ لیکن حساب دانی کا طرز وہی پرانا تھا۔ اس بُرے طریق انتظام کا یہ نتیجہ ہوتا تھا۔ کہ اگر حکومت کا کوئی افسر اپنے عہدے سے برطرف ہو جاتا تھا۔ تو برسوں بعد تک اس کے حسابات کی جانچ پڑتال جاری رہتی تھی۔ اگر وہ خود سوءِ اتفاق سے مر جاتا تھا۔ تو پھر اس کے بیٹے اور رشتہ داروں سے اس کے کئے دھرے کی جواب دہی طلب کی جاتی تھی۔ اور جب تک محکمہ متعلقہ سے قطعی طور پر فارغخطی حاصل نہ کر لی جاتی تھی۔ اس کو یا اس کے خویش و اقارب کو آرام و چین نصیب نہ ہوتا تھا۔ حکومت کے پیادے ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ تاکہ اسے یوستیہ دفتر میں لے جائیں۔ جہاں وہ اپنا حساب درست کرتا۔ اور اپنے حساب گیر کو سمجھاتا تھا۔ مشکل سے کوئی شخص ایسا نکلتا تھا۔ جو اس قدر سالوں کی خاک چھنوائی کے بعد حکومت کا باقی دہ نہ نکلے۔ ورنہ عام طور پر سب کے سب حکومت کے قرضدار نکلتے تھے۔ اور جب ایسے اشخاص قرضدار ٹھیرائے جا چکتے تھے۔ تو حکومت کی طرف سے ان پر محصل یعنی روپیہ وصول کرنے والے مقرر ہو جاتے تھے اور اب یا وہ نقد روپیہ حکومت کو ادا کر کے چھٹکارا حاصل کرتا تھا۔ اور یا پھر اس کی جائداد ضبط کر لی جاتی تھی۔

اس صورتِ اجرا کو دیکھتے ہوئے قارئین بذاتِ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تحویلدار

کس اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ ٹھیکہ داروں سے حکومت کا مال اپنی تحویل میں لیتے وقت معاملہ کر سکتے تھے۔ عہد امانیہ میں اگرچہ پرانی حساب دانی یک قلم موقوف کی جا چکی تھی۔ اور اس کی جگہ حساب رکھنے کا جدید طرز رائج کر دیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ہر ایک وزارت میں جداگانہ محکمہ تفتیش بھی قائم ہو چکا تھا۔ اور ان اشخاص کے علاوہ جو سابقہ حکومتوں کے باقیدہ تھے۔ جتنے نئے اشخاص موقوف ہوتے تھے۔ ان سے اسی وقت حساب بھی لے لیا جاتا تھا۔ اور بعض حالتوں میں حکومت ان اشخاص کے برخلاف تعزیری کارروائیاں بھی روا رکھتی تھی۔ جن کی تحویل سے نقد و جنس بروقت برآمد نہ ہوتا تھا۔ اور اموال و اجناس کی خریداری کے پہلے طور و طریق میں بھی اب کچھ کچھ اصلاح ہو چکی ہوئی تھی۔ تاہم ان اصلاحات کے باوجود ابھی تک حکام کا یہ ذریعۂ آمدنی مسدود نہیں ہو سکا تھا۔ بلکہ اس میں پیشتر کی نسبت بہت زیادہ ترقی ہی ترقی نظر آ رہی تھی۔ مختلف قسم کے اموال و اجناس کے لئے حکومت کی مانگ پہلے وقتوں سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہوئی تھی۔ اور مقامی تاجروں کے پہلو بہ پہلو اب خارجی تاجر بھی موجود ہو گئے ہوئے تھے۔ جو تجارت کے جدید اصولوں سے واقف ہونے کے علاوہ حکومت کے نظریہ و خواہش کے مطابق براہِ راست یورپ سے مال منگوانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہر وزارت مکلف تھی۔ کہ جہاں وہ بذریعہ اعلان ملک کے طبقۂ تجار کو مال مطلوبہ کی بہم رسانی کے لئے دعوت دے وہاں ان خارجی[1] تاجروں کو بھی جداگانہ اطلاع دیکر ان سے قیمتیں طلب کرے۔

ان خارجی تاجروں نے ایک دو معاملوں ہی میں بھانپ لیا تھا۔ کہ افغانستان میں کامیاب تجارت کرنے کے لئے حکومت کے محکموں اور اداروں کو خوش رکھنے

---

[1] جرمن جرمنی کی ایک مشہور فرم نے یہاں اپنی ایک کوٹھی کھول رکھی تھی۔ جس کا حکومت افغانستان سے معاہدہ تھا۔ اسکا نام شرکت آلمان با افغانستان رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی کمپنیاں تھیں جو

کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایسے اموال کی بہم رسانی کے لئے جن کو دوسرے مقامی اور اور ملکی تاجر براہ راست یورپ سے نہیں منگوا سکتے تھے۔ وہ بلاد غدغہ اپنے آپ کو پیش کرتے تھے۔ اور جونسی قیمتیں وقت کے لحاظ سے مناسب دیکھتے تھے۔ لگا کر بھیج دیتے تھے۔ ان قیمتوں میں محکمہ یا وزارت متعلقہ کے افسروں کی باقاعدہ فیصدی کمیشن مقرر ہوتی تھی۔ اور حکومت کی طرف سے روپیہ کی پہلی قسط کی ادائگی کے ساتھ ہی ان کو مل جایا کرتی تھی۔ ان مثالوں کا تخمینہ لگاتے ہوئے جن کا مجھے بذات خود علم ہے۔ یہ کمیشن عام طور پر مال کی مجموعی لاگت کا چالیس سے لے کر ساٹھ فیصدی تک ہوتی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اس کمپنی یا تاجر کا اپنا منافع کتنے فی صدی ہوگا۔ جسے حکومت کو مال سپلائی کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لینے کی اس قدر کثیر اجرت ادا کرنی پڑتی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں۔ کہ اب مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کہ وزارتیں ان قیمتوں کو منظور کرلیتی تھیں۔ اور ٹھیکیدار مال منگوا کر حکومت کے انبار خانوں میں ڈھیر کردیتے تھے۔ اگر اتفاق سے کسی مقامی تاجر کو ایسا ٹھیکہ مل جاتا تھا۔ تو وہ درپردہ انہی خارجی کمپنیوں اور فرموں کی معرفت مال منگوا کر بہم پہونچایا کرتا تھا۔ اور اس دوہرے منافع کو جو اسے ایک اپنے لئے اور ایک اس خارجی تاجر یا کمپنی کے لئے حاصل کرنا پڑتا تھا۔ وہ محکمۂ متعلقہ کے انجنیئر اور تحویلدار دونوں سے ساز باز کرکے نکال لیا کرتا تھا۔ ڈرتا ہوں کہ میرے قارئین محترم پر یہ طویل بیانی گراں ثابت نہ ہوئی ہو۔ اس لئے افسرانِ حکومت کی اس اہم مد کے متعلق جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے۔ اسی کو مکتفی سمجھتا ہوں :۔

اہلکاروں کی براہ راست رشوت ستانی ان کی آمدنی کا تیسرا صیغہ تھا۔ جو وہ اپنے اپنے محکموں کے متعلقہ حلقوں میں عام رعیتی لوگوں سے وصول کرتے تھے۔ مگر ضروری ہے۔ کہ اس کی شرح کرنے سے پہلے قارئین پر عہد غازی سے قبل

حکومت کا طور و طریق کسی حد تک واضح کیا جائے :

ان ایام میں حکومت ان بڑے بڑے چار محکموں میں تقسیم تھی :-

(۱) مستوفی الممالکی - (۲) گورنریاں - (۳) کوتوالی - (۴) قضاۃ ۔

مستوفی الممالکی ملک کے تمام ذرائع آمدنی و اخراجات مستوفی الممالک سے متعلق ہوتے تھے - جو شخص اس عہدہ پر مامور ہوتا تھا - اس کے فرائض میں سلطنت کے آمد و خرچ کا کل حساب و کتاب - خزانہ داری ، مالیات و محصولات کی وصولی ، تنخواہوں اور دیگر ضروری روپیہ کی ادائگی اور ملک کے طول و عرض یعنی صوبوں اور اضلاع میں اپنے ماتحت عملے کی نگرانی وغیرہ وغیرہ شامل ہوتا تھا - علاوہ بریں رعیت کے درمیان جائدادوں اور زمینوں وغیرہ پر جو تنازعات وغیرہ اٹھا کرتے تھے - قاضی کی مدد سے ان کا فیصلہ کرنا بھی اسی کا کام شمار ہوتا تھا - اور محکمہ کوتوالی کے ذریعہ ان اشخاص کا طلب کروانا جن کے ذمہ حکومت کا روپیہ باقی نکلا کرتا تھا - اور ان سے حکومت کا روپیہ وصول کرنا بھی اسی کے فرائض میں تھا - چند لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے - کہ مستوفی الممالک اپنے محکمہ خاص کے سوا دو اور محکموں یعنی کوتوالی اور قضاۃ پر بھی حکمراں ہوتا تھا - اب چونکہ افغانستان میں زمینوں اور جائدادوں پر لوگوں میں آئے دن ہنگامے اور فساد ہوتے رہتے تھے - اور جہالت کی وجہ سے ذرا ذرا سی بات کا دم بھر میں بتنگڑ بن جانا کوئی اچنبھا نہ سمجھا جاتا تھا - لہذا فریقین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے حکومت کے پاس آکر فریادی ہوتے تھے - جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا - کہ دونوں طرف سے قاضی ، کوتوال اور مستوفی الممالک یا اس کے ایجنٹوں کو خوب خوب رشوتیں اور نذرانے چڑھتے تھے - اور آن

کی آن میں دونوں فریقوں کا خون اچھی طرح نچڑ جاتا تھا۔ اس طرح جن اشخاص کے ذمہ حکومت کا کچھ باقی ہوتا تھا۔ وہ بھی علی المراتب مستوفی الممالک کے حساب گیروں اور کوتوال کے پیادوں اور افسروں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر اپنی جان چھڑانے پر مجبور ہوتے تھے۔ قارئین کو یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ غازی امان اللہ خان کی تخت نشینی پر جب امیر حبیب اللہ خان کے مستوفی الممالک محمد حسین کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ تو اس کی بیش قرار غیر منقولہ جائداد کے علاوہ محض نقد روپیہ جو اس کے گھر سے برآمد ہوا۔ اس کی تعداد دس کروڑ تھی۔ اور آپ کی حیرت میں یہ سُنکر اور بھی اضافہ ہوگا۔ کہ اس وقت ملک کی مجموعی آمدنی دس کروڑ روپیہ سالانہ سے کسی طرح زائد نہ تھی۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

گورنریاں۔ صوبہ جات کے گورنر ملکی اور نظامی اختیارات رکھتے تھے یعنی سول کے اعلےٰ حاکم ہونے کے علاوہ فوج کے اعلےٰ افسر بھی وہی ہوتے تھے۔ اور اگرچہ یہ اپنے صوبوں میں ان امور میں بھی مداخلت کرنے سے باز نہ رہتے تھے۔ جو مستوفی الممالک کے فرائض کے تحت میں شمار ہوتے تھے۔ تاہم اس کے سوا ملک میں جو آئے دن قتل و خون کی وارداتیں، ڈاکہ زنیاں، قوم داریوں کے نت نئے فتنے۔ نام زادوں کے لئے ہنگامہ ہائے دار و گیر اور ہشت نفری وغیرہ وغیرہ جیسے اہم معاملات ان کی دراز دستیوں کے لئے کچھ کم وسیع نہ ہوتے تھے۔ یہاں ڈاکہ زنیوں کے انسداد کے سلسلہ میں ایک نہایت ہی لطیف نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر صوبے کا گورنر اپنے ساتھ ہمیشہ ایک مختصر سی جماعت اُن اشخاص

کی بھی رکھا کرتا تھا۔ جو پہلے کسی زمانہ میں خود ڈاکہ زن رہ چکے ہوتے تھے۔ یہ جماعت اس مطلب کے لئے رکھی جاتی تھی۔ کہ اس سے اپنے اپنے علاقوں کے ڈاکوؤں کے پکڑوانے کی خدمت لی جائے۔ ایسے اشخاص کو وزدگیر کہا کرتے تھے۔ اور آپ یہ سُن کر تعجب نہ کریں۔ اگر میں یہ کہوں۔ کہ اکثر کوتاہ اندیش اور طامع حاکم انہی کی وساطت سے اصل ڈاکوؤں سے ساز باز کرکے ہر ڈاکہ میں اپنا حصّہ ان سے وصول کیا کرتے تھے۔

قارئین نے اوپر دو اسم نامزاد اور ہشت نفری کے پڑھے ہیں۔ شاید ان کو پتہ نہ چلا ہو۔ کہ ان سے کیا مراد ہے۔ لہذا ان کے متعلق ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے بعد اس بیان کو ختم کرونگا۔

افغانستان میں بجنسہٖ ہمارے ہاں کی طرح شادی سے پہلے منگنی کی جاتی ہے۔ منگنی شدہ لڑکی کو اس کے بننے والے شوہر کی نامزاد کہکر پکارا جاتا ہے۔ ہمارے اور ان کے رواج میں صرف اتنا فرق ہے۔ کہ ہمارے ہاں منگنیاں آسانی سے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ مگر وہاں یہ نامزد مرد کے لئے ننگ و غیرت کا معاملہ ہے۔ وہ مر جائیگا۔ کٹ جائیگا۔ مگر اپنی نامزاد کو دوسرے سے بیاہ ہوتے نہیں دیکھ سکیگا۔ چنانچہ ملک میں بعض مخصوص حالتوں کے ماتحت ایسے واقعات آئے دن ہوتے ہی رہتے تھے۔ جس میں کسی کی نامزاد کو کوئی دوسرا لے جانا چاہتا تھا۔ ایسی حالت میں اصل فریق حکومت کے پاس آکر فریادی ہوتا تھا۔ یا جھوٹ موٹ ایک فریق اپنے آپ کو اصل نامزد قرار دے کر بیچارے حقیقی نامزد کے برخلاف دعوٰی دائر کر دیتا تھا۔ ان حالات میں حاکموں کی خوب بن آتی تھی اور وہ دونو فریقوں کو خوب نتھار کر کسی ایک کے حق میں فیصلہ کر دیتے تھے۔

ہشت نفری۔ افغانستان میں فوجوں کے لئے رنگروٹ حاصل کرنے کا یہ طریقہ تھا۔ کہ آبادی کے ہر آٹھ آدمیوں کے بعد ایک آدمی لازمی طور پر فوج میں لیا جاتا تھا۔ اور ہر دو سال کے بعد ایسے آدمیوں کے نام کا قرعہ نکالا جاتا تھا۔ پہلے پہل ملکوں اور خوانین کے ذریعہ آدمی بھرتی کئے جاتے تھے۔ لیکن وہ بھی اپنے ماتحت قبائل میں سے نوبت بہ نوبت اسی طرح بھرتی فراہم کیا کرتے تھے۔ بعد میں اس کا تعلق براہ راست حاکموں سے ہوگیا تھا۔ جو خود اپنی زیر نگرانی قرعہ جسے فارسی میں پشک کہتے ہیں۔ نکلوایا کرتے تھے۔ اور جن کے نام پشک نکل آتی تھی۔ ان کے ناموں کی فہرستیں مرتب کرکے ملکوں کے حوالے کردی جاتی تھیں۔ عام طور پر ایسے آدمی کثرت سے نکل آتے تھے۔ جو کسی نہ کسی وجہ سے فوج میں خدمت کرنے سے بچنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے وہ یا تو مچلکہ شرعی پیش کرکے اس آفتِ ناگہانی سے اپنی خلاصی کرواتے تھے۔ اور یا کسی دوسرے کو اپنے عوض میں پیش کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں ان کو بہت کچھ رشوت میں دینا پڑتا تھا۔

ایک ضروری بات اور رہ گئی ہے۔ جس کے بطور یادداشت ذہن نشین کروانے کے بعد ہم اپنے قارئین کی توجہ کو عمال حکومت سے پھیر کر خوانین و ملک کے طائفہ کی طرف منعطف کرینگے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ غازی امان اللہ خان کے عہد سے پہلے افغانستان میں ملازمینِ حکومت کو چھ چھ ماہ ایک ایک سال بعد تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔ اس کی وجہ صاف طور پر حکومت کی مجبوری معلوم ہوتی تھی۔ مالیات نقدی کی بجائے جنس میں وصول ہوتے تھے۔ محصولات تاجروں کے ذمہ کئی کئی سالوں سے باقی چلے آتے تھے۔ حکومت اور تاجروں میں بعینہٖ وہی معاملہ جاری تھا جس طرح ہمارے ملک میں بڑے بڑے کو ٹھیدار

تاجروں اور انکے گاہک تاجروں کے درمیان جاری ہے۔ یعنی پچھلی رقوم ابھی ان تاجروں کے ذمہ باقی ہوتی ہیں۔ کہ اوپر سے اور مال ان کو دے دیا جاتا ہے اور ابھی وہ اس کو ادا کرنے نہیں پاتے۔ کہ اور مال وہ کوٹھی دار تاجروں سے منگوا لیتے ہیں غرضکہ ان مجبوریوں کی بناء پر حکومت اپنے ملازمین کو لمبے وقفوں کے سوا ماہ بماہ تنخواہیں نہ دے سکتی تھی۔ مگر اس کا اثر ملازمین حکومت پر یہ ہوتا تھا۔ کہ وہ حکومت کے کاردار ہوتے ہوئے قرض اٹھا کر گذارہ کرنے کو بزدلی اور نامردی سمجھتے تھے اور انکی حسیات انہیں ناجائز وسائل سے روپیہ پیدا کرتے رہنے کے اطراف میں اُنکی مدام رہبری کرتی رہتی تھیں *

خوانین و ملک۔ افغانستان میں خوانین اور ملک کا طبقہ ملک کی سیاسی اور سوشل زندگی میں نمایاں خصوصیت رکھتا رہا ہے۔ امیر عبدالرحمن کے تخت افغانستان پر متمکن ہونے سے پہلے طوائف الملوکی اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ ان خوانین و ملکوں کے پاس بڑی بڑی جاگیریں ہوتی تھیں۔ اور اپنے اپنے علاقہ اثر میں یہ ایک خود مختار نواب یا راجہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے پاس جو کاشتکار ہوتے تھے۔ وہ ان کی اپنی رعیت کہلاتے تھے۔ اور وہ جس طرح چاہتے تھے ان سے سلوک روا رکھتے تھے۔ ملک کے بادشاہ کو انہیں سالانہ نقد و جنس کی صورت میں ایک مقررہ خراج ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور ضرورت کیوقت لشکر سے اس کی مدد کرنی پڑتی تھی۔ ہر ایک خان اپنی حفاظت کے لئے لڑاکے ملازم رکھا کرتا تھا۔ جن کا "غیر از جنگ" یہ کام بھی ہوتا تھا۔ کہ وہ بطور پولیس کے اپنے خان کی ہدایات کو اس کے علاقہ کے اندر تکمیل کریں۔ یعنی کسی شخص یا اشخاص کو گرفتار کر کے جوابدہی کے لئے خان کے روبرو پیش کرنا اور بحکم خان اس کی سرکوبی کرنا یا خان کے برخلاف عصیان و بغاوت کرنیوالے کا گھربار

ضبط و تاراج کرنا وغیرہ ان کے فرائض میں شامل تھا۔ امیر عبدالرحمن خان نے طاقت پکڑتے ہی ان کا زور توڑنا شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی سلطنت کے آخری ایام میں طبقہ خوانین اور ملک کی حاکمانہ حیثیت گم ہو چکی تھی۔ اب نہ خان اپنی علیحدہ فوج رکھ سکتا تھا۔ اور نہ بغیر امیر کے حکم کے کسی کو سزا دے سکتا تھا۔ امیر کی طرف سے ہر جگہ حاکم مقرر ہوتے تھے۔ جو امیر کے احکام کو عملی جامہ پہناتے تھے۔ دراصل طوائف الملوکی کے خاتمہ کی طرف امیر دوست محمد خان کے وقت سے اقدام کیا گیا تھا۔ مگر امیر دوست محمد خان اور امیر عبدالرحمن خان کے عہد کے درمیانی وقفوں میں بوجہ جلد جلد بادشاہ گردی واقع ہوتے رہنے کے ملک میں طوائف الملوکی پھر اپنے پاؤں پر آ رہی تھی۔ کیونکہ ہر نئے دعویدار سلطنت کو خوانین کی امداد کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور اس لئے اس کو ان کا لحاظ اور مراعات روا رکھنی پڑتی تھیں۔ لیکن امیر عبدالرحمن خان کی مضبوط اور آہنی حکومت نے ان کو پھر اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہونے دیا۔ اور ہمیشہ کے لئے ان کے گذشتہ زور و طاقت کا خاتمہ کر دیا۔ اب اگر وہ ماضی کی طرح مطلق العنانی کے فوائد سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم ان کا اپنے اپنے قبائل پر اثر و اقتدار اب بھی مسلّم تھا۔ اور بادشاہ ان کے ذریعے ان کے زیر اثر قبائل کو رام اور مطیع رکھنے کے لئے ان کی ہستی برقرار رکھنے پر مجبور تھا۔ دوسری طرف وہ بادشاہ کی طاقت کو اپنی محدود طاقت کے بالمقابل وسیع پاکر بجائے اس سے سرکشی اور تمرد سے پیش آنے کے اس کی رضاجوئی کو اپنی ہستی کی حفاظت و بقا کے لئے مقدم سمجھتے تھے۔ اور اس مطلب کے لئے وہ ان حاکموں کو بادشاہ کے حضور میں اپنا وسیلہ بنانے لگ گئے تھے۔ جو بادشاہ کی طرف سے ان کے علاقوں پر مقرر ہو کر آتے تھے۔ حاکم طبقہ بھی اپنی نیکنامی، شہرت اور بادشاہ کی رضامندی کے حصول کی خاطر

خوانین سے مل جل کر رہنے پر مجبور تھا۔ کیونکہ اگر کوئی حاکم اپنے علاقہ کے خوانین سے بگاڑ رکھتا تھا۔ تو یا تو وہاں کے باشندوں کے ہاتھوں قتل کروا دیا جاتا تھا۔ اور یا پھر خوانین مختلف حیلوں حوالوں سے اس کو بادشاہ کے حضور میں بدنام کرنے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ اور اس کے برخلاف جبر و ستم سے حکومت کرنے اور لوگوں سے رشوتیں لینے کے الزامات عاید کرتے رہتے تھے۔ اور بالآخر اگر وہ دیکھتے تھے۔ کہ ان کا پروپیگنڈا اب تک کارگر ثابت نہیں ہوا۔ تو وہ ایک لمبا چوڑا محضر اس کے برخلاف تیار کرتے تھے۔ اور اس پر اپنے قبیلہ کے ہر فرد کی مہریں ثبت کر کے اس کو بادشاہ کے پاس بھیج دیتے تھے پس اکثر کار حاکم طبقہ ان خطرات سے دوچار نہ ہونے کی خاطر خوانین سے ساز باز کئے رکھتا تھا۔ اور ملک پر حکومت کرنے کے لئے ان کی شخصیتوں کو استعمال کرتا رہتا تھا۔ خوانین کا طبقہ بھی اپنی اندرونی رقابت کے باعث اپنے حاکموں کو مختلف طریقوں سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ ان کو قیمتی تارتق دیتا تھا۔ ان کی شاندار ضیافتیں کرتا تھا۔ اور ان کے لئے آمدنی کے جائز و ناجائز وسائل مہیا کرتا تھا۔ اس طرح اپنے آپ کو حاکموں کا دوست بنا کر خوانین کا طبقہ اپنے علاقہ میں من مانی حکومت کرنے کے لئے اپنے ہاتھ آزاد کر لیتا تھا۔ کسی علاقہ میں حاکم اور خان ہی دو ایسے عنصر تھے۔ جو ساری آبادی کو اپنے وزن کے نیچے دبائے رکھتے تھے۔ خان کی شخصیت دیرینہ روایاتِ قومی کی پابند چلی آتی تھی۔ اسکو مختلف موقعوں پر مختلف رسوم و فرائض ادا کرنے پڑتے تھے۔ جو کسی طرح بھی اس کی جائز آمدنی سے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ درجہ میں وہ جتنا بلند ہوتا تھا۔ اتنا ہی اس کا دسترخوان بھی وسیع ہونا لازمی تھا۔ یومیہ سنوں اناج اسے اپنے دسترخوان پر چننے کے لئے خرچ

کرنا پڑتا تھا۔ اس کے اصطبل میں اگر بہت نہیں۔ تو بیس تیس گھوڑے ضرور بندھے ہوئے ضروری تھے۔ اور کئی گائے بھیڑیں بیل خر اونٹ وغیرہ اسے اپنی یومیہ ضروریات کے پورا کرنے کے لئے رکھنے پڑتے تھے۔ اس کی رشتہ داریاں کثیر ہوتی تھیں۔ کم از کم چار پانچ لونڈیاں اور تین چار نکاحی عورتیں اس کے حرم میں موجود رہتی تھیں۔ اس کو اپنے تحفظ کے لئے سینکڑوں بندوقیں خریدنی پڑتی تھیں۔ اور یہ بندوقیں اعلےٰ قسم کی انگریزی ساخت کی ہونی لازمی تھیں۔ جنہیں فوجی سپاہی استعمال کیا کرتے تھے۔ ہر ایک ایسی بندوق کی قیمت افغانستان میں ایکہزار روپیہ سے دو ہزار روپیہ تک تھی۔ اب اگر کسی خان کے پاس اقلاً پچاس[۵۱] بندوقیں ہوتی تھیں۔ تو اس کو ان کی خرید پر ستر پچہتر ہزار روپیہ کابلی خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اس نسبت سے اسے گولی بارود قطارو زمہ[۵۲] چپلی وغیرہ ضروری سامان رکھنا ہوتا تھا۔ اس کے بھائی بہن لڑکے لڑکیاں اور نزدیک و دُور کے رشتہ دار کثیر تعداد میں ہوتے تھے۔ جنہیں اس کو رسم و رواج کے مطابق بہ لحاظ ان کے مراتب کے کچھ دینا پڑتا تھا۔ علاوہ بریں حاکموں اور بادشاہ کو ان کی خورسندی مزاج حاصل کرنے کے لئے تحفے تحائف دینے ضروری ہوتے تھے۔ اسے شاہی دربار میں درباریوں اور بادشاہ کے منظور نظر منصبداروں سے بھی تعلقات رکھنے پڑتے تھے۔ اور ان تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے انہیں سالانہ گھی، گائے، اُونٹ، اجناس اور استعمال کی دوسری اشیاء کی صورت

---

۵۱ میر زمان خان کنڑی کے پاس جب وہ کابل میں بحیثیت ایک نظربند کے لایا گیا۔ تو گیارہ سو بندوقیں موجود تھیں۔

۵۲ قطارو زمہ اس پیٹی کو کہتے ہیں جس میں کارتوس ٹکے ہوتے ہیں۔

میں سوغاتیں بھی بھیجنی پڑتی تھیں۔ اور پھر اگر اندرونی رقابتوں کے باعث دوسرے خوانین کے ساتھ اس کے جھگڑے اور دعوے شروع ہوتے تھے۔ (جیسا کہ یہ وبا، وہاں عام تھی) تو اس پر اسے مختلف چالیں چلنے اور ریشہ دوانیوں کے لئے بہت سا روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ خان میں سخاوت فیاضی اور دریا دلی کی صفت بھی ہونی چاہئے تھی جس صفت کا اسے تقریباً ہر روز عملاً اظہار کرنا پڑتا تھا۔ وہ وہاں کے مقامی ملّانوں اور پیروں سے بھی وابستہ ہوتا تھا۔ جن کا وہ معتقد ہوتا تھا۔ اور اسے ہر سال بہت سا نقد و جنس ان پیروں کی نذر کرنا پڑتا تھا۔ پیر اور ملّا نے اس کی شہرت کو چمکانے میں مدد دیتے اور وقت پڑے پر حاکموں کے پاس اس کے کام آتے تھے۔ اس کے جائز و ناجائز کاموں کو سراہتے تھے اور اس مطلب کے لئے فتوے دیتے تھے۔ ان کے امور دینی و دنیوی کے بخیر و خوبی انجام ہونے کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرضکہ اسی قبیل کے بہت سے اور اخراجات طبقۂ خوانین کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ جنہیں وہ کسی صورت میں بھی اس آمدنی سے پورا نہیں کر سکتے تھے۔ جو زمینوں کی کاشت کے ذریعہ سے انہیں ہر سال میسّر ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ قرض اٹھانے کے علاوہ مختلف ذریعوں سے اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حکومت کا مالیہ ادا کرتے وقت جو قبل از عہد امانیہ جنس میں ہوا کرتا تھا۔ حاکموں سے ساز باز کر لیتے تھے۔ اور کم سے کم مالیہ ادا کرتے تھے۔ اپنے دہقانوں اور کسانوں کو اچھی طرح نچوڑتے تھے۔ حاکموں کے ساتھ مل کر حکومت کے مال و اموال میں غبن اور خیانت کرتے تھے۔ حاکموں کے لئے رشوت کے ذرائع پیدا کر کے ان میں خود اپنا حصّہ ٹھہراتے تھے۔ کمزور گروہ محض اپنی حفاظت اور مامونیت کیلئے

خوانین کو بھاری نذرانے دیتے تھے۔ وہ اپنے علاقوں سے گذرنے والے تجارتی قافلوں سے رسومات وصول کرتے تھے۔ اور اگر یہ سب کچھ ان کے اخراجات اور حرص کی حدت بجھانے کے لئے مکتفی نہ ہو۔ تو پھر ڈاکوؤں سے بھی ساز باز کرلینے میں انہیں باک نہ ہوتا تھا۔ بجائے اس کے کہ خوانین کا طبقہ اپنے وسائل آمدنی کو جائز طریقہ پر بڑھانے کی کوشش کرتا۔ ملک میں ایک زبردست اور منظم حکومت نہ ہونے اور علم وعرفاں کی روشنی نہ ملنے کے باعث ماحول کے ان اثرات کے نیچے دبا پڑا رہا۔ جو قدیم سے فضا کو تاریک تر بنائے ہوئے تھے۔ اس سے نچلے طبقات اپنی لاعلمیت اور پست خیالی کے لحاظ سے اور بھی زبون حالی میں گرفتار تھے۔ علم کی غیر موجودگی اور جہالت کی فراوانی نے ان کے رہے سہے ہوش وحواس بگاڑ رکھے تھے۔ وہ اپنی سوشل زندگی میں خونخوار بھیڑئیے کی مانند تھے، اور کیوں نہ ہوتے۔ جبکہ زندگی کا کوئی صحیح اور روشن نصب العین ان کے سامنے موجود نہ تھا۔ وہ زمینداری یا ہاتھ کی دستکاری سے جو کچھ بصد مشکل پیدا کرتے تھے۔ اس کا غالب حصہ ان کے خوانین اور حاکموں کی نذر ہوجاتا تھا۔ اور انہیں کوئی مفر نہ ہوتا تھا۔ اور جب وہ اچھی طرح تباہ ہو چکتے تھے۔ تو کسی نہ کسی کو اپنی تباہی کا موجب سمجھکر اسی کے درپے آزار ہوجاتے تھے۔ اور اس انتقام کی ہوس میں ان سے قتل وغیرہ کی وارداتیں سرزد ہوجاتی تھیں۔ اور سیاستِ پادشاہی سے بچنے کے لئے انہیں لازماً ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ جسے وہ یاغی گری کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ اور چونکہ زندگی کا کوئی بہترین مقصد ان کے سامنے موجود نہ ہوتا تھا۔ اس لئے ان کی طبیعتیں ہمہ وقت اشتعال کو قبول کرلینے کے لئے تیار رہتی تھیں۔ اور برائیوں اور ہر طرح کے ظلم کی طرف اقدامات کرنے کی

خوگرانہ صفت ان میں پیدا ہو چکی تھی۔

اپنے مآل کار کو سوچے بغیر ان کا اپنے سے ذی اثر لوگوں کے کہے پر عمل کرنے لگ جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ گو یا وہ اپنے با اثر خوانین ملک یا حاکموں کے ہاتھوں میں ایک کٹ پتلی کی مانند تھے۔ وہ جس طرح انہیں چاہتے تھے۔ اپنی مطلب برآری کے لیئے استعمال کرتے رہتے تھے۔ ان میں انفرادی طور پر مقاومت کی طاقت اور سکت مطلق موجود نہ تھی۔

ملک کی سوشل زندگی کا کم دبیش یہ نقشہ تھا۔ جسے غازی امان اللہ خان نے بدلنا تھا۔ وہ اپنے دہ سالہ قیام حکومت میں اس کو ہرگز بدل نہیں سکتے تھے۔ اور اگرچہ انہوں نے حریت شخصی کی روح پھیلا دی تھی۔ لیکن یہ ابھی مرکزوں اور ان کے نواحیات تک ہی محدود تھی۔ دور رس مقامات پر ابھی ان کی ہوا تک کا گذر بھی نہیں ہوا تھا۔ اور اگرچہ سول سروس یعنی ملکی خدمات کو فوجی خدمات سے بالکل جدا کر دیا گیا تھا۔ اور ہر جگہ وزارت داخلہ کے ماتحت گورنر حاکم وعلاقہ دار اور وزارت مالیہ کے ماتحت سر رشتہ دار مال (کلکٹر) اور وزارت تجارت کے ماتحت مدیر گمرک (کسٹم آفیسر) اور وزارت عدلیہ کے ماتحت قاضی (جج) وغیرہ ہر گوشۂ ملک میں مقرر تھے۔ تاہم ابھی ایک طویل مدت درکار تھی۔ کہ وہ قبائل کے عام افراد کو بجائے خوانین کے توسط کے راساً عمال حکومت کی طرف متوجہ یا مربوط کر سکتے۔ خوانین کا اثر اب بھی بڑی حد تک موجود تھا۔ اور حاکم ان کا لحاظ یا ان سے اتحاد کیئے بغیر اپنا کام نہیں چلا سکتے تھے۔

چند بار بعض خاص موقعوں پر بعض قدیمی خاندانوں کے خوانین کی سرکشی توڑنے میں حکومت نے اقدامات ضرور کیئے۔ اور عام رو بڑی تیزی سے ان کے اثرات کے زوال کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تاہم یہ ابھی قبل از وقت تھا۔ مثال کے طور پر قندہار کے بعض شوریدہ سر خوانین جو باہمی رقابت اور مخاصمت کے اسباب کی بنا پر حکومت کے

احکام کی اکثر پرواہ نہ کرنے کے علاوہ ایک دوسرے پر ڈاکے ڈلوانے بلکہ یہاں تک کہ خود ان میں بہ نفس نفیس حصہ لینے سے باز نہیں آتے تھے قبل از دورۂ یورپ غازی امان اللہ خان نے خود قندھار سے پنج کران کا استیصال اور قلع و قمع کرنے میں دریغ نہیں کیا تھا +

مگر خوانین کا وہ طبقہ جو حکومت سے ساز باز رکھتا تھا ۔ سیاستِ حکومت سے بالکل محفوظ رہتا تھا ۔ اور وہ اگرچہ حکومت کے احکام کو اسی طرح پس پشت ڈالتا رہتا تھا جس طرح کہ سرکش طبقہ خوانین مگر محض اس وجہ سے کہ وہ اپنے آپ کو حکومت کا طرفدار مشہور کرتا تھا ۔ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اپنے رقیبوں کو ہر طرح کے ظلم و جور کا تختہ مشق بنانے سے ہرگز گریز نہیں کرتا تھا ۔ مثال کے طور پر مشہور خان زمان خان کنڑی (علاقہ جلال آباد) جو ایک معمولی درجہ سے ترقی کر کے خان بن گیا تھا ۔ اور جس کا ذکر انقلاب افغانستان کے باب میں ضرور آئے گا ۔ پورا ظالم اور فاسق انسان تھا ۔ اس نے اپنے ہی علاقہ کے مالک کاشتکاروں پر ظلم کر کے اپنی جاگیر کو از حد زیادہ وسیع کر لیا تھا ۔ اور علاوہ ایک خاص تعداد میں سپاہی ملازم رکھنے کے اپنی نوبت و نقارے[۱] بھی رکھتا تھا ۔ نہ صرف یہی بلکہ خود ہی لوگوں کو تعزیر و حبس کی سزائیں بھی دیتا تھا ۔ اور حکومت عمداً اس سے چشم پوشی کرتی تھی ۔ غرضکہ حکومت کا اساس اگرچہ غالب ہو رہا تھا تاہم خوانین کا اثر ابھی بالکل محدود نہیں ہوا تھا ۔ ان کے پاس تھوڑی بہت طاقت بھی تھی ۔ اور قبائل پر اثر بھی +

مگر نہ اتنا کہ عام رعیت کو حکومت کے برخلاف کھلم کھلا بغاوت پر کھڑا کر سکیں ۔ لیکن پرانے رواج و اثرات کے ماتحت ان کی یہ تھوڑی سی طاقت اور اثر بھی عام

[۱] پہلے خان اپنے ہاں نوبت و نقارے بھی رکھا کرتے تھے ۔ جو امیر عبدالرحمٰن خان نے یکسر موقوف کر دیئے تھے اور اب تک موقوف ہیں +

لوگوں کی ترقی و تعالی کے سد راہ تھا۔ کیونکہ انہیں سوائے اپنے اور اپنی اولاد یا متعلقین کے کسی کی بہبودی مدنظر نہ تھی۔ ان کے ہاں بہبودی کے کچھ اور ہی معنی لئے جاتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے۔ کہ قبیلہ کا خان اگر خوشحال اور فارغ البال ہے۔ تو اس کے ماتحت قبیلے سب کے سب اچھی حالت میں ہیں۔ قبائل کے لوگوں کی کس مپرسی کی حالت سے صرف ان کے اندرونی حلقے ہی آگاہ ہوتے تھے۔ یا ان کی بری حالت سے ان کے خوانین باخبر ہوتے تھے۔ جن کے پاس آئے دن فریادیں وغیرہ پہونچتی رہتی تھیں۔ اور اگرچہ وہاں کے مقامی حکام بھی ناآشنائے محض نہ ہوتے تھے۔ تاہم وہ اپنے ذاتی اور شخصی مفاد کے پیش نظر صرف خوانین ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور لوگوں کے دستور کے موافق ان کے قدرتی نمائندے بھی ان کے خوانین ہی تھے۔ یہ مقامی حکام کبھی درپے اصلاح نہ ہوتے تھے۔ آگاہی پانے پر بھی وہ صرف انہی معاملات میں مداخلت کرتے تھے۔ جن میں وہ سمجھتے تھے۔ کہ جانبین سے انہیں کچھ ہاتھ آجائیگا۔ یا انہیں اس امر کا اندیشہ لاحق ہوتا تھا۔ کہ معاملات مذکورہ کی خبر ان کے حکام بالا تک پہنچ کر رہے گی۔ اکثر معاملات میں وہ خوانین کو بطور اپنے ایجنٹ کے استعمال کیا کرتے تھے۔ تاکہ خوانین طرفین سے جو انہی کے اپنے قبیلے کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ حاکم کے لئے کچھ دلوادیں۔ خوانین اس حیثیت کو بخوشی اختیار کر لیتے تھے۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا۔ کہ اس طرح سے وہ حاکم کو ممنون کر سکینگے۔ اور آئندہ زیادہ اطمینان اور اختیار کے ساتھ اپنے حلقۂ اقتدار میں کام کر سکینگے ایک طرف تو ان کا رسوخ حاکموں کے ہاں بڑھتا تھا۔ اور دوسری طرف ان کے قبیلے کے لوگوں میں ان کی اپنی شخصیت اور قوت و اقتدار کے بارے میں خوشگوار اثر پڑتا تھا۔ اور یہی ان کا مطلوب نظر ہوتا تھا۔ گویا لوگوں پر

دو دھارا حکومت قائم تھی۔ ایک بادشاہ کے نمائندوں اور کارپردازوں کی دوسرے ان کے اپنے خوانین اور ملکوں کی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ان کا کیا کچھ خون نہ نچڑتا ہوگا۔ اور اس پر ستم یہ کہ کل آبادی کی آبادی تعلیم سے معرا جاہل اور پرانے رسم و رواج اور اعتقادیات کا شکار تھی۔ میں ایک علیحدہ باب میں کسی قدر تفصیل سے عام لوگوں کی ذہنی کیفیات بیان کرونگا اور اسی سلسلہ میں ان کی حالت کے متعلق مزید روشنی ڈالوں گا۔ تاکہ قارئین کرام بغیر کسی مشکل کے یہ اندازہ لگانے کے قابل ہو سکیں۔ کہ حالات مندرجہ کے ماتحت اگر افغانستان انقلاب کے وار سے بچ جاتا۔ تو یہ ایک معجزہ ہوتا یہاں صرف اسی قدر بیان کرنا مقصود تھا۔ کہ ملک جو مدت سے عام طور پر مفلسی کا شکار چلا آتا تھا۔ اس کی نجات کے لئے غازی کی حکومت کو کن بڑی بڑی رکاوٹوں کو دور کرنے کی ضرورت تھی۔ جو ملک کے افلاس میں ممد و معاون تھیں۔ اوپر افلاس کی دو زبردست پاور قوتوں کا ذکر ہو چکا ہے یعنی حکام اور خوانین کی وجودی حیثیت۔ تیسری پاور قوت ان سے بھی بڑھ کر زبردست تھی۔ اور وہ ملانوں کی تھی۔ جن کے متعلق ذیل میں بیان کرتا ہوں:-

ملانے۔ لفظ "ملاں" فارسی زبان میں اس شخص کی نسبت بولا جاتا ہے جو اچھی طرح پڑھا لکھا آدمی ہو۔ مثال کے طور پر "فلاں بسیار ملاں آدم است" کا محاورہ ہم اس وقت استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ کسی شخص کی نسبت ہمارا عقیدہ ہو۔ کہ اس کی معلومات عام معیار سے وسیع تر ہیں۔ افغانستان کے ملک میں جہاں امیر حبیب اللہ خان مقتول کے عہد سے پہلے تعلیم و تعلم کا سلسلہ صرف مسجدوں تک محدود تھا۔ ایسے لوگ جو مسجد کی ملاؤں سے سبق لے کر نکلتے تھے۔ لوگ تعظیماً انہیں ملاں کہکر

پکارتے تھے۔ مسجدی درس خانوں کے لئے حکومت کی طرف سے کوئی نصاب تعلیم مقرر نہ ہوتا تھا۔ بلکہ مقامی مسجدی ملّاں کی قابلیت اور علمیت کی حدود و وسعت پر موقوف ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنے شاگردوں کو کیا کچھ پڑھائے۔ عام طور پر قرآن کریم کی تعلیم سب سے پہلے دیجاتی تھی۔ یعنی جس سے صرف قرآن کا پڑھنا آجائے۔ پھر گلستان و بوستان پڑھائی جاتی تھی۔ اور ساتھ ہی خوشخط لکھنے کی مشق بھی کرائی جاتی تھی۔ زاں بعد چند ایک روایت کی کتابیں جن میں دین کے متعلق حقائق کے بجائے فضول اور بے سروپا حکائتیں درج ہیں۔ مزید پڑھائی جاکر طالب علم کی حیثیت تعلیمی کو مکمل کر دیا جاتا تھا۔ ایسے طالب علم جب حصول تعلیم سے فراغت حاصل کرتے تھے۔ تو لوگ ان کی تعظیم و تکریم کرنے لگ جاتے تھے۔ اور انہیں اپنے مقام پر عالمیت کا ایک درجہ جیسا مل جاتا تھا۔ اور وہ شادی و غمی کے مواقع پر اس نئی حیثیت سے مدعو کئے جاتے تھے۔ بعض اوقات حکومت وقت انہیں ملازمت اور منصب بھی عطا کرتی تھی جس سے ان کا اثر و وقار بہت بڑھ جاتا تھا۔ اور ان کی شخصی تعلیم و تربیت اور ان کی دماغی کیفیات کا عکس لوگوں پر پڑنا شروع ہو جاتا تھا۔

لیکن اگر کسی طالب علم کو علم دین کے مکمل حصول کا شوق ہوتا تھا۔ تو وہ مسجدی ملّاؤں کے پاس زیادہ دیر تک پڑھتا رہتا تھا۔ اور وہ قرآن کے تحت اللفظ معانی کو سیکھنے کے علاوہ چند ایک کتابیں علم حدیث اور علم بحث و کلام کی نیز پڑھتا تھا۔ اور اگر مقامی مسجد کا ملّاں ایسی کتابیں پڑھا نہیں سکتا۔ تو وہ کسی دوسرے مشہور ملّاں کے پاس جاکر اسے حاصل کرتا تھا۔ اس نصاب کی تکمیل کے بعد وہ گویا علم دین میں کامل سمجھا جاتا تھا۔ اب یا تو وہ کسی مسجد کا

امام بن جاتا یا اپنے شہر یا گاؤں کی مسجد میں بیٹھ کر درس وتدریس کا سلسلہ قائم کرلیتا۔ اور یا پھر حکومت کی طرف سے اُسے قضاۃ کے کسی عہدے پر منتخب کیا جاتا۔ وغیرہ ۔

ایسے طلباء بہت خال خال ہوتے تھے۔ جو کسی دور دراز مقام پر جاکر کسی اعلےٰ اور مستند درسگاہ میں تعلیم حاصل کریں۔ مگر جب کبھی ملّا کوئی کسی ایسی درسگاہ سے تعلیم حاصل کر کے واپس پہونچتا تھا۔ تو مقامی ملانوں میں سے وہ چند جنہیں یا تو ہنوز علم کی تشنگی باقی ہوتی تھی۔ اور یا جو طبع سلیم رکھنے کی وجہ سے علم کی فضیلت کا اثر اپنی طبیعتوں پر لینے کے لئے مجبور ہوتے تھے۔ اس کے حلقۂ ارادت کو تشکیل دیتے تھے۔ لیکن باقی کا گروہ جو اپنی خام تعلیم وتربیت کی افتاد سے کسی نئی شخصیت کے آگے سر جھکانے میں عار سمجھتا تھا۔ اس عالم کے اثراتِ شہرت کے دور و دراز پھیلاؤ میں حارج ہوتا تھا ۔

ہم نے اوپر افغانستان کے ملّانوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور جدا جدا ان کی تعلیمی حیثیت بھی بیان کردی ہے۔ قارئین کے پیش نظر ہمہ وقت یہ امر ملحوظ رہنا چاہئے۔ کہ ایسے ملک میں جہاں ساری کی ساری آبادی جاہل اور اَن پڑھ ہو۔ اور ان کی دنیاوی اور دینی معلومات کا انحصار محض سُنی سنائی باتوں یا پرانے رسم و رواج پر ہو۔ ملّانوں کا ایسا گروہ کیا کچھ ان پر اپنے اثرات نہیں ڈال سکتا ہوگا۔ لوگوں کا مذہب اسلام تھا۔ مگر وہ اس کی تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھے۔ جو کچھ وہ قدیم سے سنتے چلے آئے تھے۔ یا جو کچھ انہیں ان کا موجودہ پیدا شدہ ملّانوں کا گروہ سناتا تھا۔ اسے وہ بے چون وچرا تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ لہذا ان کے سنانے والوں میں ایک عام اطمینان پیدا ہوچکا تھا کہ جو کچھ وہ انہیں سنائینگے۔ لوگوں کی طرف سے دینی حیثیت

میں اسے قبول کیا جائیگا۔ دوسری طرف لوگوں میں اعتقاد پیدا ہو چکا تھا۔ کہ جو کچھ وہ ملّاں سے سنیں گے۔ وہ محض اور خالص دین ہی ہوگا۔ اب اگر انہیں کوئی بات دین کے متعلق نہ بھی معلوم ہوتی تھی۔ تو وہ محض اس لئے اس کے انکار سے ہچکچاتے تھے کہ کہیں وہ اس کے انکار کرنے سے گنہگار نہ ہو جائیں۔ اور دوم انہیں دوسرے لوگوں کی لعن طعن کا ڈر ہوتا تھا۔ اور ساتھ ہی حکومت کی طرف سے تعزیر و سزا ملنے کا خوف بھی ان کے دامنگیر ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ ملّاں جس کی کسی بات پر مخالفت کی گئی ہے۔ ضرور اس مخالف کے متعلق اپنے عقیدت کیشوں سے بیان کریگا۔ کہ فلاں شخص کو اس نے دین کی بات کہی۔ مگر وہ کہتا ہے۔ کہ ...... یہ دین نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہ گنہگار ہو چکا ہے۔ اگر رفتہ رفتہ یہ خبر پھیلتے پھیلتے حکومت تک جا پہونچی ہے۔ تو شاید بات کچھ ایسی ہو۔ کہ حکومت دخل انداز ہو کر اُس شخص کو سزا دیدے۔ پس شدہ شدہ ایک طرف لوگوں میں اس بات کا حوصلہ پیدا ہوتا گیا تھا۔ کہ وہ ہر اس بات کو جو کسی درجہ کے ملّاں کی زبان سے نکلے۔ دین ہی سمجھتے چلے جائیں اور دوسری طرف ملّاں کے گروہ کو اپنا اثر و اقتدار قائم کرنے اور اس کے بحال و زیادہ کرتے رہنے کا ایک نہائت ہی مکمل اور عجیب وسیلہ ہاتھ آ گیا تھا ؛

اور جیسے ہر گروہ میں رقابت اور ہمچشمی ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ اس ملانوں کے گروہ میں بھی تھی۔ وہ اس وسیلہ کے ذریعہ سے اپنا اپنا شخصی اعتماد اور عزت و وقار بڑھانے کی طرف فطرۃً مائل ہو چکے ہوئے تھے۔ اور فطرت کا یہ دباؤ اتنا شدید تھا۔ کہ وہ دین کی غلط اور بے بنیاد تاویلیں کرنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ اور ہر ایک دُور از کار بات کو کھینچ تان کر دین پر منطبق کر دیتے تھے ؛

ان کا یہ دستور ایک عام دستور بن چکا ہوا تھا۔ اور "حسِ عام"[۱] کی رہی سہی روشنی

---

۵۷ میں نے (Common Sence) کی اصطلاح کا ترجمہ "حسِ عام" کیا ہے ؛

بھی اس دستور کے بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ ملک میں بوجہ آمد و رفت اور ڈاک کا سلسلہ نہ ہونے کے ایک آبادی کے حالات و کوائف کی خبر دوسری آبادی کو خواہ وہ تیس چالیس کوس کی مسافت پر ہی کیوں نہ ہو۔ نہ ہوتی تھی۔ اور اگر نزدیک کی آبادیوں کو ایک دوسرے کی خبر بھی لگ جاتی تھی۔ تو اس وقت تک وہ اثر جو کسی بات کا ہونا ہوتا تھا۔ لوگوں میں سرایت کر چکا ہوتا تھا۔ اور اس وقت تک فنا پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک لوگوں میں عقل و علم کی فراوانی نہ ہو لیتی۔

لیکن جب کوئی ایسی خبر کسی دوسری آبادی میں پہونچتی تھی۔ کہ فلاں گاؤں کے ملاّں نے فلاں بات کے متعلق یہ فتوے دیا ہے۔ تو اس گاؤں کا جو اپنا ملاّں ہوتا تھا اس سے پوچھا جاتا تھا۔ کہ وہ اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اگر اس ملاّں نے دوسرے گاؤں والے ملاّں کی تائید کی ہوتی تھی۔ پھر تو بعد میں اگر ان دونوں ملاّنوں کے برخلاف باقی سارے جہان کے ملاّں اکھٹے ہو جائیں۔ اس پر بھی وہ اثر جو لوگوں کی طبیعتوں میں گھر کر چکا ہوتا تھا۔ ہرگز زائل نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ اپنے ملاّنوں کو حق بجانب ہی سمجھتے چلے جاتے تھے۔ اور اگر اس ملاّں نے دوسرے ملاّں کی کہیں تردید کی ہوتی تھی۔ تو اس کے گاؤں والے اپنے ملاّں کو درجۂ تعلیم میں اس پہلے گاؤں والے ملاّں کے درجۂ تعلیم سے کہیں اعلےٰ سمجھنے لگ جاتے تھے۔ اور نہ صرف اپنے ملاّں کے کہنے ہی پر عمل کرتے تھے۔

یہاں مجھے ایک نہایت ہی پرلطف حکایت یاد آگئی ہے۔ اور گو وہ افغانستان سے نہیں۔ بلکہ ہندوستان کے طبقۂ جہلا کی طرف منسوب ہے۔ تاہم چونکہ وہ اسی قبیل سے ہے۔ لہذا میں اسے درج کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہ جو کچھ میں اوپر بیان کر رہا ہوں خصوصیت کے ساتھ افغانستان ہی کے ملک سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ ہر اس ملک پر عائد ہوگا۔ جہاں لوگوں میں علم و عرفان کی روشنی مفقود ہوگی۔ حکایت یہ ہے:-

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ کسی جگہ گاؤں والوں اور شہر کے لوگوں میں یہ بحث ہو رہی تھی۔ کہ آیا گاؤں والوں کا ملّاں علم میں زبردست ہے یا شہر والوں کا۔ گاؤں والے اپنی طرف اور شہر والے اپنی طرف کے ملّاں کو بڑا عالم سمجھتے تھے۔ اور بحث کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر چند سفید ریش[1] بیچ میں پڑ کر دونوں گروہوں کو کسی ایک فیصلہ کن بات کے لئے راضی نہ کر لیتے۔ تو اندیشہ تھا۔ کہ شاید "بحث" ہنگامہ و فساد کی شکل اختیار کر جاتی۔ ریش سفیدوں نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ فلاں دن فلاں مقام پر دونوں ملّاں ایک جگہ اکٹھے ہوں۔ اور آپس میں علمی مناظرہ کریں پھر جو اس علمی مناظرہ میں جیت جائے گا۔ سب اس کو علم میں بڑا مان لیں گے۔ چنانچہ اس فیصلہ پر سب راضی ہو گئے۔ اور اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے ۔

مقررہ تاریخ پر ایک طرف سے گاؤں والے اپنے ملّاں کو بڑی سج دھج سے ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ لے کر اس مقام پر جو پیشتر ازیں مقرر تھا پہونچ گئے۔ اور دوسری طرف سے شہر والے اپنے ملّاں کو باجوں کے ساتھ لیکر آپہونچے ۔

گاؤں کے غریب ملّاں کو آتا جاتا تو کچھ نہ تھا۔ مگر تھا بڑا باتونی اور اکھڑ۔ دوسری طرف شہر کا ملّاں اس کے مقابلہ سے بہت زیادہ جانتا تھا۔ اور ساتھ ہی مہذب اور صاحب سلیقہ بھی تھا۔ وہ بیچارا گاؤں کے ملّاں کے گنوارپن کو خوب جانتا تھا۔ اور اس لئے وہ گھر سے آنے ہی سے گھبراتا تھا۔ مگر شہر والوں کے مجبور کرنے سے اُسے بالآخر آنا ہی پڑا ۔ چنانچہ جب سب لوگ اکھٹے ہوئے تو گاؤں والے اپنے گاؤں کی طرف اور شہر والے اپنے شہر کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئے۔ اور بیچ میں ایک جگہ چھوڑ دی۔ جہاں گاؤں اور شہر والے ملّاں نے آپس میں علمی مناظرہ کرنا تھا ۔

[1] وہ لوگ جو عمر میں بڑے اور انکی داڑھیاں سفید ہوتی ہیں۔ ریش سفید کہلاتے ہیں ۔

اب بیچارے گاؤں والوں کو تو اتنی سمجھ بھی نہ تھی کہ مناظرہ کیا بلا ہوتا ہے۔ اور کس طرح کیا جاتا ہے۔ وہ تو صرف یہی کچھ سمجھ رہے تھے۔ کہ جو مُلّاں علم میں زیادہ ہوگا۔ وہ تیز جلد جلد اور زیادہ بولیگا۔ ان غریبوں کے پاس علم کے پرکھنے کا یہی معیار تھا اور بس۔

غرضنکہ جب دونوں طرف کے مُلّاں اپنے اپنے جبّہ و دستار کو سنبھالتے ہوئے میدان میں نکلے۔ تو تھوڑی دیر تک دونوں نے ایک دوسرے کی طرف سکوت بھری نگاہ سے دیکھا۔ اس کے بعد شہر کے مُلّاں نے یوں لب کشائی کی :۔

شہر کا مُلّاں ۔ (گاؤں کے مُلّاں سے مخاطب ہوتے ہوئے) اُچرو اُچھا راج ! یعنی فرمائیے صاحب !

گاؤں کا مُلّاں ۔ (اب اس کو کچھ آتا جاتا ہوتا تو کچھ فرماتا۔ اس نے جھٹ کہہ دیا) ۔ اُچرو مُچرو کُچرو ۔ (بے ہنگام تک بندی)

شہر کے مُلّاں کو بڑی حیرت ہوئی ۔ کہ یہ اس نے کیا بکواس کی ہے۔ اس نے ازراہِ استفسار اس سے پوچھا :۔

ایکی یعنی یہ کیا آپ نے فرمایا ہے ؟

گاؤں کا مُلّاں جھٹ کہہ اٹھا۔ ایکی میکی ڈھیکی ۔

بس پھر کیا تھا۔ گاؤں والوں نے مارے خوشی کے دھماں دھم ڈھول پیٹنا شروع کر دیا۔ کہ وہ دیکھو ہمارا مُلّاں جیت گیا ہے۔ اگر شہر والے نے ایک بات کہی تو ہمارے مُلّاں نے تین تین کہہ ڈالیں۔ چند گاؤں والے نعرے لگاتے ہوئے اور جبر کرتے دوڑتے ہوئے آگے نکل آئے اور انہوں نے اپنے مُلّاں کو شانوں پر اٹھا لیا۔ اور واہ وا اور خوشی کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھاتے ہوئے اپنے گاؤں کو واپس پھر گئے۔ شہر والا مُلّاں لاحول پڑھتا اور پیچ و تاب کھاتا ہوا شہر والوں سے روٹھ کر

الگ جارہا،،

اس حکایت میں جہالت کی وہ جھلک موجود ہے۔ جو ملّانوں کے بلیغ علم سے کہیں زیادہ عامۃ الناس کی فرسودہ ذہنیت کا نظارہ آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔ اور میرا مقصد اس حکایت کے نقل کرنے سے یہی تھا۔ کہ میں لوگوں کی اس ذہنیت کی طرف یہاں ایک اشارہ سا کردوں۔ جس کی پوری تصویر آگے چل کر میں کھینچنے والا ہوں۔ یہاں صرف اسی قدر کافی ہوگا۔ کہ اس جہالت و بے بصری کو ملّاؤں نے خوب جانچ رکھا تھا۔ اور لوگوں کے فرسودہ اور غلط اعتقادیات نے جو ماضیٔ بعید سے بنتے اور اپنا تسلّط جماتے چلے آئے تھے۔ ملّاؤں کا اثر و اقتدار لوگوں پر مضبوطی سے قائم کر رکھا تھا۔ اور وہ ان کی گرفت سے کبھی باہر نہ تھے،،

ملّانوں کی قدر و منزلت نے جو ہر جگہ عام تھی۔ اور بھی غضب ظاہر رکھا تھا اس قدر و منزلت نے جہاں چوٹی کے چند ملّانوں کو (جن کی دینی معلومات کی حیثیت میں مجھے کچھ کلام نہیں) بقائے دوام دے رکھی تھی۔ وہاں ملک کے بیکار طبقہ کے لئے معاش حاصل کرنے کا ایک مہلک ذریعہ مہیا کر رکھا تھا۔ وہ افراد جنہیں گھر پر کوئی کام میسر نہ آتا تھا۔ اور جو جسمی حیثیت میں اتنے تندرست اور توانا نہ ہوتے تھے۔ کہ ڈاکہ اور رہزنی کا پیشہ اختیار کر سکیں۔ وہ بغل میں ایک جھولا ڈال کر جس میں کہیں سے چند معمولی ابتدائی کتابیں انہوں نے لے کر تہ کر رکھی ہوتی تھیں۔ گھر سے طالب علم بن کر نکل پڑتے تھے۔ اور گاؤں بہ گاؤں شہر بہ شہر منزل ڈھکانا کرتے ہوئے سارے ملک بھر میں گھومتے رہتے تھے۔ ہر جگہ مسجدیں ان کو بسیرا دینے کے لئے موجود ہوتی تھیں۔ اور وہاں کے مقامی لوگ ان کو طالب علم جان کر کھانا کپڑا وغیرہ دینے سے گریز نہ کرتے تھے۔ یہ برائی کا دائرہ اپنی وسعت و پھیلاؤ کے ساتھ

ہر مقام و منزل پر موجود تھا۔ صرف اقتصادی یا معاشرتی نقطۂ نظر سے نہیں۔ بلکہ لوگوں کی ذہنیات مداومت کے ساتھ اس گروہ سے زہر آلود ہوتی رہتی تھیں۔ انہیں خود تو آتا جاتا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور اکثر ان میں سے الف ب سے زیادہ نہ پڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ مگر ایک مقام سے دوسرے مقام پر آتے جاتے رہنے سے اور مقامی ملانوں کی کثرت صحبت سے جن سے ہر جگہ پر اپنے سفر کے دوران میں وہ ملتے رہتے تھے ان کو معمولی مسائل دینی کے متعلق کچھ باتیں کرنا آجاتی تھیں۔ جنہیں وہ لوگوں میں اپنی طرف سے بہت کچھ بڑھا چڑھا کر پھیلاتے رہتے تھے۔

عام لوگ جن کا درجۂ معلومات ان کی نسبت صفر ہوتا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ ان کا خطیب طالب علم ہے۔ ان کی باتوں کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔ اور انہیں دینی سمجھنے لگ جاتے تھے۔ اور اس طرح اپنی خراب شدہ ذہنیت کی فرسودگی میں اور بھی اضافہ کا باعث بنتے تھے۔

قارئین بیانات مذکورہ سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملانوں کا ایسا طبقہ ملک کے سوشل اور تمدن کے لئے کس قدر مہلک اور ملک کے محدود وسائل آمدنی پر کس قدر بار تھا۔ ہر منزل و مقام پر ان مفت خوروں کی تعداد بہ کثرت تھی۔ جو ملک کی آمدنی میں تو کسی طرح کے اضافہ کا باعث نہ ہوتے تھے۔ بلکہ الٹا ملک کی مفلس آبادی سے اپنی بزرگی اور مذہبیت کا ٹیکس وصول کرتے رہتے تھے۔

اس ارتقائے ناقص کی کہانی سناتے ہوئے ہم اپنے قارئین کی توجہ کو اس منزل پر مرکوز کرتے ہیں۔ جہاں ملاؤں کے اثر و اقتدار کی حدود متجاوز ہو کر صاحب حکم طبقوں کی آمرانہ حدود سے گذر جانے کا قصد کرتی ہے۔ اور وہاں اسے مقابلہ درپیش آتا ہے۔

ہر ارتقا۔ خواہ وہ ناقص ہو یا صالح اپنی نشو و نمو اور بالیدگی کی قوتوں کا

مظہر ہوتا ہے۔ اور یہ مظاہرہ آرائی برابر اس وقت تک جاری رہتی ہے۔ جب تک اسے مخالف سمت سے شہ نہ ملے۔ اب اگر اس کی قوت بیشتر ہے۔ تو وہ اس شہ یعنی مزاحمت کو اپنے راستہ سے ہٹا کر اپنی منزل پیشین کی طرف پھر بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ مد مقابل کی قوت سے کمتر قوت کا مالک ہے۔ تو اس کا ضعفِ قوت اس کے اپنے برخلاف ردِ عمل شروع کر دیتا ہے۔ ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ کوئی سے دو ارتقاء جو اپنے اپنے ماحول میں قوتوں میں ہم اوزان ہیں۔ جب نقطہ تصادم پر آن کر ملینگے۔ تو کسی ایک پر غلبہ کی توفیق نہ پاکر دونوں موقتاً سمجھوتہ پر مجبور ہو جائیں گے +

ملّانوں کے سامنے بھی یہی آخری منزل تھی۔ ان کا اثر و اقتدار لوگوں پر قائم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس میں زیادہ زور پیدا کرنے کے لئے انہوں نے بعض مستقل طریقے بھی ایجاد کر رکھے ہوئے تھے۔ یعنی پیری و مریدی کا سلسلہ گدی نشینی مجاورت اور لنگر خانوں کا قیام وغیرہ وغیرہ۔ لوگوں پر ان کی روحانی حکمرانی کا یہ بڑھتا ہوا تسلّط دیکھ کر اُن کے دنیاوی حکمرانوں کو بڑی تشویش لاحق تھی۔ لیکن دورِ حیات کی اس منزل پر وہ ان کے برخلاف قوت کے مظاہرہ کا استعمال نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ لوگ جن پر ان طبیعتوں کا دینی اور دنیاوی تسلط و حکام قائم تھا۔ ایک ہی تھے۔ ان کی طبیعتیں دونوں کا اثر قبول کرنے کی عادی ہو چکی ہوئی تھیں۔ لہٰذا لامحالہ ایک طرف خوانین کے طبقے میں اور دوسری طرف ملّاؤں کے طبقے میں برابر یہ خواہش موجود تھی۔ کہ وہ آپس میں اتحاد و محبت کا ہاتھ بڑھا کر ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنیں۔ خان ملّانوں سے اتحاد کر کے اپنی دنیوی شان میں دینی اثر کو بھی پیدا کر لیتا تھا۔ اور اس طرح اس کے زیر اثر لوگ یہ سمجھنے لگ جاتے تھے۔ کہ ان کے خان کو فلاں بزرگ کی رجسکو وہ خود بھی مانتے

ہوتے تھے)۔ دینی دعا حاصل ہے ۔ اور یہ چیز ان کے فخر و مباہات قومی میں مزید اضافہ کا باعث ہوتی تھی ۔ بالفاظ دیگر خان اپنے لوگوں پر ہر طرح کا تسلط قائم رکھنے اور ان سے ہر طرح کا کام لینے کے اس منزل پر پہنچکر جس کا بیان جاری ہے ۔ یہ ضروری سمجھتا تھا ۔ کہ وہ کسی دینی بزرگ کی برکت حاصل کرے ۔ دوسری طرف مُلّاں جن کے پاس دنیاوی طاقت کسی قسم کی نہ ہوتی تھی ۔ اس خصوص میں اپنی حیثیت اور وقار کو اپنے گروہ کے اندر بڑھانے کے لیئے یہ امر لازمی سمجھنے لگ گئے تھے ۔ کہ ان کے دینی اثر کے ماتحت چند صاحب قوت اور مشہور خوانین ضرور ہونے چاہئیں ۔ چنانچہ ان کی طرف سے بھی ان کوششوں میں کبھی کوتاہی نہ ہوتی تھی ۔ اور وہ شب و روز برابر اسی قسم کی تجاویز و طرائق کے سوچنے میں مصروف رہتے تھے ۔ کہ کسی طرح ان کا حلقہ اثر دور دور کے علاقوں کے مشہور خوانین تک وسیع ہو جائے ۔

بعض مُلّاں جو ملک میں شہرت دوام حاصل کر چکے ہوتے تھے ۔ خوانین کے گروہ میں کشش کا مرکز بن جاتے تھے ۔ اگر ایک خان ایسے مُلّاں کا دست بیعت ہو چکا ہے تو دوسرے خوانین بھی اسی کوشش میں رہتے تھے ۔ کہ وہ بھی اپنے اقتدار کی افزائش کے لیئے اسی مُلّاں کی برکت حاصل کریں ۔ اس طرح بعض خوش نصیب ملانوں کو ہمہ گیر شہرت اور دوام حاصل ہو جاتا تھا ۔ اور اب وہ اس منزل پر پہنچ جاتے تھے ۔ کہ بادشاہ اور اس کی حکومت کو اپنی طرف جذب اور مائل کرنے کی قوتوں کی نظاہرہ آرائی کر سکیں ۔

بادشاہ اور اس کی حکومت چونکہ اسی دور حیات کی ایک زائیدہ شئے ہوتی تھی ۔ اور ان کی پرورش اور تربیت ذہنی کا ماحول بھی گو کسی قدر بہتری کی طرف مائل فرق کے ساتھ وہی ہوا کرتا تھا ۔ اس لیئے قوت و اقتدار کی یہ مختلف روئیں جو مملکت میں جاری و رواں ہوتی تھیں ۔ اسی کے متوازی الحال بادشاہ کے تیئں اپنی حکومت کی فائق ترین

قوت کو تشکیل کرنا پڑتا تھا۔ جو دراصل ملک کی انہی زبردست قوتوں کے اساس پر رکھی ہوئی ہوتی تھی۔

بادشاہ اور اس کی حکومت کو جہاں ایک طرف خوانین و ملک سے رابطہ مرحمت اور الطاف و دوستی قائم کرنا پڑتا تھا۔ تو وہاں دوسری طرف وہ ملّانوں پر بھی اپنی بخشش و عطا کا فیضان کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ بلکہ خوانین کے گروہ سے کہیں زیادہ اس پچھلے گروہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی سعی و تدبیر کرتے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ اس امر کو اچھی طرح جانتے ہوئے تھے۔ کہ اگر ملّانوں کی طاقت ان کی سیاستِ ملکی کی ہمنوا ہو۔ تو خوانین کی شرانگیزی بدیں وجہ ان کے لئے بے ضرر رہ جاتی تھی۔ کہ لوگوں پر دینی امورات کا اثر اسقدر گہرا ہوتا تھا۔ کہ وہ بادشاہ اور ملّانوں کی یک جہتی کے خلاف اپنے خوانین کے ساتھ موافقت کرنے کا خیال تک بھی نہیں لا سکتے تھے۔ بادشاہ جو ملک میں سب سے بڑی طاقت سمجھا جاتا تھا۔ کہیں ملّانوں کے ذریعہ خوانین کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اور کہیں خوانین کی وساطت سے ملّانوں سے اپنی طاقتوں کو پیوند کرنے میں مشغول نظر آتا تھا۔ ادھر خوانین ملّانوں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی طاقت کو مزید فروغ دینے کے لئے بادشاہ کی طاقت کا سہارا لیتے تھے تاکہ اپنے ہمچشموں میں سر بلند اور قاہر نظر آئیں۔ اور اور زیادہ فراخ دستی سے اپنی پیدا کردہ طاقتوں کا استعمال کر سکیں۔ اور ادھر ملّاں خوانین کے ساتھ اتحاد کر کے اپنے اعزاز و شہرت کو بڑھا کر بادشاہ کا دستِ سیاست بننے کے آرزومند رہتے تھے۔ تاکہ ان کی حیثیت و مرتبہ اور اثر و رسوخ پہلے کی نسبت ہزار چند ہو جائے۔

میں اس عمل کو ارتقاء قوائے ثلاثہ کے نام سے تعبیر کرتا ہوں۔ دنیا میں جب فیوڈل طریقِ حکومت کو اسدرجہ ارتقاء نصیب ہوا۔ کہ اس کے ماتحت بادشاہ کے

وجود کی مرکزیت کو تسلیم کیا گیا۔ تو یہی تین طاقتیں کسی ملک و قوم کی قسمت پر کافی اثر انداز ہوتی رہیں۔ یعنی بادشاہ اور اس کی حکومت۔ خوانین اور ملاں۔ ان تینوں طاقتوں کی موجودگی میں ان میں سے ہر ایک طاقت کے فردی ارتقاء کی ایک حد معین تھی۔ جہاں پہونچ کر یہ دوسری طاقت کے ساتھ اتحاد کئے بغیر مزید ارتقاء حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اور علیٰ ہذا لقیاس اس اتحادی قوت کے ارتقاء کی بھی ایک حد تھی۔ جس جگہ جب تک تیسری قوت کی اعانت میسر نہ ہو۔ مزید ارتقاء نصیب نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ افغانستان جس میں یہ تینوں قوتیں موجود ہو چکی تھیں۔ اور جہاں تینوں نے علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے حلقہ ہائے عمل پیدا کر رکھے تھے۔ ایسے نقطۂ تصادم پر پہونچ چکا تھا۔ کہ کسی ایک کو کسی دوسری پر فوقیت و غلبہ نصیب نہ ہو سکتا تھا اس لئے تینوں قوتیں ہمیں ایک دوسری کے ساتھ سمجھوتہ کے اصول پر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں اوپر کہہ آیا ہوں۔ کہ یہ سمجھوتہ وقتی اور ہنگامی ہو سکتا تھا۔ دوامی نہیں۔ عام قانون کے ماتحت ہر ایک قوت کا آخری نقطۂ ارتقاء یہ تھا۔ کہ وہ دوسری ہر ایک قوت کو بے اثر کر دے۔ لیکن چونکہ وہ اپنے ہی ماحول کے اندر رہ کر اپنے منتہائے مقصد تک پہونچ نہیں سکتی تھی۔ اس لئے وہ دوسری قوتوں کے ساتھ اتحاد اور سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوتی تھی۔ لیکن سمجھوتہ کرتے وقت وہ اپنے فردی ارتقاء کے مدارج مابعد کو ذہن سے خارج نہیں کر دیا کرتی تھی۔ بلکہ دراصل انہی مدارج کے طے و عبور کے لئے اسے اس قسم کا ساز و باز کرنا پڑتا تھا۔

پس جب ہر ایک قوت کا نصب العین یہ تھا۔ کہ وہ اپنی آخری حد ارتقاء تک پہونچے۔ تو گویا وہ دوسری قوتوں کو اپنے مقصد کے حصول کا ایک آلہ تصور کرتے ہوئے ان سے اتحاد و مودت کا رشتہ باندھتی تھی۔ اور چونکہ کوئی قوت اپنے اس نصب العین سے منحرف ہونے کا خیال نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے یہ فطرتی تھا۔ کہ ہر ایک کی تجاویز

وراہِ عمل کا خاکہ اس کے اس عظیم مقصد کے استحصال کے عین موافق ہو۔ جو حالات وقت اور تاثیرات جاریہ کے باہم نسبت دوسری ہر قوّت کے برخلاف اپنا عمل جاری رکھتے ہوئے ان کو کمزور کرتا چلا جائے۔ اب اگر تجویز و سیاست کا یہ خاکہ اپنے اندر نقص رکھتا تھا۔ تو ملک میں باندازہ اسی نقص سیاست کے شر و فساد پیدا ہونا لازمی تھا۔ اور قوتیں باہم ٹکراتی۔ اور ایک دوسری سے برسرِ پیکار نظر آنی یقینی ؂

آؤ ہم اپنے مقصد سے ذرا دُور ہو کر دیکھیں۔ کہ افغانستان میں فیوڈل طریق حکومت کے اس ارتقاء کے بعد جہاں بادشاہ کے وجود کو مرکزیت نصیب ہو چکی تھی۔ قوائے ثلاثہ کی ارتقائیات کا کیا حال رہا۔ کس طرح اور کس جگہ پر تعاونِ عمل کے بعد اغتشاش داخلی واقع ہوتا رہا۔ اور جنگ و خونریزی کے بعد پھر کس طرح تعاون یعنی اس موقتی سمجھوتہ کو بحال و قائم کیا جاتا رہا۔ مگر ایسا کرتے ہوئے میں دُور از کار واقعات کو نقل و بیان نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ میرے موضوع حاضر سے بالکل خارج ہے۔ البتہ قارئین تاریخ سے ان اشارات کی جستجو فرما سکتے ہیں۔ جنہیں میں یہاں اپنی بحث واستخراجِ نتائج کا میلِ راہ بنا رہا ہوں ؂

اور یہ کچھ افغانستان پر ہی موقوف نہیں ہے۔ (جیسا کہ میں نے کہیں اور بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے) بلکہ جہاں اور جس جگہ کے دَورِ ملوکیت کی تاریخ کو چاہے۔ مطالعہ کر لیجئے۔ آپ کو ایک ہی قبیل کے واقعات ملیں گے۔ یہی تین غالب طاقتیں جن کا ذکر جاری ہے آپ کو ہر جگہ ملیں گی۔ یہ کبھی آپس میں امن سے رہتی نظر آئیں گی۔ اور کبھی آپس میں ایک دوسرے سے تصادم کرتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ تا آنکہ ارتقاء[1] کلی کے ماتحت ان کا قصرِ تمکین کھنڈرات بن کر رہ جائے ؂

---

[1] ارتقاء کلی سے میری مراد عام ارتقاء سے ہے۔ جو ہمیشہ سے جاری چلا آتا ہے ؂

جب نامترقی[1] فیوڈل طریق زندگی کے ماتحت خوانین اور ملانوں (لارڈز اینڈ چرچ) کی پیہم پیکار نے امن عامہ کو یکسر نابود کر رکھا تھا۔ تو دونوں گروہوں کے شکست خوردہ عنصروں کی پیدائش نے اپنے دور کے امن پسند طبائع سے ساز و باز کر کے کسی سب سے زبردست خان کی ماتحتی قبول کرنی شروع کر دی۔ تاکہ اس کے زیر حمایت وہ اپنے تباہ و برباد کرنے والوں سے انتقام لے سکیں۔ شدہ شدہ اسی خان کو بہت سے شکستہ دل خوانین و ملاں کی معیت و حمایت کی بدولت اردگرد کے کمزور اور کم طاقت خوانین پر فوقیت نصیب ہوتی گئی۔ اور بالآخر دورِ بادشاہت کی بنیاد اسی کی ذات سے وجود پذیر ہوئی۔

جب بادشاہ کے وجود کو اس طرح ایک مرکزیت حاصل ہو چکی۔ تو اس کا اندرون ملک ایک ہی اہم فرض تھا۔ کہ وہ اپنی طاقت کو اس طرح سے ترتیب و تعمیر کرے۔ کہ اس کے برخلاف بغاوۃً کوئی سر نہ اٹھا سکے۔ بادشاہ اس کی تعمیر و ترتیب میں اپنے ملک کے خوانین اور ملاں کی امداد لینے پر مجبور تھا۔ وہ خود براہ راست اپنی رعیت تک نہیں پہونچ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی رعیت ابھی خود خوانین اور ملانوں کے باہمی اثر کے مابین منقسم و منتشر تھی۔ دور از مرکز بادشاہ کے عمال بھی جو اس کے نمائندے تھے۔ بادشاہ اور اس کی رعیت کے درمیان تعارف کا واسطہ نہیں بن سکتے تھے۔ انہیں بھی اپنے مقامی خوانین و ملانوں کی وساطت قبول کرنی پڑتی تھی۔ جیسا کہ قارئین کرام کسی جگہ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ پس بادشاہ کا اپنی رعیت کے ساتھ

---

[1] نامترقی فیوڈل طریق اس طریق کا وہ درجہ یا دور ہے۔ جہاں ابھی بادشاہ کے وجود کی مرکزیت کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

تعلق براہ راست نہیں۔ بلکہ ایک واسطہ سے تھا۔ اب جس قدر یہ "واسطے" اپنے اندر زیادہ قوّت رکھتے تھے۔ اسی قدر بادشاہ کی اپنی قوّت کمزور ہوتی تھی۔ بادشاہ کے وجود کی مرکزیت ہمیشہ یہ چاہتی رہی۔ کہ وہ ان واسطوں کے طلسم کو توڑ کر براہ راست اپنی رعیت سے تعلق پیدا کرے۔ مگر دوسری طرف خوانین اور ملّاں بادشاہ اور اس کی رعیت کے درمیان واسطہ بنے رہنے پر مصر تھے۔ انہوں نے اگر بادشاہ کے وجود کی مرکزیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ تو وہ کچھ اس لئے نہیں تھا۔ کہ خود ان کی ہستی نیست و نابود ہو جائے۔ بلکہ برخلاف اس کے یہ تو ان کی اپنی ہستی کے بچاؤ و قیام کی ایک تجویز تھی۔ جو آپس میں بیہم پیکار کرتے کرتے تقریباً اضمحلال پیدا کر چکی تھی۔

اب اگر بادشاہ ان کے تباہ و برباد کرنے پر تلا رہتا۔ تو ان کے پاس بھی حربوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ جھٹ کسی نئے امیدوار کو کھڑا کر کے اس کے برخلاف بغاوت پیدا کر دیتے۔ اور اس کو تخت سلطنت سے محروم کر کے اس کی جگہ اس نئے شخص کو لا بٹھاتے۔ جو نہ صرف ان کے حقوق و مناصب ہی کا خیال رکھتا بلکہ ان کے ہاتھ میں کھیلتے رہنے کا ایک آلہ و ذریعہ بنتا۔ حتےٰ کہ وہ خود بھی اس پہلے کی طرح گرداب تقدیر میں پھنس کر محو و نابود ہو جاتا۔

عمل کی یہ رَو ملک کی ان دو بڑی قوتوں کے لئے جو فیوڈل طریق کی اصل جڑ تھیں۔ ہمیشہ تجدید زندگی کا باعث ہوتی رہی۔ اور تاریخ کا ہر ایک ورق اس کا شاہد رہا۔ عمل کا یہ دورا انسانی تاریخ میں صبر آزما طوالت کا دور ہے۔ اور جب تک اس دورۂ عمل کی تجدید و دوام کی قوتوں میں تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔ ان کے پیدا کردہ اثرات کی یکسانیت میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ یہی وہ سبق تھا۔ جسے غازی امان اللہ خان نے تاہنوز ازبر نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس کے اپنے مُلک کی تاریخ

کے واقعات ان مظاہر سے پُر تھے۔

فطرت کے اٹل قانون ارتقاء کو کہیں ٹھہراؤ نہیں۔ مگر ساتھ ہی فطرت کا منشاء یہ بھی نظر آتا ہے۔ کہ وہ اپنے مقررہ قوانین کے ماتحت انسانی ارتقاء کو پختگی اور دوام بخشتی چلی جائے۔ یعنی ارتقاء اجتماعی کی ہر طے شدہ منزل پھر سامنے نہ رہے۔ بالفاظ دیگر یہ نہ ہو۔ کہ ایک منزل جسے انسانوں کی کسی ایک جمعیت نے طے و عبور کر لیا ہے انسانوں کی نگاہوں سے بالکل گم ہو جائے۔ اور از سر نو انسانوں کی پھر کسی نہ کسی جمعیت کو وہی منزل طے کرنی پڑ جائے۔ مختلف حالات کی مساعدت و عدم مساعدت کی بنا پر یہ تو ہو سکتا ہے۔ کہ کسی ایک دور میں انسانوں کی پوری نسل ارتقاء کی مختلف منزلوں میں سے گذر رہی ہو۔ مگر تاریخ انسانی میں آپ کوئی ورق ایسا نہیں پائیں گے۔ جس میں منزل گذشتہ و طے کردہ سے پیش پیش چلنے والی کسی انسانی جماعت کا وجود ہی نہ ملتا ہو۔ تو اس سے ثابت ہوا۔ کہ فطرت اسی طرح انسانی ارتقاء کو پختگی اور دوام بخشتی ہے۔ اور جب تک پختگی اور دوام حاصل نہ ہو جائے۔ آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور شاید اسی غرض کے حصول کے لئے فطرت کے قوانین مقررہ کا عمل زندگی طولانی اور دراز ہے۔ اور شاید اسی سبب سے انسانوں کو کسی ایک منزل کے طے کرنے تک کئی نسلوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ فطرت کے کسی مقررہ قانون کا عمل جب تک انسانوں کی طبیعت کو اچھی طرح اپنا خوگر نہ بنا لے۔ انسانی حیات اس کے گرداب سے نجات پانے کی سعی نہیں کرتی۔ اور جب تک وہ تلاش کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ فطرت کے کسی دوسرے قانون کے عمل کو دریافت نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی اس کے اثرات کو اپنے اوپر وارد ہونے دیتی ہے۔ اس سے یہ عقدہ کھلتا ہے۔ کہ انسانی حیات اور ضمناً اس تمام موجودات کی ارتقاء کے لئے فطرت کے مقررہ قوانین کے

یہی مدارج ہیں۔ جنہیں پیہم و متواتر انسانی تجربہ حیات دریافت کرتا چلا جارہا ہے۔ جوں جوں انسانی حیات ایک قانون کی معرفت و شناسائی میں کمال و مہارت پیدا کرلیتی ہے۔ اسی نسبت سے اس کے ارتقاء مزید کے قیام کا مسئلہ کسی نئے قانون کے عمل کی شکل میں دریافت ہو کر ایک نئی کیفیت اور زندگی سے اسے متقابل و متعارف کرتا رہتا ہے۔ اور میں اسی کو ارتقاء اجتماعی کا ایک دَور شمار کرتا ہوں۔ کسی ملک کے بادشاہ، رہبر یا چارہ جو کے لئے میرے نزدیک اس امر کی اوّلین ضرورت ہے۔ کہ وہ اس رمزِ حیات سے آگاہ ہو۔ اور یہی وہ چیز ہے۔ جس کو ہمارا شاعر **اقبال** (اگرچہ میں اس کی بنیادِ فکر سے واقف نہیں) اس طرح بیان کرتا ہے۔ کہ ؎

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

ہم نے اوپر کہا ہے۔ کہ قوائے ثلاثہ کے ارتقاء کے دَور کو جب تک پختگی اور رسیدگی کا مرتبہ نصیب نہ ہو جائے۔ کسی ملک و قوم کی حیاتِ ملّی ارتقائے اجتماعی یا کلّی کا دَور تشکیل نہیں کرتی۔ یعنی وہ اسی منزل پر اٹکی رہتی ہے۔ اس سے نکل کر نسبتاً بلند ارتقائیات کے دائرے میں شریک و سہیم نہیں ہوتی۔ دانشمند گروہِ انسانی اس دَور کی پختگی کو یک آن زود تر لا سکتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ انسانی اعمال کی تگ و دو اور صحت پر موقوف ہے۔ اگر اس دَور کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ تو پھر بھی وہ ارتقائے کلّی کے قانون کے ماتحت اس دَور کو چھوڑ کر اپنے لئے ایک نیا دَور تشکیل کرے گا۔ لیکن اب اسے ایک خاصہ وقت لگے گا۔ اور نہ معلوم اس وقت کی طوالت ہزاروں سالوں پر جا کر مختتم ہو۔ پس اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا۔ کہ اول انسانوں کے مختلف گروہ جس جس دورۂ حیات میں اپنی

زندگی بسر کررہے ہیں۔ اس کو وہ ضرور چھوڑ کر نئے دور اپنے لئے تشکیل کریں گے۔ دوم۔ ہر ایک مختلف دَور کی مدتِ حیات اس دَور کے اندر بسنے والوں کے نقل و اعمال کی صحت و نقص پر موقوف ہے۔ یعنی یہ انسانوں کے اپنے اختیار میں ہے۔ کہ وہ اس دَور میں سے کم سے کم مدت میں گذر جائیں۔ یا ہزاروں سال تک اسی دَور کے گرداب میں چکر لگاتے رہیں۔ سوم۔ ہر زماں میں ارتقاء حیات انسانی کا ایک اجتماعی یا کلی دَور موجود ہوتا ہے۔ جس میں بہ سلسلہ مراتب ہر گروہ انسانی اپنے مخصوص دائرے طے کرتا نظر آتا ہے۔ چہارم۔ ہر گروہ انسانی کا مخصوص دَور اس گروہ کے حالاتِ زندگی کے ماتحت مختلف اسم و لقب سے پکارا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے فیوڈل طریق زندگی کے ایک دَور کو دَور ارتقاء قوائے ثلاثہ کا نام دیا ہے۔ پنجم۔ مختلف زمانوں کے ارتقائے اجتماعی کے دَوروں کا آپس میں بہت فرق ہوگا۔ یعنی اب سے ایک ہزار سال پہلے حیاتِ انسانی کے ارتقاء کا جو دَور اجتماعی تھا۔ وہ ارتقاء کے موجودہ دَورِ اجتماعی سے بالکل ہی مختلف ہے۔ مگر ہر آنے والا دور اجتماعی اپنے پچھلے دَور کی نسبت مترقی ہوگا۔ اور میں نے اسی کو ارتقائے کل کہا ہے اس قانون کے عمل کے ماتحت یہ ہوتا ہے۔ کہ ہر موجودہ دَورِ اجتماعی نامعلوم طریق پر ایک نیا دور تشکیل کرتا رہتا ہے۔ اور مختلف گروہ انسانی جو ان ترقیات سے بہت دیر تک بے خبر نہیں رہ سکتے۔ اپنے مخصوص دوروں سے نکلنے اور آگے بڑھنے کی خواہشوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اور اس طرح جدوجہد کرتے ہوئے نئے دور کی تشکیل کلی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ ششم۔ عام قانون کے ماتحت وہ گروہِ انسانی جو کسی دَور ارتقائے اجتماعی کے سر پر ہوتا ہے یعنی وہ جو سب سے مترقی ہوتا ہے وہی آنے والے دَورِ اجتماعی

میں سب سے پہلے داخل ہوتا ہے۔ مگر یہ کوئی ضروری اور لازمی نہیں۔ کہ ایسا ہی ہوتا رہے۔ بسا ایسا ہوتا ہے۔ کہ کوئی سا گروہ انسانی جو بہتوں سے منازل پیچھے ہے۔ کئی دور ارتقائیات کو پھلانگ کر سرے پر ہو جاتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کا مسئلہ ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے جس پر تبصرہ کرنا فعلاً ہمارے موضوع سے خارج ہے ٭

قارئین اسی ایک چیز کو جسے میں نے اپنے مخصوص انداز میں اوپر بیان کیا ہے۔ کئی بار مختلف اہل قلم کے گوناگوں انداز بیانات میں مختلف اوقات و مواقع پر اپنی نظر سے گذار چکے ہوں گے۔ اور میں موضوع مطلوب سے باہر ہو کر ان کا وقت ضائع کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اگر مجھے اپنی مخترع اصطلاحات کی ضروری تشریح کا فرض مجبور نہ کر دیتا۔ جن کو میں نے جابجا استعمال کیا ہے ٭

باب پنجم

نجات کی راہ کونسی تھی

اب ہمیں صاف طور پر یہ معلوم ہو گیا ہے۔ کہ افغانستان قوائے ثلاثہ کے ارتقائی دور میں موجود تھا یعنی ملک میں تین طاقتیں کارفرما تھیں۔ بادشاہ اور اس کے عمال کی طاقت خوانین کی طاقت اور ملاؤں کی طاقت۔ ان تینوں طاقتوں کا باہمی اتحاد و توازن جب تک قائم رہتا تھا۔ ملک میں سیاسی امن بحال رہتا تھا۔ مگر جب کبھی اس اتحاد و توازن میں خامی اور نقص پڑ جاتا تھا۔ تو ملک میں اسی خامی اور نقص کے اندازہ سے فساد اور جنگ واقع ہوتی تھی۔ کبھی تو یہ فساد و جنگ کسی دو قبیلوں میں پھوٹ پڑتی تھی۔ اور کبھی یہ براہِ راست بادشاہ یعنی حکومت کے خلاف ہوتی تھی۔ آپ چوتھے باب میں پڑھ آئے ہیں۔ کہ جب امیر عبدالرحمن خان مرحوم نے فیوڈل طریق حکومت کے نامترقی دور کا پوری طرح سے خاتمہ کرنا چاہا تھا۔ تو اس نے کس طرح خوانین کے زور و اثر کے برخلاف خونی جنگیں جاری رکھی تھیں۔ اور اس کے عہد میں کس طرح خوانین مختلف سمتوں میں بغاوتیں کر رہے تھے۔ جن کو وہ اپنی منظم طاقت کے ذریعہ سے دبانے میں ہمیشہ کامیاب ہوتا رہا لیکن یہ صرف فوجی طاقت ہی نہ تھی۔ جو ہر بار اس کی کامیابی

کا باعث بنتی تھی۔ بلکہ اس کی وہ سیاست جو وہ ملّانوں کی طاقت کو اپنی حمایت میں حاصل کرنے کے لئے برتتا رہتا تھا۔ بھی موجود تھی۔ اور اس کی فوجی طاقت سے کہیں بڑھ کر اس سیاست کا اثر تھا۔ جو اس کی کامیابی کا ضامن تھا جیسا کہ میں اوپر ذکر کر آیا ہوں۔ کہ ملّانوں کی غالب طاقت اگر بادشاہ کی طاقت کے ساتھ موافقت کرے۔ تو خوانین کی طاقت بادشاہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ اس کے عہد میں بھی شنواریوں نے بغاوت کی تھی۔ مگر محض اس سبب سے کہ ملّاں اپنے امیر کے برخلاف کوئی فتوے شرعی دینے کی توفیق نہ رکھتے تھے۔ اس نے شنواریوں کی بغاوت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہ ان قبیلوں کے جتنے بڑے بڑے شوریدہ سر خوانین ملک اور معتبر اسے مل سکے۔ ان کے سروں سے اس نے عبرت آئندہ کے لئے ایک مینار چن دیا تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کسی فٹ نوٹ میں کر آیا ہوں۔

مگر یہ ساری مہم خوانین کے دبانے کے لئے تھی۔ اب جس قدر ان خوانین کی طاقت کم ہوتی جاتی تھی۔ اسی نسبت سے بادشاہ اور ملّانوں کی طاقت بڑھتی جاتی تھی۔ بادشاہ کی زیادہ اور ملّانوں کی کم، تاہم چونکہ امیر عبدالرحمٰن خان اپنی ساری عمر خوانین ہی کی سرکوبی کرنے میں مصروف رہا۔ اور ملّاں اس کی پشت پر رہے۔ اس لئے ملّانوں کو اس کے عہد میں اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کے خوب خوب موقعے ملتے رہے۔ اور چند ایک جگہوں پر ان کے مستقل خاندان اور اڈے پیدا ہو گئے۔

غازی امان اللہ خان کو جن مشہور اور باسوخ ملانوں سے سابقہ پڑا۔ ان میں حضرت صاحب شور بازار۔ صاحبزادہ صاحب۔ ملّاں چکنور اور ملّائے لنگ وغیرہ تھے۔

غازی امان اللہ خان کے والد امیر حبیب اللہ خان کی پالیسی بھی ملّانوں کے موافق رہی۔ اور اس کے طویل عہد حکومت میں ان کا زور بہت زیادہ ہو گیا تھا حتیٰ کہ

اب عام طور پر وہ بادشاہ کے حضور میں خوانین کے عہد رفتہ کو بحال کرنے کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ گویا اگر امیر عبدالرحمٰن خان کے دور میں خوانین کی طاقت ملّانوں کی طاقت سے کہیں بیشتر سمجھی جاتی تھی۔ تو اب امیر حبیب اللہ خان کے عہد میں ملّانوں کی طاقت کو زیادہ فروغ نصیب تھا۔ غازی امان اللہ خان کے شروع عہد میں بھی اسی گروہ کی حاکمیت اور افضلیت مسلم تھی۔ مگر خوانین کا زور اس کے عہد میں اتنا کم ہو چکا ہوا تھا۔ کہ اسے اپنا زور و طاقت[1] ان پر خرچ کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی۔ چند ایک سالوں کی حکومت کے بعد جب غازی امان اللہ خان کی پالیسی میں فرق آنا شروع ہوا۔ تو اس نے اپنی سیاست کی راہ میں ملّانوں کے اس ٹھہے ہوئے زور و طاقت کو بری طرح حائل دیکھا۔ چنانچہ اگر امیر عبدالرحمٰن خان کو اپنے عہد میں خوانین کا زور توڑنے کے لئے ان کے برخلاف جنگیں لڑنی پڑی تھیں۔ تو غازی امان اللہ خان کو ملّانوں کے زور کا خاتمہ کرنے کے لئے ویسے ہی واقعات کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ امیر عبدالرحمٰن خان کے وقت میں شنواریوں کی بغاوت خوانین کے زیر اثر تھی۔ مگر غازی امان اللہ خان کے وقت منگلوں اور شنواریوں کی بغاوتیں ملّانوں کے خروج کے سبب سے معرض وقوع میں آئیں۔ میں نے اوپر کہا ہے۔ کہ اگر بادشاہ اور ملّانوں کی طاقت خوانین کی طاقت کے برخلاف اتحاد کر لے تو خوانین کو شاذ و نادر ہی غلبہ نصیب ہو سکتا ہے۔ مگر بصورت دیگر یعنی جب بادشاہ خوانین کی طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوا ملّانوں کے برخلاف برسرِ پیکار ہو جائے۔ تو بادشاہ کو اکثر اپنے تاج و تخت سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ ملّاں جھٹ خوانین کے ساتھ ساز و باز کر لیتے ہیں۔ اور خوانین کا طبقہ جو آگے ہی بادشاہ کی سیاست کا شکار ہوا ہوا ہوتا ہے۔ اپنی طاقت کو از سرِ نو بحال کرنے کی امید میں ملّانوں سے مل جاتا ہے۔ اور یہ دونوں طبقے مل کر

[1] زور و طاقت سے میری مراد فوجی خرچ ہے۔ کیونکہ ویسے غازی کے عہد میں بعض سرکش خوانین کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔

ملک کے عام باشندوں کو بادشاہ کے برخلاف اکسا کر اس کی مصیبت و ذلت کا باعث بن جاتے ہیں۔

پس اس سے ثابت ہوا۔ کہ قوائے ثلاثہ کے ارتقار کے دور کو ختم کرنے کا یہ طریقہ جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ صحیح نہیں تھا۔ اگر امیر عبدالرحمٰن خان نے اس خیال سے کہ اس کی نسل میں بادشاہت خاندانی کو کوئی خطرہ نہ رہے۔ خوانین کا خاتمہ کر دینا چاہا۔ تو وہ خوانین کی ہستی کو بالکل مٹا نہیں سکا تھا۔ یہ اس لئے نہیں۔ کہ اس نے اپنی طرف سے ان کے محو کرنے میں کوئی کوتاہی کی تھی بلکہ محض اس لئے کہ ماحول خوانین کی ہستی کا ابھی ساز گار تھا۔ ملک کی اقتصادی سوشل اور ذہنی حالت ابھی ان کی ہستی کے برقرار رکھنے کے لئے چارہ فرما تھی۔ اور بادشاہ ان کی ہستی کے وجود کے بغیر اپنا کاروبارِ سلطنت نہیں چلا سکتا تھا۔ ان کی اضمحلال دیدہ ہستی پھر از سرِ نو طاقت پکڑنے کی صورت دیکھ سکتی تھی لیکن۔ اس وقت جبکہ بادشاہ کی مرکزی قوت کمزور پڑنی شروع ہو جائے۔ یا جب کبھی بادشاہ ملک کی تیسری قوت یعنی ملّانوں سے برسرِ پیکار نظر آئے جیسا کہ عہدِ امانیہ میں ہم نے اس کا مشاہدہ کیا۔ اسی طرح غازی امان اللہ خان نے خوانین کی ہستی کے موجود ہوتے ہوئے اپنی بادشاہت کی راہ میں جو خطرہ ملّانوں کی طاقت میں دیکھا تھا۔ وہ ان کو مٹانے میں باوجود تساہل نہ کرنے کے محض بدیں موجب ناکام رہا۔ کہ ملّاں بادشاہ کی اصل طاقت کو جو سب کی مشترکہ تھی یعنی باشندگانِ ملک کی کچھ براہ راست اپنے اثر سے اور کچھ خوانینِ افتادہ کی معرفت سے مذہب کے نام پر توڑ سکتے تھے۔ اور ایسا کرنے میں ماحول ابھی ان کا موافق و مددگار تھا۔

تو پھر کس طرح حیاتِ انسانی کو اس برائی کے دائرے سے نجات حاصل ہو سکتی تھی؟ اور کس طرح ان قوتوں کو کچلا جا کر ملک کی ترقیات کے لئے راستہ

صاف کیا جا سکتا تھا؟

تجزیۂ مذکورہ کے بعد لامحال یہ سوالات ہیں۔ جو پیش آئیں گے۔اور ہیں ضمناً
یہاں وہ حل جو تاریخ نے پیش کیا ہے۔ محض اس لئے دوہراتا ہوں۔ کہ ہنوز افغانستان
اس برائی کے دائرے میں گردش کناں ہے۔اور نہ معلوم اسے کس قدر عرصہ اس
گرداب بلا سے نجات پانے میں لگ جائے۔ لہٰذا معیوب نہ ہوگا اگر اوراق تاریخ
کے یہ چند سبق ملک کے موجودہ بادشاہ اور اس کے جانشینوں کے سامنے رہیں۔

عام ارتقاء کے قانون کے ماتحت حیاتِ انسانی فیوڈل طریقِ حکومت کے
دور سے نکلکر دورِ استبدادِ پادشاہت سے دوچار ہوتی ہے۔ یعنی بہ امتدادِ دمرورِ
ایام فیوڈل طریق حکومت کا یہ دورِ ارتقاءِ قوائے ثلاثہ زوال پذیر ہوکر تنہا بادشاہ
کی طاقت میں مدغم ہوجاتا ہے۔ اور یہی دور تاریخ میں خودمختار بادشاہت کا
دور کہلاتا ہے۔ ملک میں صرف بادشاہ ہی کی واحد طاقت حکم فرما ہوتی ہے۔ اور
خوانین کا وہ عنصر جو اس سے پہلے فیوڈل طریق حکومت کی یادگار اور باقیات
میں سے شمار ہوتا تھا۔ اب اس عہد میں محض جاگیردار اور زمیندار بن کر رہ جاتا ہے
اور اپنی اس حالت پر قناعت کر بیٹھتا ہے۔ اور ملّانوں کا وہ عنصر جو کبھی ایک واحد
طاقت کی شکل میں خوانین اور بادشاہ کے درمیان گویا مرکزِ توازن ہوتا تھا۔ اب
منتشر اور بکھر کر کچھ تو بادشاہت کی ملازمت اختیار کر لیتا ہے۔ کچھ معلمین کی شکل
میں ڈھل جاتا ہے۔ کچھ تالیف و تصنیف کے کاموں میں مشغول ہوجاتا ہے۔ اور
باقی ملک کی فیاض اور سخی دل مخلوق پر منحصر ہوکر اپنی ہستی کو خیرباد کہہ بیٹھتا ہے۔

اگر تاریخ کا بہ نظر امعان مطالعہ کیا جائے۔ تو ہمیں معلوم ہوجائے گا۔ کہ خودمختار
بادشاہت کو یہ دور اس وقت جاکر نصیب ہوتا ہے۔ جبکہ ملک میں جماعتِ "بین"
(مڈل کلاس) اپنی ہستی سے آگاہ ہوکر اپنے قیام و عروج کے لئے جدوجہد میں

مصروف نظر آتی ہے۔ اس وقت سے پہلے اگرچہ پادشاہ ہی ملک کا حاکم تصور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اسی کے نام کا سکہ و خطبہ ملک میں رائج ہوتا ہے۔ اگرچہ اسی کی طاقت قوی تر اور بیشتر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہی سپاہ و لشکر و خزانوں کا مالک ہوتا ہے۔ اور اگرچہ اسی کی ذات کے لئے خود مختاریت کے جملہ لوازم مہیا ہوتے ہیں۔ تاہم ملک کی ذہنی اور تمدنی حالت ابھی ترقی کے وہ مدارج طے نہیں کر چکی ہوتی۔ کہ وہ فیوڈل حکومت کے دور کی یادگار قوتوں کو جو بادشاہ کی خود مختاریت کو کامل طور پر تسلیم کر لینے کی راہ میں سد ی طرح حائل ہوتی ہیں نیست و نابود یا منتشر کر دے۔ اور صحیح معنوں میں ملک پر بادشاہ کی خود مختاریت کے دور کو مسلط ہونے دے۔ پس میرے نزدیک بادشاہت کی خود مختاریت اور استبدادیت کا دور وہ ہے۔ جب ملک کی جماعتہائے بین منصۂ شہود پر آ کر اپنی ہستی کا عمل شروع کرنے لگ جائیں۔ اس سے پہلے پہلے ملک میں تین قوتیں حاکم ہوتی ہیں۔ اگرچہ نام ایک ہی قوت کا ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں اس دور کو میں قوائے ثلاثہ کے ارتقاء کا دور کہتا ہوں۔ جو کہ فیوڈل طریق حکومت کے دور کی سب سے آخری منزل ہے۔

شاید صاحبان ایراد کو یہ عجیب معلوم ہو۔ کہ جب کہ باقی دو قوتوں کی فنا آگے جا کر اٹل اور مقدر ہے۔ تو پھر میں کیوں ایسے دور کو قوا کے ارتقاء کا نام دیتا ہوں کیوں کوئی اور نام تجویز نہیں کرتا۔ میرا جواب اس کے متعلق یہ ہے۔ کہ جب کسی عہد میں ایک سے زیادہ قوتیں موجود اور ایک دوسری سے برسرپیکار ہوں۔ تو ان کی یہ باہمی جنگ ایک ہی نظریہ کے ماتحت ہو سکتی ہے اور وہ نظریہ سوائے ان کی اپنی ارتقاء کے نظریہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ جو کسی ایک یا دو معین قوتوں کو آگے جا کر شکست فاش اٹھانی پڑتی ہے۔ تو ان کے مقدر میں ایسی شکست ارتقائے کل کے قانون کے ماتحت لازم آتی ہے۔ اور یہاں ارتقائے خاص یعنی کسی فردی ارتقاء کو

خواہش نمو ہے۔ زیادہ واضح اور بالصراحت یوں کہ ہر وجود میں جستجوئے نمود آرائش و ترقی موجود ہے۔ اور ہر وجود اپنی بساط و قدرت کے مطابق اسی جدوجہد میں مصروف ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر وجود کی یہ خواہشِ ارتقاء پوری ہو کر رہے۔ بلکہ قانونِ ضعف و قدرت کے عمل کے ماتحت جو ارتقائے کل کے قانون کی جزئیات اور سازگار قوتوں میں سے ہے ہر ناکارہ اور قانونِ ارتقائے کل کے "مخالف وجود" کو فنا سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

مقصد سے دور جا پڑنے کے خوف سے اس بحث کو یہیں چھوڑتا ہوا قارئین کی توجہ کو پھر اصل بحث کی طرف پھیرتا ہوں۔ اور وہ حل جس کا لب لباب میں نے اوپر بیان کر دیا ہے کسی قدر تشریح کے ساتھ قارئین کی خدمت میں تقدیم کرتا ہوں۔

افغانستان ارتقاء قوائے ثلاثہ کے دور میں سے گذر رہا تھا۔ اور بادشاہ کی کامل خودمختاریت کی راہ میں خوانین اور ملّانوں کی دو زبردست قوتیں حائل تھیں اگر بادشاہ خوانین کی قوت کو دبانے کی طرف مصروف ہوتا تھا۔ تو ملّانوں کی قوت زور پکڑ جاتی تھی۔ اور اگر وہ ملّانوں کی قوت کی سرکوبی کے لئے اپنے آپ کو مستعد کرتا تھا۔ تو ملک میں ذہنی اور تمدنی ترقیات کی رَو کے موجود نہ ہونے کے سبب ملّانوں کی قوت دین و مذہب کے نام پر بادشاہ کے برخلاف ایک عام جہاد برپا کرنے میں اکثر کامیاب رہتی تھی۔ اور سیاسی زور آزمائی کی یہ تین طرفہ طاقتیں ایک دوسرے کے غلبۂ کل کا رد کرتی رہتی تھیں۔ ان مزاحمِ ترقی قوتوں کو نیست و نابود یا ناکارہ بنا دینے کے لئے ایک چوتھی قوت درکار تھی۔ جو بادشاہ خوانین اور ملّانوں تینوں کی قوتوں کے برخلاف اور عین ضد پر ہو۔ یہ قوت محض عام لوگوں کی ہی ہو سکتی تھی۔ جن پر نامعلوم کتنی مدتِ دراز سے ان مذکورہ بالا قوتوں کے ستم کے آرے چلتے رہے تھے۔ یہ

چوتھی قوت اگر مذکورہ بالا کسی ایک قوت کی طرف سے پیدا نہ بھی کیجائے۔ تو پھر بھی اس کا خود بخود پیدا ہو جانا یقینی اور فطری ہے۔ لیکن اس صورت میں اس کو بہت دیر لگ جاتی ہے۔ ممکن ہے۔ قرنوں اور صدیوں تک اس حالت کا انتظار کرنا پڑے۔ تاہم اگر ملک کی غالب ترین قوت یعنی بادشاہ اپنے دور استبداد و خود مختاریت کامل کے لئے اسکو جلد پیدا کرنا چاہے۔ تو اس کا نسبتاً جلد وجود میں آجانا عین ممکن ہوتا ہے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ جب بادشاہ صاف طور پر دیکھ رہا ہو۔ کہ یہ نئی قوت خود اس کی طاقت کے برخلاف بھی اپنا محاذ قائم کریگی۔ تو وہ اس نئی قوت کی تشکیل کا خود آپ باعث بنے۔ حقیقت تو یہی کچھ ہے۔ اب یا تو بادشاہ اپنی موجودہ حالت پر قناعت کرے۔ اور یا پھر اس نئی طاقت کو پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اور تیسرا کوئی راستہ اس کے لئے کھلا ہوا نہیں ہے +

دور اندیش اور صاحب فکر بادشاہ اپنی موجودہ حالت پر قناعت نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اس قسم کی تثلیثی حکومت کو برداشت ہی کرتے ہیں۔ وہ اس نئی چوتھی طاقت کو وجود میں لاکر اسے فروغ دیتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے اپنی خود مختاریت کی راہ صاف کرتے ہیں۔ جہاں تک اس نئی طاقت کا بادشاہ کی اپنی طاقت کے برخلاف صف آرا ہونے کا خوف ہے۔ اس خوف کو بدیں موجب زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ــ کہ ایک تو بادشاہ خود مختاریت کے نشہ میں سرشار ہوتا ہے۔ اور دوسرے وہ خیال کرتا ہے۔ کہ یا تو وہ اس طاقت کو بعد میں نیست و نابود کر سکیگا اور یا اسے اس طرح برقرار رہنے دیگا۔ کہ وہ اس کی خود مختاریت میں کسی طرح حائل نہ ہو سکے +

غازی امان اللہ خان نے دانستہ یا نادانستہ اسی صحیح منزل کی طرف رُخ کیا تھا۔ وہ ملک میں چوتھی قوت کے پیدا کرنے کا خیال کر رہا تھا۔ اور اس کی داغ بیل

بھی ڈال چکا تھا لیکن اس منزل کی طرف بڑھنے میں اس سے دو نہایت ہی اساسی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی اصلاح کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ بلکہ وہ ان کو صحیح تصور کرتا رہا۔ اور آخر کار انہی کا شکار ہو گیا۔

چوتھی قوت کے پیدا کرنے کا کام "جوئے شیر" کے لانے سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ لوگوں کے نام صرف حرّیت اور مساوات کے پیغام و اعلان شائع کرنے ہی کافی نہ تھے۔ بلکہ یہ کسی بنیاد کے کھودے جانے کا نشان اوّلین ہوتا ہے، بنیاد کا کھودنا اور پھر اس کو مختلف مصالحۂ تعمیر کے تناسبی اجزاء سے پُر کر کے بلند کرنا ہی دراصل وہ کام تھا جس پر نئی طاقت کی عمارت بتدریج اوپر اٹھائی جا سکتی تھی۔ حتےٰ کہ بادشاہ کا قصرِ ملوکیت دوسری طاقتوں کی مداخلت کے بغیر مکمل ہو جاتا۔

غازی امان اللہ خان نے اس بنیاد کو کھودنا بھی شروع کر دیا تھا۔ مگر اس میں بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں۔ اس نے اُسے مختلف تعمیری مصالحوں سے پُر بھی کر دیا تھا۔ لیکن ان کے باہمی اجزاء کا تناسب درست نہ تھا۔ اس نے عمارت کو ایک دو ہاتھ اوپر اٹھایا بھی تھا۔ مگر وہ ان شدید حملوں کی تاب جھیلنے کے قابل نہ تھی۔ جو تواتر کے ساتھ قوت ہائے متقابل کی طرف سے ہونے لازمی اور اٹل تھے۔ اس لئے اس کے قصر کی بنیاد نہایت ہی قلیل عرصہ میں زمین پر آرہی۔

یہ ظاہر ہے۔ کہ خوانین و ملّاں آپس میں رقیب نہ تھے۔ ان معنوں میں کہ پچھلا گروہ دنیاوی طاقت یعنی حکومت کے حصول کے درپے نہ تھا۔ امتدادِ زمانہ نے اس گروہ کی اس عصبیت کو کچل ڈالا تھا۔ اور اب اس کا منتہائے نظر صرف یہی رہ گیا ہوا تھا۔ کہ وہ حکومت گری کی طاقت کو اپنے اندر پیدا کرے۔ یعنی بالفاظ

دیگروہ اپنے مذہبی تفوق کے اثر کو اپنے دنیاوی حکمرانوں پر غالب رکھے۔ اور ان کو ایک قسم سے اپنا دست نگر بنائے رکھے۔ یہ عین ممکن تھا۔ کہ اس گروہ کو اپنی کامیابی کی صورت میں دنیاوی حکومت کو بھی اپنے قابو میں کر لینے کا خیال پیدا ہو جاتا۔ مگر اس زمانہ تک پہونچنے کے لئے ابھی اس کے پاس کوئی ساز و سامان موجود نہ تھا۔ فلہذا دنیاوی حکومت کے حصول کے سلسلہ میں طبقہ خوانین کا رقیب نہ تھا یہی وجہ ہے کہ جب کبھی بادشاہت نے ملّانوں کے برخلاف مہم شروع کی۔ تو ان کو خوانین کے گروہ سے مدد ملی۔ اور وہ خوانین کی طاقت کو لے کر بادشاہ کی طاقت کے بالمقابل آیا کئے۔ خوانین اس کیفیت کو اچھی طرح جانتے ہوئے تھے۔ کہ در صورت کامیابی دنیاوی حکومت انہی کے مابین بٹیگی۔ اور ملّاں ان کی اس امانت کو نہ چھیڑینگے گو اس تقسیم میں ان کے امر و ارادہ کو ضرور رراہ ہو گی۔ دوسری طرف جب کبھی بادشاہ نے خوانین کے برخلاف دھاوا بولا۔ تو خوانین اپنی طاقت کو اس وقت تک بادشاہ کے برخلاف میدان میں نہیں لا سکے۔ جب تک کہ ان کو ملانوں کے کسی نہ کسی حصہ کی معاونت نصیب نہیں ہوئی۔ پس اس حقیقت کی روشنی میں بادشاہ کی یہ پالیسی کہ وہ ایک گروہ سے اپنے ہاتھ قوی کر کے دوسرے گروہ کی طاقت کو پہلے کچل ڈالے۔ اور پھر دوسری طرف متوجہ ہو کر کامیابی کے ساتھ اسے بھی راستہ سے ہٹا کر اپنی حکومتِ کامل کے نقارے بجائے۔ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ علاوہ ان حقائق کے جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ایک اور وجہ بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ خوانین اور ملانوں کے گروہ اپنے آپ میں متحد و منظم نہ تھے۔ بلکہ سارے ملک میں ایک انتشار کی صورت میں پھیلے ہوئے اپنے اپنے محدود دائروں میں اپنے مخصوص اثرات پیدا کر رہے تھے۔ اندریں صورت اگر بادشاہ ملک کی کسی ایک سمت میں کسی ایک گروہ سے مصروفِ پیکار ہے۔ اور اس میں

اس کو کامیابی بھی میسر آگئی ہے۔ تو باقی دوسرے اطراف ملک میں وہی طریق زندگی قائم ہے۔ جو پہلے موجود تھا۔ اور جب اس مخصوص سمت کی شورش فرو ہوگئی ہے۔ تو اگرچہ شروع شروع میں بادشاہ کی سختیاں وہاں عام ہوا کرتی تھیں۔ (اور وہ بھی جزائیہ اور انتقامیہ صورت میں اصلاحی یا سیاسی صورت میں نہیں) تاہم تھوڑی مدت کے گذر جانے پر سب کچھ بھلا دیا جاتا تھا۔ اور حالت اپنے معمول پر آجاتی تھی۔ اور پہلا عمل پھر شروع ہوجاتا تھا۔ پس نہ تو بادشاہ ہی حالتِ ملک کے ماتحت ان مذکورہ بالا گروہوں کے برخلاف بحیثیت اجتماعی کوئی مہم شروع کرسکتا تھا۔ اور نہ ملّانوں اور خوانین کے گروہ ہی بادشاہ کے خلاف کسی ایک وقت میں اپنے پورے گروہ کی طاقت کو استعمال کرسکتے تھے۔ اور اس لئے ملک میں کسی طاقت کا خاتمہ ہونے میں نہ آتا تھا۔

مجھے امید ہے کہ اب قارئین کرام نہایت صاف طور پر سمجھ گئے ہونگے۔ کہ کس طرح ملک کی یہ مختلف قوتیں مذمومیت کے دائرے تشکیل دے کر گرداب صفت کیفیت پیدا کرلیتی تھیں۔ جن سے ملک کو نکال لے جانا تدبیر کامل کے بغیر ممکن نہ تھا۔

اوپر کے بیانات سے ہمیں معلوم ہوا ہے۔ کہ خوانین یا ملّانوں کی طاقت دونوں میں سے کوئی بھی منظم اور متحد نہ تھی۔ اب جہاں تک بادشاہ کی طاقت کا مسئلہ ہے۔ اس کو اگرچہ ایک قسم کی مرکزیت اور تنظیم نصیب تھی۔ مگر اتحاد کی صفت اس میں بھی مفقود تھی۔ جیسا کہ آپ بادشاہ کے کارداروں کے بیان میں پڑھ آئے ہیں۔ مگر اس نقص کی موجودگی میں بھی بادشاہ کی طاقت کی یہ بھونڈی اور ادھوری مرکزیت اور تنظیم ایک صاحبِ تدبیر اور اولوالعزم بادشاہ کی ماتحتی میں باقی دوسری طاقتوں پر غالب آکر مزید اصلاح اور مرکز کی اکملیت کی راہ

موجود کر سکتی تھی ۔

ان حالات کی روشنی میں جو ہم اوپر پڑھ آئے ہیں ۔ غازی امان اللہ خان ملک کی دیگر طاقتوں پر غالب آ سکتا تھا بشرطیکہ وہ تدبر احتیاط حوصلہ اور استقلال کو ہاتھ سے نہ دیتا ۔ نہ تو ملاؤں میں تنظیم اور اتحاد تھا ۔ اور نہ خوانین ہی میں یہ وصف موجود تھا ۔ اور ملک میں جو فساد یا شورشیں یا بغاوتیں وغیرہ ہوتی تھیں ۔ وہ تمام تر اس غیر ذمہ داری کی پیدا کردہ ہوتی تھیں ۔ جو عدم تنظیم کی وجہ سے قدرتاً ان گروہوں کے اندر موجود تھی ۔ اب اگر ان گروہوں کی لوگوں پر اپنی طاقت و اثر کے استعمال کرنے کی قدرتی خواہش کو ذمہ داری کے قالب میں ڈھال دیا جاتا ۔ تو یقیناً اور قطعیاً ان کا دستور راہ (Course of action) تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ۔ اور بالآخر ان گروہوں کی طاقتیں تحلیل گاہ سیاست (Laboratory of Politics) کی حلقہ بند ہو کر خود بخود چھوٹے بڑے متوازی القوت حصوں میں تشکیل پا جاتیں جنہیں حکومت کا ہاتھ آسانی سے نقل و حرکت دے سکتا ۔ یورپ اس وقت تک چرچ اور لارڈز کی مذمومیت کو دور نہیں کر سکا ۔ جب تک غیر معلوم طور پر ملکی سیاست نے چرچ اور لارڈز کے اندر تفرقے پیدا کر کے نہ رکھ دیئے جن کی بنا پر مذکورہ بالا گروہ تنظیمی انتشار کا شکار ہو گئے ۔ اور بالآخر حکومت کے دست نگر ہو کر رہ گئے فیوڈل لارڈز جاگیر دار اور سرمایہ دار بن گئے اور چرچ کے پیشوا علم مذہب کی تفسیر اور تعلیم کے جامہ پوش نظر آئے ۔ اگر یورپ میں ملوکیت کو اس طرح نجات میسر ہوئی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی ۔ کہ ایشیا کے ملک افغانستان کو کیوں اس طرح نجات نہ ملتی ۔ جبکہ حالات اور عمرانی دور ایک ہی جیسا تھا ۔

میں نے اوپر تنظیمی انتشار کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔ درحالیکہ بظاہر یہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ تنظیم اور انتشار دو متضاد چیزوں کو باہم ترکیب دے کر

ایک نئے معنی پیدا کئے جائیں۔ لیکن اگر دو متضاد کیفیتوں کے امتزاج باہمی سے کوئی نئی کیفیت پیدا ہو سکے۔ تو میں زبان کی ترقی کے لئے اس کو محض جائز ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھتا ہوں۔ جس کیف کو اوپر میں نے پیدا کرنا چاہا ہے۔ اس کی مزید وضاحت یوں ہے۔ کہ اگر کوئی گروہ منظم ہو۔ اور بہ سلسلۂ تنظیم اپنے اندر متعدد فرقے پیدا کرتا چلا جائے۔ تو یہ اس گروہ کا تنظیمی انتشار ہوگا۔

الغرض ملک کی ان مذکورہ قوتوں میں انتشار موجود تھا۔ بادشاہ کے ذمۂ ہمت پر صرف اتنا ہی کام تھا۔ کہ وہ اس انتشار میں تنظیمی صفت پیدا کر دے۔ اور اپنی قوت و اثر کے ذریعہ سے ان کو چھوٹے چھوٹے متعدد حلقوں میں منقسم کر دے۔ جہانتک ملّانوں کے گروہ کا تعلق تھا۔ ان کو وزارت تعلیم و معارف کی سرکردگی میں علم و مجالس دینی کے مشاغل کی طرف بڑی آسانی سے مشغول کیا جا سکتا تھا۔ اور جب ایک دفعہ وہ اس حصار کے اندر آجاتے۔ تو وہ پھر بمشکل تمام اس سے اپنے آپ کو علیحدہ کر سکتے تھے۔ مالی نقطۂ نظر سے بھی یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ عہد حبیبیہ میں خزانہ عامرہ سے بہت سی رقوم ان ملانوں کو بطور وظیفہ و مواجب سالانہ کے ملتی رہتی تھیں۔ جو عہد امانیہ میں بھی چند سالوں تک بحالہ قائم رہیں۔ بجائے اس کے کہ اس طرح وظائف و مواجب کا دیا جانا یک لخت بند کر دیا جاتا۔ اور ملّانوں کو یہ سمجھنے کا موقع دیا جاتا۔ کہ اب ان کا بیت المال میں کوئی حصہ ہی نہیں۔ اگر یہی رقم وزارت معارف کے بجٹ ربودیجہ میں ضم کر دی جاتی۔ اور صوبوں میں اور صوبجات کے ماتحت سارے ملک میں اس رقم کو ملّانوں کی تنظیم و اصلاح پر صرف کیا جاتا۔ تو طبقہ ملّاں کے ان افراد میں جن کی علمی حیثیت بہ نسبت دوسروں کے بڑی ہوئی تھی۔ خواہ مخواہ اس طرف کشش ہونی شروع ہوتی۔ اور حکومت کا مقصد پورا ہونا شروع ہو جاتا۔ عہد امانیہ میں وزارت معارف کا سالانہ بودیجہ ملک کی کل آمدنی کے آٹھویں حصہ کے برابر تھا۔

اس سے ظاہر ہے ۔ کہ غازی امان اللہ خان کس تندہی اور انہماک توجہ کے ساتھ ملک میں تعلیمی سلسلہ کو وسیع کرنا چاہتے تھے ۔ اور یہ امر کوئی مشکل نہ تھا ۔ اگر سوا کروڑ یا ڈیڑھ کروڑ کے سالانہ بودیجہ میں پندرہ بیس لاکھ کی رقم ملانوں کی طاقت کے گداز کر دینے پر صرف کر دی جاتی ۔

مگر افسوس غازی امان اللہ خان کی اس طرف بالکل توجہ نہ تھی ۔ بغاوت منگل کے بعد وہ اور بھی ملانوں کے مخالف ہو گئے تھے ۔ ان کو اس سے پیشتر جو کچھ حکومت سے مواجب و وظیفہ کی صورت میں ملا کرتا تھا ۔ وہ بعد میں بالکل بند کر دیا گیا تھا اور اس کے عوض اور کسی صورت میں حکومت کی طرف سے ان کی معاونت و دستگیری کی کوئی راہ کھلی نہ تھی ۔ جس کے سبب ان میں غیر ذمہ واری کی روح اور بھی تقویت پا گئی تھی ۔ جو آخر میں حکومت کے حق میں سم قاتل ثابت ہو کر رہی ۔

حکومت امانیہ نے اپنے آخری ایک دو سالوں میں زیادہ سے زیادہ جو اصلاحی اقدام اس جانب کیا وہ یہ تھا ۔ کہ اس نے وزارت معارف کے ماتحت چند دینی مکتب کھول دیئے ۔ جہاں پر ایک دینی نصاب کے ماتحت تعلیم دی جاتی تھی جس کو ختم کرنے کے بعد طالب علموں کو اطراف و اکناف ملک میں قضاۃ کے چھوٹے بڑے عہدوں پر سرافراز کیا جاتا تھا ۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے ۔ تو یہ اقدام اس جانب بالکل نہیں تھا جس کے متعلق میں نے اوپر اشارہ کیا ہے ۔ بلکہ یہ تو وزارت تعلیم و معارف کا ایک ضروری وظیفہ تعلیمی تھا جس کا ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے موجود ہونا لازمی و ناگزیر تھا ۔ اور اس پر بھی ملانوں کے گروہ کی اصلاح کا تمام تر انحصار اسی ایک شعبہ پر کر لینا غلطی اور سخت غلطی تھا ۔ (بشرطیکہ اس شعبہ کا قیام ملانوں کی اصلاح و ترقی کی غرض سے ہوا ہو) کیونکہ یہ سمندر میں ایک قطرہ کی مثال تھا ۔ اور پھر اس پر طرہ یہ کہ سارے ملک میں صرف ایک ہی جگہ یعنی کابل میں ان مکتبوں کی بنا رکھی گئی تھی ۔ جس میں

ملک کے چند دیگر اہم حصوں سے طالب علم نہیں آسکتے تھے۔ اور پھر یہ امر بھی ملحوظ ہے کہ آخر کار یہ طالب علموں اور نو آموزوں کے لئے تھا۔ اور وہ بے شمار عنصر جو اب پختگی کو پہونچ چکا تھا۔ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

حکومت کی سیاست کا نامعلوم ہاتھ وزارتِ تعلیم و معارف کے توسط سے ملک کے طول و عرض میں اس طرح حرکت کرتا ہوا دکھائی دیتا۔ کہ ملّانوں کا عقلمند عنصر اس ہاتھ سے فیض پانے کی کشش کے ماتحت اپنے آپ کو برضا و رغبت اور بلا کسی رسمی (افیشل) ذمہ داری کے حکومت کے حوالہ کرتا چلا جاتا۔ اور یہ خصوص تب ہی حاصل ہوسکتا تھا۔ جبکہ اس طریق پر کام کرنے کے لئے وزارت معارف کے پاس ہر سال ایک معقول رقم فالتو موجود ہوتی۔ اور وہ ایسے قواعد وضع کرتی جس کی رو سے ملک کے صوبوں اور صوبوں کے اندر اہم مقامات پر ملّانوں کو تشویق دی جاتی۔ کہ وہ اپنی اپنی تنظیم کرنا شروع کردیں۔ حکومت کی طرف سے ہر ایسی تنظیم کو جو شرائط مجوزہ کے ماتحت قائم ہوتی مختلف شرحوں سے سالانہ امداد دی جاتی۔ اور وزارت معارف کے عہدیداران مجالس سے ملکر سال کے لئے ایک ایسا پروگرام طے کرتے جس کی جزئیات :-

(الف) دین حق کی تحقیق؛

(ب) باطل اعتقادیات کے برخلاف جہاد؛

(ج) مذہب و مادی ترقیات کا آپس میں تعلق و لگاؤ؛

(د) علم و ہنر کے حصول کی تشویق و تبلیغ؛ اور

(ہ) آپس میں بحث و مناظرہ کی مجالس اور اپنے اپنے مقامات کی حدود ذات کے اندر مواعظین کے دورے وغیرہ ہوتے؛

سب سے اوّل اور اہم نتیجہ جو اس تحریک سے پیدا ہوتا۔ وہ بحیثیت اجتماعی ملّانوں کے گروہ کی توجہ کا یک لخت اس نئی جولانگاہ کی طرف پھر جانا تھا۔ سوائے ان چند گنتی

کے ملّانوں اور عالموں کے جن کی ساکھ ملک میں قائم ہو چکی ہوئی تھی۔ اور یا وہ جو آگے ہی سے حکومت کے دورۂ ملازمت میں منسلک ہو چکے ہوئے تھے۔ اور یا وہ جو ابھی نوآموزی اور ابتدائیت کے دور میں سے گذر رہے تھے۔ باقی سارے کا سارا درمیانی گروہ حکومت کی طرف سے امداد سالانہ ملنے کے سہارے پر مجتمع اور منظم ہونا شروع ہوجاتا۔ اور قدرتاً وہ ایسے پیمانہ پر اپنی تنظیم کرنے کے خواہشمند ہوتے۔ جو سب سے زیادہ آمد لانے والی ہوتی۔ اور جبکہ یہ ان کو اطمینان ہوتا۔ کہ جو امداد ان کی مجلس کے نام پر انہیں حکومت سے ملیگی۔ اس کے خرچ کرنے کا بلا مداخلتِ حکومت صرف انہی کو اختیار ہوگا۔ تو ان کے شوق کی حدت اور بھی تیز ہوتی۔ جس کے قدرتی نتائج یوں مرتب ہونے شروع ہوتے۔ کہ ایک ایک صوبہ میں ملّانوں کے گروہ متعدد جماعتوں میں تقسیم ہوجاتے۔ اور ہر ایک جماعت یا مجلس ہم اثر اور ہم علم افراد سے بنتی۔ یعنی جن کا اثر اور علم بمنزلہ دیگر کے زیادہ ہوتا۔ وہ اپنی جماعت کو اعلےٰ پیمانہ پر تشکیل کرنے میں کامیاب ہوتے۔ اور باقی اسی ترتیب سے سلسلہ وار حتےٰ کہ آخری درجہ تنظیم پیدا ہوجاتا۔ اور جب یہ خصوص موجود ہوجاتا۔ تو ان جماعتوں میں اس رقابت کی آگ پہلے سے بھی زیادہ بھڑک اٹھتی۔ جو ان کے غیر منظم ہونے کے وقت موجود تھی۔ کیونکہ اُس وقت ان کے فوائد دینی یا دنیوی غیر معین اور غیر یقینی تھے۔ مگر اب وہ معین اور یقینی فائدوں کے حصول کی منزلوں پر گامزن ہوتے۔ اس رقابت کے ماتحت ان میں علمی رشک پیدا ہونا شروع ہوجاتا۔ تاکہ ایک دوسرے کے بالمقابل وہ اپنا علمی تفوق ثابت کرسکیں۔ ان میں لوگوں کے دینی اور دنیاوی راہنما بننے کی خواہش بھی ایک نئے رنگ میں موجود ہونی شروع ہوجاتی تاکہ اگر علم کے ذریعہ سے نہیں۔ تو اسی ایک طریقہ سے حکومت کی آنکھوں میں ایک دوسرے پر اپنے تفوق اور غلبہ کا اظہار کریں۔ دوسری طرف لوگوں پر ملّانوں کی اس تنظیم اور کچھ

اس تنظیمی انتشار اور اختلاف فی العلماء خواہ ان اختلافات کی "اصل" محض علمی ہوتی یا علماء کی باہمی رقابت، کے اثرات جلد جلد پڑنے شروع ہو جاتے۔ جن کا بالآخر نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ ان کا تذبذب ان کے ذہنی قواء کو ہوشیار اور بیدار کرنا شروع کر دیتا۔ اور رفتہ رفتہ ان میں دینی اور دنیاوی امورات کے درمیان امتیاز کرنے کی طاقت پیدا ہونی شروع ہو جاتی۔ اور وہ ملّانوں کے چنگل کو اپنے اوپر کمزور کرنے کی طرف مائل ہونے لگتے۔ حکومت ملّانوں کے اس تنظیمی انتشار سے جو اس کی اپنی سیاست کا پیدا کردہ ہوتا۔ کیونکر اور کس طرح فائدہ اٹھاتی۔ یہ اس کے اپنے تدبّر و فہم و فراست پر موقوف ہوتا۔ مگر اس ترکیب سے قطعیت کے ساتھ ایک فائدہ جو اسے ملتا۔ وہ یہ ہوتا کہ ملّانوں کی طاقت کو اس کے برخلاف کبھی اور کسی رنگ میں بھی سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکتا۔

علٰے ہٰذا القیاس۔ خوانین کے برخلاف بھی نہایت آسانی سے ایک قسم کا سیاسی محاذ قائم کیا جا سکتا تھا۔ یہ گروہ تو پہلے ہی سے کمزور ہو چکا ہوا تھا۔ اس کا صید و اسیر کر لینا ملّانوں کے گروہ کی نسبت بہت معمولی اور سہل تھا۔ ان کی رقابت باہمی صرف سوشیل اور اقتصادی دائروں ہی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ سیاسی اور ملی حدود تک متجاوز کر چکی ہوئی تھی۔ قارئین ذیل کے بیان سے ان کی اس ہمچشمی اور رقابت باہمدگر کا بخوبی اندازہ لگا سکینگے۔

ملکی رسم کے مطابق صوبہ جات کے گورنر تقریباً ہر روز دربار منعقد کیا کرتے تھے۔ یہ دربار دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک دربار خاص اور ایک دربار عام۔ دربار خاص میں خوانین اور رؤسائے ملک وغیرہ حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور دربار عام میں لوگوں کی عرضداشتیں اور مجرموں کو پیش کیا جاتا تھا۔ جن کے متعلق گورنر حکم و احکام صادر کیا کرتا تھا۔ اس دربار عام میں بھی درباری خوانین و رؤساء کو نشست و برخاست کی اجازت

ہوتی تھی۔ اور چونکہ حکومت قومی سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے رسمیت (Formality) کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ عام طور پر دربار میں مختلف قصّے اور دُور ازکار باتیں زیر بحث رہتی تھیں۔ اور ساتھ ہی حکومت کے فرائض بھی انجام پاتے رہتے تھے۔ یہ زیادہ تر گورنر کے رجحان طبیعت پر موقوف ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنے اردگرد بیٹھنے والوں کو اپنے قیمتی وقت کا کس قدر حصّہ نذر کر سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ گورنر کو جس کی باتیں سب سے زیادہ پسند آئیں گی۔ اسی کی طرف زیادہ مخاطب ہوگا۔ پس اگر گورنر صاحبِ شعورِ سیاسی نہیں ہے۔ تو اس کا یہ قدرتی میلانِ طبیعت اس کے لئے ایک آفت بن جائیگا۔ خوانین و رؤساء جھٹ مختلف قسم کی سازشوں میں مشغول ہو جائیں گے جن کا مقصد یہ ہوگا۔ کہ گورنر کے منظور نظر کو کسی نہ کسی طرح دربار میں ذلیل کروا دیا جائے۔ اور اس کی اہمیت اور شخصیت کو کم کر کے دکھلایا جائے۔ تاکہ گورنر اس کو بیکار محض سمجھ کر اپنی نظروں سے گرادے اور بجائے اس کے ان کی اپنی طرف متوجہ ہونا شروع ہو جائے۔ اس مطلب کے حصول کے لئے کبھی تو وہ دربار کے "حقہ بردار"[۵] سے ساز باز کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ تاکہ گورنر کے حقہ پی چکنے کے بعد اس کے "منظورِ نظر" سے پہلے

۵؎ افغانی درباروں کا یہ دستور تھا۔ کہ جب حقہ بردار حقہ بھر کر مجلس میں لاتا تھا۔ تو سب سے پہلے صدر مجلس یعنی گورنر کے آگے آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور جب وہ حقہ کے کش لگا چکتا تھا۔ تو پھر حقہ بردار کا یہ فرض ہوتا تھا۔ کہ نوبت بہ نوبت حاضرین دربار میں سے ہر ایک کی طرف حقہ کھڑا کرے لیکن ایسا کرتے ہوئے اس کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ کہ جو اس کے آقا کی نگاہ میں سب سے زیادہ مقرب ہے۔ پہلے اس کے آگے حقہ لائے اور پھر اسی طرح نوبت بہ نوبت اور سلسلہ وار ہر ایک کے آگے لیجائے۔ چونکہ حقہ کی ساخت افغانی طرز کی ہوتی تھی۔ اس لئے وہ نوبت بدلواتے وقت مجبور ہوتا تھا۔ کہ چند قدم پیچھے ہٹ کر حقہ کا جمع شدہ دھواں خارج کرے۔ اور پھر کسی دوسرے کے سامنے لائے۔ چنانچہ اس اثنا میں اگر اس نے دوسرے خوانین سے ساز باز کیا ہوتا تھا۔ تو وہ اپنے اوپر عاید کردہ اس سازشی فرض کی بخوبی تکمیل کر سکتا تھا۔

حقہ ان کی اپنی طرف پھرایا جائے ؛
اور کبھی وہ پانی پلانے اور ہاتھ دھلانے والے سے اسی طرح کا ساز باز کیا کرتے تھے۔ اور ان کو اس کام کے لئے کافی بخشیش دیتے تھے۔ علاوہ برآں وہ گورنر کے سکرٹری اور ماتحت سکرٹریوں وغیرہ سے بھی مل ملا کر اس بیچارے آفت زدہ خان کے برخلاف زہر اگلوانے کی کوششیں کرتے تھے۔ نیز دربار میں ایسے آدمی پیدا کرتے تھے۔ جو موقع موقع پر اس شخص کے قول کی تردید کرتے رہیں۔ اور کسی وقت بھی اس کو جھوٹا ثابت کرنے میں دریغ نہ کریں۔ اگر ان کے یہ مذکورہ بالا تیر بھی نشانے پر نہیں بیٹھتے تھے۔ تو گورنر کے برخلاف ہر طرح کے اتہام والزام لگانے میں انہیں کوئی باک نہ ہوتا تھا۔ پس اکثر اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ اگر گورنر بیچارہ کمزور یا شریف طبیعت کا انسان ہے۔ تو بہت جلد بدنام ہو کر اسے اپنے صوبہ کی گورنری سے ہاتھ دھونے پڑ جاتے تھے ؛

قندہار کی نسبت یہ بات عام مشہور ہے۔ کہ خوانین بڑی بڑی رقمیں صرف اسی بات پر صرف کر دیتے تھے۔ کہ دربار میں " حقّہ بردار " حقہ کو سب سے پہلے ان کے روبرو لائے۔ وہاں یہی دوسروں پر فوقیت رکھنے کا نشان متصور ہوتا تھا ؛

جاہلانہ نمائش اور رقابت کی اس انتہا نے اگرچہ خوانین کو بتدریج کمزور اور حکومت کی سیاست کو (سیادت پادشاہی کے سلسلہ میں) غالب کر دیا ہوا تھا۔ اور اس لئے عہد امانیہ میں ان کی قومی طاقت سے حکومت چنداں مخوف نہ تھی۔ تاہم اس گروہ کی سوشل اور دنیاوی جد و جہد کا عکس جو ملت کے سر کہ دمہ پر پڑ رہا تھا وہ اتنا مذموم اور مضر تھا۔ کہ حکومتِ وقت کے اس سے غفلت برتنے کا نتیجہ بالآخر اس کے زوال کی صورت میں رونما ہوا ؛

آگے چل کر قارئین معلوم کر لینگے۔ کہ اسی جاہلانہ نمائش اور رقابت کی روح نے

کس طرح غیور افغانوں کے سروں کو تھوڑی دیر کے لئے ایک گمنام اور بے اصل بچہ سقاؤ کے آگے جھکا دیا تھا ۔

یہاں ہم ان مذموم اور مضر اثرات کو جوان کی سرگرمیاں ملت عامہ پر ڈال رہی تھیں ۔ مکرر نہیں دوہرائیں گے ۔ کیونکہ ہم خوانین کے سلسلہ میں ان کے متعلق بہت کچھ کہہ آئے ہیں ۔ بلکہ یہاں ہم نے یہ دیکھنا ہے ۔ کہ حکومت امانیہ کس طرح ان کی راہ عمل کو کسی دوسری طرف پھیر سکتی تھی ۔ جس سے مرکزی حکومت کو استحکام کلی نصیب ہو سکتا ۔ اور بادشاہ نئی طاقتوں کے ساتھ (جن کا پیدا ہونا ناگزیر تھا) اپنی ملوکیت کامل کا ڈنکا بجا سکتا ۔

میں قارئین سے التجا کرتا ہوں کہ وہ یہاں اس امر کا خیال رکھیں ۔ کہ ہر دور کے عروج کی منزلوں میں وہ تمام طاقتیں ساتھ ہی ساتھ موجود رہتی ہیں ۔ جن کے اضمحلال پر کسی خاص دور کی ابتدا ہوا کرتی ہے ۔ اور اس دوران میں یہی طاقتیں اس دور کے عروج وکمال کی راہ میں بری طرح حائل ہوتی رہتی ہیں ۔ گویا ان کی اضمحلال یافتہ حالت جب تک کسی خاص دور کے آغاز کو جنم نہیں دے لیتی ۔ اس وقت تک یہ طاقتیں ایک بے خودی کے عالم میں مدہوش پڑی ہوتی ہیں ۔ لیکن جونہی کہ اس خاص دور کے نہال جدید کو زمین نے قبول کر لیا ہو ۔ اور اس کی جڑیں کچھ مضبوط ہو چکی ہوں ۔ تو معاً یہ خود فراموش کردہ طاقتیں پھریری لے کر ہوشیار اور بیدار ہونی شروع ہوتی ہیں ۔ اور راز خود رفتگی کا احساس انہیں دور جدید کی مخالفت پر آمادہ کر دیتا ہے ۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے ۔ کہ یہ طاقتیں غالب آ کر دور جدید کی رفتار کو آگے بڑھنے سے روک دیں ۔ تاہم یہ وقتی روک ہوتی ہے ۔ تھوڑی دیر کے بعد اس جدید دور کو پھر نشوونما نصیب ہوتی ہے ۔ اور وہ قوی ہونا شروع ہو جاتا ہے ۔ جوں جوں وہ قوت پکڑتا جاتا ہے ۔ اسی نسبت سے دور رفتہ کی طاقتیں یا تو کمزور ہو کر سمٹتی چلی جاتی ہیں ۔ اور یا ان کے اپنے اندر

تغیرات و انقلاب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ تا آنکہ ان کی پہلی شکل و صورت بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک جدید رنگ میں دنیا اور سوسائٹی کے سامنے پیش کر کے اپنی ہستی اور قوت کی بنا پر اپنا مرتبہ قائم و حاصل کرتی ہیں۔ پس جب تک دورِ رفتہ کی طاقتوں کو یہ آخری مرحلہ پیش نہ آ جائے۔ اس وقت تک دورِ جدید کے عروجِ کامل کی منزل پیدا و موجود نہیں ہوتی۔ اور یہاں یہ التزام بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ کہ جیسے جیسے دورِ رفتہ کی طاقتوں کا مسخ و تبدیل ہونا شروع ہو کر تکمیل پاتا رہتا ہے۔ ویسے ویسے ایک اور آنے والے دورِ جدید کی قوتوں کی پیدائش بھی ساتھ ہی ساتھ جاری رہتی ہے جسے اس نئے دور کے بعد آنا ہے۔ جواب شروع ہے۔ اب جونہی کہ دورِ جدید اپنے عروج کی انتہائی منزل پر فروکش ہوگا۔ ایک طرف تو دورِ رفتہ کی طاقتوں پر (اوپر کے بیان کے مطابق) موت وارد ہو چکی ہوگی۔ اور دوسری طرف نئی طاقتوں نے (جو آنیوالے دورِ جدید کا پیش خیمہ ہیں) جنم پا لیا ہوگا۔ گویا کسی دور کا عروجِ کامل جہاں دورِ رفتہ کی قوتوں کی فنا پر اپنی بقا کا اعلان کرتا ہے۔ وہاں اس کی اس بقا کے قیام میں آنیوالے دورِ جدید کی نو پیدا شدہ قوتوں کا ہاتھ اور سہارا بھی ہوتا ہے۔ اور بعد میں یہی نو پیدا شدہ قوتوں کا ہاتھ اور سہارا جو ابھی اس کے عروجِ کامل کا باعث بنا تھا۔ آگے چل کر خود اپنی تخلیق کی نمائش اور مرتبت کے لئے اس کے زوال و سقوط کے اصلی اسباب فراہم کرتا چلا جاتا ہے۔

پس میرے نزدیک افغانستان میں غازی امان اللہ خان کا یا موجودہ بادشاہ کا عہدِ حکومت صحیح معنوں میں خود مختار ملوکیت کے عروجِ کامل کا دور نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہنوز فیوڈل طریقِ حکومت کے دورِ ارتقاء قوائے ثلاثہ کی آخری منزل ہے۔ میں اس گرانبار حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں۔ کہ اگر میرے نظریہ کے مطابق عہودِ تاریخیہ کی تفریق و تقسیم

کی گئی۔ تو بے اندازہ مشکلات اور لغزشوں کے علاوہ جو ہر مقام پر مورخین کو پیش آئیں گی۔ انہیں بہت سی نئی اصطلاحیں دریافت کرنی پڑینگی۔ تاکہ وہ اپنے انتشار توجہ پر غالب آسکیں۔ اور اپنی تحریر میں ان اصطلاحوں کے قابل فہم معانی پیدا کرسکیں اسی سلسلہ میں میرے پیش نظر ایک عظیم الشان کام ہے۔ انشاء اللہ اس میں میں بہ ترتیب عمل ارتقا ہر دور تاریخی کی صحیح اور مکمل تصویر اپنی زندگی کے مقصد کو سامنے رکھ کر کھینچنے والا ہوں۔ تاکہ یہ دنیا جس کا میں ایک ناچیز فرد ہوں۔ میرے کیف حسیات سے نامحرم و ناآشنا نہ رہ جائے۔ یہاں اس کتاب کا اصل موضوع اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ ضرورت سے زیادہ انسانی زندگی کے ان اہم مرحلوں پر نقش آرائی کی جائے ؛

اپنے مقصد کی طرف مراجعت کرتے ہوئے عرض ہے۔ کہ ہم اس امر پر بحث کر رہے تھے۔ کہ خوانین کی طاقت و اثر کے رخ و افتاد کو حکومت امانیہ کس طرح تبدیل کرسکتی تھی۔ تاکہ وہ کبھی اور کسی وقت میں بھی ملت عامہ یا اس کے کسی جزو کو حکومت کے برخلاف استعمال نہ کرسکیں۔ یہاں اس امر کا خیال رہے۔ کہ گو خوانین کی طاقتیں اب ماند پڑ چکی ہوئی تھیں۔ تاہم ملاؤں کے وجود و اتحاد سے ان کی طاقتیں اب بھی حکومت کے برخلاف استعمال میں لائی جا سکتی تھیں۔ اس لئے محض اس خیال سے کہ خوانین کی اپنی طاقتیں ضعیف ہو چکی ہیں۔ حکومت کا ان کی طرف سے مطمئن ہو جانا تدبر اور سیاست ملکی کی ایک اہم لغزش تھی۔ خوانین کے مرکز شہروں کی بجائے گاؤں میں تھے۔ اور ملت کی آبادی کا کثیر حصہ دیہاتی تھا۔ جو صدیوں کے عمرانی تمدن اور رسم و رواج کی بندشوں سے ایک دوسرے سے پیوند ہو چکا ہوا تھا۔ جہاں تک ان کی مالی و اقتصادی ثروت کا تعلق ہے۔ آپ اس کا ذکر اس سے پہلے پڑھ ہی آئے ہیں۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ کہ وہ اپنی کف دست گذران کے لئے کس کس طرح کے وسائل

سے کام لیتے تھے۔ کھیتی باڑی سے جو کچھ انہیں میسر آتا ہے۔ اسے خان حاکم اور ملاں کس کس طرح ان سے اینٹھ لیتے تھے۔ اور وہ کیسی بری طرح ان کے داؤ پر چڑھے ہوئے تھے۔ ان کو ان سے توڑ کر براہ راست حکومت سے وابستہ کر دینا کوئی معمولی اور سہل کام نہیں تھا۔

تمدنی، معاشرتی، سیاسی یا مذہبی اصلاحات کے جاری کرنے سے یہ خصوص حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جب تک کسی ملک میں تعلیم عام نہ ہو جائے اور لوگوں میں اصلاحات کی قدر و قیمت جانچنے کا شعور پیدا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک ایسی اصلاحات بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ اور ملک ردِّ عمل کے تھپیڑوں سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ افغانستان جس میں نہ ابھی تعلیم عام ہوئی تھی۔ اور نہ اصلاحات کے سمجھنے کا شعور ہی تھا کس طرح بے چون و چرا ان اصلاحات کو قبول کر سکتا تھا۔ بلکہ یہ قدرتی تھا۔ کہ لوگ سختی سے اس کی مخالفت کرتے۔ کیونکہ وہ ماحول جس میں وہ نسلاً بعد نسلاً رہتے چلے آئے تھے۔ اپنی قدامت و خوبی کا اثر ان کے دل و دماغ پر مسلط کر چکا ہوا تھا۔ اور لوگ اس وقت تک اس کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ جبتک ان کے دل و دماغ پر سے یہ تسلط ہٹا نہ دیا جاتا۔ اور اس تسلط کے ہٹانے میں تنہا تعلیم ہی کافی نہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ لوگوں کی خواہش کو بھی اس میں بہت بڑا دخل تھا۔ لوگوں کی اس خواہش کا پتہ لگانا اور پھر اس کو تیز کرتے رہنا ہی دراصل حکومت کا کام تھا جس سے وہ اس مذمومیت کے دائرے سے ملک کو باہر نکال سکتی تھی۔

وہ خواہش کیا ہو سکتی تھی؟ یہ کوئی راز نہ تھا۔ جسے کوئی حکومت دریافت کرنے سے معذور رہ سکتی۔ یا جسے حکومت امانیہ نے دریافت نہ کر لیا تھا۔

یہ انسانوں کی ایک قدرتی خواہش تھی۔ اور ان کی اقتصادی بہتری اور خوشحالی سے تعلق رکھتی تھی۔ حکومت کا کام تھا۔ کہ لوگوں کی اس خواہش میں ایک زبردست تموج پیدا کرے۔ اور پھر ان کی سرگرمیوں کو اس میدان میں نمایاں کرتے رہنے کی غرض سے اپنی امکانی کوششوں و وسائل کو وقف کر دے۔ کیا غازی امان اللہ خان کی حکومت نے اس ضمن میں کچھ کوششیں کیں؟ اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے اس کا جواب دیا جائے۔ تو بحال تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ غازی کی حکومت نے بیشک اس کی پہلے بنیاد رکھ دی تھی۔ اور آپ اس کتاب کے تیسرے باب میں زراعتی اور صنعتی ترقی کے بارے میں یہ سب کچھ پڑھ آئے ہیں۔ غازی امان اللہ خان کی حکومت پر جو اعتراض وارد ہوتا ہے تو یہی ہے۔ کہ باوجود اس راستہ پر چل نکلنے کے اس نے صبر و استقلال اور مداومت کے ساتھ اس کو طے کرنے پر قناعت نہیں کی۔ اور اپنی پوری توجہ اس پر مرکوز نہیں رکھی۔ بلکہ لوگوں کے تمدن و معاشرت و مذہب کی اصلاح کا کام بھی اس نے ایک ساتھ ہی شروع کر دیا۔ جس سے لوگوں کے خیالات کی روح منتشر ہو کر رہ گئی۔ اور وہ فرق و امتیاز کے ساتھ یہ تحقیق نہ کر سکے۔ کہ ان کے اردگرد یہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگ پڑے۔ کہ انہیں بزور بدلا جا رہا ہے۔ اور اس لئے ان کی اقتصادی بہتری اور خوشحالی کے لئے جو کچھ حکومت کر رہی تھی۔ اس کا خوشگوار کیف و اثر ان پر نہ جم سکا۔

ان مذکورہ بالا تحریکات کے ضمن میں جو مختلف اثرات لوگوں پر ہو رہے تھے۔ لوگ بوجہ تعلیم سے بہرہ ور نہ ہونے کے خود تو انہیں سمجھنے سے معذور تھے۔ اور اس لئے لامحالہ ان کی جویا نظریں اپنے خوانین اور ملانوں پر پڑتی تھیں۔ تاکہ وہ انہیں ان کے حسن و قبح سے واقف و آگاہ کریں۔ اب چونکہ قدیم اور مروجہ تمدن و

معاشرت کے معدوم ہو جانے سے خوانین کی اپنی شخصیت پر اس سے کاری ضرب پہونچتی تھی ۔ اور ان کی قوت کی گرفت لوگوں پر ڈھیلی ہوتی تھی ۔ اس لئے وہ حکومت کی اس اصلاحی روح کو ایک نہایت ہی بھیانک پیرایہ میں لوگوں پر ظاہر کرتے تھے ۔ اور ان کی خوش قسمتی سے حکومت مذہب اور اعتقادیات کی اصلاح کی طرف بھی چونکہ ایک ہی وقت میں مائل تھی ۔ لہذا ملّانوں کا گروہ اور بھی لوگوں کو حکومت کی ان سرگرمیوں کے برخلاف اُکساتا اور اشتعال دلاتا رہتا تھا ۔ لوگوں کی یہی دو راہنما جماعتیں تھیں ۔ اور یہی وہ جماعتیں اصلاحات حکومت کو بُری اور مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں ۔ اور اپنی عقول اور خواہشات کی روشنی میں عوام کی اسی طرح راہنمائی بھی کر رہی تھیں ۔ کیا ان حالات میں یہ کوئی تعجب تھا ۔ کہ حکومت کی اقتصادی اصلاحات کا "موافق اثر" مخالف اثرات کی قوتوں کے نیچے دب کر نہ رہ جاتا ۔

قطع نظر اس ایک اہم لغزش کے جو مختلف اصلاحات کے آپس میں خلط ملط کر دینے سے متعلق تھی ۔ عوام کی اقتصادی بہتری اور بہبودی کے لئے جو اصلاحات رائج کی گئیں ۔ وہ ایک عام اصولِ اصلاحات کی بنا پر تھیں ۔ ملک کی مخصوص حالت سیاسی کی مکدر فضا کو صاف کرنا خصوصیت کے ساتھ ان کا مقصود نہ تھا ۔ یعنی وہ اقدامات جو اس ضمن میں کئے گئے تھے ۔ لوگوں پر سے خوانین کی طاقت و اثر ماندہ کے زائل کرنے کی غرض و غایت سے نہ تھے ۔ بلکہ محض حکومت کی خواہش ترقیٔ ملک سے وابستہ تھے ۔ لہذا حکومت کا اقتصادی پروگرام ملت کی اقتصادی بہتری و امنگ کی خواہش میں تموّج پیدا نہ کر سکا ۔ اور ہونہار ملت افغان خوانین اور ملّانوں کے چنگل سے آزاد نہ ہو سکی ۔

یہ خصوص کس طرح سے حاصل ہو سکتا تھا ۔ اس کے متعلق میں اپنے ناچیز خیالات ذیل میں قلمبند کرتا ہوں ممکن ہے کہ موجودہ حکومت ان سے فائدہ اٹھانیکی ضرورت محسوس

کرے :-

سب سے اوّل یہ کہ وہی انتشار تنظیمی جس کا ذکر ملّانوں کے بیان میں ہو چکا ہے۔ یہاں بھی متعارف کیا جا سکتا تھا۔ اگرچہ یہاں اس کی غرض و غایت بالکل مختلف تھی۔ اور اسی انتشار تنظیمی کو بوجہ خوانین کے گروہ میں سخت رقابتیں موجود ہونے کے نہایت آسانی اور جلدی سے پھیلایا جا سکتا تھا۔ ملک میں خوانین کا ثروتی اساس ان کی زمینوں اور جاگیروں پر تھا۔ اور ان کی محدود آمدنیاں اور اس کے بالمقابل ان کے بڑھے ہوئے اخراجات جن کا ذکر تفصیل سے باب گذشتہ میں ہو چکا ہے۔ انہیں مختلف حیل و حوائل سے دونوں سروں کو برابر برابر کرنے پر طبعاً اُکساتے رہتے تھے۔ گویا ان میں اپنی آمدنیوں کو زیادہ کرنے کی فطری خواہش موجود تھی۔ اور چونکہ وہ خود کوئی معقول اور دیانتدارانہ راہ اپنی آمدنیوں کے بڑھانے کے متعلق سوچ نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا وہ اپنے بڑھے ہوئے اخراجات کے دباؤ کے ماتحت مختلف مذمومیت کے دائرے تشکیل و ترتیب دینے پر مجبور ہوتے تھے۔ اور اس طرح اس مذمومیت کی روح کو پھیلاتے اور ملت میں برقرار رکھتے تھے۔ صرف حکومت ہی ان کی اس باب میں راہنمائی کر سکتی تھی۔ اور ان کو وہ راہیں سوجھا سکتی تھی جس سے وہ اپنی آمدنیوں میں معقول اضافہ کر سکیں۔ حکومت کا صرف یہی کام نہ تھا۔ کہ وہ ان کے علاقوں میں آبپاشی کے ذرائع کی تکمیل کرے۔ یا سڑکوں کی تعمیر و درستی کی طرف توجہ دے۔ جس سے زمینوں کی پیداوار بہ آسانی و ارزانی ایک مقام سے دوسرے مقام تک نقل دی جا سکے، (اور یہ حکومت امانیہ کر ہی رہی تھی) یا وہ جدید آلات زراعت وغیرہ انہیں مہیا کرے۔ یا زراعت کے علم و معلومات کی ان میں تشہیر کرے۔ تاکہ وہ اپنی زمینوں کی پیداوار کو بڑھا سکیں۔ اور گو یہ حکومت کے فرائض میں داخل تھا۔ مگر ابھی حکومت اس

قابل نہ ہوئی تھی۔ کہ وہ[1] زیادہ سرگرمی کے ساتھ اس طرف رجوع کرے۔ بلکہ حکومت کا چونکہ ماسوا اس کے کچھ اور مقصد تھا۔ اس لئے اسے اپنے مقصد کی نوعیت کے مطابق اپنے اوپر اور چند فرائض عائد کرنے کی ضرورت تھی۔ اور چونکہ ملک میں بادشاہ کی ذات کو فوقیت اور خود مختاریت حاصل تھی۔ اس لئے وہ آسانی سے ان ماسوا فرائض کی بجاآوری کے لئے اپنی حکومت کے ہاتھ قوی کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ زور و طاقت سے خوانین کے گروہ کو ان اصلاحات کے جاری کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اور خوانین کا گروہ مخالفت کا کوئی پہلو نہ پا کر بالآخر سر جھکانے پر مجبور تھا۔

یہ کام وزارت تجارت کے سپرد ہونا چاہئے تھا۔ کہ وہ ہر صوبہ میں خوانین اور ملکوں کے طائفوں کو متعدد و موافق حلقوں میں تنظیم کرے۔ اور ایسی تنظیم سیاسی نقطہ نظر سے وقوع میں آئے۔ یعنی کسی ایک حلقۂ تنظیم میں موافق عنصر موجود ہو۔ اور اس عنصر کا مخالف اپنا دوسرا حلقہ تنظیم کرے۔ تاکہ حلقوں کے اندر رقابت ملی و قومی اپنے برے اثرات نہ پھیلا سکے۔ مگر کسی دو حلقوں کے درمیان ہمچشمی کی صفات ضرور موجود رہے۔

اس طرح سے ملک کے بکھرے ہوئے اور غیر ذمہ دار عنصر کو شیرازہ بند کرنے کے بعد وزارت کا یہ کام تھا۔ کہ وہ مختلف مقامی حالات کے ماتحت وہاں کے خوانین اور ملکوں کے حلقوں کے روبرو ایک صنعتی پروگرام پیش کرتی۔ تاکہ مقامی صنعت کے رواج و ترقی کی صورت نکلتی۔ جس کی عدم موجودگی نے ملک بھر میں مختلف قسم کے مذمومیت کے دائرے تشکیل کر رکھے تھے۔ اور ملت کی بینائی سلب کر رکھی ہوئی تھی۔ ایک ایسا قانون وضع کیا جاتا۔ جس کی رو سے ایسے تنظیم یافتہ حلقوں کو حکومت

---

[1] حبیبیہ کالج میں زراعتی عملیات و تطبیقات کے لئے ایک کلاس کھول دی گئی تھی۔ جو یقیناً آہستہ آہستہ آئندہ چل کر ایک باقاعدہ انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل ہو جاتی۔

کے خزانہ سے زرِ تقاوی مل سکتا۔ مگر اس زرِ تقاوی کی مقدار اس نسبت سے معین و محدود کی جاتی جس نسبت سے کوئی حلقہ پیش نظر اقتصادی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لئے خود سرمایہ فراہم کرتا۔ یعنی حکومت کی طرف سے یہ امداد مشروط ہوتی۔ اور جب تک کوئی حلقہ اپنے اندر سے زرِ مطلوبہ بطور سرمایہ کے فراہم نہ کر چکتا۔ اس وقت تک اس کو حکومت سے تقاوی ملنے کی امید نہ ہوتی۔ ایک اور قانون کے ذریعہ سے ایسے تمام تنظیم یافتہ حلقوں پر لازم کر دیا جاتا۔ کہ وہ اس قدر مدت کے اندر اندر اقتصادیات ملک کی ترقیات میں عملاً حصہ لینے کے لئے جو مقامی حالات کے اندازہ سے وزارتِ تجارت نے پروگرام کی صورت میں بیان کر دیا ہوتا۔ اس قدر زر بطور سرمایہ خود فراہم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ تاکہ ہر حلقہ جو تشکیل پا چکتا۔ حکومت کے دباؤ کے ماتحت زرِ معینہ فراہم کرنے پر مجبور ہوتا۔ وزارتِ تجارت اس امر کو اپنے اوپر فرض کر لیتی۔ کہ ایسے مختلف پروگرام بناتے وقت وہ مقامی حلقہ ہائے تنظیم سے مشورہ کرے۔ اور ان کے ابتدائی پروگرام اس اندازہ سے بنائے۔ کہ مختلف حلقوں پر ناقابل برداشت بار نہ پڑے یہ کوئی ضروری نہیں تھا۔ کہ وہ زرِ تقاوی جو حکومت انہیں دیتی۔ تمام کا تمام بصورت نقدی دیا جاتا۔ بلکہ جہاں جہاں مشینری وغیرہ کی ضرورت ہوتی۔ حکومت مشینری اور دیگر اسباب متعلقہ کی صورت میں فراہم کر سکتی تھی۔ حکومت ان حلقوں کے حسابات کی جانچ پڑتال کے لئے وزارتِ تجارت یا وزارتِ مال کے ماتحت مفتش[ا] مقرر کرتی۔ جو مختلف وقتوں میں تفتیش حسابات کرتے رہتے۔ اور وزارتِ تجارت کا یہ آخری فرض ہوتا۔ کہ وہ ششماہی یا سالانہ رپورٹیں شائع کرتی رہتی۔ جس سے ان حلقوں کی سرگرمیوں کا علم ملت کو ہوتا رہتا۔

وہ وخیم نتائج جو اس تحریک و دستورِ عمل سے مرتب ہوتے۔ وہ ملک بھر میں ترقیات

ا۔ Auditor

اور اقتصادی دلچسپیوں کی ایک نئی رو پھیلا دیتے ۔ اور اس کے قیام کے ساتھ ہی خوانین اور ملکوں کے گروہ میں ایک ایسی امنگ پیدا ہو جاتی ۔ جسے وہ سیاسی اقتدار کے بھینٹ نہ چڑھا سکتے ۔ بلکہ وہ رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگ پڑتے ۔ کہ اقتصادی اقتدار سیاسی اقتدار سے کہیں بڑھ کر بیش قیمت اور ٹھوس ہے ۔ اور جب وہ کسی قدر اور زیادہ ترقی کے میدان میں بڑھ چکتے ۔ تو وہ استعجاب کے ساتھ اس حقیقت کو جاننے لگتے ۔ کہ سیاسی اقتدار در اصل اقتصادی اقتدار ہی کا ایک جسم ہے ۔ اور بس ۔ حکومت اس تحریک سے نہ صرف اپنا اصلی مقصد ہی حاصل کرتی ۔ جو صرف یہ تھا ۔ کہ وہ خوانین اور ملکوں کی طاقتِ سیاسی کو لوگوں پر سے دور کر دے ۔ جس سے لوگوں کو اپنی بہتری اور خوشحالی کے لئے بجائے ایک عضو معطل یا اپنے خوانین اور ملکوں کا آلۂ کار بنے رہنے کے حکومت کی طرف دستِ آرزو بڑھانے کے مواقع ملیں ۔ بلکہ عام ملت کے لئے ترقی کی نئی نئی راہیں کھل جاتیں ۔ اور وہ قدیم راہ جس پر وہ اس سے پہلے چل رہے تھے ۔ بتدریج ان راہوں کی پُرپیچ شاخوں میں گم اور معدوم ہو جاتی ۔ اور نئے دَور کے جاری ہونے کے ساتھ ملک کی عام سوشل تمدنی اور مذہبی حالت میں صحت مندانہ تغیر شروع ہو جاتا ۔

حکومت کے لئے اس پر عمل کرنا چنداں مشکل نہیں تھا ۔ وہ بڑے بڑے شہروں اور مرکزوں میں نیم رسمی تجارتی کمپنیاں کھول رہی تھی ۔ اور اس میں نہ صرف ملک کے تاجر بلکہ حکومت کے کاردار اور خود شاہی خاندان کے افراد بڑھ بڑھ کر حصہ لے رہے تھے ۔ تا کہ ملت کے طبقۂ متوسط کو اس قسم کی کمپنیاں قائم کر کے ملک کے اقتصاد کی بہتری کی طرف تشویق ہو ۔ حکومت ملت کے عام افراد کو تجارت کی غرض سے تقاویاں بھی عطا کر ر

صرف انفر [illegible] ہی کر

فائدہ اٹھانے کی پوری پوری اجازت تھی۔ چھوٹے چھوٹے زمیندار جن کی زمینیں اپنی ہوتی تھیں۔ وہ بھی تقاوی سے محروم نہ تھے۔ اور وہ لوگ بھی جن کے پاس حسب قانون ضمانت کے لئے غیر منقولہ جائداد ہوتی تھی مگر جو اس سے پہلے اور کسی قسم کی تجارت وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ مشینری وغیرہ ملک میں منگوانے کے لئے تقاوی حاصل کر سکتے تھے۔ اور ملک کے اندر مشینری درآمد کرنے والوں کو اور چند سہولتیں بھی حاصل تھیں۔ کیونکہ ایسی درآمد پر جو کسٹم لیا جاتا تھا۔ وہ بہ نسبت دوسری اشیاء کے بہت ہی تھوڑا اور برائے نام ہوتا تھا۔ تاکہ ملک میں مشینری عام ہو جائے۔ اور لوگوں میں تشویق زیادہ بڑھے ؛

ایسی شرکتوں پر حکومت کا محاسبہ بھی قائم رہتا تھا۔ اور وزارت مالیہ کا وزیر ان شرکتوں کا رئیس اعلیٰ ہوتا تھا۔ تاکہ شرکتوں کی راہنمائی اور نگرانی کا کام حکومت ہی کے پاس رہے۔ پس حکومت کو کوئی مشکل پیش نہ آ سکتی تھی۔ اگر وہ خوانین اور ملکوں کو اس تحریک کے ماتحت کام کرنے پر مجبور کرتی۔ بلکہ خوانین اور ملکوں کا وہ خاص عنصر جو ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا۔ کہ کب حکومت ان پر نظر الطاف مبذول کرے۔ اور کب وہ اس کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اس تحریک کو اپنے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ سمجھتے۔ اور رقابت اور ہم چشمی جو اس طائفہ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی دوسرے خوانین اور ملکوں کو بالکل چین نہ لینے دیتی۔ اور چشم زدن میں ان کی جماعت بندیاں ہو جاتیں۔ اور حکومت کامیابی اور کامرانی کے ساتھ لوگوں پر اپنا براہ راست تسلط قائم کرنے میں چل نکلتی ؛

لوگوں میں نظر بحالات ملک صنعتی چرچا موجود تھا۔ جلال آباد۔ کابل۔ ہزارہ جات

ترکستان اور قندہار وغیرہ میں گھریلو صنعت موجود تھی۔ اس کو مذکورہ بالا پروگرام کے ماتحت بخوبی تنظیم منظم کیا جا سکتا تھا۔ اور لوگوں اور خوانین و ملکوں میں چونکہ پہلے ہی سے ایک قسم کا تعلق بہتری و کہتری موجود تھا۔ اس لئے خوانین و ملک ان کو ایک تنظیم کے ماتحت کام کرنے پر حکومت کی مداخلت کے بغیر محض اپنے سوخ سے مدعو اور شریک کر سکتے تھے۔ اور اگرچہ شروع شروع میں وہ لوگ جن کی گھریلو صنعت ان کی اپنی گذران کے مطابق چل رہی تھی سایسے حلقہ ہائے تنظیم میں شاید شریک نہ ہوتے۔ مگر جب وہ دیکھتے کہ وہ ان تنظیمی جماعتوں کا مقابلہ نہیں کر سکینگے۔ تو خود بخود شریک ہونے لگ جاتے۔ پہلے پہل یہ لوگ قدرتاً حکومت ہی سے اس امر کی شکایت کرتے۔ کہ انہیں ان کے خوانین اور ملک مشترکہ سرمایہ سے کام کرنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں جو کہ ان کے مفاد کے خلاف ہے۔ اور اس طرح حکومت خوانین اور ان لوگوں کے درمیان ایک ثالثانہ اور مشفقانہ حیثیت سے فیصلہ کرتے ہوئے اپنے اقتدار کی بحالی کی طرف پہلا قدم بڑھانا شروع کرتی۔ اور جب خوانین اور ملک اپنے اپنے حلقوں میں اپنی اپنی اقتصادی انجمنوں کو چلانے میں مشغول ہو جاتے۔ تو لامحال انجمنوں اور مزدور کاروں کے درمیان تنازعات اور جھگڑے اٹھتے ہی رہتے جنہیں حکومت کا ہاتھ ثالث بالخیر بن کر سربار مٹاتا رہتا۔ اس طرح اپنے اپنے ذاتی مفاد کی روح ترقی کر کے خوانین اور ملکوں کو لوگوں سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیتی۔ اور سیاسی اقتدار اپنی نئی طاقتوں کے ساتھ بادشاہ کے در پر جبہ سائی کرتا ہوا دکھائی دیتا۔

یہی حلقہ ہائے تنظیم ملک کی زراعتی ترقی کا بھی خود بخود باعث بننا شروع ہوتے اور حکومت کی زرعی اصلاحات میں خود بخود ایک شغف اور دلچسپی کے ساتھ اس کا ہاتھ بٹاتے رہتے۔ کیونکہ خوانین اور ملکوں کی اصل ثروت زراعت ہی تھی۔ اور ان ایام میں جبکہ حکومت کو ملک کی زراعتی ترقی میں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ ملک کی زمینیں

انہی خوانین اور ملکوں کے دم سے آباد رہتی تھیں۔ وہ اپنے خرچ پر بڑی بڑی لمبی کاریزیں کھود کر اپنی زمینوں کی آبپاشی کے لئے اونچی بلندیوں سے پانی فراہم کرتے تھے۔ اور جیسا کہ میں کسی جگہ پہلے ذکر کر آیا ہوں۔ کہ ان کاریزوں کا ایک جال ہے۔ جو سارے افغانستان میں پھیلا ہوا ہے اور یہ انہی خوانین اور ملکوں کے نام سے موسوم ہیں۔ جنہوں نے ان کو کھدوایا تھا۔ ان میں بعض ایسی بھی ہیں۔ جو پچھلے حکمرانوں یا ان کے خاندان کے افراد کے نام سے موسوم ہیں۔ مگر یہ کاریزیں ملت کی بہبودی یا ملک کی زرعی ترقی کے لئے انہوں نے نہ کھدوائی تھیں۔ بلکہ محض اپنی زمینوں کی سیرابی اور آبادکاری کی غرض سے ان کی ہستی معرض وجود میں لائی گئی تھی۔ اس موقعہ پر ناموزوں نہ ہوگا۔ اگر قارئین زمین مزروعہ کی ملی تقسیم کے متعلق علم و آگہی حاصل کرنے کی خاطر مجھے اجازت دیں۔ کہ میں قدرے تفصیل کے ساتھ اسے بیان کرنے کی کوشش کروں ؛

افغانستان میں زمین مزروعہ چار اہم گروہوں میں تقسیم ہے۔ پہلا گروہ جس کے پاس بڑے بڑے قطعات اراضی ہیں۔ خوانین و ملکوں کا گروہ ہے۔ دوسرا گروہ حاکموں اور کارداران حکومت کا ہے۔ تیسرا گروہ عام لوگوں کا ہے۔ اور چوتھا گروہ خود حکومت کا ہے۔ جس کے قبضہ میں وہ زمینیں ہیں۔ جن پر فرد ملت کی حیثیت سے کسی باشندۂ ملک کا قبضہ و تصرف نہیں ہے۔ علاوہ بریں کچھ زمینیں اوقاف میں شامل ہیں۔ اور کچھ ملاؤں کے قبضہ میں ہیں۔ حکومت کے اپنے قبضہ میں جو زمین ہے۔ وہ باقی گروہوں کے مجموعہ کے بالمقابل کل چار حصوں کا تقریباً ڈیڑھ حصہ ہے۔ اس میں وہ زمینیں بھی شامل ہیں۔ جنہیں حکومت کے حکم سے وقتاً فوقتاً ضبط کیا جاتا رہا ہے۔ اور وہ زمینیں بھی جو معمولی طور پر آباد یا بالکل ہی غیر آباد ہیں۔ ان کی آگے دو تقسیمیں ہیں۔ ایک خاص بادشاہ وقت کی زمین کہلاتی ہے۔ جسے عین المال کہتے ہیں۔ اور ایک حکومت کی

جسے بیت المال کی زمینیں کہتے ہیں۔ عین المال کا انتظام حکومت کی زمینوں کے انتظام سے علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ اور اس کی جس قدر آمدنی ہوتی ہے۔ اسے بادشاہ اپنے مصرف میں لاتا ہے۔ اور جب بادشاہت بدلتی ہے۔ تو نیا بادشاہ اپنے سے پہلے بادشاہ کے عین المال کا وارث شمار ہوتا ہے۔ عین المال کی زمینوں کی آبادکاری اور زرخیزی بہ نسبت بیت المال کی زمینوں سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اور وجہ صاف ظاہر ہے۔ ضبطی کے عمل کے ماتحت جو زمینیں حکومت کے قبضہ میں آتی تھیں۔ وہ بیت المال کی سمجھی جاتی تھیں۔ اور چونکہ وہ کسی خان یا اہلکار کی ملکیت ہونے کے سبب سرسبز و شاداب ہوتی تھیں۔ اس لئے بادشاہ یا تو اسے اپنے عین المال والی دور رس اور کم آباد زمینوں سے تبادلہ کر لیا کرتا تھا۔ یا وہ بادشاہ کے کسی منصبدار کو بطور بخشش کے دیدی جاتی تھیں۔ لیکن اگر وہ کچھ مدت یونہی پڑی رہتی تھیں۔ تو بیت المال کے عملہ کی نگرانی کے ماتحت وہ چند ہی سالوں میں اپنی قدرومنزلت کو کھو بیٹھتی تھیں۔

عہد امانیہ میں عین المال کی زمینوں کی آمدنی ڈیڑھ دو کروڑ روپیہ کے لگ بھگ تھی۔ اور ملک کی زمینوں کا کل سالانہ مالیہ چار پانچ کروڑ روپیہ سے زیادہ نہ تھا غازی امان اللہ خان کے ملک کی زرعی ترقیات کی طرف راغب ہونے سے پہلے آبپاشی کے ذرائع پیدا کرنیکا سارا بار یا تو خوانین اور ملکوں پر تھا۔ یا وہ حاکم یا اہلکار جو کسی جگہ مقرر ہو کر جاتے تھے۔ اور وہاں جایز و ناجایز طریقے سے زمینیں حاصل کرتے تھے۔ اپنی زمینوں کو سیر حاصل کرنے کے لئے وہاں کے مقامی لوگوں کی امداد سے کاریزیں وغیرہ کھدواتے تھے۔ اور یا پھر بادشاہ کی اپنی زمینوں کی آبادکاری کے لئے عین المال کی طرف سے اس قسم کے کاموں کا اجرا ہوتا رہتا تھا۔ اور گو عام لوگوں کی زمینوں کا انحصار زیادہ تر برف و باراں پر رہتا تھا۔ تاہم وہ اپنے خوانین حاکمو

پر مجبور ہوتے تھے اور اپنے اپنے علاقوں میں کاریگری کا ذمہ لے لیتے تھے۔ اور اس طرح ان کو بھی کم و بیش کاریزی پانی سے استفادہ کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

غازی امان اللہ خان کی حکومت نے زراعت کی ترقی کے لئے جو اقدامات کئے تھے۔ وہ نظر بحالات ملک بہت ہی ناکافی تھے۔ اور حکومت اپنی محدود آمدنی کے پیش نظر اس سے زیادہ کچھ کرنے سے معذور تھی۔ ملک میں لاکھوں ایکڑ قابل کاشت زمین بوجہ آب رسانی کے ذرائع نہ ہونے کے افتادہ پڑی ہوئی تھی۔ اور جب تک حکومت کی راہنمائی میں ملی ہاتھ بھی اس عظیم الشان کام میں تعاون نہ کرتا۔ کسی حد تک کامیابی کا تصور ناممکن محض تھا۔ خوانین اور دیگر صاحب غرض افراد جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے۔ زرعی ترقیات کی خواہش سے عاری نہ تھے۔ ان کی زندگیوں کا دارومدار زمینی پیداوار پر تھا۔ اور سالہائے دراز سے ان کا آبائی پیشہ زمینداری ہونے کے سبب وہ وقتاً فوقتاً آبپاشی کے ذرائع پیدا کرنے کی طرف سے غافل نہ تھے۔ اب جبکہ حکومت بھی اس طرف اپنی توجہ منعطف کر رہی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لئے ہمہ تن تیار نظر نہ آتے لیکن وہ غیر منظم اور پاشان تھے۔ اور حکومت کے جتنے بھی زرعی منصوبے تھے۔ وہ براہ راست حکومت کی اپنی نگرانی میں ان کی شرکت کے بغیر انجام پا رہے تھے۔ جس کا نتیجہ نہ صرف یہ تھا کہ ان کو حکومت کے ان کاموں سے دلچسپی پیدا نہ ہوتی تھی۔ بلکہ حکومت اپنے کوتاہ اندیش اور خود غرض اہلکاروں کی بدولت سخت نقصان اٹھاتی رہتی تھی۔ اور ایک منصوبہ جس پر دس لاکھ روپیہ خرچ ہونا ہوتا تھا۔ بیس لاکھ روپیہ کے مصارف ہو چکنے پر بھی پایہ تکمیل تک نہ پہونچتا تھا۔ حکومت کھدائی کے کام ٹھیکہ پر دیتی تھی۔ مگر یہ ٹھیکے ان علاقوں کے خوانین و معززین کو نہیں ملتے تھے۔ جن میں سے نہروں نے گذرنا ہوتا تھا۔ بلکہ وزارت اور انجینئر مل ملا کر ایسے ٹھیکہ دار پیدا کرتے تھے۔ جن سے وہ خود

کافی نفع کما سکیں۔ اور انجنیئر چونکہ سارے کے سارے غیر ملکی ہوتے تھے۔ اور ان کے ایگریمنٹ گورنمنٹ کیساتھ دو دو تین تین سال کے لئے ہوتے تھے۔ اس لئے ٹھیکیدار انجنیئر کے حکم کے ماتحت کھدائی وغیرہ کا کام جاری رکھنے پر مجبور ہوتے تھے وہ جب دیکھتے تھے۔ کہ ان کو گھاٹا ہو رہا ہے۔ اور پہلا انجنیئر ملازمت کی قرارداد کے اختتام پر یا کسی اور وجہ سے بدل گیا ہے۔ اور اس کی جگہ نیا انجنیئر آگیا ہے۔ تو وہ اس نئے انجنیئر سے مل ملا کر حکومت سے مزید روپیہ اینٹھنے کی سازشوں میں بسا اوقات کامیاب ہو جایا کرتے تھے۔ اور اس نقصان وغیرہ کا سارا الزام پہلے انجنیئر کی سوء تدبیر وادارہ پر محمول کرتے تھے۔

خوانین وملکوں کے حلقہ ہائے تنظیمی حکومت کے ان اقدامات میں بے حد مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ اور جہاں تک بندوں اور نہروں کے ذریعہ سے پانی کی بہم رسانی کا تعلق ہے۔ ہر حلقہ تنظیم یا چند ایک حلقے ملکر حکومت کی اعانت سے اپنے اپنے علاقوں میں ان ذرائع کی بخوبی تکمیل کر سکتے تھے۔ نہ صرف وقت اور روپیہ ہی کی اس طرح بچت ہوتی۔ بلکہ خوانین اور ملکوں میں ایک نئی روح حکومت سے تعاون کرنے کی پیدا ہو جاتی۔ اور حکومت کی تشویق کے موجود ہوتے ہوئے وہ جدید زرعی آلات اور نئی اور زیادہ مفید فصلوں کی کاشت وتجربہ کی طرف روز بروز مائل ہوتے جاتے۔ ان کی آمدنیوں میں ان نئی راہوں کے نکل آنے سے اضافہ ہونا شروع ہوتا۔ اور وہ دیگر بدمویت کے دائروں سے اپنی توجہ پھیر کر ملک کی صنعتی اور زراعتی ترقیات کی طرف بدل وجان مصروف ہونے لگ جاتے۔ اور اس طرح حکومت اور اپنے درمیان مواخات کی ایک نئی راہ پیدا کر کے اس کے اساس کی مضبوطی کا باعث بنتے۔

باب ششم

ذہنیت عامہ

ارباب فکر و بصیرت کے لئے اب یہ مسئلہ چنداں مشکل نہیں ہے۔ کہ وہ گذشتہ ابواب پر نظر رکھتے ہوئے ذہنیت عامہ کا ایک صحیح تصور جو افغانستان میں اندریں حالات موجود ہوسکتی تھی۔ اپنے ذہن میں لاسکیں۔ میں یہاں نہایت ہی اختصار کے ساتھ وہ چند اہم امور بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ جو لوگوں کے اندر ایک ذہنی انقلاب کے سرعت کے ساتھ وقوع ہونے میں سدّ راہ تھے۔

ارتقاء ذہنی کے مزاحم بدبختی سے جو سب سے بڑی چیز تھی۔ وہ مسئلۂ تقدیر تھا۔ اور یہ کچھ افغانستان ہی پر موقوف نہیں۔ بلکہ ہمارے طالع واژگونی کی انتہا ء ہمیں اس مسئلہ تقدیر سے یہاں ہندوستان میں بھی دوچار کرتی ہے۔ اور قسم ہے رب کعبہ کی کہ میں اپنی محنت کا ثمر پوری طرح حاصل کرونگا۔ اگر میں اس کتاب کے ذریعہ سے لوگوں کو اس مسئلہ تقدیر کے مہلک گرداب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات دلانے میں کامیاب ہو سکا۔

لوگوں نے نہایت ہی غلط اور گمراہ طور پر آج تک اس مسئلہ تقدیر پر اپنے اعتقاد ویقین کی تعمیرات کو بنا رکھا ہے۔ اور مسلمانوں کے زوال کا سبب اولین علے الخصوص

یہی ناشدنی مسئلہ ہے۔ جب مسلمانوں نے اسلام سے بہت دُور ہٹ کر اپنے اندر ملوکیت کی شان پیدا کی۔ تو علماءِ سُوء کا گروہ جو ہر عہد میں اس ملوکیت کے قیام کا سازگار رہا کیا۔ ملّت اسلامیہ میں "مسئلہ تقدیر" کی غلط تعبیریں رواج دینے سے کبھی غافل نہ رہا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ علمائے سوء اپنی خود غرضیوں کی وجہ سے علم دین کی صحیح روشنی بالکل سلب کر چکے تھے۔ اور وہ اس ضمن میں قرآن و حدیث کے مطالب سے قطعیاً ناآشنا تھے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ ملوکیت کے دائرہ مذموم کا ان سے یہ ایک اہم مطالبہ تھا۔ کہ وہ لوگوں میں سچائی تعریض و تقریظ کی صفت کو ملیت و نابود کرنے میں ملوکیت کے ساجھی بنے رہیں۔ کیونکہ ملوکیت کا قیام بادشاہوں اور اس کے کارداروں کے برخلاف حرف دار گیری کی موجودگی میں کبھی ممکن نہ تھا۔ شدہ شدہ دنیاوی طاقت کے زیر اثر جب علمائے حق کی ہستی معدوم ہوتی گئی۔ اور علماءِ سوء کو ہر چہار طرف اپنے دام پھیلانے کے مرغوب مواقع ہاتھ آتے گئے۔ تو انہوں نے اس مسئلہ تقدیر کو اس طرح کے رنگ و روغن سے منقش کر کے رکھ دیا۔ کہ عام جمہور اس کے نظر فریب خط و خال کا شکار ہونے سے نہ بچ سکا۔ اور لوگوں پر یہ دور از کار حقیقت نقش کالحجر ہو کر رہ گئی۔ کہ اس دنیا میں جو کچھ ان کے حصہ میں آ چکا ہے۔ یا آ رہا ہے۔ یا جو رنج و خوشی ان کے پیش آئے گا۔ وہ ان کی تقدیر ہو گی۔ جو روزِ ازل سے خدا نے لوحِ محفوظ پر لکھ رکھی ہے۔ اور جس میں شاید اب خدا بھی تغیر و تبدل نہ کر سکے (نعوذ باللہ)

آؤ ہم ذرا اپنے اصل مقصد سے دور ہو کر دیکھیں۔ کہ اس مسئلہ تقدیر کی فلسفیانہ حیثیت کیا ہے؟

لوگوں نے اس غلط اعتقاد کو کچھ اس طرح سے اپنے سینہ و دماغ کے اندر محفوظ

کر لیا ہوا ہے۔ کہ روزمرہ کے معمولی اعمال و واقعات بھی اب ان کی تقدیر کا ایک جزو لا ینفک قرار پا چکے ہیں۔ ان کا سونا اٹھنا ہاتھ منہ دھونا دست و پا کو حرکت دینا زبان سے گفتگو کرنا وغیرہ بھی نوشتہ ازل کے ماتحت ہے۔ اور اگر ان کی غلط کاریوں اور نامعقول تدبیروں سے ان پر آفتیں یا مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ تو وہ اسے خدا کی طرف سے سمجھکر صبر و شکر کا نامردانہ گھونٹ پی کر خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ انہوں نے خدا کے اس فرمان واجب الاذعان کو یکسر فراموش کر رکھا ہے۔ کہ "خدا اس وقت تک کسی قوم کی حالت کو ہرگز نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت کے بدلنے کے لئے آپ ہمہ تن کمربستہ نہ ہو جائے"۔

اگر وہ صرف اسی فرمان کے معانی و مطالب کی طرف اپنی توجہات کو مرکوز رکھتے تو انقلاب و ادبار کی یہ گھناؤنی تاریکیاں ان پر کبھی مسلط نہ ہو سکتیں۔ فرمان مذکورہ کی موجودگی میں ابن آدم کی سرزمین پر کوئی تقدیر ایسی نہیں رہ جاتی۔ جو بدل نہ سکتی ہو۔ اور انسان جس کے لئے زمین و آسمان، شمس و قمر یہ سب کچھ مسخر کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اپنی تقدیرات کا آپ صنعت گر ہے۔ اور خدا جس نے یہ تمام کائنات ایک امانت کے طور پر اس کو بخش دی ہے۔ بحیثیت خداوند زمین و زمان ہونے کے نہ تو اپنی بخشش کو واپس پھیر سکتا ہے۔ اور نہ ہی وہ انسان کی اس صنعت گری تقدیر میں مداخلت کر کے اپنی شانِ خداوندی کو حقیر کر سکتا ہے۔

ابن آدم کے لئے خدا کے ہاں ایک ہی تقدیر ایسی ہے۔ جس میں تبدیلی پیدا کرنے کا اسے مقدور نہیں دیا گیا۔ اور وہ یہی ہے کہ ایک وقت مقررہ تک کیلئے اس کرۂ ارضی کا ساکن بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اس وقت مقررہ کے پورا ہونے پر اس کی فنا مقدر ہے۔ وہ اپنی فنا سے نہیں بچ سکتا۔ اور نہ ہی وہ شام و سحر کے حصار متین سے اس وقت تک نجات پا سکتا ہے۔ جب تک وہ اس کرۂ ارضی کا

ساکن ہے۔ مگر اس کرہ ارضی کی وسعت و پہنا میں وہ اپنی مرضی کا آپ مختار اپنی ضرورتوں کا آپ کفیل اور اپنی آزادیوں کا آپ ہی ضامن ہے۔ وہ لوازم جو اس کرہ ارضی میں ہماری زندگی کے لئے فراہم کر دئیے گئے ہیں۔ وہ اور جو کچھ ان کی ترکیبات باہمدگر سے فراہم ہے۔ ان ہر ایک کی اپنی اپنی تاثیرات ہیں۔ ان تاثیرات سے وہ (انسان) متاثر ہوتا ہے۔ کہیں یہ تاثیرات اس کے مخالف اور کہیں موافق ہوتی ہیں۔ ان ہی کے باہم خلط ملط سے بصورت عمل و نتیجہ جو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اُسے ہم نوع انسان کی "تقدیر حیات" کا نام دیتے ہیں۔ گویا ابن آدم اس وقت تک جب تک کہ اس پر فنا کی کیفیت طاری نہ ہو جائے۔ یونہی اپنی تقدیر حیات سے دست و گریبان رہنے پر مجبور ہے۔

خارجی ماحول یا فطرت کے ساتھ ہماری یہ دست و گریبان گیری مقدر اور اٹل ہے۔ نہ ہمارے آباؤ اجداد نہ ہم اور نہ ہماری آنے والی نسلیں اس تقدیر حیات کے طلسم سے آزاد و باہر ہیں۔ اب خارجی فطرت کی مختلف کیفیتیں اور تاثیریں انسانوں کے گروہوں کے اندرونی اختلاف اعمال کی تاثیرات کے ساتھ جب اختلاط و آمیزش پیدا کرتی ہیں۔ تو وہ انہی گروہوں کی دست و گریبان گیری کی قوت و صفت کے اندازے سے ان پر اثر افگن ہوتی ہیں۔ اور اسی سے انسانوں کی کوئی قوم اپنی نشو و ارتقا میں کسی دوسری قوم سے تنزل و ترقی کے مدارج میں آگے یا پیچھے ہوتی رہتی ہے۔ اور یہی عمل و نتیجہ تقدیر اقوام کو تشکیل و موجود کرتا ہے۔

اب جس طرح قوموں کے درمیان ایک دوسرے کی نسبت سے اختلاف اعمال اور پھر ان مختلف اعمال کا پرتو خارجی فطرت کی قوتوں سے ہم آہنگ یا ہم آمیز ہو کر بحیثیت مجموعی قوموں کی حیات پر مختلف کیفیات و تاثرات پیدا کرتا ہے۔ اور ان کی ملی یا قومی تقدیر کو سنوارتا یا بگاڑتا رہتا ہے۔ بعینہ اسی طرح ہر ایک قوم

کے افراد کا اندرونی اختلاف عمل وحرکت یا سکون وقرار قوم کی اجتماعی صورت میں منعکس ہو کر خارجی فطرت کی قوتوں کی اس تقسیم سے جس کا عمل خصوصیت کے ساتھ اس ایک قوم پر ہو رہا ہوتا ہے۔ ہم آہنگی یا باہم آمیزی اختیار کرتا ہے۔ جس سے قوم کے ہر فرد واحد پر اس کی اپنی حرکت وسکون کے اندازہ ومقدار سے اثر و کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور یہی تقدیر یا قسمت افراد ہے۔

اگر خدا انسانوں کو اپنی تقدیر آپ بنانے کا مالک ومختار نہ بناتا۔ اور جو کچھ انسانوں سے یہاں سرزد ہو رہا ہے۔ اس میں براہ راست تقدیر الٰہی کا ہاتھ شامل ہوتا۔ تو پھر خدا کو اس بات کا کس طرح حق پہنچ سکتا تھا۔ کہ وہ انسانوں کو عذاب وثواب کرے۔ اور جب کہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ اس کی مرضی اور خواہش سے ہو رہا ہے۔ تو یہ تصور کر لینا ایک بڑے درجہ کی حماقت اور ابلہی ہے۔ کہ اس کی مرضی ومنشاء کے پورا کرنے والے ہی اس کے عذاب کے منت کش بھی ٹھہرائے جائیں۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ "نہایت ہی غلط امر" صحیح بھی سمجھ لیا جائے۔ تو پھر قرآن کی وہ آیت جس کا ترجمہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں انسانوں کو یہی وعدہ دے کر دعوت عمل دی گئی ہے۔ کہ اگر وہ اپنی ہمتوں کو بلند کر کے اپنی حالتوں کے بدلنے کے درپے ہو جائیں گے۔ تو خدا کی نصرت بھی ان کا ساتھ دیگی۔ اور وہ اپنی حالتوں میں حسب دلخواہ تغیر پیدا کر سکینگے۔ اور پھر یہی کچھ نہیں بلکہ اس سے یہ راز بھی اسی آیت سے کھلتا ہے۔ کہ خدا تقدیرات کو پیہم بدلتا رہتا ہے۔ علماء سوء نے ہماری ملت کے کانوں میں نہایت بلند آہنگی اور دیدہ دلیری سے یہ پھونک مارا ہے۔ کہ "روز ازل ہی سے لوح محفوظ پہ جو کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ اس میں ردّوبدل اور تغیر کی مطلقاً کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اور شاید

اپنی اس گمراہی کے ثبوت میں وہ "لاتبدیل لکلمت اللہ" اور اسی قبیل کی دیگر آیات شریفہ کو پیش کرتے ہیں جن کا مفہوم یہی کچھ ہے۔ کہ خدا اپنے کلمات یا احکام کو نہیں بدلا کرتا۔ ان کی خام نظر اس حقیقت کی طرف بالکل نہیں گئی۔ کہ اس طرح تو وہ دنیا کے روبرو خدا کو یا اگر ہم اس کی ذات کو یہاں براہ راست زیر بحث نہ بھی لائیں۔ تو اس کے کلام یعنی قرآن کو ایک طرح سے جھوٹا اور اختلاف بیانات کا مرقع ثابت کر رہے ہیں۔ حالانکہ اگر یہی نامعصوم لوگ خدا اور اس کے قرآن پر صدق دل سے ایمان لا چکے تھے۔ اور اب تک اس سچائی سے ان کا دل مشکوک نہیں ہو چکا ہوا تھا۔ تو انہیں بجائے اس زبون صفتی کے اختیار کرنے کے قرآن میں تدبر کرنے کی ضرورت تھی۔ سارا قرآن ان کے آگے اپنی صاف اور واضح صورت میں موجود تھا۔ اور وہ بلا غلطی کے صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔ کہ ایک جگہ خدا ایک چیز کو بیان فرما رہا ہے۔ تو دوسری جگہ کسی دوسری چیز کا اظہار ہو رہا ہے۔ قرآن میں جا بجا خدا اس بات کا اعلان کر رہا ہے۔ کہ زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے وہ سب اسی کا ہے۔ اور اس نے ہر ایک چیز اپنے قدر و اندازہ کے مطابق بنا کر رکھ دی ہے۔ اس کی ہر صفت کے جدا جدا قدر و انداز ہیں۔ جن میں اس کی سر کاریگری یا صفت محرک و زندہ موجود ہے۔ اور کسی میں یہ مجال و قدرت نہیں۔ کہ وہ اپنے قدر و اندازہ کی حدود کو توڑ کر باہر نکل جائے۔ لہذا "خدا کے کلمات میں کوئی تبدیلی یا تغیر ممکن نہیں۔"

یہاں ان احکام اساسی کا ذکر تھا۔ جن پر اس کی ساری کائنات کی وجود و ہستی قائم و برقرار ہے۔ البتہ ان میں تبدیلی ممکن نہ تھی۔ اور اگر ہم بغور دیکھیں۔ تو یہ عدم امکانی بھی ایک حد ہی ہے۔ جو ایک خاص وقت کے پورا ہونے پر جس کا تعین کرنا فعلاً انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ قائم نہ رہ سکے گی۔ کیونکہ خدا یہ بھی تو کہتا ہے

کہ اس کے نزدیک کوئی چیز بھی ناممکن نہیں۔ مگر نہ تو اس وقت ہی جس وقت قرآن نازل ہوا تھا۔ اور نہ اب تک ہی عقل انسانی نے اتنی ترقی کی ہے۔ کہ وہ خدا کے اختلاف بیان (جو درحقیقت اختلاف نہیں۔ بلکہ حکومتِ خداوندی کی بے پایاں وسعت کے مختلف عہود و مدارج ہیں) کے بحر کی متخصص صفت غواص بن سکے۔ اس لیے دانائے کل نے دیدہ و دانستہ اس اختلاف بیان کو اپنے کلام میں موجود کر دیا ہے۔ تاکہ کسی عہد و زمان میں انسانوں کی ترقیات احکام و ہدایاتِ خداوندی کو اپنی راہ میں حائل پا کر رک نہ جائیں۔ اور انسانوں کی عقول خام جس قدر ترقیات کے تدریجی درجے طے کرتی چلی جائیں۔ خدا کے اسی اختلاف بیانیہ سے وہ اپنی آئندہ منازل کو قطعیت کے ساتھ تعین و دریافت کر سکیں ؛

یہ اختلاف بیانیہ دراصل تقدیرات الہی کی معرفت کے نشانات ہیں۔ اور چونکہ اس کی تقدیرات کی کوئی انتہا و حد نہیں۔ اور ان میں ایک التزام بھی موجود رکھا گیا ہے۔ اس لیے انسان اپنے مختلف دورہ ہائے زندگی میں مختلف تقدیرات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور اپنے دور کے معیارِ عقل کے مطابق اپنی تقدیر حیات کی تفسیر کرنے میں منہمک رہتے ہیں ؛

آگے قدم بڑھانے سے پہلے ہم یہاں "تقدیر" کی تعریف بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جب تک عوام الناس میں تقدیر کے اصل معنی و مطلب کا چرچا موجود نہ ہوگا۔ کسی مطلوبہ ذہنی انقلاب کی توقع و گنجائش پیدا نہ ہوگی۔ اس کے لیے پہلے ہم "تدبیر" کو لیتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ ہم اس کی تفسیر و کیفیت ذیل کی چند عام اور آسان مثالوں سے واضح کرینگے ؛

پہلی مثال۔ جب انسان کو بھوک لگتی ہے۔ تو وہ اپنی بھوک رفع کرنے

کرنے کے لئے پہلے یہ سوچتا ہے۔ کہ اسے کس چیز سے اپنی بھوک رفع کرنی چاہیئے ہم یہاں فرض کئے لیتے ہیں۔ کہ ایک شخص نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ وہ اپنی بھوک رفع کرنے کے لئے روٹی اور گوشت کھائیگا۔ اس فیصلہ پر پہونچکر اب وہ شخص اس امر کی طرف متوجہ ہوگا۔ کہ گوشت روٹی کے حاصل کرنے پر اس کو کیا کچھ صرف کرنا پڑیگا۔ فرض کریجیئے۔ وہ چار آنے کے مصرف سے ایسا کرسکتا ہے۔ لہذا وہ ان چار آنوں کی مطلوبہ اشیاء بازار سے جاکر خریدے گا۔ اور گھر پر آن کر انہیں پکا کر کھائے گا۔

اب ملاحظہ ہو۔ کہ اپنی بھوک کو رفع کرنے کے لئے جو کچھ اس نے سوچا۔ وہ اس کی تدبیر تھی۔ اور اپنی بھوک کو رفع کرنے کے لئے جو کچھ اس نے کھایا۔ وہ اس کی تقدیر تھی۔ میں یہاں تدبیر کے عمل آخری کو **تقدیر** کہتا ہوں۔ یا یوں سمجھ لو۔ کہ "**تقدیر**" تدبیر کے عمل کا نتیجہ یا عکس ہے۔ اگر تدبیر میں نقص ہے۔ تو اس کا عمل بھی اسی اندازہ سے ناقص ہوگا۔ اور ساتھ ہی لازمی طور پر اس عمل کا نتیجہ یا عکس بھی اسی نسبت سے اپنے اندر نقص یا خرابی رکھتا ہوگا۔ مثلاً اوپر والی مثال کو دیکھو کہ اس شخص نے اپنی بھوک رفع کرنے کے لئے گوشت اور روٹی کا انتخاب کیا۔ اب اگر اس کا جسم بیمار یا ضعیف ہے۔ اور اس نے اپنی صحت یا قوت ہاضمہ کا اندازہ صحیح نہیں لگایا۔ تو وہ یقیناً گوشت روٹی کھا کر اپنی صحت و تندرستی کا مزید نقصان کر بیٹھے گا۔ درحالانکہ اس کی ذاتی خواہش ہرگز یہ نہ تھی۔ کہ اس کی صحت کو گوشت روٹی کے کھانے سے کسی طرح کا نقصان پہونچ جائے۔ تو اب کیا ہوا۔ کہ اس کی تدبیر گوشت روٹی کے انتخاب کرنے میں جس قدر ناقص یا ناکمل تھی۔ اسی قدر اور اسی نسبت سے اس کے نقص تدبیر کا نتیجہ یا عکس ظاہر ہوا۔ آگے چلیں۔ فرض کریں۔ کہ اس کی جسمانی صحت و توانائی اس کی انتخاب کردہ خوراک کی متحمل تھی یعنی اس کی انتخاب کرنے والی تدبیر میں کوئی نقص نہ تھا۔ مگر اس کے پاس چار آنہ

کے پیسے موجود نہ تھے۔ پھر بھی اس کی خواہش کا تقاضا یہی تھا۔ کہ وہ ضرور گوشت روٹی ہی کھائے۔ پس اپنی خواہش کی تکمیل کرنے کے لئے وہ کسی دوست یا حبیب سے قرض اٹھانے کی تدبیر کرے گا۔ اور اگر وہ اپنی اس تدبیر میں کامیاب رہا۔ تو وہ باقی کے سبادیات طے کرکے گوشت اور روٹی سے اپنا پیٹ بھر لیگا۔ مگر یہاں اسے گوشت روٹی سے اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر کسی دوسرے کا منت کش ہونا پڑا۔ یہ منت کشی اس کی بقیہ عمر کے کسی نہ کسی حصّے کی تقدیر پر ضرور اثر انداز ہوگی۔ اس سے قطعیاً چھٹکارا نہیں۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ وہ کسی سے قرض مانگنے جائے۔ اور اسے نہ ملے۔ اور وہ اپنی خواہش کو ضرور ہی پورا کرنے کے لئے کسی کی چوری کر بیٹھے۔ پکڑا جائے۔ اور جیل بھیج دیا جائے۔ اور یا اس کے دوسرے ہی دن اس کا قرضخواہ اس سے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ اور اس کا اس سے جھگڑا ہو جائے۔ ہاتھا پائی تک نوبت جا پہونچے۔ ایک دوسرے کو چوٹیں آئیں۔ دونوں کے دونوں پکڑے جائیں۔ اور جیل میں ٹھونس دیے جائیں۔ پس جہاں تک اس شخص زیر بحث کا تعلق ہے۔ کہا جائے گا۔ کہ اس کی چار آنہ کے مصرف سے بھوک رفع کرنے والی تدبیر کا حصّہ ناقص تھا۔ جس کا نتیجہ وہ مصیبت تھی۔ جس سے اوپر اسے دوچار ہونا پڑا۔

اور آگے چلیں۔ اب فرض کرلو۔ کہ اس کی صحت بھی درست ہے۔ اور اس کے پاس چار آنے کے پیسے بھی موجود ہیں۔ وہ ان پیسوں کو لے کر بازار میں ضروری اشیاء کے مہیا کرنے کے لئے جاتا ہے۔ مگر بجائے اچھی جنس خریدنے کے ناقص اور ناکارہ جنس خرید لاتا ہے۔ جسے کھا کر بعد میں بیمار ہو جاتا ہے۔ یا خریدنے میں بے پرواہی کرتا ہے۔ اور تین آنے کی چیز کے چار آنے دے آتا ہے۔ مگر اس صورت میں بقدر ایک آنہ اس کی تدبیر ناقص تھی۔ جس کا نتیجہ و اثر اس کی

مجموعی مالی حالت پر بالعکس پڑے گا۔

ذرا اور بھی آگے بڑھیں۔ فرض کرلو۔ کہ اوپر کے اجزائے تدبیر میں درجہ توازن قائم رہا ہے۔ مگر جب وہ پکانے بیٹھا ہے۔ تو اس کی غفلت سے گوشت یا روٹی خام رہ گئی ہے۔ مگر بھوک کی شدت نے اس کے لئے انتظار دوبھر کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے یہی کچا پکا کھانا کھا لیا ہے جس سے وہ بیمار ہوگیا ہے یا اس کی سوء تدبیر سے پکاتے وقت ہنڈیا بے مزہ ہوگئی ہے جس سے گو اس کی صحت کو کوئی نقصان نہیں پہونچا۔ لیکن ہنڈیا کی بدمزگی نے اس کے ذہنی قواء پر ایک ناخوشگوار اثر ڈالا ہے۔ انسانی زندگی میں اس قبیل کے دیگر ناخوشگوار اثرات سے عموماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور ہر ناخوشگوار اثر طبیعت پر ردِ عمل کی کیفیات پیدا کرتا رہتا ہے۔ جو بالآخر طبیعت میں ناموافق انقلاب لانے کا باعث ہوتی ہیں۔ جس کی افتادِ زندگی کے ہر پیش آیند مرحلہ پر پڑتی ہے۔ تو بس یہ ناخوشگوار اثر شخص مفروضہ کی طبیعت پر بقدر اپنے اندازۂ ناخوشگواری کے ویسا ہی اپنا نتیجہ ظاہر کرے گا۔ لہٰذا ہماری اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ تدبیرات کا عمل تقدیرات کا صانع ہے۔ اور جس درجہ تدبیر ناقص ہوگی۔ اسی درجہ تقدیر بھی خراب اور ناقص ہوگی۔

دوسری مثال۔ فرض کرو کہ ہم نے ایک اچھے کارخانہ کی بنی ہوئی گھڑی خریدی ہے۔ جس کو ہر چوبیس گھنٹوں کے بعد چابی دی جاتی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ اس گھڑی کے متعدد اور مختلف الحجم و شکل پرزوں کو ایسی صنعتی ترکیب سے آپس میں جوڑ دیا گیا ہے۔ کہ اس میں حرکت کی خاصیت و قوت موجود ہوگئی ہے۔ یہ حرکت چابی دینے کے تابع ہے یعنی جب تک ہم گھڑی کو چابی نہیں دینگے۔ اس کی پوشیدہ قوتوں کا عمل حرکت میں نہیں آئیگا۔ اب اگر

گھڑی کی صنعتی ترکیب میں کوئی نقص نہیں رہ گیا ہے۔ تو لامحالا چابی دینے سے گھڑی حرکت میں آکر اپنا عمل شروع کردے گی۔ اور اگر ہم حسب قاعدہ مقررہ ہر چوبیس گھنٹوں کے بعد اسے متواتر چابی دیتے رہیں گے۔ تو وہ ہمیشہ حرکت میں رہے گی۔ اور جس غرض کے لئے وہ بنائی گئی ہے۔ وہ غرض بھی پوری ہوتی رہیگی یعنی ہمیں گھڑی کی حرکتوں سے مختلف وقتوں کا پتہ چلتا رہے گا۔

اس مثال میں صانع کی تدبیر مکمل ہے۔ اور استعمال کنندہ کے چابی دینے کی احتیاط کے ماتحت گھڑی کی حرکت لازمی اور مقدر ہو چکی ہے۔ مگر ایک خاص مدت تک کے لئے جو صانع اپنے گذشتہ تجربوں کی بنا پر تخمین و مقرر کرتا ہے اور اس کی ضمانت یعنی گارنٹی بھی دیتا ہے۔

پس یہاں بھی تدبیرات کا عمل تقدیرات کا صانع ٹھیرا۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جس درجہ صانع کی تدبیر میں پختگی اور کمال ہے۔ اسی درجہ گھڑی کی حرکت یقینی اٹل اور اس کی زندگی طولانی ہو گئی ہے۔ فلہذا جس درجہ تدبیر کامل ہوگی۔ اسی درجہ تقدیر بھی کامل ہوگی۔

آئیے اب دیکھیں۔ کہ قدرت کی اشیاء و مظاہر کا اس سلسلہ میں کیا حال ہے۔ لیکن اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں ایک آدھ مثال پر ہی قناعت کرنی پڑیگی۔

پانی کو دیکھئے کہ اس کی فطرت میں بہنا سرایت یا نفوذ کرنا اور کایا پلٹنا ہے یعنی قدرت نے یہی اس کی قسمت و تقدیر لکھدی ہے کہ جہاں اسے گراؤ یہ نہ نکلیگا جس جسم پر اسے گراؤ۔ یہ اس میں نفوذ یا سرایت کر جانے کی جدوجہد میں اپنے کل کا ایک حصہ صرف کر دیگا۔ اور جونہی اس کو حرارت پہنچانی شروع کرو۔ یہ اپنی کایا پلٹنے لگ جائیگا۔ پانی کو یہ تقدیر کیونکر میسر ہوئی۔ آگ میں بہنے کی خاصیت کیوں موجود نہیں بہ صاف ظاہر ہے۔ کہ پانی اور آگ کی ساخت جسمانی میں جن تدابیر سے

کام لیا گیا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان تدابیر کا اختلاف صانع کی معرفت اجسام و مادہ پر منحصر تھا۔ یعنی اگر صانع کو مختلف اجسام و مادہ کی شناخت و پہچان نہ ہوتی۔ تو وہ مصالحہ یا سواد جو ان کی تعمیر میں خرچ کیا گیا ہے۔ اسے صانع کیونکر انتخاب کر سکتا تھا۔ صانع کا اس مصالحہ یا مواد کو انتخاب کرنا۔ اور پھر ان باہمی اجزاء کا ایک ایسا تناسب جس سے آگ یا پانی کا وجود تشکیل پائے۔ اس کی تدبیرات تھیں۔ غرضکہ یہاں بھی صانع کی تدبیرات کے عمل نے تقدیرات کو پیدا کیا۔

اب ذرا ملاحظہ ہو۔ کہ صانع نے جو تدبیرات کیں۔ ان تدبیرات کے اثرات دو طرفہ ہونگے۔ صانع پر بھی اور صانع کے مقصود پر بھی۔ جونسی طرف صانع سے متعلق ہے۔ وہ تقدیر صانع ہے اور جونسی طرف صانع کے مقصود سے متعلق ہے یعنی اس کی تدبیرات کے عمل کا جو نتیجہ ہے۔ یا اور بھی واضح تر یوں کہ اس کی تدبیرات نے جس وجود و شئے کو بنایا ہے۔ وہی اس وجود یا شئے کی تقدیر ہستی ہے۔ جسے ہم اس سے پہلے تقدیر حیات کا نام دے چکے ہیں۔

ہم بسا اوقات یہ کہتے ہیں۔ کہ "فلاں چیز کی فطرت و خاصیت ہی ایسی ہے۔" ایسا کہتے ہوئے گویا ہم اس چیز کی تقدیر ہستی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بمعنی دیگر "تقدیر ہستی" اشیاء و وجود کی فطرت و خاصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے یعنی جو وجود یا شئے اپنی ہستی کا مظہر بنتا ہے۔ وہ اپنی صفات اور خاصیتوں کے لحاظ سے اپنی "تقدیر حیات" کو خود ترتیب دیتا ہے۔ اور اپنی حرکات و اعمال سے اپنا ایک خاص ماحول تشکیل دے کر اس کے اثرات و نتائج سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اب جہاں تک اس ماحول کا تعلق ہے۔ وہ کچھ تو اس کا اپنا پیدا کردہ ہوتا ہے اور کچھ طبعی طور پر پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ یہ ماحول طبعی اس کی ہستی کے لئے عیناً ساز گار ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو اس کا وجود کبھی بھی اپنی ہستی کا مظہر نہ

بن سکتا۔ گویا ایک وجود اپنی ہستی کے مظاہرہ کے ساتھ ہی ماحول سے دست و گریبان ہو جاتا ہے۔ جو اگرچہ ہر طرح اس کی حیات کے لئے سازگار ہے۔ تاہم اس کی اپنی ناتجربہ کاری اور کوتاہیاں اس ماحول طبعی کی سازگارانہ کیفیات کو مکدر کرتی رہتی ہیں تا آنکہ وہ اس سازگار ماحول میں ایسی تاثیرات پیدا کر دیتا ہے۔ جو اس کی اپنی ہستی و حیات کے لئے خوفناک طور پر زہریلی اور موت آور ہوتی ہیں۔ اور بالآخر وہ انہی تاثیرات کے مہلک حربوں کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ مرگ اس کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ اور وہ فنا ہو جاتا ہے ؛

میں اس چیز کو اس فنا سے دو چار ہو جانے والے وجود کے صانع کی تقدیر کہتا ہوں۔ میرے نزدیک "تقدیر صانع" یہی کچھ ہے کہ اس کی ہر بنا کردہ صنعت و کاریگری فنا سے دوچار ہوتی رہے۔ کسی کو بقائے دوام نصیب نہ ہو۔ ہر ایک تغیر پذیر و زوال آشنا رہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ (صانع) اپنے لئے ایک دلفریب ماحول تشکیل کرتا ہے۔ اور اس ماحول کا طبعی حصہ وہی کچھ ہے۔ جو اس کی مصنوعات اور آئے دن کی کاریگریوں کی ایجاد و فنا کے تاثرات و عواقب سے بن کر تیار ہوتا رہتا ہے۔ اب جس درجہ کسی صانع کے وسائل و ذرائع اپنی وسعت و کثرت کے لحاظ سے عام ہونگے۔ اسی درجہ صانع کی تقدیر کا وہ حصہ جو خود اسکے اپنے وجود و ذات سے متعلق ہے۔ خود مختاریت اور زیست ابدی سے ہمکنار ہوتا چلا جائے گا۔ شاید یہاں اب یہ راز بھی کھل چکا ہے۔ کہ کیوں اس کائنات ارض و سما کے جاں بخش کو ہمیشگی اور دوام نصیب ہے ؛

ہم اپنی تدبیرات کے بل بوتے پر قطعیت اور تعین کے ساتھ ان امورات کے انجام و تکمیل پانے کے اوقات معلوم کر لیتے ہیں۔ جن کی نسبت ہماری معلومات اور تجربہ عمل اپنی پختگی کو پہونچا ہوتا ہے۔ ہمیں ان میں شاذ و نادر ہی ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ اقوام و ملل جو اپنے ارتقاء کی پیشین منزلوں میں گامزن ہیں۔ اپنے

ارتقائی اعتبار سے اپنی زندگی کے دوام و قیام اور بست و کشاد کے رازوں پر حاوی ہیں اور اگرچہ سو فیصدی ان کو اپنی تدابیر و تجاویز میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی تاہم اگر ان کی "کُنْ فَیَکُوْن" کی طاقتوں کا موازنہ ان پس ماندہ اور افتادہ اقوام سے کیا جائے۔ جو اپنے آپ کو "تن بہ تقدیر" کی سپردگی میں مفلوج و اپاہج بنا بیٹھی ہیں۔ تو حقیقت خود بخود بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اور ہمیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوتا ہے کہ وہی امور جو اپنے اعمال کی قوتوں سے متمدن اور مترقی اقوام میں ایک فیصلہ کن قطعیت کے ساتھ تکمیل کے مدارج طے کرتے ہیں۔ راہ گم کردہ قوموں میں سنوزان کے احساس کا شعور تک نہیں آیا ہوتا۔ ان کی حیات خلق و باز آفرینی کی قوتوں کی وارا ہوتی ہے۔ مگر ان کی محض عارضی اور صرف شدہ، انہیں استقلال و دوام نصیب ہوتا ہے۔ مگر یہ ہمہ وقت تغیرات و انقلابات سے دوچار، وہ اپنی فراہم کردہ قوتوں کا سارا زور اپنی تعمیر پر صرف کرتی ہیں۔ مگر یہ انہی سے اپنی تخریب کا سودا ڈھونڈنے میں مشغول، وہ تقدیر فطرت کو اپنے قبضہ میں لانے کی سعی میں مضطرب ہیں۔ مگر انہیں اپنی مجبوریت و بے بسی کا احساس کچھ کرنے ہی نہیں دیتا۔ یہ حسرت و نامرادی سے ایک دوسرے کا منہ تکتی رہتی ہیں۔ اور ٹھیراؤ کی اس منزل پر جاگزین ہوتی ہیں۔ جہاں یخ بستگی اپنے ہولناک انجمادی تاثرات سے ان کا خون خشک کئے رکھتی ہے۔"

آہ! یہ سب فرسودہ اعتقادیات کے ہنگامہ زار کی لعنتیں ہیں۔ جن میں صدہا قومیں گرفتار ہوئیں۔ اور زندگی کے ابدی جہنم میں معدوم ہو گئیں۔ اگر ہم اس ذہنی پسماندگی کا تجزیہ کرنے بیٹھیں۔ تو اس حقیقت کو ڈھونڈتے ہمیں دیر نہیں لگے گی۔ کہ ان فرومایہ اعتقادیات کی اصل جڑ یہی "مسئلہ تقدیر" ہے۔ جملہ قسم کے عوارض و امراض جو اقوام و ملل کو لاحق ہو جاتے ہیں۔ اپنی نمو و پیدائش کے لئے اسی کے رہین منت ہیں۔ اور جب تک کوئی قوم یا ملت اس کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر لیتی۔

اس میں "بینائی حیات" پیدا ہی نہیں ہوتی۔ چنانچہ تاریخ عالم کا سینہ چاک کر کے اگر دیکھا جائے۔ تو یہ راز اپنی تمام ستر پوشیوں کے باوجود بے پردہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کہ جب کبھی کسی قوم و ملت نے اس کی "مضبوط پکڑ" سے اپنے آپ کو بے نیاز کرنا چاہا۔ تو ایسا اسی وقت ہو سکا۔ جبکہ اس نے "مذہب" سے اپنا دامن چھڑا کر مادیت میں پناہ ڈھونڈی ہو۔ اور یہ گمراہی اس وجہ سے نصیب ہوئی۔ کہ **تقدیر** کو مذہب کی بنا د اساسی سمجھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ "مذہب" اور "مادیت" کے دو مستقل محاذ قائم ہو گئے۔ اور مادئین کا گروہ جو اپنے عمرانی دور کے "تاثرات" سے کسی طرح نہ بچ سکتا تھا۔ یہ غلط اصول تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کہ "مذہب کے ہوتے ہوئے دنیا کی ترقیات محض طفل خیالیاں ہیں"۔ اور چونکہ ترقیات کے بغیر "انسانی شرف" یقیناً پامال ہو رہا تھا۔ اس لئے مادیت کی دنیا میں یہی عقیدہ نقش کالحجر ہو کر رہ گیا۔ اور اسے یہاں وہی درجہ حاصل ہوا۔ جو خود عقیدہ تقدیر کو عامتہ الناس کے مذہب میں حاصل تھا۔

ہم نے اوپر کہا ہے۔ کہ اس عقیدہ تقدیر نے جس ذہنیت کی تخلیق کی۔ اس کا تقاضا ہی یہ تھا۔ کہ اس کے ماتحت قوموں میں ایسے عوارض لاحق ہوتے رہیں جو اعتقادات باطلہ کی شکل میں ظہور پا کر ان کی ہستی عمل کے لئے غارت گر احساس ثابت ہوں۔ آئیے۔ اب دیکھیں۔ کہ افغانستان ان کے زہر آلود کم و کیف سے کس کس طرح متاثر ہوا۔

سلہ میں "خدا، انسان اور مذہب" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دے رہا ہوں جس میں نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ ان تمام مسائل کو بیان کیا جائے گا۔ قارئین منتظر رہیں۔ یہاں یہ اشارہ کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ غازی امان اللہ خان اپنے ملک کے مخصوص حالات کے ماتحت بدقسمتی سے مادئین کے اس اصول کو صحیح سمجھنے لگ گئے تھے۔ اور انہوں نے بہت بڑی حد تک انہی اثرات کو قبول کر لیا ہوا تھا۔ وہ دراصل "حقیقت مذہب" کو سمجھ ہی نہ سکے تھے۔

ہم یہ معلوم کر ہی چکے ہیں۔ کہ افغانستان کے باشندوں پر جن قوتوں کا عمل و دخل جاری تھا۔ وہ بادشاہ، اس کے حکام، خوانین اور ملّاؤں پر مشتمل تھیں۔ ان فریقوں میں جہاں تک دنیاوی اور دینی اقتدار کی ہوس و آرزو کا تعلق تھا۔ ایک حس مشترک موجود تھی جس کے سبب سے وہ اس ایک خصوص میں بالکل نامعلوم اور غیر ارادی طور پر ایک دوسرے کے معین و مددگار بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک فریق اپنے حیطۂ اقتدار و تسلط میں اپنی بزرگی و اربابیت کو فروغ و دوام بخشنے کے لئے طرح طرح کے فسوں طراز نغموں سے کیفِ مسحوریت کا ایک عالم پیدا کر رہا تھا۔ جس میں عوام کی ذہنیت اپنی مخصوص تربیت و زندگی کے سانس لینے پر مجبور تھی:

بادشاہ اس کے حکام اور خوانین تو طبعاً دنیاوی طاقت و اقتدار کے پیچھے پڑے ہوئے تھے ہی مگر ملّاں اپنی مذہبی شان میں دینی اثر و تفوق کے ماسوا ان دنیاوی حکام و خوانین کے ڈکٹیٹر بننے کے نیز آرزومند تھے۔ اگر سچ پوچھا جائے تو اسی آرزومندی کی تلاش میں گم ہو کر وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا ہوتے دیکھ چکے تھے۔ اور ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر کا غلط اور گمراہ کن استدلال انہیں ایک ایسے گرداب ہلاکت میں پھنسا چکا تھا۔ جس سے ان کا سلامت بچ کر نکل آنا اب ایک امر محال سا ہو گیا تھا۔ اس آیت ربانی کا مفہوم یہ ہے۔ کہ "تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور موجود ہونی چاہیئے۔ جو لوگوں کو خیر و نیکی کی طرف بلائے۔ اور بدی و نواحی سے روکتی رہے"

اجتماعیات کا مذہب فردی حیثیت کو اس حد تک قبول کرتا ہے جس حد تک کہ وہ "ملی سلسلۂ تنظیم" کی رہین منت ہو۔ تنظیم کے مفہوم کو اسلام "جماعت" سے ادا کرتا ہے۔ لہٰذا اگر ملت کی اجتماعی حیثیت میں تنظیم مفقود ہے۔

تو ملانوں اور علماء کا گروہ خواہ وہ اپنے محدود حلقوں میں جماعتی زندگی ہی بسر کیوں نہ کر رہا ہو۔ اپنے ان فرائض کو جو آیۂ مذکورہ کے تعلق سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ کسی طرح بھی پورا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نہ تو خیر کے لئے امر و ترغیب دیتے وقت اور نہ ہی شر و نہی سے روکتے وقت اس کے ہاتھوں میں کوئی قوۃ اجرائیہ موجود ہے۔ جو منشاء ایزدی کی ذکر یافتہ حکمت بالغہ کو پورا کر سکے۔ حکمت و منشار خداوندی تو یہ تھی۔ کہ جسد ملت کے تنظیمی تار و پود میں ایک ایسی امت یعنی جماعت موجود ہو۔ جو علم دین کی صحیح روشنی میں اس کے باقی اعضاء و جوارح کے اعمال کے لئے زیست کے سامان پیدا کرے۔ اور یہ سب کچھ خیر و عدل کے ماتحت تعاون باہمد گر سے حاصل ہو۔ لیکن اس کے بالکل ہی برعکس علماء سوء نے جو کچھ خیال باندھا۔ وہ یہ تھا۔ کہ ملت خواہ کس قدر پراگندگی اور انتشار کی حالت میں کیوں نہ اسیر و گرفتار ہو چکی ہو۔ اور وہ خود بھی کیوں نہ انتہائی طور پر اسی زبون صفتی کا شکار ہو چکے ہوں۔ پھر بھی یہ حق صرف انہی کو پہونچتا ہے کہ وہی خالصۃً للہ امر و نہی کی تلقین کرتے پھریں۔ اور اپنے آپ کو "اولٰئک ھم المفلحون" کے مصداق سمجھیں ؀

انہوں نے یہ کبھی سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کہ ان کے اس طریق عمل سے بہ سبب اس کے کہ ان کے پاس قوت اجرائیہ موجود نہیں ہے۔ ملت ورق ورق ہو کر رہ جائے گی۔ اور ایک حبل المتین کا سہارا پکڑنے والے صدہا خداؤں[1] اور بتوں کے آگے سر بسجود ہو جائیں گے ؀

[1] آج جو لوگ مسلمانوں میں صدہا فرقے دیکھ رہے ہیں۔ اور اس حالت پر نوحہ کناں ہیں۔ انہیں اپنے سے کہیں زیادہ ان بدبختان ازلی کا ماتم کرنا چاہئے۔ جو اگر علم دین کی صحیح روشنی میں چاہتے۔ تو انہیں اس ذلت و نکبت آفرین انتشار سے بچا سکتے تھے ؀

ان کے اپنے اندر کوئی تنظیم بھی موجود نہ تھی۔ جو اگرچہ ملت میں تفرق و انتشار کی شدت کو تو کسی صورت سے بھی روک نہ سکتی۔ تاہم اس سے اتنا ہو جاتا۔ کہ عوام بہت بڑی حد تک اس فرسودہ و پامال ذہنیت سے بچ جاتے۔ جو دوسری صورت میں نت نئے غلط اعتقادیات اور رسم و رواج کی بدولت ان میں پیدا ہو جانی لازمی تھی:۔

ہم اوپر ابھی کہہ آئے ہیں۔ کہ ملانوں اور علماء کا گروہ اس صورت میں کہ ملت میں تنظیم یکسر مفقود ہو۔ بطور خود منظم ہونے پر بھی عام انتشار کے مقابلہ میں اسے تفرق و منتشر ہو جانے سے نہیں روک سکتا۔ یہ اس لئے کہ صورت فوق کے ماتحت ان کی اپنی تنظیم مقامی ہو گی۔ اور اس نسبت سے صدہا حلقوں میں بٹی ہوئی ہو گی۔ اب یہ چھوٹے چھوٹے حلقے بوجہ آپس میں شدید بغض و رقابت رکھنے کے من حیث الکل ملت پر جو کہ کامل انتشار کے دور میں سے گذر رہی ہو گی۔ اپنا کوئی اثر نہیں ڈال سکینگے۔ بلکہ صرف اپنی دور و پیش کی فضا کو متاثر کرتے ہوئے ملت کے افراد میں ایک مقامی و محدود ذہنیت تفرق پیدا کر کے رکھ دیں گے۔ البتہ جہاں تک خود "اعتقادات باطلہ" کی فراواں پیدائش کا تعلق ہو گا۔ وہ یقیناً اسی نسبت سے کم پیدا ہونگے۔ جس نسبت سے علماء کے ان حلقوں کی اندرونی وسعت بڑی ہو گی:۔

لیکن حقیقت میں ایسا ہو نہیں سکتا۔ کہ اگر ملت پراگندگی کے دور میں سے گذر رہی ہے۔ تو علماء (خواہ مقامی طور پر ہی کیوں نہ سہی) کسی آئین تنظیم کے ماتحت زندگی بسر کر سکیں۔ یقیناً ملت کا انتشار اپنے ردّ عمل کی کیفیات سے خود ان کی ذات کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیگا۔ نتیجہ سب کی پراگندہ حالی اور پراگندہ صورتی ہو گا:۔

پس علماء کا یہ سر خود غلط قیاس کہ وہ اپنی فردی حیثیت میں بھی اس آیہ مذکورہ کے

مقصود عینی ہیں۔ میرے نزدیک ہرگز درست نہیں۔ ہاں اس علم کی بدولت جو ان کو حاصل ہے۔ ان میں آیہ مذکور کا مصداق بننے کی صلاحیت ضرور موجود ہے ۔

آیۂ مذکورہ کے مفہوم کی غلط تفسیر نے علماءِ سوء کو کہیں زیادہ اس زعم باطل میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کہ وہ دنیاوی حکمرانوں اور ملت کے اقتدار یافتہ جزو پر ہر طرح حاوی و مسلط ہیں۔ اور ان کے ہاتھوں میں جو قوتِ اجرائیہ موجود ہے۔ اس کو اپنی مرضی و ارادہ کی ایک ادنےٰ جنبش سے وہ جس وقت بھی چاہیں۔ حرکت میں لا سکتے ہیں۔ جب حکمران اور صاحبان قدرت کے لیئے ان کا یہ خیال تھا۔ تو پھر عامۃ الناس کی زندگیوں کا جکڑ کر ان کی آہنی گرفت میں آجانا تو ایک بالکل ہی معمولی بات تھی ۔

اگر بغور دیکھا جائے تو ان کے اسی اصرار شدید کے برخلاف اعلےٰ طبقات اور پھر انکے زیر اثر دیگر طبقوں میں وہ باغیانہ روح پیدا ہو کر رہی جو بالآخر ان کے شخصی استبداد و ضد کی مخالفت کی حد سے گذر کر سرے سے مذہب ہی کی مخالف بن بیٹھی۔ اور اسلام فتنۂ ارتداد و الحاد سے دوچار ہو کر رہ گیا ۔

شروع شروع میں ملّانوں کی یہ مستبدانہ دخل اندازی صرف طبائع پر ہی گراں گذرتی تھی۔ لیکن پھر بتدریج مختلف مذہبی احکام میں ان کی جا و بیجا سختیوں نے یہ رنگ پیدا کرنا شروع کیا۔ کہ لوگ عمل کی دنیا میں مذہبی احکام سے گریز اختیار کرنے لگ پڑے۔ پھر جہاں گریز آیا۔ وہاں حیلہ تراشیوں کا از خود موجود ہو جانا لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہو کر رہا ۔
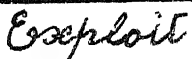
دوسری طرف ملّانوں پر اس امر میں ضد کرنے کا جو اثر پڑا۔ وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ ان کی حقیقی عزت و توقیر ان حکام و خوانین کے دلوں سے اٹھتی جاتی تھی۔ اور ان کو بتدریج معلوم ہوتا جا رہا تھا کہ وہ کسقدر آسانی سے انہیں اپنے دنیاوی مقاصد کی تکمیل کا آلۂ کار بنا سکتے ہیں۔ ملّاں بھی اپنی اس کمزوری کو محسوس کر رہے تھے اور

انسانی فطرت کے ماتحت اپنی عزت و اکرام کو کسی حال میں بھی کھونا نہیں چاہتے تھے۔ پس ان احساسات کے دباؤ کے ماتحت وہ مجبور ہوتے گئے۔ کہ جن لوگوں کے محتاج و دست نگر یہ خود بن چکے ہیں۔ ان کے لئے مذہب میں آسانیاں پیدا کریں۔

اب ایک طرف حیلہ جوئیوں کی جستجو تھی۔ تو دوسری طرف حیلہ گر موجود تھے۔ نتیجہ یہ تھا۔ کہ نت نئی تاویلات نت نئے نظریوں کو روبکار لاتی تھیں۔ اور ان سے غلط عقائد کی ترویج و تشہیر کا ایک مہلک گرداب بنتا تھا۔ جس میں مذہب کی ناؤ پڑی ڈوب رہی تھی۔

خواہ صورت حال کچھ بھی تھی۔ اس سے دو مخالف عنصر (بادشاہ[1] حکام و خوانین[2] اور ملّاں) آپس میں ضرور تعاون کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اب حلقوں کی پہلی تقسیم بھی نہ رہ سکتی تھی۔ بلکہ ان کی جگہ ان مختلف قواملکی کے مخلوط حلقے بن چکے تھے۔ جن کی بنا و اساس "تبادلہ مفاد ذاتی" پر رکھی گئی تھی۔ اس کے ماتحت حکام و خوانین، ملّانوں کے اثر و طاقت کو ایک طرف اور ملّا نے، حکام و خوانین کی قوت و شوکت کو دوسری طرف صرف و[1] استعمال کرنے میں مشغول تھے۔ حقانیت کا اب کوئی سوال ہی باقی نہ رہ گیا تھا۔ بلکہ ظاہرداری حیلہ جوئی اور مکر و ریا کا ہر چہار سو دور مسلط ہو چکا تھا۔

ذہنیت عامہ اسی ماحول کی پروردہ تھی۔ اور "الناس علےٰ دین ملوکہم" کے ماتحت لوگ اپنے اپنے راہنماؤں اور پیشواؤں کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ ان کو اپنی زبوں بختی سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ کہ وہ اپنی غلامی و عبدیت سے ایک آن کنارہ ہو کر اپنے آپ کا جائزہ لے سکیں۔ اور پھر دیدۂ عبرت کو وا کر کے دیکھ سکیں۔ کہ وہ ذلت و ادبار کی کس گھناؤنی منزل میں اتر چکے ہیں۔

علماء حکام اور خوانین اپنی انفرادی حیثیت میں جہاں تک عامۃ الناس سے

---

[1] صرف و استعمال: Exploit

انکے اپنے حقوقِ پیشوائی و حکمرانی کی پاسبانی و نگہداشت کا تعلق تھا۔ طوعاً و کرہاً ایک دوسرے سے تعاون برت رہے تھے۔ اور اپنی اپنی پوزیشن کے استحکام و دوام کے لئے وہ "من ترا آقا بگویم۔ تو مرا مرشد بگو۔" کے اصول پر عمل پیرا ہونے سے ایک دم نہ چوکتے تھے۔ ملّا نے خوانین و حکام کے دستر خوانوں کے ریزہ چین بن چکے ہوئے تھے۔ اوران کے لئے اپنی تعیش زا زندگی بسر کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور جب کبھی ان کو اپنے مریدوں اور معتقدوں میں غیر از معجزات روحانی اپنے زور و طاقت کی نمائش درکار ہوتی تھی۔ تو ان کے دوست حکام و خوانین کا رعب و دبدبہ اس کمی کو پورا کردیتا تھا۔ وہ اس کے عوض حکام و خوانین کو جو معاوضہ پیش کرتے تھے۔ وہ خدا اور دین فروشی ہوتا تھا۔ لیکن میں اس جگہ اتنا ضرور اضافہ کرونگا۔ کہ جس ماحول و فضا کے وہ پروردہ تھے اس کے ماتحت ان کی ذہنیت کچھ اس طریق پر ڈھل چکی تھی۔ کہ ان کے نقطۂ نگاہ میں یہی دین فروشی "عین مذہب" بن گیا ہوا تھا۔

اہل ثروت اور ارباب حکومت و اقتدار کو سب سے اول جس چیز کی ضرورت تھی۔ وہ ان کی اپنی ہستی کے تحفظ و بقاء کا مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے۔ کہ ایک ایسے دور میں جس میں جہالت لاعلمی ظلم اور استبداد کے سوا ملک میں اور کوئی آئین و نظام ہی موجود نہ ہو۔ محض قومی یا قبائلی رسم و رواج کی پاگیریاں اپنی عینِ حقیقت میں کسی طرح بھی مقہور و محکوم عوام کو اپنے خداوندانِ ہست و بود کا پوری پوری طرح مطیع و منقاد نہ رکھ سکتی تھیں۔ جب تک کہ خود رسم و رواج پر اعتقاد کی چاشنی نہ چڑھ چکی ہو۔ اس بارے میں مذکورہ بالا فریق براہ راست ان "اعتقادات" کے پیدا کرنے والوں کے محتاج و دست نگر تھے۔ تاکہ وہ آئین و دستور الٰہی سے ان کی ہستی کے بقاء و دوام کی سند (تائید) موجود کرسکیں۔ ایسا کرنے میں ان علماء سود کو

کوئی مستقل دریش نہ تھی۔ انہوں نے جابجا قرآن الہی سے ایسی آیتوں کو اکٹھا کر لیا تھا جن سے اس قسم کے مطالب ومعانی پیدا کئے جاسکتے تھے۔ جو عیناً ان کے مقاصد سے ہمدوش ہوں۔

فضلنا بعضھم علٰی بعض ط۔ اور اسی قبیل سے قرآن کی وہ مقدس آیتیں جن میں خداوند تعالےٰ عمومیت کے ساتھ مختلف وقتوں اور زمانوں میں مختلف اقوام و شعائب پر اپنے افضال واکرام اور اپنی بخشائش وانعامات کا ذکر فرماتا ہے۔ ان کے ان مقاصد کی تکمیل کا اساس بن چکی تھیں۔ انہوں نے عوام کی جہالت و بے بصری کو علےٰ حالہ قائم رکھنے کے لئے خود تو مذہبی پیشوائی کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ جس کے تقدس ورعب کے آگے گویائی اور خطابت کے تمام سرچشمے خشک ہو کر رہ جایا کرتے ہیں۔ مگر اپنے دنیاوی دوستوں اور سرپرستوں کے اقتدار و قوت کو مذہبی رنگ دینے میں بھی انہوں نے کچھ کم ہمت نہ کر رکھی تھی۔

اس باب میں ان کی تعلیم یہ تھی۔ کہ " اگر خدا کی مرضی ومنشاء نہ ہوتی۔ تو یہ لوگ کس طرح سے صاحب ثروت و اقتدار بن سکتے تھے۔ اور جب ان کو ہر طرح کی قوت و شوکت نصیب ہے۔ تو ان کی شوکت و قوت کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا یا ان سے بغاوت و سرکشی اختیار کرنا خدا کے ارادے کی شکست کے درپے ہونا ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے۔ غریب مفلس و قلاش پیدا کرتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے عزت و رتبوں والا بنا دیتا ہے۔"

زبان کی اس خواب آور فسوں سازی نے عوام پر صدیوں بجلیاں گرائے رکھیں اور آج بھی یہ حال ہے۔ کہ اگر اس طبع زاد تخیل کے برخلاف کچھ کہا جائے۔ تو اسے کفرانہ سرزہ سرائی کا نام دیا جائے گا۔ قارئین خود ہی قیاس فرما سکتے ہیں۔ کہ جبکہ موجودہ علم وعرفان کی روشنی میں یہ زبوں حالی نصیب ہے۔ تو اس وقت کا کیا منظر ہو گا۔

جبکہ ہرکس وناکس جہالت اور بے خبری کی ایک گہری نیند سو رہا تھا ؟

لیکن خواہ کچھ بھی ہو۔ آئیے لگے ہاتھوں اس کو بھی دیکھتے چلیں۔ کہ آیا ہماری اس دنیا میں غربت و افلاس یا امارت و غنا خدا کی مسلط Imposed کردہ ہے۔ یا خود ہماری اپنی پیدائش ہے ؟

میں اس کے متعلق پوری تفصیل سے تو اپنی کسی بعد کی تصنیف میں کام لونگا۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے اسی قدر کہنے کی گنجائش موجود ہے۔ کہ خدا جس نے اس کارخانۂ حیات کو وجود دیا ہے۔ اپنی قوتوں و قدرتوں کے نیچے خود ہی دب کر رہ جاتا۔ اگر وہ خیر و عدل کے محکم و پائندہ اساس پر ان کا ادارہ و اہتمام نہ فرماتا۔ اب اس کے بالمقابل ایک شخص یا انسانوں کے اس گروہ کو دیکھو جو اس دنیا میں ظالم و سفاک بن کر اپنی قوت و شوکت کو پیدا کرتا ہے۔ کیا تم گمان کرسکتے ہو۔ کہ اس شخص یا گروہ نے باوجود ظلم و گناہ کے خدا کے فضل و کرم کو حاصل کرلیا ہے اگر واقعی خدا کی بخشش و رحمت اتنی ہی ارزاں و عام تھی۔ تو وہ ان لوگوں کو اس دنیا میں کیوں میسر نہ آسکی۔ جو بجائے ظلم و گناہ کے نیکی و خیر کے طرفدار ہے۔ یہاں یہ ضرور ماننا پڑے گا۔ کہ یا تو خدا خود سفاک و ظالم تھا۔ یا ان سفاکانِ ارضی سے بدرجہا کمزور و نحیف تر (نعوذ باللہ)۔

اور اگر یہ ہر دو صورتیں ممکن نہیں ہوسکتیں۔ تو پھر قطعیت کے ساتھ یہ حکم لگانا پڑیگا۔ کہ خدا کا فضل و اکرام درحقیقت وہ معنی نہیں رکھتا۔ جس کی عام طور پر ہمیں تعلیم ملتی رہی ہے۔ یقیناً اس کے صحیح معنی کچھ وہی لوگ دریافت کرسکتے ہیں۔ جنہیں قرآن "اولی الالباب" کہہ کر غور و فکر کی دعوت پیش کررہا ہے۔

یہ مسئلہ اتنا اہم اور باریک ہے۔ کہ بیک لغزش اس کا منکر اسی غلط راستہ پہ جا پڑیگا۔ جس پر ہزاروں نے آج سے پہلے چل کر ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھائی

ہیں۔ اس لئے ہمیں نہایت ہی احتیاط سے اول اس امر کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ خدا کے فضل سے دراصل مراد کیا ہے۔

فطرت کی قدرتوں اور طاقتوں پر دسترس و قابو حاصل کرنے کے وہ جملہ وسائل و ذرائع جنہیں حیاتِ انسانی کے مصرف میں لایا جا سکتا ہے۔ خدا کے افضال و اکرام ہیں۔ مگر ان وسائل و ذرائع کے استعمال کرنے کا طور و طریق براہِ راست انسانی امر و ارادہ کا تابع ہے۔ اب جہاں تک ان وسائل و ذرائع کی موجودیت کا تعلق ہے۔ وہ اپنی "ہمہ صفت استعمال" کے ساتھ ہر حال و زمان میں کسی خاص شخص یا فرقہ و جماعت کے لئے نہیں بلکہ عمومیت کے ساتھ نوع انسانی کی خدمت کے لئے حاضر و موجود ہیں۔ بعض ان میں سے ابھی تک مخفی ہیں۔ اور بعض کو ہم نے معلوم کر رکھا ہے۔ پہلی قسم کو خدا اپنے مخفی خزائن ارضی و سماوی کہہ کر پکارتا ہے۔ اور دوسری قسم کو افضال و اکرام کا نام دیتا ہے۔ اور جہاں وہ کسی قوم یا جماعت پر اپنے افضال و اکرام کا ذکر کرتا ہے۔ تو اس سے گویا مراد یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ خاص قوم یا جماعت خدا کے افضال و اکرام سے بہرہ ور تھی۔ یعنی وہ ان وسائل و ذرائع پر قابو رکھتی تھی۔ جن سے وہ فطرت کی متعلقہ قدرتوں اور طاقتوں کی مالک ہو کر ان کو اپنے تصرف میں لا سکے۔ لیکن ان وسائل و ذرائع کا طور و طریق استعمال اس قوم یا جماعت کا اپنا پسند کردہ فعل ہوتا تھا۔ جس کے لئے وہ براہ راست خدا کے حضور میں مسئول و جوابدہ تھی۔

اگر تم بغور ان آیات کا مطالعہ کرو۔ جن میں خدا کسی قوم پر اپنے افضال و اکرام کا ذکر فرماتا ہے۔ تو تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ کہ خدا اپنے طرز بیان میں ایک طرح اس قوم کا شاکی نظر آتا ہے۔ کہ دیکھو ہم (خدا) نے اس پر

کیسے کیسے فضل کئے کیسی کیسی نعمتوں سے اسے بہرہ اندوز کیا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ ہمارا شکر بجا لاتی۔ اس نے کس کس طرح سے ہمارا کفران نعمت کیا۔ اور اپنے زور و طاقت کو جو ہم نے اسے اچھے کاموں کے کرنے کے لئے عطا کر رکھا تھا۔ اس نے کس کس طرح برائی و گناہ کے لئے وقف کئے رکھا۔ پھر ہم نے بھی اسے دھر پکڑا۔ اور اس کو ایسا کر دیا۔ جیسے وہ اس صفحۂ ہستی پر کبھی تھی ہی نہیں؛

اس مفہوم کی روشنی میں کون کہہ سکتا ہے۔ کہ وہ لوگ جو اس دنیا میں غلبہ و طاقت حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر خدا کے منشاء افضال و اکرام سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔ تو محض اس لئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے افضال و اکرام کو برت رہے ہیں۔ خدا کی استرضاء و خوشنودی کے حق دار گردانے جائیں اور ان کی نسبت یہ کہا جائے۔ کہ ان پر خدا کا فضل و کرم ہو رہا ہے۔ خدا کی عادلانہ صفت میں اس بات کی قوت برداشت ہی نہیں۔ وہ انہیں مجرم ٹھیراتا ہے انہیں اُچک لے جانے والے چور (Smuggler) قرار دیتا ہے۔ اور انہیں کسی وقت بھی سزا دینے سے نہیں چوکتا۔

قارئین یہاں اس فرق کو ملحوظ رکھیں۔ جو خدا کے افضال و اکرام اور ان کے استعمال کے طریقوں کے اختیار کرنے میں موجود ہے۔ کوئی سا فضل فضل ہو جاتا ہے جبکہ اس کا طریق استعمال فطرتی و طبعی ہو۔ اور وہ اپنی اسی صورت میں متواتر ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس کے بالکل ہی برعکس کوئی سا فضل غیر طبعی طور پر برتے جانے سے اپنے اندر مذمومیت کے اثرات پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس کے عواقب و نتائج بھی اسی صورت سے ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

پس خدا کے افضال و اکرام کا سوء استعمال غیر فطری طور پر نوعِ انسانی میں

امیر و غریب اور طاقتور و کمزور طبقات کو پیدا کرتا ہے تو خود قدرت اس الزام سے بالکل بری الذمہ اور غیر ملوث رہتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو عذاب و ثواب غالبؔ کے نقطہ نگاہ کی طرح بے معنی چیز ہو کر رہ جائے۔ پس اس شرح و تفصیل سے یہ ثابت ہوا۔ کہ ہماری غربت و امارت یا غلبہ و مغلوبیت خدا کی طرف سے ہم پر مسلط کردہ نہیں بلکہ یہ خود ہمارے اپنے تصرفات فعلی ہیں۔

اب جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ عوام الناس کے لئے یہ افسوں بے حد خواب آور تھا۔ وہ اسی اثر کے ماتحت مدتوں اپنے آقاؤں اور خداوندوں کی غلامی و عبدیت کا جوا پہنے رہے۔ پھر جب ملوکیت کا دور آیا۔ تو ان کے اسی ذہنی خمیر سے بادشاہوں کے لئے "ظل اللہی" کی عمارت اٹھا کھڑی کی گئی۔ اور عوام کو ایک بڑے بت کے آگے سربسجود ہونے کو کہا گیا۔

عوام کی بے بسی کا یہ منظر واقعی دیدۂ عبرت کے لئے خونچکاں تھا۔ مگر اسی پر بس نہیں ہوئی۔ بلکہ "ملوکیت میں وراثت" کے مسئلہ نے ان کی ذہنیت فرسودہ پر اور بھی ستم ڈھائے۔ ان کی بے بسی اب انتہائے کمال پر پہونچ چکی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک ایسے گرداب ہلاکت میں پھنس چکے ہیں جس سے صرف موت ہی انہیں نجات دلا سکیگی۔

اب وہ "تن بہ تقدیر" ہو بیٹھے تھے۔ اور ایک سکتہ اور تعطل کے عالم میں اپنی ناکارہ زیست کے دن پورے کر رہے تھے۔ عزم و ارادہ کی جملہ قوتیں ان میں سلب ہو چکی تھیں۔ فرق و امتیاز کرنے کی بینائی ان سے جاتی رہی تھی۔ اور اب جو کچھ ان سے عمل و حرکت میں آرہا تھا۔ وہ وہی کچھ ہوتا تھا۔ جو ان کے خداوندان زمینی چاہا کرتے تھے۔

عجیب نکتہ ہے۔ کہ انسان کی ذہنی و عملی بے چارگی اس کو تقلید کا خوگر بنا دیتی

ہے۔ اور وہ وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے۔ جسے وہ دوسروں کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ سو یہی حال افغانستان کے باشندوں کا بھی تھا۔ وہ اپنے آقاؤں کے ظلم وستم سہتے سہتے خود بھی جابر و ظالم بن گئے ہوئے تھے۔ اور جہاں کہیں انہیں خود ظلم وجور کی خوآزمانے کا موقع ملتا تھا۔ وہ ایک لحظہ بھی توقف نہ کرتے تھے۔ وہ اس مشق آرائی کو اوّل اوّل اپنے آقاؤں کے مجرمین اور معتوبین کو سزا دیتے وقت سیکھتے تھے۔ اور پھر اس طرح جب ان کے کلیجے سخت پتھر کے سے ہو جاتے تھے۔ تو وہ خود ایسے موقعے پیدا کرنے کے متجسس ہو رہتے تھے۔ اور ذرا ذرا سی بات کا پہاڑ بنا کر لوگوں کی عقوبت واذیت وہی کا باعث بنتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی عام لوگوں میں بھی اسی مشق ستم رانی کی وبا پھیل چکی تھی۔ اور جہاں کھلی بربریت سے کام نہ چلتا تھا۔ وہاں جھوٹ فریب اور حیلہ کاریوں سے اپنا مطلب سیدھا کیا جاتا تھا۔ یوں سمجھ لیجئے۔ کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو اور چھوٹی اپنے سے چھوٹیوں اور وہ ان سے چھوٹیوں کو "بلع" کرنے میں مصروف تھیں۔

مگر اس روش نے افغانوں میں فیاض صفتی اور حاکمانہ عصبیت کے دو خاص جوہر پیدا کر رکھے تھے۔ جو اگرچہ بنظر اول آج بھی کسی قوم کے لئے مایۂ امتیاز وافتخار شمار ہونگے۔ تاہم اگر بغور دیکھا جائے۔ تو یہ اپنے دور رس نتائج میں افغانستان کے لئے تمدنی، اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر زبوں اور مہلک ہی ثابت ہوا کئے۔

یہ ہم پہلے کہیں بالتفصیل بیان کر ہی چکے ہیں۔ کہ خوانین وحکام اپنی شرافت نسبی اور رتبہ کی بزرگی کے ثبوت میں طرح طرح کے فیاضانہ کام کرنے پر مجبور تھے لیکن جو کچھ بھی ہو۔ ان کی شرافت نسبی یا عالی مرتبگی اس صفت کی تخلیق کا سبب اوّلین نہ تھی۔ بلکہ خود اس شرافت نسبی یا عالی مرتبگی کا حصول اس صفت کے ان میں موجود

ہونے کا اصلی باعث تھا۔ دولت ان کو آسمانوں سے نہیں برسی تھی۔ بلکہ براہ راست ان کے یا ان کے آباؤ اجداد کے ستم و جور کا نتیجہ تھی۔ اب جو اشخاص ان کے اس جور و ستم کے برتنے کے لئے آلۂ کار بنائے جاتے تھے۔ ان کو اپنے ساتھ متحد العمل رکھنے کے لئے یہ ان پر لازم آتا تھا۔ کہ وہ وقتاً فوقتاً داد و دہش سے ان کو اپنے ساتھ ملائے رکھیں۔ علےٰ ہٰذالقیاس۔ یہ ان سے فیض یاب ہونے والا گروہ بھی اپنے حلقۂ اقتدار میں اسی طرح کی روش اختیار کرتا تھا۔ اور اس طرح افغانوں کی تمام قوم اس صفتی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ مگر نتیجہ کیا تھا۔ لوگوں نے اپنی ذات کے ماسوا دوسروں پر بھروسہ کرنا سیکھ لیا ہوا تھا۔ وہ جس میں ذرا خون دیکھتے تھے کلان کار[۵] یا چاپلوس بن کر جھک جاتے تھے۔ اور اس طریق سے اپنی بسر اوقات کرنے کو ہرگز ننگ و عار نہ سمجھتے تھے۔ ان کے اعمال کی جملہ سرعتیں یا تو لوگوں کے زد و کند (مار دھاڑ) کرنے میں مشغول تھیں۔ اور یا پھر کاہلی اور سست الوجودی کی نذر ہو جاتی تھیں۔ ذرائع معیشت کو ڈھونڈنے اور ان کی وساطت سے اپنی روزی پیدا کرنے کا خیال انہیں کبھی آیا ہی نہ تھا۔ وہ صرف ان لوگوں کا حصہ تھا۔ جو خود ان کے تختۂ مشق بنے رہتے تھے۔ اس طرح "فیاضی" جو کہ ایک اعلےٰ درجہ کی صفت تھی۔ عمل گاہ دنیا میں ان کے اعضاء و جود کے تعطل کا سبب بن چکی تھی۔ اور بیکاری نے اپنے تمام مذموم خصائص کے ساتھ اس مفلسی کو ملک میں عام کر رکھا تھا جو ہمارے چوتھے باب کا موضوع خاص رہا ہے۔

لہٰذا ظلم و تشدد برتنے سے ان میں حاکمیت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہوا تھا۔ اور جب کبھی معمولی حالات میں وہ اس جذبہ سے کام لینے سے رک جاتے تھے۔ تو وہ قبیلہ قبیلہ میں سازشوں کا ایک طوفان برپا کر دیتے تھے۔ اور ادھر ادھر شرارتیں کر کے

---

[۵] کلاں کار خواہ مخواہ کا پنچ بن جانے کو کہتے ہیں۔

خانہ جنگیوں کی آگ کو مشتعل کرتے رہتے تھے ظلم و ستم کے اس پیہم سلسلہ نے جہاں ان میں صبر و مقاومت کی خاصیتیں پیدا کر دی ہوئی تھیں۔ وہاں ان آئے دن کی خانہ جنگیوں نے انہیں جنگجو لڑائی کا شائق، بہادر اور نڈر بھی بنا رکھا تھا۔ اس سے کم از کم ایک عظیم الشان فائدہ تو ضرور مرتب ہو کر رہا۔ کہ خواہ داخل ملک میں ان کا کتنا ہی برا حال کیوں نہ تھا۔ انہوں نے بحیثیت ایک قوم مغلوب ہونے پر بھی کبھی کسی خارجی سلطنت کی اطاعت کو قبول نہ کیا۔ اور جب کبھی ایسا وقت آیا۔ انہوں نے اس وقت تک ملک میں امن قائم نہ ہونے دیا جس وقت تک کہ خارجی عنصر ملک سے باہر نہ ہو گیا۔ تاہم داخل میں یہ خانہ جنگیاں ان کی سوشل اور معیشتی حالت پر آسمان توڑ رہی تھیں سب سے بڑی زبون کیفی تو یہ تھی۔ کہ ان خانہ جنگیوں کے شور ہائے و ہو میں انہیں ترقیات کی وہ شاہراہیں سوجھنے سے رہ گئی تھیں۔ جن کا اس سے برعکس صورت میں دکھائی پڑ جانا عین یقینی تھا۔ البتہ جیسا کہ پہلے بھی کسی جگہ کہا جا چکا ہے۔ ان کو ان خانہ جنگیوں سے ایک امداد ضرور ملتی رہتی تھی۔ اور وہ یہ کہ ایک قبیلہ کی شکست و فنا دوسرے قبیلہ کی زیست و بقا کا تھوڑے دنوں تک کے لئے باعث بن جاتی تھی۔ اور مفلسی کا وہ شدید دباؤ جو کسی حیات آفرین انقلاب کا سبب بن سکتا۔ ساری کی ساری قوم پر نہ پڑتا تھا۔ اور وہ امن کے چند وقفے جو ایسی امداد کے مل جانے پر ملک کو میسر آجاتے تھے۔ عوام کی ذہنی ترقیات کی راہ میں فریب جلوہ کا کام دیتے تھے۔ لوگ خیال کرنے لگ جاتے تھے۔ کہ جو کچھ اپنے اعمال کی دنیا میں انہیں نظر آ رہا ہے۔ بس وہی ان کی حدِ نگاہ ہے*
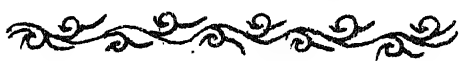
انقلاب کا دور

انقلاب کے دور کے واقعات اور سانحات بیان کرنے سے پہلے ہم نے گذشتہ چھ بابوں میں اپنے قارئین کی معلومات کے لئے کافی ذخیرہ فراہم و موجود کر دیا ہے۔ اور ہم قارئین سے التجا کرتے ہیں۔ کہ وہ اسباب کے شروع کرنے سے پہلے گذشتہ ابواب کے سلسلہ معلومات کو اپنے پیش نظر رکھیں۔ ان کی توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے ہم نے یہاں تجویز کیا ہے۔ کہ گذشتہ ابواب کی مختصر یاد ان کو کرادی جائے۔ تاکہ حظوظ اور لذاتِ دماغی کی کیفیات سے وہ کسی طرح محروم نہ رہیں۔ جو بہ سلسلۂ سابق مابعد کے انکشافِ حالات سے انہیں میسر و نصیب ہونگی۔

پہلے باب میں ہم نے غازی امان اللہ خان کے عزم سیاحت یوروپ کے سلسلہ میں افغانستان کی سیاسی پارٹیوں کا مکمل نقشہ اپنے قارئین کے پیش نظر کر دیا ہے اور دوسرے باب میں یوروپ سے غازی امان اللہ خان کی واپسی کے تحت میں ہم نے اس کے عزم و ارادۂ اصلاحات اور ملک کی سیاسی پارٹیوں پر اس کے اثرات، دباؤ اور ردعمل کو واضح کیا ہے۔ تیسرا باب ملک کی اقتصادی ترقی کا ایک منظر قارئین

کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور چوتھے باب میں ہم نے ملک کی عام مفلسی اور اس کے مضر اثرات پر بحث کی ہے۔ جو غازی امان اللہ خان کے عہد کے آغاز و دوران میں موجود تھی۔ تاکہ قارئین کرام غازی امان اللہ خان کی ان مشکلات کا پوری طرح سے اندازہ لگا سکیں۔ جو ملک کی اصلاحات و ترقی کی راہ میں اس کی خواہش کے بالمقابل حائل تھیں۔ اسی ضمن میں مفلسی کے اسباب و عناصر کی تلاش کرتے ہوئے ہم نے بقدر ضرورت امیر عبدالرحمن خان اور حبیب اللہ خان کے عہود پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس طرح سے ہم نے عناصر کی ان قوتوں کے عمل و شدت اور ان کے اثرات و نتائج کو عام ملت کے اعمال و جوارح پر منعکس ہوتے دیکھا ہے۔ اور غازی امان اللہ خان کی اصلاحات کی پالیسی کی خامیوں اور کوتاہیوں کے متعلق قارئین کو اپنی آزاد رائے قائم کرنے کے قابل بنانے کی سعی و کوشش کی ہے۔ پانچویں باب میں ہم نے اپنے ناچیز خیالات "نجات کی راہ کونسی تھی" کے عنوان کے ماتحت پیش کئے ہیں۔ چھٹے باب میں ہم نے ملک کی عام زندگی کو ملت کی ذہنیت اجتماعی کی شکل میں دیکھنا چاہا ہے۔ ایسا کرنے سے ہمارا مطلب یہ تھا۔ کہ قارئین انقلاب کی مختلف منزلوں میں ملک کی اس ذہنیت کو اپنے لئے میل راہ بنا سکیں ÷

ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس لائحہ پر عمل کرتے ہوئے ہمیں کہاں تک قارئین کی طبعی خواہش معلومات کو پورا کرنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ مگر ہم اس کو قارئین کی کرم گستری اور فیاض نگاہی پر چھوڑتے ہوئے میدان انقلاب کی طرف ان کی رہبری کرتے ہیں ÷

قارئین دوسرے باب میں پڑھ آئے ہیں۔ کہ شاہ غازی کی واپسی یورپ پر ملکی سیاسیات کا نقشہ نو کیا تھا۔ اور کس طرح بعض غلط سیاسی تدابیر نے

بادشاہ کی وضعیت (پوزیشن) کو نازک کر رکھا تھا۔ ان کی پغمان والی مشہور تقریر جس میں انہوں نے افغانی لڑکیوں کو تعلیم کی غرض سے مغربی ممالک میں روانہ کرنے اور صرف ایک ہی نکاحی بیوی کے رکھنے کے متعلق حکومت کی پالیسی کا اظہار کیا تھا۔ ابھی تک کانوں میں گونج پیدا کر رہی تھی۔ وزراء جو حکومت کے دست و پا تھے۔ اپنی اپنی جگہ الگ ناک بھوں سکیڑ رہے تھے۔ اور اپنے اپنے اثر و اقتدار کے لئے وکلاء ملت سے سازشیں کر رہے تھے لوئے جرگہ کا اختتام ہو چکا تھا۔ اور وکلاء حکومت کی ملی سیاست کا ایک برا اثر لے کر اپنے گھروں کی طرف رخصت ہو چکے تھے۔ جو کچھ انہوں نے پایہ تخت میں اپنی آنکھوں دیکھا۔ اور اپنے کانوں سنا تھا۔ اسے وہ دور دور ملت کے منتشر اور بکھرے ہوئے قبائل تک پہونچا رہے تھے۔ جن کو سن کر یہ علم سے ناآشنا قبیلے اپنی حکومت کی لامذہبیت پر سخت چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ اور اپنے وکلاء سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کے چلے آنے کے بعد جو کچھ کابل میں گذر رہا ہے۔ اور جو نئے احکام وغیرہ وہاں نکل رہے ہیں۔ ان سے انہیں باخبر رکھا جائے۔ خود وکلائے ملت بھی ایک فطرتی اشتیاق کے ساتھ نئے وقائع سننے کے آرزومند تھے۔ اور ان میں سے بہت سے چونکہ مختلف وزراء کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر آئے تھے۔ اس لئے ان کے اس فطرتی اشتیاق کی جولانیاں اور بھی زوروں پر تھیں۔ وہ خود آپ اور ان کے واسطے سے تقریباً ملت کا ایک بڑا حصہ ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔ ادھر پایہ تخت میں نت نیا اصلاحی حکم جاری ہو رہا تھا۔ جس سے حکومت کے برخلاف ناراضگی اور بھی بڑھ رہی تھی۔ حکومت سے ناراضگی اور دل کندگی کی یہ لہریں صرف مرکزی حدود تک ہی مقید نہ رہتی تھیں۔ بلکہ نئے حکم کے جاری ہوتے ہی

صاحب غرض افسرانِ حکومت کی وساطت سے ٹیلیفون کے ذریعہ سے سارے ملک میں دوڑ جاتی تھیں۔ غرضکہ ملّت کا ایک خاصہ گر مشتاق حصہ اپنے گوش برآواز ہونے کی صدائے بازگشت ہر چوبیس گھنٹوں کے بعد سن لیتا تھا۔ حتےٰ کہ وہ مقررہ دن آن پہونچا۔ جو سلطنت امانیہ کی تخریب کلی کا بنیادی دن تھا۔ اسدن منتخب شدہ افغان نوجوان دوشیزہ لڑکیوں نے یوروپ کو بغرض حصول تعلیم روانہ ہونا تھا۔ ان میں سے بعض کے والدین نے برضا و رغبت یا بادشاہ کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے کے لئے ان کا بھیجا جانا قبول و منظور کر لیا تھا۔ مگر اکثر کے والدین قطعیاً راضی نہ تھے۔ بلکہ جبر بادشاہی کے ماتحت دم بخود اور چین بجبیں تھے۔ وہ کھلی مخالفت تو نہ کر سکتے تھے۔ مگر لڑکیوں کا یوروپ کے ملک میں بھیجا جانا ان کی غیرت افغانی پر گویا بجلی گرا دینا تھا۔ لڑکیوں کے وداع کی خدمت وزارت خارجہ کے سپرد کی گئی تھی۔ اور وہیں سے لڑکیوں نے موٹروں پر سوار ہو کر سمت مشرقی کی راہ سے ہندوستان کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ ان کے بھیجے جانے کا پروگرام پہلے سے مرتب تھا۔ اور لوگوں کو یا کم از کم ان کو جن کے گھروں سے ان کی اولاد نے جانا تھا۔ بہت پہلے سے اس کا علم تھا چنانچہ ناراض والدین اور ان کے قوم و رشتہ داروں کا طائفہ ملک کے قدامت پسندوں کی ست پا کر ایک گہری سازش طے کر چکا تھا۔ مگر اس سازش کا واحد مقصد یہی تھا۔ کہ کسی طرح لڑکیوں کو یوروپ جانے سے روک دیا جائے۔ اور حکومت پر ملّت کی عام ناراضگی کا عملاً اظہار کیا جائے۔ اس کام کے لئے انہوں نے افغانستان کے مشرقی سرے والی قوم کے چند دلیر افراد سے بات چیت طے کر رکھی تھی۔ یہ قوم شنواریوں کی تھی۔ جو ڈکہ اور جلال آباد کے درمیانی علاقہ میں بود و باش کرتی تھی۔ تجویز یہ تھی۔ کہ لڑکیوں کا قافلہ جونہی کابل سے روانہ ہو انہیں فی الفور خبر کر دی جائے۔ ان کا کام یہ ہو گا۔ کہ وہ ڈکہ اور جلال آباد والی سڑک پر فوراً

مسلح ہو کر انتظار میں بیٹھ جائیں گے۔ اور جونہی کہ موٹریں پہونچیں گی۔ انہیں زبردستی روک لیں گے۔ اور پھر حکومت کو کھلے طور پر کہہ دیں گے۔ کہ وہ اس بے غیرتی کے ہرگز متحمل نہ ہوں گے ÷

مجھے انقلاب کے دوران میں بعض معتبر اور صاحب رتبہ افراد سے اوپر کے بیان کی تصدیق ہو گئی تھی۔ لیکن میرے دوستوں میں سے چند ایسے بھی تھے۔ جو کسی باقاعدہ اور منظم سازش کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کا بیان تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان کی یہ پالیسی کہ وہ وزرا اور وکلائے ملت کو ایک دوسرے کے برخلاف استعمال کریں لوئے جرگہ کے دوران ہی میں ناکام ہو چکی تھی۔ گو اس ناکامی کا علم بادشاہ کو نہ تھا۔ اور وزرا اور وکلا کے درمیان اپنی اپنی پارٹیاں بھی بن چکی تھیں۔ تاکہ بادشاہ کی پالیسی کو مزید شکست ہوتی رہے۔ تاہم وزرا اور وکلا کی ان مخلوط پارٹیوں میں سے کسی نے بھی ایسی سازش نہ کی تھی۔ بلکہ شنواریوں میں یہ خیال مذہبی لوگوں کی چہ میگوئیوں نے پیدا کر دیا تھا۔ میرا خود بھی یہ خیال ہے۔ کہ وزرا اور وکلا کی کسی مخلوط جماعت نے یہ سازش نہیں کی۔ لیکن یہ کہ سازش کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اس کو میں تسلیم کرنے سے معذور ہوں۔ گو یہ ظاہر ہے۔ کہ سازش کرنے والے گروہ کا یہ ہرگز منشا نہ تھا۔ کہ وہ ایک ایسی بغاوت کو فروغ دیں جس کی آگ حکومت کے جسم ہی کو بھسم کر دے۔ ان کا تو صرف اسی قدر مقصد تھا۔ کہ وہ لڑکیوں کو یوروپ جانے سے رکوا دیں۔ اور حکومت پر ملت کی ناراضگی کو ظاہر کر دیں۔ تاکہ حکومت اس قسم کے اقدامات سے محترز رہے۔ وہ یہ تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔ کہ جو شورو شر اس سازش کے کامیاب ہو جانے کی صورت میں پیدا ہو گا۔ وہ اتنی نزاکت بھی اختیار کر جائے گا۔ جس کے مقابلہ میں حکومت تاب مقاومت نہ لا سکے گی ÷

غرض اصلیت جو کچھ بھی ہو شنواریوں کا ایک [illegible] جلال آباد اور ڈکہ کی

سڑک پر موٹروں کو روکنے کے لئے موجود تھا۔ مگر یہ افغانستان کی انتہائی بدبختی تھی۔ کہ یہ طائفہ اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لڑکیوں کے کابل سے روانہ ہونے کی اطلاع انہیں بروقت مل گئی تھی۔ مگر چونکہ سڑک سے وہ دور آبادیوں میں منتشر تھے اس لئے انہیں آپس میں اکٹھا ہونے میں کافی وقت لگتا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ موٹروں کے جلال آباد اور ڈکہ کی درمیانی سڑک پر سے گذرنے کے وقت کا تخمینہ لگانے میں بھی ان سے غلطی ہو گئی تھی۔ (انہوں نے اس وقت کا تخمینہ موٹر لاریوں کی رفتار کے مطابق لگایا تھا۔ حالانکہ لڑکیاں سریع الرفتار موٹروں میں جا رہی تھیں)۔ اس طرح جب وہ جائے مقررہ پر پہونچے۔ تو ان کو کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا۔ کہ موٹریں ان کے آنے سے چند گھنٹے پہلے گذر چکی ہیں۔ وہ گھر سے ایک راسخ عزم کر کے نکلے تھے۔ مگر ان کو ایک دلشکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا جس کی تاب نہ لا کر وہ حکومت کے برخلاف غیظ و غضب سے بھر گئے۔ اب وہ اپنے گھروں کی طرف خوفناک منصوبوں کو دل میں جگہ دیئے ہوئے رخصت ہو رہے تھے۔ اب ان کی غیرتِ افغانی اشتعال کے انتہائی درجہ پر پہونچ چکی تھی۔ اور اب وہ حکومت کی تخریب کے سلسلہ میں جو کچھ نہ بھی کر گذریں تھوڑا تھا۔

میں نے شنواریوں کے اس طائفہ کی ناکامیابی کو افغانستان کی انتہائی بدبختی سے منسوب کیا ہے۔ اے کاش وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتے۔ تو افغانستان پر ادبار کی آنے والی گھٹائیں کچھ اور مدت کے لئے رک جاتیں۔ اور شاید اس درمیانی وقفہ میں حکومت افغانستان کو اپنی سرگرمیوں کا از سر نو جائزہ لینے کا موقع مل جاتا اور شاید وہ صحیح راہ اختیار کر لیتی۔

میرا خیال ہے کہ اگر وہ لڑکیوں کو روکنے میں کامیاب ہو جاتے۔ تو اس کامیابی کی خوشی سے ان کے دل کا بخار کسی قدر ہلکا ہو جاتا۔ اور ان کے خیالات کا رخ

بالکل بدل جاتا۔ اب وہ متعارضین (حملہ آور) کی حیثیت نہ اختیار کر سکتے۔ بلکہ حکومت کے بالمقابل ان کی حیثیت مدافعین کی ہو جاتی۔ اور حکومت بھی اس وقت تک ان کے برخلاف کوئی سخت اقدامات نہ کر سکتی۔ جب تک لڑکیوں کا گروہ ان کے قبضے سے نہ نکل چکتا ادھر لڑکیوں کے والدین کا جن میں اکثر حکومت کے ارکان و منصبدار تھے دباؤ بھی حکومت پر پڑتا اور سارا معاملہ بات چیت شروع کرنے پر آ ٹھہرتا۔ اور آپس میں دونوں فریقوں کو آزادی سے اپنے اپنے دلوں کے بخار نکالنے کا موقع مل جاتا۔

مگر مقدرات ایسے نہ تھے ناکام طائفہ نے شنواریوں کی آبادیوں میں جا کر ایک کہرام برپا کر دیا۔ اور ملّا نے اس گروہ کے جوش و خروش کو دیکھ کر خود بھی علی الاعلان بادشاہ کے برخلاف جہاد کا اعلان کرنے لگ گئے۔ خوانین بھی ان کے ساتھ کچھ پہلے ہی سے تھے۔ اور کچھ غیرت قومی کے سبب سے اب ساتھ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہ لہر فوجیوں تک بھی جا پہونچی شنوار کی سرحد پر جو چھاؤنی تھی۔ اس میں ایک پلٹن شنوار قوم کی رہتی تھی۔ پہلا نشانہ اسی چھاؤنی کو تاکا گیا۔ فوج بلوائیوں کے ساتھ مل گئی۔ چھاؤنی لوٹ لی گئی۔ اور باقاعدہ علم بغاوت بلند کر دیا گیا۔

چھاؤنی کے لوٹے جانے اور بغاوت شنوار کی خبریں جب کابل پہونچیں۔ تو چند دن انہیں عوام سے پوشیدہ رکھا گیا۔ مگر آخر کب تک۔ دوسرے ہی دن کابل کے ہر کہ و مہ کی زبان پر شنواریوں کی بغاوت کے چرچے تھے۔ لوگوں کی طبیعتیں اپنے مآل کار سے بے خبر اس واقعہ کو سنکر مسرور تھیں۔ اس لئے کہ اصلاحات کا سارا دباؤ پہلے انہی مرکزی لوگوں پر پڑ رہا تھا۔ اور ان کے اپنے نقطۂ خیال کے مطابق سب سے پہلے انہی کے دین کو بگاڑا جا رہا تھا۔

حکومت کو جب یہ خبریں ملنی شروع ہوئیں۔ کہ شنواری آس پاس کی حکومتی جگہوں پر حملے کر رہے ہیں۔ اور ان کو اپنے قبضہ میں لیتے جا رہے ہیں۔ حتےٰ کہ کابل کا رستہ

بھی مسدود کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں ان کی نیت جلال آباد کی طرف بڑھنے کی ہے۔ تو حکومت کو ضروری معلوم ہوا۔ کہ وہ امدادی فوج بھیجنے کے علاوہ کسی اعلےٰ اور سمجھدار افسر کو متعین کر کے بھیجے۔ تاکہ وہ شنواریوں کو سمجھا بجھا کر ان کے ارادوں سے انہیں باز رکھ سکے۔

معاملہ جب جنگ و جدل پر آ چکا تھا۔ تو ایسی حالت میں کسی افسر کا انتخاب حکومت کے نزدیک نہایت ہی اہم مرحلہ تھا۔ کیونکہ اگر حکومت اس اہم مسئلہ میں ذرا سی بھی غلطی کر بیٹھتی۔ تو اسے یقیناً دور رس نتائج سے دوچار ہونا پڑتا۔ مگر بدقسمتی سے کسی صحیح انتخاب کے لئے جو ماحول ضروری تھا۔ وہ اس وقت موجود نہ تھا۔ بادشاہ کو وزراء کے بالمقابل صدارت عظمےٰ کے عہدہ کے قیام کے سلسلہ میں ناکامی ہو چکی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ اپنے وزراء سے دل میں سخت ناراض تھا۔ اور قدرتی طور پر وہ کسی ایسے موقع کا منتظر تھا جس سے وہ اپنے انتخاب کی صحت کا نقش برقرار کر سکے۔ اور اگرچہ وہ اس قسم کا موقع نہیں ڈھونڈتا تھا۔ جیسا کہ بغاوتِ شنوار نے اس کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ تاہم اب جبکہ ایسا موقع آ ہی گیا تھا۔ تو وہ اسی کو اپنی انتخابی قابلیت کی کسوٹی بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے آقائے شیر احمد خان (ناکام صدرِ اعظم) کو اس کام کے لئے منتخب کر کے جلال آباد کی طرف روانہ کر دیا۔

آہ! یہ انتخاب غلط تھا۔ اس وجہ سے نہیں۔ کہ مجھے آقائے شیر احمد خان کی قابلیت میں کوئی شک تھا۔ بلکہ میں کہتا ہوں۔ کہ ماحول اس کا سازگار نہ تھا۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح تھی۔ کہ وزراء آقائے شیر احمد خان کو بالکل نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ہر وقت اس کے گرانے کے درپے رہتے تھے۔ اس ضمن میں بغاوت منگل کا تلخ تجربہ بھی حکومت کے سامنے تھا۔ کہ ان ایام میں کس طرح ایک کاردار[1] دوسرے کاردار کے کاموں پر

---

[1] کاردار۔ کام رکھنے والا منصبدار۔

صرف اس لئے پانی پھیر دیتا تھا۔ کہ کسی طرح وہ بادشاہ کی نظروں میں اپنے آپ کو یہ ثابت کر سکے۔ کہ فلاں مہم اسی کے وجود سے سر ہو سکی ہے۔ قطع نظر اس ایک امر کے حکومت کو اس بات کا بھی کافی تجربہ ہو چکا ہوا تھا۔ کہ اگلی بغاوت منگل محض اسی وجہ سے دفعتہً ایک نہایت ہی یقینی خطرہ بن گئی تھی۔ کہ اس کی بنیاد مذہب کی مدافعت پر اٹھائی گئی تھی۔ اور شنواریوں نے بھی حکومت کے برخلاف یہی حربہ اختیار کرنا چاہا تھا۔ لہذا گذشتہ تجربہ اور تازہ اصلاحات کے اثر مخالف کی موجودگی اور روشنی میں حکومت کو اندازہ کر لینا چاہئے تھا۔ کہ یہ بغاوت بھی بغاوت منگل کی طرح وخیم اور اپنی حدود وسعت میں کہیں زیادہ ہوگی۔ مگر حکومت کے غرور طاقت[۵] نے شروع میں اس بغاوت کو چنداں اہمیت حاصل نہ ہونے دی۔ بلکہ اسے بہت ہی جلد دب جانے والی سمجھ کر اس کی کامیابی کا سہرا ایک ایسے شخص کے سر باندھنے کی جویا ہوئی جس کو وہ دوسرے سب کارداروں سے ممتاز و سرفراز دیکھنا چاہتی تھی اب تک جو سد آقائے شیر احمد خان کے امتیاز پانے کی راہ میں حائل تھی۔ وہ یہی تھی۔ کہ تاہنوز اس کے ہاتھوں کوئی کارنمایاں سرزد نہیں ہوا تھا۔ اور اس لئے اس کو ان لوگوں پر فوقیت پانے کا کوئی حق نہیں رہ جاتا تھا۔ جنہوں نے حکومت کی عظیم الشان خدمتیں کی ہوئی تھیں۔ پس بادشاہ چاہتا تھا۔ کہ وہ اسے اس مہم پر بھیجکر اس کو ترقی دینے کا راستہ صاف کرے۔

جو پالیسی اس نوازش کی تہ میں کام کر رہی تھی۔ آقائے شیر احمد خان بھی اسے بخوبی جانتا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش یہی ہو سکتی تھی۔ کہ وہ اس مہم کو بکمال و خوبی انجام تک پہونچائے۔ قارئین یہ نہایت ہی باریک اور اہم نکتہ اپنے ذہن میں رکھیں کہ اس کی عملیات و سرگرمیوں کی تہ میں یہی جیتنہ تحریک اپنی غیر معمولی حدت کے ساتھ

---

۵ حکومت کی طاقت یقیناً پہلے کی نسبت بہت بڑھ چڑھ کر تھی؟

اُبل رہا تھا۔ اور یہی اس کی ناکامی کا باعث بھی ہوا۔ مجھے اس امر کا ذاتی تجربہ ہے۔ کہ جب کوئی کام غیر معمولی اشتیاق کے ساتھ کیا جائے۔ اگر اس کے انجام کار کی تہ میں نفسانیت یا ذاتیات کو دخل ہو۔ تو انسان اس کام کے اجراء کے دوران میں اپنی دماغی قابلیتوں سے اچھی طرح کام نہیں لے سکتا۔ اور چونکہ اس کے پیش نظر عجلت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے اشتیاق کی آگ کو جلد فرو کر سکے۔ اس لئے وہ غیر معمولی طریقوں کو سوچتا اور عاید کرتا ہے۔ اور آخر میں ناکامی سے دوچار ہوتا ہے۔ آقائے شیر احمد خان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اس کو شنواریوں سے گفت وشنید اور معاملہ کرتے ہوئے یہی ضروری معلوم ہوا۔ کہ حکیمانہ اور عاقلانہ انداز کے بجائے دھمکیوں اور زور و طاقت کی نمائش سے شنواریوں کو مرعوب کرے۔ اور جلد اس آتش فساد کا فیصلہ کر دے۔ مگر اسے یہ سوچنے میں سخت غلطی ہوئی۔ کہ اگر ان پر حکومت کے زور و طاقت کی ہیبت چھائی ہوئی ہوتی تو وہ باغیانہ اقدامات ہی کیوں کرتے۔ انہیں بغاوت منگل کا جو آج سے صرف تین چار سال پہلے ہو چکی تھی۔ علم تھا۔ کہ حکومت نے کس طرح اسے کچل کر رکھ دیا تھا۔ مگر باوجود اس حقیقت کے جبکہ وہ ایک آگ سے کھیلنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ تو آخر ان کی اس خودسری کی تہ میں کوئی تو ایسی زبردست تحریک ہو گی۔ جو انہیں حکومت کے خوف و ہیبت کی پرکاہ جتنی پرواہ بھی نہیں کرنے دیتی۔

یہ بھی نہیں کہ آقائے شیر احمد خان اس تحریک کی بنیاد سے بے خبر تھا۔ ملک میں حکومت کی مجوزہ اصلاحات کے برخلاف ایک عام ناراضگی پھیل چکی ہوئی تھی اور لوگ حکومت پر لامذہبیت و الحاد کے الزامات لگا رہے تھے۔ گویا وہ حکومت کے برخلاف ایک مدت سے بھرے بیٹھے تھے۔ اور کوئی معقول بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ جس سے وہ افغانی قوم کی غیرت کو حکومت کے برخلاف بآسانی اکسا سکیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں شیر احمد خان پر ملک و حکومت کی طرف سے ایک بڑی بھاری

ذمہ داری عاید تھی۔ اور اب جبکہ وہ سمت مشرقی کے رئیس تنظیمہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اسے گفت و شنید میں کامل احتیاط برتنی چاہیئے تھی۔ کہ وہ اپنی طرف سے مشتعل لوگوں کو کہیں اور زیادہ بھڑکا نہ دے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ ایک طرف مذہبی جنوں کارفرما ہے۔ اور دوسری طرف حکومت کی وضعیت بوجہ موجودہ اصلاحات کے ملّت کی نگاہوں میں سبک ہو چکی ہے۔ وہ ملت کے سامنے ایک ملزم کی حیثیت میں کھڑی ہے۔ اور ملت کا ایک حصّہ اس کو مجرم سمجھ کر سزا دینے کے لئے آمادہ ہو چکا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس ساری واقعیت (Situation) کی نزاکت کو ملحوظ رکھ کر مصلحانہ سیاست سے کام لیتا۔ اور ایسی تدابیر اختیار کرتا جس سے باغی گروہ اور عام ملت کا غم و غصّہ کم ہونا شروع ہو جاتا۔ اس نے شنواریوں کو دھمکانا شروع کر دیا۔ اور صبر و تحمل کو ہاتھ سے دیتے ہوئے ان کے نمائندوں کی ایک مجلس میں یہاں تک کہہ دیا۔ کہ امیر عبدالرحمٰن نے تو صرف تمہارے سروں کے مینار ہی بنائے تھے۔ مگر میں تمہاری خاک تک کو شنوار میں نہیں رہنے دونگا۔ اسے بھی بوریوں میں بھر کر کابل لے جاؤں گا۔

سنا گیا ہے۔ کہ شنواریوں کے یہ نمائندے جو حکومت اور اپنی قوم کے درمیان صلح کروا دینا چاہتے تھے۔ اس کے بعد پھر واپس نہیں آئے۔ بلکہ یہ خود بھی جا کر باغیوں سے مل گئے۔ اور اب شنواریوں کی پوری قوم حکومت کی مخالفت پر کمربستہ تھی۔

میر زمان کنڑی جس کے نام سے قارئین پہلے واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان دنوں میں کابل میں بطور شاہی نظر بند کے مقیم تھا۔ مگر اس کی نظر بندی صرف اتنی ہی تھی کہ وہ کابل کو چھوڑ کر اپنے علاقہ میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس کو یہاں فرقہ مشری[1] کا

---

[1] فرقہ مشر کو شاید انگریزی میں Divisional General کہتے ہیں یہ سپہ سالار سے رتبہ میں چھوٹا اور جرنیل سے بڑا ہوتا ہے Commanding Officer

عہدہ ملا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے اہل و عیال سمیت یہیں بود و باش بھی اختیار کر چکا تھا۔ اس کی وسیع جائداد جو اس کے اپنے علاقہ میں تھی۔ ضبط نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ وہ اپنے ناظم یا کے ذریعہ سے اس کا ادارہ و انتظام کیا کرتا تھا۔ اس کی نظربندی کے بہت سے وجوہ و اسباب تھے۔ وہ سخت ظالم و جفاکیش انسان تھا۔ اور اپنی رعیت یعنی مزارعین پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھایا کرتا تھا۔ سوائے اس کے اپنے کارپردازوں اور تنخواہ دار نوکروں کے (جو اس کے بندوق بردار بھی تھے)۔ اور کوئی اس کے ظلم و ستم کی دستبرد سے محفوظ نہ تھا۔ اپنے ہمسایہ خوانین پر بھی وہ طرح طرح کی مصیبتیں نازل کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی زمینیں بھی زبردستی چھین کر اپنی زمینوں میں شامل کر لیتا تھا +

بات دراصل یہ تھی۔ کہ اعلحضرت امان اللہ خان کی والدہ نے کسی وقت اس کو بیٹا کہا ہوا تھا۔ اور اس کی ترقی کی زیادہ تر وجہ بھی خود علیا حضرت کی ذات ہی تھی۔ وہ ہمیشہ بہت بڑی مقدار میں تحائف اس کی خدمت میں روانہ کیا کرتا تھا۔ وزیر دربار اور دیگر وزراء سے بھی اس کے تعلقات نہایت اچھے تھے۔ اور چونکہ اب وہ صاحب قوم و حیثیت اور حکومت کا طرفدار شمار ہوتا تھا۔ اس لئے کمال بے پرواہی سے بادشاہ کی رعیت پر ظلم روا رکھنے سے نہیں چوکتا تھا۔ مقامی حاکم ڈر کے مارے اس سے چون و چرا نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ ارد گرد کے علاقوں کے حاکموں کو مار پیٹ دینا اس کے لئے ایک معمولی بات بن گئی ہوئی تھی۔ صوبہ کے گورنر تک اس سے دبتے رہتے تھے۔ اور کسی نہ کسی طرح اس سے ساز باز کر لیتے تھے۔ وہ خود بھی ان سے اچھے تعلقات قائم کر لیتا تھا۔ اور پھر بیفکر ہو کر اپنے علاقہ اثر میں بلاخوف و دغدغہ جو چاہتا تھا۔ کرتا تھا +

بغاوتِ منگل میں اس نے بھی حکومت کی امداد کی تھی۔ اور یہ داخلی علاقہ کے چند ہزار مہمندوں کے قومی لشکر کے ساتھ سمت جنوبی کی مہم میں شریک ہوا تھا۔ اس شرکت نے حکومت کی اندرونی کَل کو اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کر کے رکھ دیا تھا۔

اور اس وقت سے یہ حکومت کو بہت ہی کمزور خیال کرنے لگ گیا تھا۔ غرضکہ جب یہ بغاوتِ منگل کے فرو ہو جانے پر اپنے لاؤ لشکر سمیت اپنے علاقہ میں واپس پہونچا ہے۔ تو اس کے تخیلات کی پرواز کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ اس کی سرگرمیاں اپنی حدود و وسعت میں اب اور بھی خود سرانہ ہو گئی تھیں۔ اب اس نے باقاعدہ اپنا طبل بھی بجوانا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے ملازم سپاہیوں سے پریڈ بھی لینے لگ گیا تھا۔ شاید اس کا ارادہ فیوڈل سسٹم کی سنّتِ مردہ کو پھر زندہ کرنے کا تھا۔

اس کی ان دراز دستیوں کو دیکھ کر مظلوم رعیت سے صبر نہ ہو سکا۔ اور وہ "ہرچہ بادا باد" کہہ کر اس کے برخلاف علمِ بغاوت لے کر کھڑی ہو گئی۔ حکومت کو جب اس کی خبر ملی۔ تو اس نے بریگیڈ احمد جان[۵] کو اس تنازعہ کے فیصلہ کرنے کیلئے بھیجا لیکن تنگ آئے ہوئے مظلوم انتقام کی آگ کو اپنے سینوں میں مشتعل کر چکے تھے۔ اس

[۵] بریگیڈ احمد جان پشاور کے علاقہ کا رہنے والا افغان تھا۔ اس نے مدت مدید سے کابل میں سکونت اختیار کی ہوئی تھی۔ اور وہاں اس نے کافی سے زیادہ دولت اور عزت حاصل کی تھی۔ اس کا عہدہ بریگیڈ کا تھا۔ اور جلال آباد میں اس کا اثر و رسوخ زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے ہمندوں کے اس قضیہ کو فیصلہ کرنے کے لیئے اسے بھیجا گیا تھا۔ اس کے تین فرزند تھے۔ ایک کا نام لطیف جان۔ منجھلے کا محفوظ جان اور چھوٹے کا سید احمد جان تھا انقلاب کے دوران میں لطیف جان تو پشاور آ گیا ہوا تھا۔ مگر اس کا منجھلا بیٹا محفوظ جان بچہ سقاؤ کے ساتھ مل گیا تھا۔ وہ بچہ سقاؤ کے حکم سے وزارتِ حربیہ کا ایک اعلےٰ عہدہ دار مقرر کیا گیا۔ اور اس نے نادری فوجوں کا آخر دم تک نہایت شدت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ بچہ سقاؤ کے ساتھ اسے بھی گولی مار دی گئی تھی۔

لئے اس کی ایک پیش نہ گئی۔ انہوں نے میر زمان خان کنڑی کے قلعہ کا مدتوں محاصرہ کئے رکھا۔ اور بالآخر اسے زنانہ بھیس بدل کر قلعہ سے بھاگنا پڑا۔ ایک اور بڑے عہدیدار کو کابل سے بھیجا گیا۔ جس نے جا کر بظاہر امن پیدا کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے میر زمان خان کے بُرے ارادوں سے واقفیت حاصل کر کے حکومت کو بروقت مطلع کر دیا۔ چنانچہ غازی امان اللہ خان کو اس خطرے کے سر سے ٹالنے کے لئے دو ایک مرتبہ خود جلال آباد جانا پڑا۔ مگر اس طرح کہ میر زمان خان کو بالکل معلوم نہ ہو سکا۔ کہ بادشاہ کی نیت اس کے متعلق کیا کچھ ہے۔ لہٰذا اس نے جب یہ سنا۔ کہ بادشاہ جلال آباد میں پہونچا ہے۔ تو وہ گورنر کی دعوت پر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اس سے نہایت نرمی اور رفق و ملائمت سے پیش آیا۔ چند دن تک بادشاہ نے اس کو اپنے ہمرکاب رہنے کا حکم دیا۔ جو ایک بہت بڑی عزت تھی۔ پھر جب بادشاہ کابل کی طرف واپس لوٹا۔ تو اس کو بھی اپنی ہمرکابی میں کابل لے آیا۔ یہاں پہونچکر بادشاہ نے اپنا عندیہ اس سے بیان کیا۔ اب وہ مجبور تھا۔ ناچار بادشاہ کی مرضی پر راضی ہو گیا۔

اس کے قبضہ سے نوسو انگریزی بندوقیں اور کئی لاکھ کارتوس برآمد ہوئے۔ جنہیں بادشاہ نے بعد میں اس سے لے لیا تھا۔ اس سے قارئین اس کی طاقت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

غرضیکہ جب شنوار کی بغاوت نے سر نکالا ہے۔ تو یہ کابل ہی میں تھا۔ اگر شیر احمد خان رئیس تنظیمہ جلال آباد اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا۔ تو حکومت کو غالباً میر زمان خان کنڑی کے بھیجنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ مگر آقائے شیر احمد خان اپنے پہلے ہی مرحلہ پر ناکام ہو چکا تھا۔ اور شنوار کی ساری قوم برسر جنگ ہو چکی تھی۔ اب حکومت کو جو نشۂ طاقت میں سرمست تھی۔ یہ مناسب معلوم ہوا۔ کہ میر زمان خان کو فوراً علاقہ کنڑ میں بھیجدیا جائے۔ جہاں جا کر یہ مہمندوں کا ایک لشکر فراہم کر کے شنوار کے قلب و قیام پر

حملہ کرے۔ اور اُسے جلد تتر بتر کردے۔ تاکہ سرکاری فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ جلال آباد کی طرف نہ بڑھ سکیں۔

آہ! حکومت کا یہ انتخاب بھی غلط تھا۔ اس لئے نہیں کہ حکومت کے پیشِ نظر مہمندوں کی معرفت شنواریوں کو کچل دینے کی جو تجویز تھی۔ وہ عسکری نقطۂ نظر سے درست نہ تھی۔ بلکہ اس لئے کہ اس تجویز کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے میر زمان کنڑی کا وجود ہرگز موزوں نہ تھا۔ وہ تو پہلے ہی اپنے علاقہ میں بدنام تھا۔ اور مہمندوں وغیرہ کے بہت سے فرقے اس کے لہو کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اس کا وہاں پہونچنا تو ایک نئی واقعیّت کو پیدا کرنے والا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ وہ ملّت کی ایک طاقت کو باغیوں کے برخلاف استعمال کرسکے۔ اس کی اپنی ہستی کے معرضِ خطر میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ قطع نظر اس کے حکومت اس کی دست درازیوں کی داستانوں سے پوری طرح واقف تھی۔ اور اس کے عزمِ پوشیدہ سے بھی آگاہ تھی۔ اس لئے اس کو کابل سے چلے جانے کی اجازت دینا ایک بڑی حد تک سیاستِ ملکی کے بھی برخلاف تھا۔ ان دوراندیشیوں کے ماتحت اس علاقہ میں ایک ایسے وجود کی ضرورت تھی۔ جس میں سیاسی قومی اور مذہبی صفات موجود ہوں۔ تاکہ وہ شنواریوں کے فتنہ کی آگ کو دیگر علاقوں میں پھیلنے سے روک سکتا۔ اور اگر ضرورت پڑتی۔ تو ان علاقوں میں سے قومی لشکر فراہم کرکے حکومت کی فوجوں کے ساتھ شنواریوں پر باقاعدہ حملوں کا اقدام کرتا۔

پس جیسا کہ اندیشہ تھا۔ وہی کچھ ہوا۔ میر زمان خان کے وہاں پہونچتے ہی حالات بدتر ہو گئے۔ اور حکومت کی تمام کوششیں مہمندوں کی ایک زبردست طاقت کو کھڑا کرنے کے سلسلہ میں ناکام رہیں۔ میر زمان خان کنڑی کے وجود کی موجودگی نے اس کے دشمن قبائل اور فرقوں کو بغاوت کے اس طوفان بے تمیزی میں اپنے انتقامات لینے کا خاطر خواہ موقع بہم پہونچا دیا تھا۔ اور وہ اس موقع کو ہاتھ سے

دینے کے روادار نہ تھے رفتنواری تو حکومت کی فوجوں سے لڑتے رہے۔ اور انہوں نے میرزمان خان کنڑی اور اس کے پشتیبانوں پر ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تھوڑی ہی مدت کے بعد وہ میرزمان خان اور اس کے لاؤ لشکر پر غالب آ گئے۔ میرزمان خان کو انہوں نے بُری طرح قتل کر ڈالا۔ اس کے فرزند و دیگر اقارب بھاگ کر سرکانی[1] میں پناہ گزیں ہوئے۔ اور جو کچھ اس کا مال و متاع ان کے ہاتھ لگا۔ انہوں نے بیدریغ ہو کر لوٹ لیا۔

ادھر کابل سے رئیس تنظیمہ شیر احمد خان کی مدد کے لئے اور بھی چند معتبر افراد جلال آباد کو روانہ کئے گئے۔ تاکہ آزاد سرحدی قبائل کو حکومت کی مدد کرنے پر ابھارا جائے۔ ان آزاد سرحدی قبائل میں ایک طرف تو آفریدی تھے۔ اور دوسری طرف مہمندوں کی قوم آباد تھی۔ دونوں قبائل میں افغانستان کی حکومت کا اثر و رسوخ تھا۔ اور ان قبائل کے بڑے بڑے سردار و شیوخ و خان حکومت کے مواجب خوار بھی تھے۔ باایں ہمہ حکومت ان قبائل کی امداد بروقت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اور جو امداد پہونچی بھی وہ بہت تھوڑی اور برائے نام تھی۔ آفریدیوں نے تو گویا لبیک ہی نہ کہا۔ مگر مہمندوں کا چار پانچ ہزار کا لشکر بادشاہ گل صاحبزادہ حاجی ترنگ زئی کی سعیت میں جلال آباد کے سقوط کے کچھ تھوڑے ایام پہلے پہونچ چکا تھا۔

حکومت کی خواہش کے جواب میں قبائل کی طرف سے سرد مہرانہ اظہار چند خاص سبب رکھتا تھا جنہیں گو کسی قدر اختصار ہی سے سہی۔ لکھے بغیر چارہ نہیں۔

اوّل۔ میں نے اوپر لکھا ہے۔ کہ ان قبائل کے سردار، شیوخ، اور خوانین کو حکومت افغانستان کی طرف سے سالانہ تنخواہیں ملتی تھیں۔ اور تقریباً ہر سال ان کو اپنی

---

[1] سرکانی یہ ایک سرحدی مقام ہے۔

تنخواہوں کے لینے کے لئے کابل میں آنا پڑتا تھا۔ تنخواہ یا مواجب بندی اس طرح تھی۔ کہ جس خان یا ملک کے ماتحت جتنی نفری ہے۔ فی نفر کے حساب سے اس خان کو اپنی قوم میں تقسیم کرنے کے لئے روپیہ ملتا تھا۔ اور خود اس خان کو اس کے رتبہ اور حیثیت کے مطابق ایک جدا رقم ملتی تھی۔ سرحدی شیوخ اور ملّاؤں کو بھی حسب رتبہ اور اثر وظائف ملا کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے اطلاع ملنے پر یہ لوگ کابل میں آجاتے تھے۔ مگر ان کو دو دو تین تین ماہ تک کابل میں اپنی تنخواہوں کے لئے ٹھیرنا پڑتا تھا۔ صرف مختلف قبائل کے نمایندے ہی نہیں آتے تھے۔ بلکہ عام قبائل کے لوگ بھی آتے تھے۔ یا تو اس وجہ سے کہ وہ لوگ اپنے خوانین پر روپیہ پیسہ کے سلسلہ میں اعتبار نہیں کرتے تھے۔ اور خود جاکر اپنی تنخواہ وصول کرنا چاہتے تھے۔ اور یا اس وجہ سے کہ خوانین اپنی ماتحت نفری کا حکومت کی نظروں میں مظاہرہ کرنے کے لئے اس بات کو ضروری سمجھتے تھے۔ کہ وہ ان کے ساتھ ہوں۔ اور تعداد کی بہتات پر ان کی قوم کے حصہ میں کچھ زیادہ رقم آئے۔ بہرکیف یہ لوگ مہمند[1]، باجوڑ، وزیرستان اور تیراہ کے علاقوں سے جوق در جوق پا پیادہ آتے تھے۔ جہاں فی نفر دو چار دس روپیہ سالانہ کے حساب سے تنخواہیں ملنی ہوتی تھیں۔ حکومت ان کو کئی ماہ تک ٹھیرانے کے بعد تنخواہیں دیتی تھی مگر حکومت کے کاروار یہاں بھی رشوت ستانی سے باز نہ آتے تھے۔ اور کل رقم کا پانچ دس یا بیس فیصدی حصہ ان کی جیبوں میں چلا جاتا تھا۔ جس سے ان قبائل پر بہت بُرا اثر پڑتا رہتا ہے۔ اور وہ اکثر کابل سے

---

[1] مہمندوں کی قوم تین حصوں پر منقسم ہے۔ ایک[1] حصہ افغانستان کی رعیت ہے۔ دوسرا[2] انگریزوں کی رعیت یا ان کی محافظت میں ہے۔ تیسرا[3] آزاد قبائل میں شمار کیا جاتا ہے۔

ناراض ہو کر جاتے تھے۔ اس میں وہ حق بجانب بھی تھے۔ ایک تو انہیں بڑی دُور سے سفر کر کے آنا پڑتا تھا۔ اور دوسرے ان کو دو دو تین تین ماہ تک ٹھہرنا پڑتا تھا۔ تیسرے ان سے دورانِ قیامِ افغانستان اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ اور اگر حکومت خود نہیں۔ تو اس کے کارداران کو یہ سمجھ کر کہ وہ حکومت کے خزانہ پر ایک ناحق کا بوجھ ہیں۔ حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگ گئے تھے۔ چوتھے جو کچھ ان کو ملنا ہوتا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ وہ وہاں خرچ کر جاتے تھے۔ پانچویں ان کو ابھی پھر اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹنا ہوتا تھا۔ اور سب سے آخر یہ کہ اس پر بھی ان کی قلیل تنخواہوں کا ایک معتدبہ حصہ متعلقہ کارداروں کی رشوت کی نذر ہو جاتا تھا۔ لہٰذا ان کا حکومت افغانستان سے سرد دل ہوتے جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

دوم۔ بغاوت منگل کے موقعہ پر آفریدیوں نے بالخصوص حکومت کی خاطر خواہ مدد کی تھی۔ مگر کامیابی کے بعد حکومت نے نہایت ہی عدم التفاتی کا ان سے برتاؤ کیا تھا جس سے وہ بہت ہی دل گرفتہ ہو چکے ہوئے تھے۔ اور بعض تو قسمیں اٹھا چکے تھے۔ کہ وہ حکومت کی پھر کبھی امداد نہ کرینگے۔

سوم۔ ان قبائل کا وہ حصہ جو افغانستان سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ انگریزوں کا دشمن اور مخالف متصور ہوتا تھا۔ ان کا افغانستان سے تعلق اسی ایک سیاسی نظریہ کے ماتحت تھا۔ اور جب کبھی انگریزوں اور افغانستان کے درمیان جنگ ہوئی ہے۔ انہی قبائل نے افغانستان کی باقاعدہ فوج سے کہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ یہ حصۂ قبائل اپنے آپ کو افغانستان کی بے قاعدہ محفوظ فوج سمجھتا رہا ہے۔ اور حکومت افغانستان بھی یہی سمجھکر ان کو ایک زرِ کثیر سالانہ وظیفہ اور مواجب کے طور پر دیتی رہی ہے۔ لہٰذا ان کی طاقت کو ملکی جنگ میں استعمال کرنا اس محفوظ فوج کو

غلط راہ پر استعمال کرنے کے برابر تھا۔ اور قبائل خود بھی اس قسم کی جنگ میں شمولیت کرنے کو ایک غیر مذہبی بار تصور کرتے تھے۔

جہاں تک آفریدیوں کا تعلق تھا۔ وہ اس جنگ میں اس وجہ سے بھی اشتراک نہیں کر سکتے تھے۔ کہ شنواری قبائل کے ساتھ ان کے اکثر فرقوں کے راہ و رسم تھے۔ اور بعض صورتوں میں اقتصادی مفاد بھی ان کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے تھے۔ اور پھر یہ ملکی بغاوت مذہبی نام پر پھوٹ رہی تھی۔ اور وہ اس کے برخلاف اس وقت تک ہرگز شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک ان کے ملّا نے ایسا کرنے کا ان کو فتویٰ نہ دیں۔ ان وجوہات کی بنا پر آفریدی آخر دم تک حکومت کی معاونت پر تیار نہ ہوئے۔ اور حکومت کے لاکھ سر پٹکنے پر بھی ان کی کل تعداد دو تین سو سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ ان کی طرح سرحد پار کے مہمند بھی مذبذب تھے۔ اور کافی وقت گذر جانے تک وہ بھی اپنے گھروں سے نہیں نکلے۔ حکومت امانیہ کے آخری عہد میں مہمندوں کے سرداروں اور شیوخ سے بھی افغانستان کی حکومت کے تعلقات خراب ہو چکے تھے۔ اور ان کو بھی حکومت سے بہت ساری شکائتیں اور شکر رنجیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور وہ اگر آئے بھی تھے۔ تو یونہی دکھلاوے کے لئے یا حکومت کی شکست پر عام لوٹ کھسوٹ میں حصہ لینے کے لئے۔

آغائے شیر احمد خان کی ایک بڑی بھاری غلطی یہ بھی تھی۔ کہ انہوں نے شروع ہی میں سرحدی قبائل کی امداد حاصل کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اور بغاوت کو نہایت ہی معمولی سمجھ کر حکومت کی فوجوں پر ہی اکتفا کیا۔ مگر جب صورت حالات نازک ہوتی گئی۔ تو انہیں اس غلطی کا احساس ہونا شروع ہوا۔ مگر اب وقت جا چکا تھا۔

اندرونی علاقہ کے مہمندوں اور دیگر قبائل کا وہ حصہ جو میر زمان خان کے درپئے آزار تھا۔ کنڑ اور کامہ کے علاقوں میں حکومت کی تنظیم خراب کر چکا تھا۔ حکومتی چھاؤنیں تاراج

ہو چکی تھیں۔ فوجیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں جو ان علاقوں میں جا بجا بکھری پڑی تھیں۔ قبائل کے آگے یا تو ہتھیار پھینک چکی تھیں۔ اور یا جلال آباد کی طرف بھاگ آئی تھیں۔ اور ان قبائل میں آپس کی دشمن داریوں کی روح زندہ ہو چکی تھی۔ اب یہ آپس میں لڑ رہے تھے۔ اب گویا یہ بھی حکومت کے باغی تھے۔ ان سے آپس کی رقابتوں اور دشمن داریوں کی وجہ سے قتل غارت ولوٹ کے سنگین جرائم سرزد ہو چکے تھے۔ اب یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ حکومت کامیاب ہو۔ کیونکہ اس صورت میں ان سے سخت بازپرس ہونی تھی۔ اب اس بازپرس اور حکومت کی گرفت سے بچنے کے لئے یہ شنواریوں کی لگائی ہوئی آتشِ فساد کو دور دور تک پھیلانا چاہتے تھے۔ ننگرہار کے علاقہ میں بھی جہاں صافی وغیرہ قومیں آباد تھیں۔ اکساہٹ اور ہلچل شروع ہو رہی تھی۔ ان کی بھی آپس کی دشمنداریاں اب زندہ ہو رہی تھیں۔ اور وہ ایک دوسرے پر بڑے بڑے خوفناک ڈاکے ڈال رہے تھے اور حکومت کے ڈر سے مطلقاً بے پرواہ ہو کر ایک دوسرے کو لوٹ مار رہے تھے۔

ان ہنگاموں کے درمیان شنواری جن کے ساتھ باقاعدہ فوج کا ایک حصّہ بھی مل چکا تھا۔ اپنی آس پاس کی مزاحمتوں کو دور کر کے جلال آباد کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ سرکاری فوج بھی ان سے بہت کم مزاحمت کرتی تھی۔ کیونکہ ایک تو وہ مرکز سے دور تھوڑی ہی تعداد میں ہوتی تھی۔ دوسرے ان کو مذہب کا خیال حقیقی جوش و خروش کے ساتھ حکومت کی مدافعت کرنے سے باز رکھتا تھا۔

سقوطِ جلال آباد کے کچھ دن پہلے حکومت نے مذہبی شخصیتوں کے ذریعہ شنواریوں کو رام کرنے کی کوشش تو کی۔ مگر یہ اب بعد از وقت تھی۔ اور ساتھ ہی اس کے یہ بات بھی تھی کہ بغاوت منگل کے دوران میں عام ملت کو حکومت کی عہد شکنیوں کا جو تجربہ ہو چکا تھا۔ اس کے دوہرائے جانے کا خوف لوگوں کے دلوں میں سمایا ہوا تھا۔ اور اس لئے وہ حکومت کے قول وفعل کا اعتبار کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

ہم اپنے قارئین کے اضافۂ معلومات کے لئے "بغاوتِ منگل" کے دوران میں جو عہد و پیمان باغیوں اور حکومت کے درمیان ہوئے تھے۔ اور جن کو بعد میں نبھایا نہیں گیا تھا یہاں تحریر کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ انہی عہد شکنیوں کا اثر باقی تھا۔ جو ایک طرف حکومت کی طرف سے کسی مصالحانہ اقدام کئے جانے کی راہ میں حائل تھا۔ اور دوسری طرف اعتماد باختہ ملت کے باقی حصّہ کو حکومت کے کسی قول پر اعتماد کرنے سے روک رہا تھا۔ اور جو آخر کار حکومت کے حق میں مہلک ثابت ہوا۔

لیکن واقعات کو اگر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے، تو حجم کتاب کے بہت زیادہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے بمصداق "نمونہ از خروارے" اختصار ہی مناسب ہے۔

بغاوت منگل اپنے نوعی و خصوصی لحاظ سے شنوار کی موجودہ بغاوت سے کہیں بدتر اور وخیم تر تھی۔ حکومت کی باقاعدہ اور بے قاعدہ فوجیں اور قبائل کے رضاکار جنگجو مل ملا کر تقریباً ایک لاکھ کی تعداد میں اس بغاوت کے فرو کرنے میں شریک تھے مگر تاہم حکومت کی یہ فراہم کردہ قوت باغی منگلوں اور ان کے حواری قبائل کو سر نہ کر سکی تھی۔ اور آخر کار خاندان سردار ایوب خان کے ایک فرد عبدالکریم خان کے نمودار ہونے اور اپنے آپ کو بادشاہ کہلانے پر اس بغاوت کی مذہبی حیثیت جاتی رہی تھی۔ اور لڑنے والے گروہ میں تفرقہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ تفرقہ ان علماء نے ڈلوانا شروع کیا تھا۔ جو حکومت کے طرفدار اور صلح و امن کے دل سے مؤید و متمنی تھے انہی علماء نے ملائے لنگ اور اس کے ساتھی علماء سے عہد و پیمان کئے تھے۔ مگر باغی فریق نے اس وقت تک اپنے آپ کو حکومت کے حوالے نہیں کیا تھا۔ جس وقت تک کہ غازی امان اللہ خان نے اپنی مہر و دستخطوں سے قرآن پر اس مضمون کا حلف اٹھا کر نہیں بھیجا تھا۔ کہ وہ ان سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کرے گا۔ مگر جیسا کہ قارئین بے خبر نہ ہونگے۔ بادشاہ

نے اپنے اس حلف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان سب کو ہلاک کروا ڈالا تھا۔

لہذا اب کس برتے پر حکومت مصالحانہ اقدام میں اپنے صداقت مندانہ ضمیر کا مظاہرہ کر سکتی تھی۔ اور باغی شنواری کس دل سے اس کی بات پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے۔ ان کے لئے ہر طرح مرگ موجود تھی۔ اگر وہ جنگ کو بند کر کے اپنے آپکو حکومت کے حوالہ کرتے ہیں۔ تو انہیں معلوم تھا۔ کہ منگلوں کی طرح ان کا بھی ویسا ہی خوفناک حشر ہوگا۔ اور اگر وہ حکومت سے جنگ جاری رکھتے ہیں۔ تو پھر بھی انہیں کوئی امید نہیں تھی۔ کہ وہ حکومت کی طاقت پر کبھی غالب آسکینگے۔ مگر چونکہ وہ اپنے علم و یقین کی بنا پر مذہب کے لئے لڑ رہے تھے۔ اس لیئے یہ ان کے لئے عین سعادت تھی۔ کہ وہ میدان جنگ میں اپنے مذہب پر قربان ہو کر کٹ مریں۔ لہذا ان کا فیصلہ تھا۔ کہ وہ آخر دم تک جنگ کو جاری رکھینگے۔

یہی حال ان لوگوں کی ذہنی کیفیت کا بھی تھا۔ جو میر زمان خان کنڑی کے دشمن تھے اور اس سے جنگ کر رہے تھے۔ اب وہ بھی سمجھتے تھے۔ کہ ان کا بچاؤ حکومت کی کایا پلٹ جانے ہی میں ہے۔

ان حالات کی روشنی میں حکومت کی مصالحانہ تدبیریں کارگر نہ ہوئیں۔ اور باغیوں نے بڑھکر جلال آباد کو محصور کر لیا۔ آقائے شیر احمد خان رئیس تنظیمیہ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن بذریعہ ہوائی جہاز جلال آباد کی فوج اور مدافعین کو ان کی قسمتوں پر چھوڑ کر کابل واپس چلے آئے۔ البتہ ان کی واپسی حکومت کے علم و ارادہ سے ہوئی تھی۔ اور اس کی اپنی درخواست پر تھی۔

آقائے شیر احمد خان کے مخالفین اس کی ناکامی پر بہت خوش تھے۔ اور کیوں خوش نہ ہوتے۔ جبکہ ان کے ہونیوالے صدر اعظم کا اب وہ منہ ہی نہیں رہا تھا۔ کہ وہ ایسے عہدہ جلیلہ کی ہوس بھی کر سکے۔ اور نہ ہی بادشاہ کے لئے اب کوئی گنجائش ہی رہ گئی تھی

کہ وہ آئندہ اس کی صدر اعظمی کے لئے لب کشائی کر سکے۔

مگر ان کی اس خوشی میں اس وہم و گمان کا گذر تک نہ تھا۔ کہ ان کا اپنا مقدر ان کے کیا پیش لانے والا ہے۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے۔ کہ یہ شر و فساد صرف چند دنوں کی بات ہے۔ اور حکومت کی طاقتیں بالآخر اس کو دبا ہی لیں گی۔ پھر کیوں نہ اس کے دبانے کا سہرا انہی کے سر رہے۔ اور یہ اس طرح ممکن تھا۔ کہ آقائے شیر احمد خان کی ناکامی کے بعد شاید قرعہ ان کے نام کا پڑے۔

مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان اس پیش افتادہ مہم کو شاہ پرست گروہ کے ذریعہ سے دبانا چاہتا تھا۔ ایک شاہ پرست اگر ناکام ہو کر آچکا تھا۔ تو کیا ہوا۔ اب وہ دوسرے شاہ پرست کو سمت مشرقی کا رئیس تنظیمیہ بنا کر بھیجے گا۔ اور قارئین پر یہ بھی واضح رہے۔ کہ وزارت حربیہ کی باگ ڈور بھی ایک شاہ پرست ہی کے ہاتھ میں تھی یعنی سردار عبدالعزیز خان قندہاری کے ہاتھ میں جس سے آپ اس سے پہلے تعارف حاصل کر چکے ہیں۔

یہ دوسرا شاہ پرست کون تھا۔ جو اب رئیس تنظیمیہ بن کر جا رہا تھا۔ قارئین اس سے بھی ناآشنا نہیں۔ یہ ہمارا دوست اور اس کتاب کے مصنف کا "رفیق سخن" آقائے محمود خان یاور گورنر کابل تھا۔

کیا اس شخص کا انتخاب مصلحت وقتی کے لحاظ سے صحیح اور موزون تھا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ کیوں؟ ہم اس کی تفصیل تو بعد میں دوہرائیں گے۔ یہاں قبل ازاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلے اس کے انتخاب اور تقرری کی جو وجوہات تھیں۔ اسے بیان کیا جائے۔

قطع نظر اس حقیقت کے کہ یہ بادشاہ کا منظور نظر تھا۔ غازی امان اللہ خان نے اپنے یورپ کے جانے سے پہلے اس کی نگرانی میں چند ایک اہم محکمے سپرد کر رکھے تھے اور جیسا کہ قارئین آگاہ ہیں۔ ان میں ایک محکمہ تو ریاست سرحدات کا تھا۔ اور دوسرا محکمہ

خفیہ نگاری تھا محکمہ سرحدات کے توسط سے اس نے اپنا اثر و رسوخ قبائل ماورائے سرحد کے اکابر و خوانین وغیرہ کے درمیان پیدا کر لیا تھا۔ اور خفیہ محکمہ کا افسرِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اس کو اندرون قبائل کے حالات معلوم کرنے کا موقع بھی ملتا رہا تھا لیکن جہاں تک آزاد قبائل میں اس کے اثر و رسوخ کا تعلق تھا۔ اس کو ان کے ساتھ ملنے جلنے اور ان کی عادات و خصلت سے واقفیت بہم پہونچانے کی بہت کم فرصت ملی تھی۔ اس لئے یہ اثر و رسوخ محض عارضی تھا۔ اور ساتھ ہی جلال آباد کے سقوط کے بعد اب یہ براہ راست اپنا تعلق مہمندوں اور آفریدیوں سے پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ دوسرے خصوص میں یہ اپنے محکمۂ خفیہ کے کارپردازوں کے ذریعہ سے قبائل کی باہمدگر اندرونی لگاوٹوں اور رمز و رقابتوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ اور وہ اس کی دماغی اٹھان بھی "آئی لگائی" کے درسِ بنیادی سے نامحرم نہ تھی۔ مگر تاہم چونکہ جو کچھ وہ جانتا تھا۔ اس کے وقائع نگاروں اور رخبر دہندوں کے توسط سے تھا۔ جو اس کے ماتحت کام کرتے تھے۔ اس لئے اندرونی قبائل میں اس کے چند دوستوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ جس سے اس کی براہ راست راہ و رسم ہو۔ اس نے بعد میں مجھے قیدخانہ میں بتلایا تھا۔ کہ اپنے اقتدار کو بڑھانے کے لئے اس نے انہی اپنے چند دوستوں کے ذریعہ سے کام شروع کر رکھا تھا۔ اور غازی امان اللہ خان نے انہی متذکرہ خصوصیات کی بنا پر اسے منتخب کر کے اس شر و فساد کے دبانے پر مامور کیا تھا۔

مگر جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے۔ کہ مصلحتِ وقتی کی بنا پر یا ور صاحب کا منتخب کرنا موزوں اور صحیح نہ تھا۔ اس کی اصل حقیقت یہ تھی۔ کہ فتنہ و فساد کی آگ جو ملک میں پھیل رہی تھی۔ وہ مذہب کے نام پر تھی۔ اور محمود خان یاور کی زندگی کا شرعی پہلو عوام کی نظر میں بہت ہی کمزور اور تاریک تھا۔ وہ شراب بہت پیتا تھا۔ اور افسرانِ حکومت میں سے سب سے پہلے اسی نے اپنی خانم کی برہنہ روئی میں سبقت کی تھی۔ ابھی غازی

امان اللہ خان یوروپ ہی میں تھا۔ کہ یہ ٹھیٹھ یوروپین وضع میں اپنی بے نقاب خانم کو ساتھ لے کر سیر وغیرہ کو نکلا کرتا تھا۔ اور اس کی دیکھا دیکھی چند ایک منچلے نوجوان بھی اپنی خواتین کے ہمراہ اس کی تلقین کرتے دیکھے گئے تھے۔ دراصل یہ تحریک اس کی اپنی نہ تھی۔ بلکہ غازی امان اللہ خان یورپ جاتے وقت اس کو اس بارے میں خاص ہدایات دے گیا ہوا تھا جیسا کہ قارئین اس سے پہلے محمود خان یاور کے حال میں پڑھ چکے ہیں۔ اور چونکہ یہ شاہ پرست کہلاتا تھا۔ اس لئے اگر بادشاہ پر لامذہبیت کا الزام ملت کی طرف سے عاید ہے۔ تو یہ اس الزام سے ہرگز بچ نہیں سکتا تھا۔ بلکہ عام لوگوں کے خیال کے مطابق ایسے ہی لوگوں نے بادشاہ کو بے راہ کیا تھا۔ اس لئے بادشاہ سے کہیں زیادہ اس قسم کے لوگوں کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگ انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ علاوہ بریں نوجوان طبقہ تو اس کے لہو کا پیاسا تھا۔ کچھ اس وجہ سے کہ اس کا اپنا کوئی ضمیر نہ تھا۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ حکومت کے خرید و فروخت کے کاموں میں بے جا تصرف کرتا رہتا تھا۔ اور راشی بھی تھا۔

پھر یہی نہیں۔ بلکہ محمود خان یاور سے حکومت کا ہر بڑا افسر ناراض تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ چونکہ یہ بادشاہ کے محکمۂ خفیہ کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس لئے طبعاً دیگر افسرانِ حکومت پر بادشاہ کی طرف سے جو جو اسپیس مقرر ہوئے تھے۔ ان کی اس کو خبر ہوتی تھی۔ بلکہ اکثر یہی ان کو مقرر بھی کرتا تھا۔ اور جو خبریں وہ اس کو لا کر دیتے تھے انہیں یہ بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیتا تھا۔ اب اگر دربار میں بادشاہ نے کسی وزیر یا دیگر رکنِ حکومت پر عدم التفاتی ظاہر کی ہے۔ تو وہ شخص یہ سمجھنے لگ جاتا تھا۔ کہ یہ ساری کارروائی محمود خان یاور کی ہے۔ اس لئے وہ دل سے اس کا دشمن بن جاتا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہ تھا۔ کہ بادشاہ کی عدم التفاتی یا خفگی کا

باعث ضرور محمود خان یاور ہی ہو۔ کیونکہ بادشاہ کا اپنا خاص محکمہ خبر رسانی بھی موجود تھا۔ تاہم طعن و ملامت کا ہدف اکثر یہی بنتا تھا:۔

اب یہ ظاہر ہے۔ کہ جس رکن حکومت کے خلاف اراکین کی اکثریت ہو۔ وہ اگر کسی ایسی مہم پر مامور کیا جائے۔ جس کی اہمیت خاص الخاص ہو۔ تو قطع نظر اس کی اپنی کمیوں کے انہی مخالفتوں کی بھیڑ میں اس کا دیکھتے ہی دیکھتے لاپتہ ہوجانا چنداں تعجب زا نہ ہوگا۔ اور اگر افغانستان کے مخصوص حالات کی روشنی میں اراکین حکومت کی باہمی تعاونی یا عدم تعاونی زندگی کے طرز پر نگاہ دوڑائی جائے۔ تو یہ چیز غیر معمولی واقعہ بھی نہیں رہ جاتی:۔

غرضکہ محمود خان یاور رئیس تنظیمیہ سمت مشرقی کی حیثیت سے بڑے طمطراق اور بہت سی توقعات کے ساتھ روانہ ہوا۔ لیکن اس کے جانے تک جلال آباد سقوط کر چکا تھا۔ لہذا اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر "نملہ" میں قائم کیا۔ جو جلال آباد سے تقریباً ۳۵ میل کابل کی طرف واقع ہے:۔

جلال آباد میں جس قدر سرکاری فوج تھی۔ اس کا بچا کھچا حصہ نملہ کی طرف واپس ہٹ آیا تھا مگر ساتھ ہی بہت سا ذخائر حرب و ضرب باغیوں کے ہاتھ آچکا تھا۔ جس سے ان کی طاقت اور بھی قوی ہو چکی تھی۔ جلال آباد سے حکومت کا انتقال حکومت کے حق میں بہت بُرا ثابت ہوا۔ مہمندوں کا وہ حصہ جو میرزمان خان کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ جلال آباد کے سقوط پر جلال آباد کی تباہی کا باعث بنا۔ میرزمان خان قتل ہو چکا تھا۔ اور اس کے خویش و اقارب اور دوست و احباب سب منتشر ہو چکے تھے۔ اب یہ گروہ بالکل فارغ اور حکومت کا باغی بن چکا تھا۔ اس نے بھی جلال آباد کی لوٹ میں کافی حصہ لیا اور شنواریوں .... کے ساتھ مل کر جلال آباد کی اینٹ سے اینٹ بجا ڈالی۔ شہر کو انہوں نے آگ کی

نذر کر دیا تھا۔ سرکاری عمارتوں کو منہدم کر کے کھنڈرات کی شکل میں جا بجا بکھیر دیا تھا۔ ان ڈھیر شدہ عمارتوں کی لکڑیاں، کھڑکیاں، دروازے اور فرش فروش کی جملہ چیزیں لوگ لوٹ لوٹ کر اپنے گھروں کو لے جا چکے تھے۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ وہ میوہ دار اور غیر میوہ دار درختوں کو بھی جڑ سے کاٹ کر لے گئے تھے۔ اور جلال آباد اور اس کے نواحی میں لکھوکھا درخت بے دریغ ہو کر کاٹ ڈالے گئے تھے۔ سبزی کا کہیں نشان تک بھی نہ ملتا تھا۔ جس طرف نگاہ اٹھتی تھی خاک کے ڈھیر کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ ایک مٹی انہوں نے باقی چھوڑی تھی۔ نہ معلوم اسے بھی وہ کیوں نہ ساتھ لے گئے۔ باقی کوئی چیز وہاں نظر نہ پڑتی تھی۔ سوائے ان دورویہ درختوں کے جو سڑک کو ناقابلِ گذر بنانے کے لئے انہوں نے جا بجا کاٹ کاٹ کر ڈال دیے تھے۔

مہمندوں کی امدادی فوج جسے بادشاہ گل حکومت کی امداد کے لئے لایا تھا واپس جا چکی تھی۔ اور حکومت کے عہدیدار جو باغیوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ نکلے تھے۔ ادھر ادھر بھاگ کر منتشر ہو چکے تھے۔ جلال آباد میں حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ہی انار کی چاروں طرف پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔ ہر ایک قبیلہ اور فرقہ اپنی جدا جدا ٹولیاں قائم کر رہا تھا۔ یہ ٹولیاں لوٹ مار قتل و غارت گری کے قیامت خیز ہنگامے برپا کر رہی تھیں۔ ان کے لئے حکومت کیا فنا ہوئی تھی۔ گویا عشرت کی عید آ گئی تھی۔ پرانی دشمنیاں جی کھول کر خونی ہولیوں کا رنگ اختیار کر رہی تھیں۔ اب کسے غرض تھی۔ کہ کوئی رد کرے۔ ہر ایک اپنے ہی حال میں مست تھا۔ امن پسند لوگوں یا حکومت کے طرفداروں میں مجال نہ تھی۔ کہ ان ناشدنی واقعات و حالات کے خاتمہ کے لئے لب کشائی کر سکیں۔ بیچارے چپ چاپ خون کے آنسو رو رہے تھے۔ فضا ایسی مکدر اور غلیظ ہو چکی

تھی۔ کہ امن یا حکومت کے ازسرِ نو قیام کا نام لینا گویا سنگین جرائم میں شمار ہونے لگا تھا۔ یہ وہ حالات تھے۔ جن کو محمود خان یاور نے اپنے قابو میں لانا تھا۔ اس کا کام تو آقائے شیر احمد خان کی نسبت سے کہیں زیادہ کٹھن اور مشکل تھا۔ یہاں تو کوئی ایسا جری صف شکن۔ اور کوہ وقار کی سی قوتیں رکھنے والا شخص چاہئے تھا۔ جس کے دم سے حکومت کے طرفداروں کو تقویت نصیب ہوتی اور ملت کا درمیانی عنصر جو مدام درجۂ تذبذب میں رہتا ہے۔ اس کی شخصیت کے سامنے جھک جاتا۔ باغیوں کی ترغیب و تحریص کا جادو ان پر نہ چل سکتا۔ اور اشتعال زا طاقتیں ایک ایک کر کے ان سے جدا ہونی شروع ہو جاتیں۔ اے کاش اگر حکومت ایک ایسے شخص کو چن کر بھیجتی۔ تو آج افغانستان کی تقدیر کچھ اور ہوتی۔

بہرکیف ایسا نہ ہوا۔ ادھر محمود خان یاور کی تقرری کی خبر منتشر ہوئی اور ادھر بغاوت کی حدود و وسعت کو پھیلاؤ نصیب ہوا۔ جلال آباد کے سقوط نے لغمان کے علاقہ کو بھی کابل سے منقطع کر دیا تھا۔ اور اگرچہ کابل سے لغمان کی طرف ایک اور بھی پہاڑی راستہ جاتا تھا۔ مگر چونکہ وہاں کے باشندوں میں بھی ہل چل مچ چکی تھی۔ اس لئے حکومت نے لغمان کی طرف اپنی فوجوں کو منتشر کرنا ضروری خیال نہ کیا۔ اور اپنی توجہ کو جلال آباد کے پھر حاصل کرنے ہی پر موقوف رکھا۔

لیکن چونکہ اب باغیوں کے پاس اسلحہ و دیگر ذخائر حرب کی کوئی کمی نہ تھی۔ (گو وہ کسی نظم و نسق کے ماتحت نہ تھے)۔ اور ان کا بے قاعدہ گروہ بھی کثیر ہو گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے حکومت کی باقاعدہ یا بے قاعدہ فوج کو متعارضین کی حیثیت اختیار نہ کرنے دی۔ وہ بڑھ بڑھ کر حکومت کی فوجوں پر شبخون اور چھاپے مارتے تھے۔ اور اس طرح ان کو پریشان کرتے تھے۔ محمود خان یاور کی لامذہبیت کی داستانوں کو اہل غرض نے بہت سا رنگ و روغن چڑھا کر بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر یہ اہل غرض صرف باغی ہی

نہ تھے۔ بلکہ کابل کے وہ اراکین بھی جو محمود خان یاور کے مخالف تھے۔ اس کو اس طرح سے بدنام کرنے کی تحریک میں حصہ دار تھے۔ حکومت پر جو مصیبت وادبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ یہ لوگ اب تک اسے معمولی ہی سمجھ رہے تھے۔ اور اس لئے ہر ایک چاہتا تھا۔ کہ اس کا مخالف بدنام ہو۔ اور شنواریوں کی بغاوت کے قلع قمع کرنے کا کام اسی کے سپرد ہو۔ انہوں نے جلال آباد کے سقوط سے بھی کچھ عبرت حاصل نہ کی۔ حالانکہ یہ مقام صوبہ مشرقی کا پایہ تخت تھا۔ اور اس کے حکومت کے ہاتھ سے نکل جانے سے اس کا رعب و وقار بہت سا کم ہو چکا تھا۔ بغاوت شنوار کے علاقہ تک محدود نہ رہی تھی۔ بلکہ کنڑ، کامہ اور لغمان کے باشندے بھی اس میں ملوث ہو چکے تھے۔ صرف یہیں تک نہیں۔ بلکہ اب غلہ اور جلال آباد کے درمیانی علاقہ کے فتنہ جو لوگ بھی دلیر ہو چکے تھے۔ اور اگر وہ بغاوت کے خیال سے نہیں۔ تو کم از کم لوٹ مار ہی کے لئے باغیوں کے جتھوں میں شریک ہو ہو کر سرکاری فوجوں پر چھاپے پر چھاپے مار رہے تھے۔ ان کی لوٹ مار کی مرغوب طبع چیزیں بندوقیں اور کارتوس تھے جنہیں وہ خاصی تعداد میں سرکاری افواج و ذخائر ہی سے حاصل کر سکتے تھے۔ ملک میں امن و امان اور حکومت کے از سرِ نو قائم ہو جانے پر بھی اس مالِ غنیمت کو وہ بآسانی چھپا سکتے تھے۔ یا سرحد پار جا کر آزاد قبائل میں بیچ سکتے تھے جلال آباد کے سقوط کے موقع پر کوڑیوں توپیں اور سینکڑوں مشین گنیں ان کے ہاتھ لگ چکی تھیں۔ اور بڑی مزیدار بات یہ تھی۔ کہ وہ ان کو چلانا نہیں جانتے تھے تاہم ہر ایک خان اور ملک اپنے قلعہ میں دو دو ایک ایک توپیں بیجا چکا تھا اور وہ توپیں یا مشین گنیں جو عوام کے ہاتھ لگی تھیں۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ کہ بعض ایک مجہول اشخاص انہیں فروخت کرنے کے خیال سے انگریزی سرحد میں لے گئے تھے اور شاید ان بیوقوفوں کو یہ بھی خیال ہو۔ کہ انگریز ان کی اس حرکت سے خوش ہو کر انہیں

قیمت کے علاوہ کچھ انعام بھی دیں گے۔ مگر ملک کے ان جاہل غداروں کو دولت انگلیس کی طرف سے الٹی بہت سی جھاڑیں پڑیں اور حکام سرحد نے ان کو آئندہ کے لئے ایسا کرنے سے بالکل روک دیا ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان چند توپوں وغیرہ کا کیا حشر ہوا جو یہ لوگ انگریزوں کے پاس لے گئے تھے۔ آیا انگریزی حکام نے ان کو بطور افغانستان کی امانت کے رکھ چھوڑا۔ یا انہی کے ہاتھ واپس لوٹا دیا۔ جب میں افغانستان سے واپس لوٹ رہا تھا۔ تو اس گروہ کے چند ایک اشخاص کو حکومت نادری نے گرفتار کر رکھا تھا۔ نہ معلوم ان کا کیا کچھ حشر ہوا۔ اور مزید تحقیقات کا کیا کچھ نتیجہ نکلا۔

بہر حال جلال آباد کے سقوط پر لوٹ مار اور تاراجی کی اس روح نے ہر کہ ومہ کو مشتعل کر دیا تھا۔ اور لوگ خواہ مخواہ باغی ہوتے چلے جا رہے تھے۔ محمود خاں یاور کے زمانہ قیام حملہ چھاپوں اور شبخونوں کی کثرت سے سرکاری فوج کا ناک میں دم آچکا تھا اور معقول انتظام اور ضبط و ربط (ڈسپلن) کی عدم موجودگی نے سرکاری فوج کے دل باغیوں کی دہشت سے بھر دیئے تھے۔ محمود خان یاور نے بہتیرا سر مارا۔ اور ارد گرد کے خوانین و ملک کو اپنے دور و پیش جمع کیا۔ مگر کچھ بھی نہ بن سکا۔ اور آخر کار حملہ کے باغ کا جس میں یاور فروکش تھا۔ باغیوں نے محاصرہ کر لیا۔ یاور محمود خاں کو گرفتار کر کے انہوں نے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ فوج کچھ ماری گئی۔ کچھ تتر بتر ہو گئی۔ اور ایک حصہ نے اپنے اسلحہ جات باغیوں کو حوالہ کر کے اپنی جان بچانے کی سبیل نکالی۔ اب گویا حکومت کے ہاتھ سے حملہ بھی جا چکا تھا۔

اس ناگہانی آفت کی ایک دو دن تک کوئی خبر نہ مل سکی۔ کیونکہ باغیوں نے حملہ اور کابل کے درمیان ٹیلیفون کے سلسلہ کو منقطع کر دیا تھا۔ مگر جب یہ خبر موصول ہوئی تو حکومت کو اب واقعی وضعیت کی گرانباری کا احساس ہوا۔ اب حالات اس درجہ مخدوش ہو چکے تھے۔ کہ اس کو بڑے پیمانہ پر فوجی تیاریاں کرنے کی ضرورت تھی۔ اور

ساتھ ہی کسی ایسے ہنر مند صاحب حوصلہ اور با اثر شخص کو اس کام کے لئے تلاش کرنا تھا۔ جو حکومت کے برخلاف بڑھتی ہوئی رو کو جا کر تھام سکے۔ اور جو علاقے باغیوں نے لے لئے ہیں۔ انہیں پھر حکومت کے زیر نگین لے آئے۔ اور عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے میں اسے ید طولی حاصل ہو۔ کیا کوئی ایسا شخص افغانستان میں موجود تھا۔ اور اگر وہ موجود تھا۔ تو وہ اب تک کہاں تھا کس حال میں تھا۔ کیوں اسے پہلے ہی سے اس مہم کی سربراہی کا کام سپرد نہیں کیا گیا تھا؟

یہ سوالات ہیں جن کے جاننے کے لئے قارئین طبعاً بے قرار ہوں گے :۔

الحق کہ افغانستان ایسے وجود سے بالکل خالی نہیں تھا۔ اگر نادر خان اور محمد ولی خان دونوں کی شخصیتوں کو ہم تھوڑی دیر کے لئے نظر سے اوجھل کر کے بھی دیکھیں۔ تو اب بھی افغانستان میں سردار علی احمد جان کی شخصیت ایک ایسی شخصیت تھی۔ جو اس مہم کی سربراہی کی بہت بڑی حد تک اہلیت رکھتی تھی۔ مگر غازی امان اللہ خان کی آنکھ باوجود ایک مانوس آنکھ ہونے کے اس کو شروع ہی سے نہ پہچان سکی تھی۔ اور شاید شروع ہی سے ان دونوں کے ستاروں کی گردشوں میں باہمی کشمکش رقابت اور فراق کے انداز موجود تھے۔ جو ان دونوں کے درمیان غلط فہمیاں اور رنجشیں پیدا ہونے کا باعث ہوئے گئے۔ اگر غازی امان اللہ خان اپنے آغاز حکومت ہی سے اس پر اپنی نظر التفات مبذول رکھتے۔ اور اس کو حکومت میں کافی حصہ دیتے رہتے۔ تو یقیناً اس شخص سے بڑھ کر غازی امان اللہ خان کا کوئی اور یار غار اور وفادار نہیں ہو سکتا تھا۔ غازی امان اللہ خان کا یہ خیال کہ سردار علی احمد جان خود عزم بادشاہی رکھتا ہے۔ اگر ہم اسے تسلیم بھی کریں کہ بالکل بے بنیاد نہ تھا۔ پھر بھی کم از کم غازی امان اللہ خان کے دوران قیام حکومت میں اس خیال کے بر آنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ خود علیا حضرت کا وجود تھا۔ جو رشتہ میں اس کی پھوپھی اور غازی امان اللہ خان کی ماں تھی۔ ماں کبھی نہیں

چاہ سکتی تھی۔ کہ اس کے بیٹے کے برخلاف اس کا بھتیجا بغاوت کرے۔ تنہا یہی خاندانی اثر اتنا زبردست تھا۔ کہ سردار علی احمد جان کو کبھی اس کے سامنے یارائے دم زدن نہ ہو سکتا تھا۔ وہ تو اپنی وضع کے قائم رکھنے پر مرتا تھا۔ غازی امان اللہ خان کے بہنوئی اور ماموں زاد ہونے کی حیثیت سے اسے اپنی ذات و شخصیت پر بہت کچھ ناز تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان سب سے زیادہ اس کو اپنے اعتماد میں لے۔ اور سب ارکین حکومت سے زیادہ اس کو حکومت میں حصہ دے۔ اگر اس کی یہ خواہش کسی حد تک پوری کر دی جاتی۔ تو غازی امان اللہ خان کے برخلاف کبھی اس کے دل میں غدر نہ آسکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ جب بغاوت منگل کے بعد غازی امان اللہ خان نے اس کو ولایت کابل کا والی یعنی گورنر مقرر کیا ہے اور ہم چند ہندوستانی اس عزت افزائی پر مبارکباد دینے کی غرض سے اس کے پاس گئے ہیں۔ تو وہ انتہا درجہ کا مسرور نظر آتا تھا۔ اور گویا وہ بزبان حال ہم سے یہ کہہ رہا تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان کو اب جاکر کہیں پتہ لگا ہے۔ کہ اس نے کس اہم شخصیت کو اب تک نظر انداز کر رکھا تھا۔

در اصل غازی امان اللہ خان کو سردار علی احمد جان سے بعض خانگی رنجشیں تھیں۔ اور یہ میرا حق نہیں ہے۔ کہ میں ان شخصی رنجشوں کے وجوہ و اسباب کو یہاں روشنی میں لاؤں۔ جن کی وجہ سے غازی کا دل سردار سے ہمیشہ پھرا رہتا تھا۔ اور اگر وہ کبھی کوئی نوازش بھی اس پر مبذول کرتا تھا۔ تو اس کے دل کی دنیا اس وقت تک مکدر رہتی تھی جس وقت تک وہ پھر اس پر اپنا عتاب نازل نہ کر دے۔

قارئین پہلے باب میں پڑھ آئے ہیں۔ کہ غازی امان اللہ خان نے اپنے یوروپ جاتے وقت سردار علی احمد جان کو اپنے پیچھے چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اور سفر یوروپ میں اس کو اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ اس سفر کے دوران میں غازی اور سردار کے مابین فراق کی خلیج جو کسی حد تک بغاوت منگل کی کارگذاری سے

پٹ چکی تھی۔ از سرِ نو حائل ہو گئی۔ اور صرف یہی نہیں۔ کہ پرانے زخم ہرے ہوئے ہوں۔ بلکہ اب ایک دوسرے کے دل میں حقارت اور غیظ و غضب کے طوفانوں نے جگہ پالی تھی۔ اب وہ ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے۔ اور شاید اب وہ آپس میں کبھی نہ مل سکیں گے۔

اس خوفناک باہمی کشیدگی کی وجہ کیا تھی؟ ظاہر ہے۔ کہ غازی امان اللہ خان ایک صاحبِ عزم بادشاہ کی حیثیت میں یورپ کی سیاحت کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک کو قعرِ گمنامی سے نکال کر منصۂ شہود پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ یورپ سے اس کارِ نمایاں کی داد چاہنے کے لئے گیا تھا۔ اور یورپ کی سلطنتوں کو اپنے وجود و ذات کی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ لہذا وہ طبعاً اپنے ہمرکاب رفقاء سے اس بات کا آرزومند تھا۔ کہ وہ اس کے وجود کو یورپ کی بڑی بڑی شخصیتوں کا مرکزِ کشش بنانے میں اپنی ذاتی تجلیوں کو اسی کے نور کی ضو فشانی کے لئے وقف کر دیں۔ وہ ان کا بادشاہ تھا۔ اور اس لئے اس کا اپنے رفقائے سفر سے یہ مطالبہ بالکل حق جانب تھا۔ مگر یہاں "فطرتِ سردار" اس سے متصادم تھی۔ وہ اپنی نمو چاہتی تھی۔ اپنی نمائش پر مرتی تھی۔ اور خود اپنے نورِ ذات کو نمایاں کرنے کی طلب کوش تھی۔ اس لئے غازی کا دل اس سے سخت بیزار و نفور ہو چکا تھا۔ اور کابل کی واپسی پر حسبِ قانون چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ سردار علی احمد جان کو پھر عہدۂ گورنری کابل پر سرفراز کیا جاتا۔ مگر غازی امان اللہ خان نے محمود خان یاور کو جو گورنر کابل کے عہدہ کو نیابتاً انجام دے رہا تھا۔ اب مستقل طور پر گورنر بنا دیا تھا۔ اور سردار کو کوئی عہدہ نہ دیا تھا اگر بات یہاں تک ہی رہتی۔ تو یہ بادشاہ کا ایک معمولی فعل سمجھا جاتا۔ مگر غازی امان اللہ خان کا دل کچھ اس طرح سے پھر چکا تھا۔ کہ اس نے اپنے مراتبِ پادشاہی

کا بھی کچھ لحاظ و پاس نہ کرتے ہوئے اعلانیہ ذلیل کرنا شروع کر دیا۔ اور اس تشہیر و ذلت کا جو ڈھنگ اختیار کیا۔ وہ بالکل انوکھا اور خلاف شانِ پادشاہی تھا۔

غازی کے حسبِ ایماء وزارتِ خارجہ نے سیاحت کے متعلق یوروپ و مصر کی فلمیں عمائد و اکابرینِ شہر و مقامی منصبداران حکومت و سفراء وارباب دول کو دکھلانے کا انتظام اپنے ایک بڑے ہال میں کر رکھا تھا۔ یہ انتظام صرف چند دن کے لئے تھا۔ اور بادشاہ بہ نفسِ نفیس شریک ہو کر اپنے دورۂ سیاحت کے حالات مناظر پردہ کے مطابق بیان کرتا تھا۔ یہاں جب کبھی سردار کی تصویر پردے پر آتی تھی۔ تو بادشاہ بے خود ہو کر پکار اٹھتا تھا۔ کہ "اینک خرس آمد"[۱] اور "ببینید ایں خرس راچہ طور خود را شخ گرفتہ است"[۲]

اب قارئین "فطرت سردار" کو اپنے پیش نظر رکھ کر خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ ایسی تحقیر و رسوائی نے سردار کے دل پر کیا کچھ بجلیاں گرائی ہونگی۔ اور اگر اب تک اس کو بادشاہ کے گرانے کا خیال نہ بھی آیا تھا۔ تو اب یقیناً ایسے جذبات نے اس کے دل و دماغ کو گھیر رکھا ہوگا۔ اور وہ یقیناً کسی ایسے موزوں موقع کا منتظر ہوگا۔ جب وہ پوری طرح اپنی ذلتوں اور رسوائیوں کا اپنے ماموں زاد بھائی یعنی بادشاہ سے بدلہ لے سکے۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ اس نے محمود خان یاور کو بالخصوص ناکام بنانے میں خفیہ ہی خفیہ بہت سا حصہ لیا ہو۔ ....

محمود خاں یاور کی ناکامی جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں۔ حکومت کے لئے سخت دل شکن تھی۔ اب گویا حکومت کے ہاتھ سے شملہ بھی جا چکا تھا۔ اور بغاوت آگے ہی آگے کابل کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ اور اب اگر اس

---

[۱] "ایلو وہ ریچھ آیا"

[۲] "اس ریچھ کو تو دیکھو خود کو کس طرح لکڑا رہا ہے"

سیلاب بے تمیزی کو جلدی ہی سے نہ روک دیا گیا۔ تو یہ بہت جلدی کابل تک پھیل کر رہیگا۔" اس ایک دہشت زا خیال نے حکومت کو بے حد مضطرب کر رکھا تھا۔ اور غازی کے صبر کا پیالہ چھلک چکا تھا۔ وہ اب سمجھ چکا تھا۔ کہ یہ آگ اس کی اپنی پارٹی کے لوگوں کے ہاتھوں نہ بجھ سکیگی۔ مگر وہ محمد ولی خان کو جسے وہ ابھی ابھی یوروپ سے واپس آکر گرا چکا تھا۔ اب پورے اعتماد کے ساتھ اس مہم کو نہیں سونپ سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسے محمد ولی خان کے ہاتھوں اپنی بادشاہت کے چھن جانے کا کوئی خطرہ تھا۔ بلکہ چونکہ اب بھی اسے یقین تھا۔ کہ حکومت اس بغاوت کو آخرکار دبا ہی لے گی۔ اور تھوڑے دنوں تک امن قائم ہو جائے گا۔ لہذا وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ حکومت کی آئین بندی کے لئے جو نقشہ وہ اب تک ترتیب دے چکا ہے۔ اس میں پھر سے ردّ و بدل ہو۔ محمد ولی خان کو مہم سونپنے سے اسے اس کی کامیابی کی صورت میں پھر عروج پر لانا پڑتا تھا۔ اور یہی چیز وہ نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس موقع پر اس کی نگاہ انتخاب میں محمد ولی خان نہ آسکا۔ بلکہ اس نے "خرِس شیخ گرفتہ" ہی کو اس مہم کی سربراہی عطا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

سردار علی احمد جان کو اب تحقیق طور پر معلوم ہو چکا تھا۔ کہ غازی پر آڑا وقت آچکا ہے۔ اور اب اس کو میری ضرورت پڑے گی۔ اس لئے وہ کچھ دنوں تک خاموش اور بے تعلق بنا رہا۔ اور جب اس کے پاس شاہی پیغام پہونچا۔ تو اس نے مہم کو ہاتھ میں لینے سے صاف انکار کردیا۔ ادھر بادشاہ پر ایک ایک دن سال سال بھر کا گذر رہا تھا۔ اس نے بلا توقف مزید اپنے روٹھے ہوئے بہنوئی کو منانے کے لئے علیا حضرت کو واسطہ بنایا۔ علیا حضرت گو خود غازی سے بہت سخت ناراض تھی۔ مگر اس وقت ماما کا جوش اس کو کب نچلا بیٹھنے دیتا تھا۔ وہ جھٹ اپنے بھتیجے کے

پاس پہونچی - اور آخر کار بہزار وقت و دشواری اس کی بادشاہ سے صلح و صفائی کروا دی - اب سردار علی احمد جان مہم پر جانے کے لئے راضی ہو گیا تھا - مگر اب اس نے بادشاہ کے سامنے چند کڑی شرطیں پیش کی تھیں - ان میں سے ایک تو یہ تھی - کہ وہ وزارت حربیہ کے زیر اثر ہرگز کام نہ کرے گا - بلکہ اپنا تعلق براہ راست بادشاہ سے رکھیگا - دوم یہ کہ جس قدر روپیہ قبائل میں تقسیم کرنے کی سیاستاً اس کو ضرورت لاحق ہو گی بادشاہ اسکی منظوری دینے سے نہیں ہچکچائے گا - اور پیشبندی اور فوری ضروریات کے لئے چند لاکھ روپیہ کی رقم خزانہ سے اسے اپنے ساتھ لیجانے کی اجازت دے گا - تیسرے مختلف قبائل جو اس وقت حکومت سے برسر جنگ ہیں - یا بغاوت کو دبانے کے لئے وہ جن قبائل کی امداد لینا چاہتا ہے - اُنسے جو عہد و پیمان بھی وہ باندھیگا بادشاہ بعد میں اس کو ضرور پورا کرے گا - اس شرط کی ضرورت یوں واقع ہوئی تھی - کہ بغاوت منگل کے موقع پر سردار علی احمد جان نے جو عہد و مواعید مختلف قبائل کے خوانین و ملکوں سے کئے تھے - مہم کی فراغت کے بعد ان کو حکومت کی طرف سے پورا نہیں کیا گیا تھا جس کا بہت برا اثر سردار کی اپنی شخصیت پر پڑ چکا تھا - اب ایک تو وہ تلافی مافات چاہتا تھا - اور دوسرے وہ قبائل کے لوگوں کو صرف اس حالت میں اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا جس حالت میں کہ وہ ان کو اس امر کا کلی اطمینان دلا سکے - کہ جو کچھ وہ ان سے طے کرے گا - حکومت بعد میں بلا چون و چرا اس کی تعمیل کرے گی سردار کی چوتھی شرط یہ تھی - کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی میدان جنگ میں اپنے ساتھ لے جائے گا ؛

صرف یہی ایک شرط ایسی تھی - جو بادشاہ کے دیرینہ کھٹکے کو اس کی ذات کے متعلق اور بھی قوی کرنے والی تھی - اور اس کی نیت پر شبہات وارد کرنے کے رجحان کو تیزی رفتار بخشتی تھی - اگر غازی وقت کی تنگی اور آدمیوں کے قحط الرجال سے مجبور

نہ ہوتا۔ تو شاید اس شرط کے سنتے ہی وہ بجائے سردار کو مہم پر بھیجنے کے زندان خانہ میں ڈال دیتا۔ مگر حالات کی نزاکت سے وہ مجبور ہو چکا تھا۔ کہ صرف سردار ہی سے اس خدمت کو لے۔ تاہم بادشاہ نے اس کی اس شرط کو نہ مانا۔ اور چونکہ وہ آپس میں بہت ہی قریبی رشتہ دار تھے۔ اس لئے قرابتداری کے اثر کے ماتحت سردار علی احمد جان نے عورتوں اور بچوں کے ساتھ لیجانے کی شرط کو واپس لیلیا۔ مگر اب بھی وہ اپنے ایک فرزند کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

کیا واقعی اس کی نیت بری ہو چکی تھی۔ اور کیا وہ اس اعتماد کا جو بادشاہ نے اس پر کیا تھا۔ کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا تھا؟ یہ سوالات تھے۔ جو مقامی اور خارجی لوگوں کے ذہن کی خلش کا بار بار باعث ہو رہے تھے۔ مگر میری اپنی رائے اس وقت بھی یہی تھی۔ (اور اب بھی جبکہ ہمیں مابعد کے کل واقعات کا علم ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی) کہ سردار علی احمد جان بایں ہمہ کہ وہ خود بادشاہ بننے کی بے حد تڑپ اپنے اندر رکھتا تھا۔ حالات اور واقعات پر اپنے اندرونی جذبات کو منحصر رکھے گا۔ اگر اس نے یہ دیکھا۔ کہ وہ کسی طرح بھی بادشاہ کے برخلاف ان جذبات کو جو رعیت کے دلوں میں جاگزین ہو چکے ہیں۔ نہیں نکال سکتا۔ اور بغاوت کی آگ کو بزور شمشیر یا بروئے سیاست بادشاہ کے حق میں فرو نہیں کر سکتا۔ تو وہ قبائل کے ہاتھوں اپنے لئے کم از کم محمود خان یاور جیسا حشر گوارا نہ کرے گا۔ اور اگر باقی حالات کو اپنے موافق پا سکا۔ تو خود اپنی بادشاہی کا اعلان کر دینے میں بھی اس کو کوئی روک ٹوک نہ ہو گا۔

واقعات مابعد نے اس تفسیر کو لفظ بہ لفظ صحیح ثابت کیا۔

بعض لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ اس کو بادشاہ نے از خود اجازت دی تھی۔ کہ اگر وہ قبائل کے دلوں سے بادشاہ کے متعلق جملہ شکوک و شبہات کو اور کسی حیلہ وہ نہ نکال سکے۔ تو سمت مشرقی میں امن قائم کرنے کے لئے وہ سیاستاً اپنی باد

کا اعلان بھی کر سکتا ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی جاتی تھی۔ کہ اگر اسے بادشاہ کی طرف سے ایسی اجازت نہ ملی ہوتی۔ تو وہ جلال آباد میں اپنی ناکامی کے بعد کس منہ سے غازی امان اللہ خان کے پاس قندہار جا سکتا تھا۔

دلیل کی مضبوطی میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن ان ایام میں قندہار میں جو کچھ ہو رہا تھا اور جو حصہ ان حالات کا میں فراہم کر سکا ہوں۔ ان کی روشنی میں بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ گو غازی امان اللہ خان نے سردار علی احمد جان کی واپسی قندہار پر اسے کچھ نہیں کہا۔ تاہم اس وقت سے بادشاہ نے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا ہوا تھا اور اپنی قسمت کے پانسہ پھر پلٹنے تک اس کو نظر بند رکھنا ہی از روئے سیاست ضروری سمجھا تھا اگر بادشاہ کی طاقت پھر بحال ہو جاتی۔ تو سردار علی احمد جان کو یقیناً غازی امان اللہ خان کے ہاتھوں چاشنیٔ مرگ سے لب آشنا ہونا پڑتا۔

یہ عین ممکن ہے۔ کہ سردار علی احمد جان نے سمت مشرقی میں اپنی بادشاہت کا نقارہ بجاتے وقت غازی امان اللہ خان کو سکون بخشنے کے لئے اپنے فعل کو فعل سیاسی کا نام دیا ہو۔ تاہم ابھی بفضل تعالےٰ غازی امان اللہ خان زندہ و برقرار ہیں۔ اور اس لئے اصل حقیقت در پردہ نہیں رہ سکتی۔ میں یہاں ان سے بصد ادب التجا کرونگا۔ کہ وہ از راہ ذرہ نوازی بالخصوص اس ایک مسئلہ پر ضرور روشنی ڈال کر سرافرازی بخشیں۔

الغرض سردار علی احمد جان پھر ایک دفعہ بڑی شان و شکوہ کے ساتھ رئیس تنظیمیہ کی حیثیت سے سمت مشرقی کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے جاتے ہی اپنا دارالصدر جگدلک میں قائم کیا۔ یہ مقام جلال آباد اور کابل کے عین وسط اور خوگیانی قبائل کے قلب میں واقع ہے۔ یہاں سردار علی احمد جان کا بے حد اثر مانا جاتا تھا۔

یہ افغانستان کی انتہائی بدقسمتی تھی۔ کہ ایسا شخص ایسے وقت میں اہم کی سرکوبی

کے لئے روانہ کیا گیا۔ جبکہ صوبہ جلال آباد میں طوائف الملوکی اپنا گھر کر چکی تھی۔ اور عہد رفتہ کی یاد عوام الناس کے دلوں میں پھر سے تازہ ہو رہی تھی۔ رعیت کا وہ مظلوم طبقہ جو ایک مدت سے حاکم و خوانین کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو رہا تھا۔ اب موقع پاکر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور درجہ وار ٹولیاں بنا کر صوبہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوٹ مار اور قتل و فساد کے ہنگامے برپا کرتا پھرتا تھا۔ نملہ میں حکومت کی شکست نے لوگوں کے دلوں سے اس کا رہا سہا ڈر بھی غائب کر دیا تھا۔ اور اب وہ بیدھڑک ہو کر قرنوں سے چھائے ہوئے افلاس کو اپنے طور پر رفع کر رہے تھے۔ ان کو اب اپنے خوانین کی بھی چنداں پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ خود بھی ایسے موقع پر اپنی باہمی آتش حسد و رقابت کی لپیٹ میں آئے ہوئے تھے۔ اور اپنے اپنے قبیلوں کے عوام کو ساتھ لئے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو نیچا دکھانے میں مشغول ہو رہے تھے۔ عامۃ الناس صدیوں کے قائم شدہ قومی دستور کے مطابق اس خصوص میں اپنے خوانین کی کھلے دل سے مدد کر رہے تھے۔ اور ایسا کرتے ہوئے انہیں طبعاً اپنے لئے لوٹ و غارتگری کی انفرادی آزادی حاصل ہو رہی تھی۔ خوانین ان کی اس آزادی کو ٹوک نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ خود ان کا بھی کام بن رہا تھا۔ گویا ملک میں انارکزم کے پھیلنے میں خوانین اور عوام کا غیر معین رشتہ و اتحاد قائم ہو چکا تھا۔ اس مقام پر میں اپنے قارئین کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کہ فیوڈل سسٹم کے مختلف دوروں میں مظلوم عوام اسی طرح اپنی کہنہ سال بدبختیوں اور صدیوں کی سوء استمالیوں[۵۱] کا اپنے سوء استعمال کرنے والوں سے انتقام لیتے رہے ہیں۔ اور اگرچہ طاقت کا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں انتقال انہیں چنداں فائدہ نہیں بخشتا تھا۔ اور وہ از سر نو پھر پہلے کی طرح کے مذمومیت کے دائروں میں پھنس جاتے تھے۔ تاہم لوٹ مار کا وہ حصہ

---

۵۱ Exploitation

جو اس طرح کے شرّ و فساد سے ان کے ہاتھ آتا تھا۔ ایک حد تک ان کی اپنی اقتصادی حالت کو سنوار دیتا تھا۔ اور وہ یہ سمجھ کر کہ پہلے کی نسبت ان کی مالی حالت کچھ بہتر ہو گئی ہے۔ ایسے شر و فساد کے آئے دن خواہاں اور متوقع رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آپ تاریخ کے پچھلے دوروں میں کثرت سے ہر مقام و ہر گوشۂ دنیا میں انسانوں کو قتل و نہب کے خونین میدانوں میں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا پاتے ہیں۔ تعلیم کا فقدان اور عقل و تجربہ کی کم مائگی عوام کو ان انقلابات سے کسی طرح کا اساسی فائدہ اٹھانے نہیں دیتی تھی۔ بلکہ ہر انقلاب کے بعد وہ پہلی سی قسم کے مذمومیت کے دائرے تشکیل کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ یہ کوئی قدامت پسندی کا جذبہ نہ تھا۔ جو انہیں ہر بار پہلی ہی سی زندگی پر قانع رکھتا تھا۔ حالانکہ ایسی زندگی سے تنگ آ کر وہ اس قسم کے اقدامات کرتے تھے۔ بلکہ ایسا کرتے ہوئے وہ مال و متاع جو اس قسم کی لوٹ کھسوٹ سے ان کے ہاتھ آتا رہتا تھا۔ ہمیشہ ہاتھ بدلتا رہتا تھا۔ یعنی وہ انسانی گروہ جو ابھی ایک دوسرے انسانی گروہ کو اس طرح تاراج کر چکا ہے۔ کل کسی تیسرے انسانی گروہ سے خود بھی تاراج ہو گیا ہے۔ وقس ہذا۔ دولت و حکومت کا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں یہ نہ رکنے والا چلاؤ انہیں ایک ہی قسم کے مذمومیت کے دائرے تشکیل کرنے سے باز نہ رکھ سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی زندگی کی تقدیر کو انہی دائرہ ہائے مذمومیت کا رہین منت سمجھا۔ پس یہی وجہ ہے کہ انسانوں کو ان زندگی کوش وادیوں کے محیط سے باہر نکلنے میں صدیاں لگ گئیں۔"

غرضیکہ افغانستان کے جن علاقوں میں غربت و افلاس تہی دستگی اور کم مائگی عام تھی۔ ان علاقوں میں شنواریوں کی اس بغاوت کا اثر اب پھیلنا شروع

ہوگیا تھا۔ اور اب یہ آفت آب سیلاب روکے سے نہیں رک سکتا تھا۔
میں نے پچھلے بابوں میں افلاس اور غربت کے ممد اسباب کی پوری تشریح کی
ہے۔ لہذا قارئین ملحوظ نظر رکھیں۔ کہ جہاں جہاں ان ممد اسباب اور ان کے
عناصر کی زور و کثرت تھی۔ وہاں وہاں یہ آگ پھیل کر رہی۔ مثلاً ترکستان میں یہ
آگ نہیں پھیلی۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہاں اگرچہ خوانین اور ملکوں کے بجائے
بائیوں[1] کا عنصر غالب تھا۔ تاہم ان بائیوں کا انحصار تنہا زراعت پر نہیں تھا۔ بلکہ
ان کی اکثریت صنعت و تجارت میں بھی ساتھ ہی ساتھ مشغول تھی۔ اور چونکہ زمین
کی نسبت سے آبادی بہت کم تھی۔ اس لئے لوگوں کو زراعت کے ذریعہ اپنی
بسر اوقات کرنے کی کافی توفیق حاصل تھی۔ اور آبادی کا بیشتر حصہ گھریلی صنعت
قالین قرہ قولی اور ریوڑ پالنے کی نفع زا تجارتوں میں مشغول تھا۔ اور اگرچہ
اعتقاد ان کے بھی فرسودہ تھے۔ تاہم ملاؤں کا زور زیارتوں اور مزاروں تک
محدود تھا۔ ہرات میں بھی اس شورش و فساد کی آگ نہ پہونچ سکی۔ اس لئے
کہ وہاں کے لوگ بھی گھریلی صنعت و حرفت میں مشغول اور وافر زمینوں پہ
اپنی زندگی کا انحصار رکھتے تھے۔ ہرات تجارت کا مرکز بھی تھا۔ اور سرحد ایران
کے اس پار مشہور شہر مشہد سے اس کی تجارت بہت زیادہ تھی۔ غرضکہ داخل و
خارج میں تجارتی اشیاء کا کثرت سے تبادلہ نقل و حمالی کے پیشہ کی فراوانی کا
باعث ہو رہا تھا۔ اور اگرچہ ترکستان و ہرات دونوں میں افلاس کا ایک ممد عنصر اپنی
ویسی ہی شدت و حدت کے ساتھ موجود تھا جیسے باقی اقطاع افغانستان میں۔
یعنی حکام کی رشوت ستانی، مگر چونکہ یہاں باقی کے دو عنصر یعنی بائیوں اور ملاؤں کا
عوام پر مطلق دباؤ نہ تھا۔ بلکہ الٹا بائی یہاں اپنے [illegible] اور صنعتی

[1] بائی سردار یا خوانین کو کہتے ہیں۔

سرگرمیوں سے عوام کے لئے کام مہیا کرتے رہتے تھے۔ اور ملّا نے یا تو بائیوں کے فیاض دستر خوانوں کے ریزہ چین بنے ہوئے تھے۔ اور یا ان علاقوں میں بوجہ چند مشہور زیارت گاہوں کے ہونے کے ان کی شکم پری کا سامان دور دور کے علاقوں اور ملکوں کے زائرین کی گرہ سے بخوبی ہو رہا تھا۔ اس لئے افلاس کی شدت و سختی یہاں عوام کے ابل پڑنے کے درجہ تک ہرگز نہ پہونچ سکتی تھی۔ اور میرا یہ دعوےٰ ہے۔ کہ جب تک ان علاقوں میں تجارت، صنعت و حرفت کو جدید زندگی نصیب نہ ہو جائے۔ اور سرمایہ دار اور مزدور میں دورِ حاضر جیسا فرق و امتیاز پیدا نہ ہو جائے۔ یہ علاقے ہمیشہ پر امن رہیں گے۔ بشرطیکہ یہ علاقے دول خارجہ کی باہمی جنگوں کا مرکز و نشانہ نہ بن جائیں۔

قندھار میں بھی اس شورش کا وقتہً اثر نہ پہونچ سکا۔ اس لئے کہ یہ بھی ایک تجارتی مرکز تھا۔ اور اس علاقہ میں ہر قسم کے میوہ جات کی بہتات ہونے کے سبب لوگ کم از کم بھوکوں نہیں مرتے تھے۔ علاوہ برآں پشم، ریوڑ اور کشیدہ کاڑھی کی تجارت و صنعت لوگوں کے لئے ایک حد تک مشغولیتیں بہم پہونچانے میں ممد تھی۔ لیکن چونکہ یہاں خوانین ملّاؤں اور حکام کی سہ گانہ کشمکش اور ظلم و استبداد کا ویسے ہی غلبہ تھا۔ جیسے سمت مشرقی و جنوبی کے اطراف میں لہٰذا یہاں بے آرامی پھیلانے والا عنصر ایک طرف غزنی اور قندھار اور دوسری طرف قندھار و ہرات کے درمیانی علاقوں میں بکثرت پھیلا ہوا تھا۔ جس کی گذر اوقات لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ پر تھی۔ اور اگرچہ بُعد مسافت اور دیگر چند وجوہات کی بنا پر یہ علاقے شروع فساد شنواری سے جلد متاثر نہ ہو سکے۔ تاہم جونہی کہ غازی امان اللہ خان کی حکومت کو کابل میں شکست نصیب ہوئی۔ ان میں حکومت امانیہ کے برخلاف ہیجان رونما ہو گئی۔ اور انہوں نے فوراً بچہ سقاؤ کا ساتھ دیا۔ قارئین یہاں اس نقطہ کو بھی نظر انداز نہ کریں

کہ ان علاقوں کی مختلف شخصیتوں اور قبائل کی باہمی مخالفت جو دور ارتقائے قوائے ثلاثہ کا ایک نتیجہ مقدرہ ہے۔ بھی غازی امان اللہ خان سے ان کی روگردانی کا کچھ کم باعث نہ تھی۔ اور اسی ایک نتیجۂ مقدرہ کا اثر تھا۔ جو سقوط قندہار کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بہرحال ان امور کا ذکر آگے آئے گا +

ہزارہ جات کا علاقہ بھی اس شر و فساد کے اثر سے آخر تک مامون رہا۔ اور اگرچہ اس علاقہ میں حاکموں کی رشوت ستانی کا شدت سے زور و شور تھا۔ تاہم یہاں کے لوگ خوانین اور ملانوں کے جابرانہ طرز عمل کے خوگر نہ تھے۔ اور چونکہ یہ نسلاً تاجک واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ان میں افغانوں جیسی قبائلی فرقہ بندیاں بھی نہ تھیں۔ بلکہ یہ ان سے کہیں زیادہ آپس میں متحد تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ ان کی شیعہ مذہبی بھی تھی۔ اہل سنت والجماعت سے ان کا مذہبی اختلاف بھی کسی حد تک ان کی باہمی تفریق کو روکے ہوئے تھا۔ اور اگرچہ غربت کی ان میں انتہا تھی۔ لیکن چونکہ ان کی قوم ساری کی ساری محنت کش ہنرمند اور کفائت شعار تھی اس لئے حالات نے بالطبع ان کو امن پسند بنائے رکھا تھا۔ بہادری میں وہ افغانوں کے ہم پلہ تھے۔ ان صفتوں کے ساتھ وہ اپنی غربت کے انتہائی اثر بد کو نامحسوس طور پر اپنے آپ سے دور کرتے رہتے تھے۔ غازی امان اللہ خان کے عہد سے پہلے ان کی بُری گت بنی ہوئی تھی۔ اور قومی بنا پر ان کی ذلت و تحقیر کی کوئی حد باقی نہ تھی۔ غیر ہزارہ اقوام ان کو بری طرح پامال کر رہی تہیں۔ اور ان بیچاروں کے لئے در حکومت ہمیشہ بند رہتا تھا۔ یہ اپنی محنت و مزدوری تجارت و صنعت کی طفیل جو کچھ اندوختہ جمع کرتے رہتے تھے۔ یا تو ان سے افغان قبائل لوٹ لیتے تھے۔ اور یا اس کا معتدبہ حصہ انہی قبائل کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے وہ اپنے حاکموں کی نذر کر دیتے تھے مگر پھر بھی ان کی دادرسی نہیں ہوتی تھی۔ چند ایک قزاقوں کی جماعتیں جو ان میں پیدا ہوگئی

نہیں۔ تو اس کی اصل وجہ ان کی غربت کی سختی نہ تھی۔ بلکہ ان افغانوں سے انتقام لینے کی خواہش ان کی تولید کا باعث ہوئی تھی۔ جو ان کو امن پسند زندگی بسر کرنے اور اپنی حالت کو سنبھالنے سے مدام روکتے رہتے تھے۔ اور بار بار ان کا مال و متاع لوٹ لے جاتے تھے۔ غازی امان اللہ خان کے تخت سلطنت پر سریر آراء ہوتے ہی ان کی تحقیر جوئی کی روک تھام ہو گئی تھی۔ اور غازی امان اللہ خان کے کارناموں میں یہ ایک سنہری کارنامہ ہے۔ کہ انہوں نے ہزاروں کو افغانوں کے بالمساوی حقوق عطا کئے۔ اور ان کو ہمیشہ کے لئے نیم غلامی سے آزاد کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے غازی امان اللہ خان نے گویا ہزاروں کو بندۂ بے دام بنا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ وہ آخر دم تک غازی امان اللہ خان کے طرفدار اور وفادار رہے۔ اگرچہ اس کے عہد کے آخری چند سالوں میں ہزاروں کو سلیمان خیل قبائل کی دست درازیوں کا جبر سہنا پڑا۔ اور حکومت نے ان کے حق میں پورا انصاف نہ کیا۔ تاہم ان کی وفا صفتی میں کوئی فرق نہ آیا +

نہایت ضروری ہے۔ کہ ہم یہاں ہزاروں اور سلیمان خیل قبائل کی باہمی کشمکش کی داستان مختصراً اپنے قارئین کے گوش گذار کر دیں۔ تاکہ سلیمان خیل قبائل نے غازی امان اللہ خان کے برخلاف جو کھیل کھیلا ہے۔ اس کی ماہیت کا ٹھیک ٹھیک علم ان کو ہو جائے۔ ایسا کرتے ہوئے ہم ہزارہ جات کی اقتصادی اور سیاسی وضعیت پر بھی کچھ روشنی ڈالیں گے +

قوم ہزارہ کی صحیح تعداد کے متعلق پوری معلومات میسر نہیں ہیں۔ لیکن یہ بہر حال افغانوں کی مجموعی تعداد سے بیشتر ہے۔ ایک طرف یہ قوم میدان ہزارہ جات کی سمت میں قندھار اور اس کے ملحقہ علاقہ جات کی حدود و وسعت میں پھیل کر قندھار کے شمال کی طرف بڑھتی ہوئی اور سلیمان خیل قبائل سے ٹکراتی ہوئی کابل کی جنوبی سمت

میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ تو دوسری طرف یہ وسط افغانستان سے نکلکر مغربی حدود فراہ وہرات کے دامنوں تک چلی گئی ہے۔ گویا افغانستان کے قلب میں واقع ہوکر اس کی آبادیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ❊

سیدان ہزارہ جات کے آس پاس سبزہ زار پہاڑ کثرت سے ہیں۔ اور یہیں پر سال کے ایک قلیل حصہ میں تھوڑی بہت کاشت ہوسکتی ہے۔ اب مختلف سلیمان خیل جو اونٹ، بھیڑ، بکریوں کے ریوڑ پالتے ہیں۔ اپنی حدود میں چراگاہوں کی قلت کے سبب ہزاروں کے علاقہ جات میں زبردستی گھس آتے ہیں۔ اور اپنے ریوڑوں کو چراتے رہتے ہیں۔ جن سے نہ صرف ان کی کشت کاری کو نقصان پہونچتا ہے بلکہ چونکہ وہ خود بھی مویشیوں کے ریوڑ رکھتے ہیں۔ اس لئے سلیمان خیل قبائل کی یہ ظلم و تعدی ان کے لئے ناقابل برداشت ہوجاتی ہے۔ اور انہی امور پر ان کی باہمی لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اور حکومت آئے دن ان کے تنازعات فیصل کرنے پر مجبور رہتی ہے مگر رشوت ستانی کا دوطرفہ زور حکام کو انصاف کرنے سے باز رکھتا ہے۔ دورامانیہ میں سلیمان خیل قبائل کی بعض شاخیں جو ہزارہ جات کے قرب وجوار میں مسکن گزین تھیں۔ اپنی سکونت ہزاروں کے علاقہ میں اختیار کرلینا چاہتی تھیں۔ ہزارہ قوم ان کے اس اقدام کی بناپر سخت برافروختہ ہوگئی تھی۔ مگر غازی امان اللہ خان کی طرف سے جو حاکم وہاں مقرر ہوکر جاتا تھا۔ وہ سلیمان خیلی قبائل سے رشوت وغیرہ لیکر الٹا ہزاروں کو دبا دیا کرتا تھا۔ ہزارے اپنی ذلت وبیچارگی کو دیکھ کر اس دوطرفہ زور کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ انہوں نے نہایت ہی مایوسی کی حالت میں اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہنے کی ٹھان لی تھی۔ اب وہ چاہتے تھے۔ کہ کسی طرح افغانستان سے نکل جائیں۔ اور کسی دوسرے ملک میں جا بسیں۔ اور اگرچہ ہزارہ قوم ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کی طرف کوچ کرجانے کی عادی تھی۔ جہاں وہ محنت مزدوری کرکے سردیوں کے

ایام بسر کرتی اور پھر گرمیوں میں اپنے مُلک کو واپس ہو جاتی تھی۔ تاہم زبان، آب و ہوا اور رسم و رواج کی غیر مانوسیت انہیں ہندوستان میں ہجرت کرآنے سے مانع تھی۔ قارئین کے یہ بھی ملحوظ نظر رہے۔ کہ ایک حصہ ان ہزارہ اقوام کا ہندوستان کے صوبہ بلوچستان کے اطراف میں بھی مسکن گزین ہے۔ اور انگریزی سیاست انہیں اپنی فوج میں بھرتی کرنے اور کئی طریق سے ان کی دلجوئی کرنے کی طرفدار ہے۔ اور اگرچہ مذکورہ بالا دونو باتیں یعنی ان کا موسم سرما میں ہندوستان میں اترنا اور ان کے ایک حصۂ قوم کا یہاں مستقل بود و باش رکھنا ان کی توجہ کو اس ملک میں ہجرت کرآنے کی طرف جلب کرسکتا تھا تاہم ان کے لئے ایک دوسری ایسی کشش بھی موجود تھی۔ جو پہلی کے اثر کو بالکل زائل کردیتی تھی۔ یہ کشش ایران کی تھی۔ جو اس وقت رضا خان پہلوی کی سرپرستی میں آچکا تھا۔ افغانستان و ایران کی پرانی اور تاریخی رقابتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں صرف اسی رقابت کو لیں گے۔ جو عہد امانیہ میں ان دو ملکوں کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسی رقابت نے ہزارہ کی تحریک مہاجرت کو مزید تقویت بخشی تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ افغانستان کا ملک عہد امانیہ سے پہلے نیم گمنامی کی حالت میں تھا۔ اور غازی امان اللہ خان نے ہی اس کو پہلی مرتبہ دنیا کی توجہات کا مرکز بنانا شروع کیا تھا افغانوں کے جذبات میں تحرک و ہیجان پیدا کرنے کے لئے تاکہ وہ ایک جوش و سرگرمی سے میدان گاہ عمل میں اس کی منشاء کے مطابق اقدامات کرسکیں۔ اسے ضروری معلوم ہوا۔ کہ وہ ان کی پوشیدہ قوتوں کو بر سرِ شہود لائے۔ اور ملت کی ان صفات کو جن سے وہ اب تک ناآشنائے محض تھی۔ متعارف و آشنا کرائے۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ملت افغانیہ کو ایرانی ملت کے بالمقابل لاکھڑا کیا۔ اور نوجوان افغانوں میں اس کے مقابلتہً قومی علو و برتری کی روح پھونکنی

شروع کردی تھی جس سے ملتِ ایران کے نونہالوں کے دلوں کو طبعاً ٹھیس لگ رہی تھی۔ اور اب جبکہ افغانوں نے میدان گاہ عمل میں کچھ کچھ قدم اٹھانے شروع کر دیئے تھے۔ تو ان کے جذبات کی بلند پروازیاں ان کیلئے اور بھی شعلہ بداماں ہو گئی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا۔ کہ عہد امانیہ کے آخری چند سالوں میں ایرانیوں اور افغانوں میں ایک دوسرے سے کھچاوٹ نمایاں طور پر موجود ہو گئی تھی۔ اور یہ لازمی تھا۔ کہ ہر دو ممالک کی سیاست میں اس کی تاثیر اپنی رنگ و بو کو ظاہر کرے۔ لہذا ایرانی حکومت نے ان ہزاروں کو جو اس کے ملک میں ہجرت کر کے بود و باش اختیار کرنا چاہتے تھے۔ خاص سہولتیں بہم پہونچانے کا عزم کر لیا تھا۔ اور چونکہ ایرانیوں اور ہزاروں، کا ایک ہی مذہب تھا۔ اس لئے ہم مذہبی کی یہ کشش موخر الذکر کی توجہ کو اول الذکر کی طرف مائل کرنے کا مزید باعث تھی۔ انجام یہ ہوا۔ کہ ایران میں ہزاروں کی ہجرت شروع ہو گئی۔ اور قبیلوں کے قبیلے ہرات کی راہ سے سرحد ایران کی طرف کوچ کر گئے۔

"اس بڑھتی ہوئی رَو کو اگر نہ روکا گیا۔ تو یقیناً یہ افغانستان کے حق میں سم قاتل ثابت ہو کر رہے گی۔ اگر ہزاروں کا ایک معتدبہ حصہ ایران میں جا بسا۔ اور انہیں وہاں ہر طرح کا راحت و آرام میسر ہوا۔ تو حکومت ایران مخالفانہ صورت میں انہی کے ذریعہ سے ان ہزارہ قبائل کو جو افغانستان میں بس رہے ہونگے۔ گمراہ کرتی رہے گی۔ اور چونکہ ایران بھی اپنے جمشیدی سازوسامان کے دیکھنے کا پھر آرزومند ہے۔ کیا عجب ہے۔ کہ وہ کل کو اس عظیم الشان قوم کی تقویت پا کر نہ صرف ہرات پر ہی اپنی فتح و ظفر کا از سر نو پھریرا لہرائے۔ بلکہ اس مقام سے کہیں آگے بڑھ کر ہزارہ جات کو اپنے تسلط میں لے آئے۔ اور اس طرح افغانوں کی رقیبانہ لن ترانیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دے۔"

خواہ ایران کی اس تمنا کا بر آنا ایک بے حقیقت سا خواب ہی کیوں نہ تصور کر لیا جائے۔ تاہم ہزاروں کی اس تحریک ہجرت کو ناکام بنانا افغانی سیاست کی رو سے ضروری تھا۔ اور افغانستان کی حکومت اس تحریک کو اسی صورت میں کمزور کر سکتی تھی جس صورت میں کہ وہ ہزاروں کی واجبی شکایات کو سنتی اور ان کا ازالہ کرتی۔ بالآخر یہ حکومت افغانستان نے مجبور ہو کر کیا۔ جس سے سلیمان خیل قبائل میں ناراضگی پھیل گئی۔ اور اس ناراضگی کا اثر اس وقت جا کر ظاہر ہوا۔ جب غازی امان اللہ خان شورشات داخلی میں گرفتار ہو گیا۔

گذرتے ہوئے ہم یہاں یہ بھی اشارۃً بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ کہ درانیوں اور غلزائیوں[۵۱] میں قدیم سے دشمنی و رقابت موجود تھی۔ اور اگرچہ اسی حال میں مدتوں گذر جانے سے یہ اب ایک معمولی واقعہ بن چکی ہوئی تھی۔ تاہم جس دن سے غلزائیوں کے ہاتھ سے حکومت منتقل ہو کر درانیوں[۵۲] کے ہاتھ لگی تھی۔ اس دن سے غلزائیوں پر بہت کم اعتماد کیا جاتا تھا۔ اور حکومت میں ان کو مناصب و عہدیداریاں بہت کم ملتی تھیں۔ کسی معقول نمائندگی کے موجود نہ ہونے کے سبب سے قدرتی طور پر ان کے دلوں میں درانی حکومت کے برخلاف خلش اور کوفت باقی رہتی تھی۔ اور وہ تقریباً ہر ایک مرحلہ پر حکومت کو اپنے حق میں ناانصاف پاتے تھے۔ اور اگرچہ افغانی قبائل میں غلزائیوں کو درانیوں پر اکثریت حاصل تھی۔ تاہم ان کے اپنے درمیان کسی نظم اور اتفاق کے نہ ہونے کے وہ اس ناانصافی کے برخلاف اپنی آواز بلند نہ کر سکتے تھے۔ اور اپنے آپ کو بیچارہ پاکر جی ہی میں کڑھ کڑھ کر خاموش ہو رہتے تھے۔

یہ اسی غلزائی قبائل کے سلیمان خیل تھے۔ جنہوں نے حکومت امانیہ کو زوال پذیر

---

۵۱ سلیمان خیل قبائل غلزائیوں کی شاخ ہے۔

۵۲ امان اللہ خان درانی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہوتے دیکھ کر اس کو پھر پاؤں جمانے نہ دیتے۔ والا بچہ سقاؤ میں کب اس کی مجال تھی۔ کہ وہ غازی امان اللہ خان کے قندھاری لاؤ ولشکر کے سیلاب عظیم کو غزنی کے قرب و جوار میں روک لیتا۔ قارئین کو شاید اس موقع پر یہ خلجان واقع ہو۔ کہ غلزائیوں نے ایسے مغتنم واقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بچہ سقاؤ کی بجائے کیوں نہ اپنی حکومت کو تشکیل کیا۔ تو اس کی وجہ جیسا کہ میں نے سلیمان خیل قبائل کے چند سرداروں سے جن سے مجھے بچہ سقاؤ کے عہد میں کابل میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اپنے اسی قسم کے سوال کے جواب میں سنا تھا۔ یہ تھا کہ نہ تو ان میں اتفاق تھا اور نہ تنظیم اور نہ ہی بدقسمتی سے ان میں کوئی ملکی سیاست دان یا مدبّر ہی موجود تھا۔ جو ایسے وقت میں ان کی راہنمائی کر سکتا۔

اس قحط الرجالی کے سبب سے وہ اس قسم کے خیالات کو جوان کے ہونہار سرداروں کو بے چین ضرور کئے رکھتے تھے۔ عملی جامہ نہ پہنا سکتے تھے۔ تاہم وہ بچہ سقاؤ کی امداد کر کے اپنے دشمن قبائل سے خاطر خواہ انتقام لے سکتے تھے۔ چنانچہ بچہ سقاؤ نے ان کی ہر قسم کی شکایتوں کو دور کرنے کے حتمی وعدے ان کو دے رکھے تھے۔ اور جہاں تک ہزارہ قوم کا ان سے تعلق تھا۔ اس کو تاخت و تاراج کرنے کی تو کھلّم کھلّا اجازت ان کو مل چکی تھی۔

پس اس سارے بیان سے یہ واضح ہوا۔ کہ گو ہزاروں میں مفلسی عام تھی۔ اور وہ افغانوں میں ذلت اور حقارت کی نظروں سے بھی دیکھے جاتے تھے۔ اور ان کو حکومت امانیہ سے چند در چند شکایات بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ تاہم چونکہ ان پر قوائے ثلاثہ کی حکم فرمائی نہ تھی اس لئے وہ حکومت کے برخلاف خواہ یہ ان کے حق میں اچھی تھی یا بُری آخر تک نہ اٹھے بلکہ اُلٹا اس کی معاونت کرتے رہے۔

اب ہم ان کو چھوڑ کر سمت جنوبی کی طرف آتے ہیں۔ یہ صوبہ ۱۹۲۴ء میں باغی ہو چکا تھا۔ اس کے باغی ہونے کے اصل اسباب وہی یہاں کے باشندوں کی انتہائی مفلسی

اور مفلسی کو عام کرتے رہنے والے ممد عناصر یعنی حاکموں، ملّانوں اور خوانین کا ان پر غلبہ اور تسلط تھا۔ حکومت نے اس بغاوت کو فرو کرتے ہی ان خوانین اور ملانوں کو موت کی سزائیں دے دی تھیں، جنہوں نے مذہب کو بنائے حیلہ قرار دے کر اس آگ کو مشتعل کیا تھا۔ اور منگل اور جدران وغیرہ کے قبیلوں کو بالکل کچل کر رکھ دیا تھا۔ تاکہ ان میں پھر سر اٹھانے کی طاقت نہ رہے۔ ان جنگجو قبائل کے بہت سے افراد یا تو جنگ میں مارے یا زخمی ہو کر بیکار ہو چکے تھے۔ اور یا شکست کھاتے ہی حکومت کے خوف سے ہندوستان کی طرف بھاگ گئے تھے۔ اور پھر حکومت نے ان کو پکڑ کر اطراف و اکناف افغانستان میں خارج البلد کر دیا ہوا تھا +

ان تعزیری کارروائیوں کی بنا پر بغاوت شنوار کی چنگاریاں یہاں جلد فروزاں نہ ہو سکیں۔ مگر حکومت امانیہ اپنے آخری لمحۂ حیات تک اس سمت سے بے خوف نہ تھی۔ اسے اپنی فوج کا ایک معتدبہ حصّہ یہاں رکھنا پڑا تھا۔ اگر بچہ سقاؤ کا حملۂ کابل دیکھتے ہی دیکھتے حالات کا نقشہ نہ بھی پلٹ دیتا۔ تو بھی حکومت کی یہاں تعزیری کارروائیوں کے باوجود ہم سمت جنوبی کو بغاوت کی آگ میں لپٹا ہوا پاتے۔ اور گو وہ قبائل جنہوں نے گزشتہ بغاوت کے موقعہ پر نمایاں حصہ لیا تھا۔ اب کی دفعہ پیش پیش نہ ہوتے۔ یا بالکل ہی حرکت نہ کرتے۔ تاہم وہ قبائل جو حکومت کی تعزیری نگاہ سے بچ رہے تھے۔ ضرور بغاوت کی تجدید کرتے ہوئے نظر آتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ کہ ان قبائل میں جو حکومت کی تعزیری کارروائیوں سے بچ رہے تھے۔ قوائے ثلاثہ کی گرفت مضبوط تھی۔ افلاس کے ممد عناصر شدت سے اپنا کھیل عوام پر اسی طرح کھیل رہے تھے۔ اور بچہ سقاؤ کے برسرِ منظر نہ آنے کی صورت میں بھی یقیناً بغاوتِ شنوار

جاری رہتی۔ سمت جنوبی کے قبائل حکومت کے خلاف ضرور اٹھ کھڑے ہوتے ایک خیال جو سمت جنوبی والوں کو اب تک لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہ تھا۔ کہ وہ سمت مشرقی کی حکومت کے برخلاف کامیابی کو یقینی نہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ سمت مشرقی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اور یہ بالکل صحیح بھی تھا اس لئے وہ واقعات کی رفتار کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن بچہ سقاؤ کے کابل پر یک لخت حملہ کرنے نے حکومت کے رعب و داب پر کاری ضرب لگا دی تھی۔ اور سمت جنوبی کے احمدزائی قبائل میں ہلچل کے آثار موجود ہو گئے تھے جس کا بیان آگے آئے گا۔

سمت شمالی کا علاقہ جہاں سے بچہ سقاؤ کا خروج ہوا۔ امیر عبدالرحمن خان کے تسلط کے بعد سے پرامن تھا۔ اس کے اسباب یہ تھے۔ کہ یہ علاقہ ایک تو دارالسلطنت افغانستان سے بالکل ہی قریب واقع تھا۔ اور حکومت ضرورت کے وقت نہایت آسانی اور جلدی سے تعزیری مہموں کو اس علاقہ کی طرف سوق دے سکتی تھی۔ دوسرے اس قربت اور ہمجواری کی وجہ سے یہاں کے عام باشندوں کو مختلف طریقوں سے اپنی روزی پیدا کرنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ مثلاً موسم زمستان میں دارالسلطنت میں جس قدر ایندھن کی ضرورت ہوتی تھی۔ سمت شمالی کے لوگ مہیا کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے علاقہ میں میوہ دار لکڑی عام اور بکثرت ہوتی تھی۔ معمولی کشت کاری کے علاوہ اس علاقہ میں انگور، اخروٹ، سردہ خربوزہ وغیرہ کی کثیر پیداوار ہوتی تھی جسے وہ دارالسلطنت اور باہر کی منڈیوں کے لئے بغرض فروخت لاتے رہتے تھے پنیر بھی جو کہ امیر و غریب کے لئے یکساں طور پر ایک دلپسند کھانے کی چیز ہے سندوں کی مقدار میں یہیں سے کابل میں درآمد ہوتا تھا۔ چہاریکار کا مشہور مقام

ترکستان کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ اور اس لیئے جس قدر اموال و اجناس
ترکستان سے کابل یا کابل سے ترکستان کی طرف آتا جاتا رہتا ہے۔ اس کا
ایک کثیر حصہ انہی باشندوں کی وساطت سے نقل وحمل ہوتا رہتا تھا۔ گویا
سمت شمالی کی گذران کا ایک معقول ذریعہ یہی نقل و حمالی تھی۔ اور بار برداری
کے بڑے بڑے پیشہ وروں سے لیکر جن کے پاس اونٹ یابو وغیرہ بکثرت ہوتے
تھے چھوٹے چھوٹے محنت کشوں تک جن کے پاس ایک آدھ گدھا ہوتا تھا۔ اسی
پیشۂ بار برداری پر اپنی بسر اوقات رکھتے تھے۔ مثلاً جس کے پاس ایک بھی گدھا نہیں
ہے۔ وہ اگر لکڑی کا ایک بار کابل تک نہیں لیجا سکتا تو ضرور بہیر کے دو بستے اپنی
وہنگی پر ڈال کر شہر کی طرف بیچنے کے لیئے چل کھڑا ہو گا۔ یا انگور کے چند ٹوکرے پیٹھ
پر لاد کر سڑک پر چلتا ہوا دکھائی دیگا۔

سمت شمالی کا علاقہ حسب قاعدۂ مقررہ فوج کے لیئے رنگروٹ بھی مہیا کرتا تھا
اور افغانی فوجوں میں غالب عنصر یہیں کے باشندوں کا ہوتا تھا۔ علاوہ مذکورہ بالا مشغولیات
کے یہاں گھریلی صنعت پارچہ بافی بھی اور صوبوں سے زیادہ تھی۔ جبل السراج چہاریکار
استالف وغیرہ مشہور مقامات پر ہر قسم کا معمولی کھدر و سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ مشہور
کابلی پٹو کی بافت کرنے والے گھرانے بھی یہیں اس علاقہ میں تھے۔ اور گو یہاں حاکموں
ملاؤں اور خوانین کا ویسا ہی زور تھا۔ جیسا کہ سمت مشرقی اور سمت جنوبی وغیرہ میں تاہم
اجناس و میوہ جات کی ارزانی گھریلی صنعت و حرفت کی موجودگی پیشۂ بار برداری کی
عمومیت تجارتی سرگرمیوں کی زیادتی معیار زندگی کی پستی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ
دار السلطنت کی قربت قوائے ثلاثہ کے سختی اور تشدد کو بہت حد تک کم کرنے میں مساعد
تھی۔ مثلاً مظلوم عوام کے دل میں یہ ایک قسم کی ڈھارس بندھی رہتی تھی۔ کہ اگر مقامی

۱ اس شکل کا ▽ ہوتا ہے جس میں پیر میں تخمیناً سیر کے قریب آجاتا ہے۔

حکام نے ان کے حق میں انصاف نہ کیا۔ تو وہ چند گھنٹوں میں کابل پہنچکر حکام اعلےٰ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور گو یہ ایک نری ڈھارس ہی ڈھارس تھی تاہم اس کا ردعمل ضرور اس مظلومیت کے درد میں تھوڑا بہت افاقہ کر دیتا تھا جس سے مجبور ہو کر ہر ایک انسان بیتابانہ چیخ اٹھتا ہے"

بیان مذکورہ سے قارئین یہ ہرگز نہ سمجھ لیں۔ کہ یہاں پر افلاس موجود ہی نہ تھا۔ البتہ یہاں افلاس کی اتنی شدت نہ تھی۔ کہ اس علاقہ کے باشندوں کو ایک مٹھی کی صورت میں حکومت کے مقابل لا کھڑا کر دے۔ اس کی وجوہات میں نے اوپر بیان کر دی ہیں۔ قوانین ثلاثہ کی سختیوں اور ظلم کا ازالہ وہاں کے مقامی اور طبعی حالات کر رہے تھے۔ لوگ اپنی محنت و مشقت سے اپنے معیار زندگی کے بلند کرنے کی توفیق پیدا کرتے تھے۔ اور قوانین ثلاثہ ان کی اس توفیق کو چھین لیتا تھا اگر وہ اپنے آپ میں از سر نو پھر اس معیار زندگی کو اونچا کرنے کی توفیق محسوس نہ کرتے ہوتے۔ جس کے نامعلوم طور پر پھر چھن جانیکا ان کو اپنی جہالت اور کم علمی کی وجہ سے پتہ نہ ہوتا تھا۔ تو ہم کوئی وجہ نہیں پاتے۔ کہ وہ کیوں ایک ربع صدی میں ایک بار بھی حکومت کے برخلاف آمادہ پیکار نہ ہوتے۔ جبکہ دوسری سمتیں کئی کئی بار اسی سمت میں باغی ہوا کیں"

میں خیال کرتا ہوں کہ قارئین اس حقیقت کے پیش نظر کہ بچہ سقاؤ نے یہیں سے اٹھ کر حکومت امانیہ کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اوپر کے بیان سے چنداں متعجب نہ ہونگے کیونکہ میں آگے چل کر بتلانے والا ہوں۔ کہ سمت شمالی بحیثیت ایک سمت کے آخری دم تک غازی امان اللہ خان کے برخلاف باغی نہیں ہوئی۔ یہ صرف بچہ سقاؤ اور اس کے چند ساتھی تھے۔ جو ہمیں یہاں سر بکف اقدامات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور ہمیں افغانستان کے مخصوص حالات کی بنا پر اس سمت والوں پر یہ الزام

بھی دھرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کہ انہوں نے بچہ سقاؤ کی معاونت بھی
کی۔ کیونکہ اگر واقعات آئندہ سے جیسے قارئین آگے چل کر ملاحظہ کرینگے۔ سمت شمالی
کے باشندوں پر معاونت کا الزام بھی عائد ہو۔ تو یہ معاونت شروع شروع میں ڈاکوؤں
کی دہشت اندازی کے زیر اثر تھی ہیں اسے کوئی معجزہ بھی تسلیم کرنے کے لئے
تیار نہیں۔ کیونکہ جو کچھ فوق العادہ ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ حکومت کے سوء تدبّر اور
مقامی حکام کی غفلت یا بددیانتی کی بنا پر ظہور ہوا۔ جنہوں نے وضعیت کی نزاکت
کو نہ سمجھا۔ اور اسے ایک عادی کھیل جان کر اپنے آپ کو دولتمند کرنا چاہا۔

اب ہم نے افغانستان کے تقریباً کل قابل ذکر حصص پر ایک چھچھلتی ہوئی
نظر ڈالتے ہوئے اپنے قارئین کے یہ امر ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے کہ
شنوار کی بغاوت کا دائرہ اشتعال کس قدر وسعت کی توفیق اپنے اندر رکھتا تھا۔
ایسا کرتے ہوئے ہم نے معلوم کیا ہے۔ کہ گو اسے بہت کم وسعت کی توفیق تھی۔
تاہم خالص افغانی علاقوں یا صوبوں میں اس کی آگ کا پھیل جانا کچھ انہونی بات
نہ تھی۔ اور یہی عنصر ملک میں اساسی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں
ہوا۔ جس کی وجہ میں نے اوپر بیان کر دی ہے۔ کہ بچہ سقاؤ نے منظر پہ آن کر
جھٹ واقعات کے طبعی بہاؤ کا رخ پلٹ دیا تھا۔ ورنہ میرے حساب سے اگر
بچہ سقاؤ صفحۂ عام پر مشہود نہ کرتا۔ اور بغاوت شنوار دوام پکڑتی۔ تو شدہ شدہ
خالص افغانی علاقے اس میں اشتراک کرنے کے بغیر نہ رہ سکتے۔ قارئین پر واضح
رہے۔ کہ میں سمت شمالی کو خالص افغانی علاقہ نہیں شمار کرتا۔ کیونکہ یہاں افغانوں
کے ساتھ اور تاجک وغیرہ قومیں بھی آباد ہیں) لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے۔ کہ اگر
بغاوتِ شنوار حکومت امانیہ کے برخلاف کامیاب ہو جاتی۔ تو اس صورت میں ملک
میں قومی جنگ کا سلسلہ ایک نامتناہی صورت اختیار کر جاتا۔ اور غازی

امان اللہ خان کے علیحدہ ہوجانے پر سلطنت کے دعویدار کثرت سے پیدا ہوتے اور مدتوں تک آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تحقیق یہ افغانستان کی انتہائی خوش قسمتی تھی۔ کہ غازی امان اللہ خان کے مقدرہ زوال کی صورت میں کھیل کا پانسہ بچہ سقاؤ کے حق میں پڑا۔ کیونکہ ایسا واقع ہونے سے افغانیوں کے لئے دو ہی راہیں کھلی تھیں۔ وہ یہی کہ یا تو وہ ایک ایسے شخص کی متابعت کرلیں۔ جو ان کی قوم میں سے نہیں ہے۔ اور یا پھر متحد ہوکر اس سے لڑیں۔ اور افغانی حکومت کو افغانستان میں پھر بحال کریں۔ اور اگر ان میں بدقسمتی سے اتحاد نہ بھی قائم ہوسکے اور ان کا ایک حصہ متابعت کرلے۔ مگر دوسرا حصہ لڑائی پر کمر باندھے رکھے۔ تو ہر دو صورتوں میں لڑنے والا افغانی فریق ایک نصب العین کے ماتحت جنگ کرتا ہوا اگر بچہ سقاؤ کا تختہ الٹ دینے میں کامیاب ہوجائے گا۔ تو وہ جسکو اپنا بادشاہ منتخب کرے گا۔ وہی افغانستان کا بادشاہ ہوگا۔ اور مخالف افغانی قبائل اس کی مخالفت نہ کرسکینگے۔ علی الخصوص وہ حصۂ قبائل جس نے بچہ سقاؤ کی اطاعت قبول کر رکھی تھی۔ کیونکہ اگر ان میں پہلے سے ہمت اور جان ہوتی۔ تو وہ بچہ سقاؤ کی اطاعت کرنے کی بجائے افغانستان کی بادشاہت کے لئے خود اپنا امیدوار کھڑا کرکے اس سے لڑتے ۔

لیکن اگر بچہ سقاؤ کے ہاتھ میں بادشاہت کے منتقل ہونے کی بجائے سمت مشرقی کی بغاوت کامیاب ہوجاتی۔ اور غازی امان اللہ خان میدان سے چلا جاتا۔ تو افغانی قبائل جن کی رقابتانہ زندگی اظہر من الشمس ہے۔ بادشاہت کے انتخاب پر ضرور جھگڑتے۔ اور قومی تعصب افغانوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل لا کھڑا کرتا۔ اور نتائج نہ معلوم کس قدر وخیم و سقیم نکلتے ۔

قارئین سے گذارش ہے کہ وہ اس نقطہ کو ہرگز فراموش نہ کریں۔ کہ میں نے

افلاس کی کہانیاں کہتے ہوئے ملک کی اس اقتصادی بنیاد کو کھود کر ان کے سامنے پیش کیا ہے جس پر افغانستان کے ملک کے باشندوں کی سیاسی، معاشرتی، تمدنی، قومی، علمی اور مذہبی تعمیر ڈھلی ہوئی تھی۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ سب کچھ کسی ملت کے درجۂ اقتصاد کی بنیاد کا مظہر ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام کے وجود کا ظہور چونکہ ساتھ ہی ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے تجربہ کی آنکھ اکثر دھوکا کھا جاتی ہے۔ اور ان کی تولید کے تقدم و تاخر کی نسبت اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ بہر حال حقیقت خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ مگر اس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ یہ تمام اپنی قوتوں کا اثر ایک دوسرے پر پھینکتے رہتے ہیں۔ کسی ملت کی سیاست، معاشرت، تمدن، قومیت، علمیت، مذہب اور اقتصاد اس کی ذہنی ساخت پر علیحدہ علیحدہ اور کبھی ایک ایک دو دو کی موافقت سے اور پھر یکجائی کی صورت میں موافق و مخالف دونوں قسم کے اثرات وارد کرتے رہتے ہیں جس سے وہ دور تشکیل ہوتا ہے۔ جسے ہم کسی ملت کے ایک خاص دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس دور کے تشکیل کرنے میں وہ طبعی حالات بھی ہوتے ہیں جس کے ماتحت کوئی ملت بس رہی ہوتی ہے۔ مگر یہاں ہماری بحث کے لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ مجموعی دور جو تشکیل ہوتا ہے۔ اپنے اجتماعی اثرات سے کسی ملت کی سیاست و معاشرت وغیرہ کو خوراک بہم پہونچاتا رہتا ہے۔ اور خود ان کے فردی اثرات سے ڈھلتا سنورتا یا بگڑتا رہتا ہے۔ پس وہ یہی نقطہ تھا۔ جسے میں نے اوپر اپنے قارئین سے فراموش نہ کرنے کی التجا کی تھی۔ جہالت، لاعلمی، قدامت پسندی اور افلاس نے مل جل کر افغانستان کے باشندوں کی مذہبی ذہنیت کو ضرورت سے زیادہ محسوس بنا رکھا تھا۔ اور یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ لوگوں کی

یہ جلد متاثر ہونے والی ذہنیت وقت پر حکومت کے برخلاف ان کے طبائع کے ناراض اور مشتعل کرنے کا باعث نہ بنتی ۔ پس بغاوت شنوار کے شروع ہونے سے پہلے اور اس کے شروع ہونے کے بعد سے مذہبی ناراضگی کی یہ رو بلا تخصیص ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی ۔ اور اپنا مخصوص اثر ہر مقام پر پیدا کر رہی تھی ۔ لہٰذا سمت شمالی بھی اس سے مستثنےٰ نہ تھی ۔ اب یہ سوء استعمال کرنے والوں کی طاقتوں اور قدرتوں پر موقوف و منحصر تھا ۔ کہ وہ اس کو کس طریقہ سے اپنے مقاصد کی انجام دہی کیلئے استعمال کرتے ہیں ۔ بچہ سقاؤ نے اس رو سے جو کام لیا ۔ قارئین خود ان حالات سے اندازہ لگا لینگے ۔ جو آگے آئیں گے ۔

سردار علی احمد جان کے رئیس تنظیمیہ بنکر جانے کے وقت سمت مشرقی میں طوائف الملوکی جس زوروں پر تھی ۔ قارئین اب اس سے اچھی طرح آگاہ ہیں ۔ اور اب وہ اس حقیقت سے بھی نا آشنا نہیں ہیں ۔ کہ ملک کے اندر طوائف الملوکی پھیلانے والوں کی ذہنیت قائم شدہ حکومت کے برخلاف کیا کچھ ہو سکتی تھی ۔ حکومت کی کامیابی کی صورت میں انہیں اپنے جان و اموال کے ضائع ہونیکا خطرہ تھا ۔ اس لئے وہ حکومت کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار نہ ہو سکتے تھے ۔ حکومت کی طرف سے شاہی اعلان معافی کی بھی اب کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہی تھی ۔ بلکہ وہ الٹا اُسے حکومت کا ایک جھانسہ یا فریب تصور کرتے تھے ۔ بغاوت کو جاری رکھنے کا ان کے ہاتھ معقول بہانہ بھی آیا ہوا تھا ۔ اور وہ ملت کی جہالت کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے مذہبی جذبات کو حکومت کے برخلاف اکسانے میں کامیاب ہو رہے تھے ۔ پس سردار علی احمد جان کے لئے یہ ایک نہایت ہی دشوار گذار مرحلہ تھا ۔ اور وہ سوائے اس کے کہ اپنی شخصیت کے اثر کے ماتحت عملاً باغی شدہ اور اس سے جلد متاثر ہونے والے قبائل کا جرگہ بلائیں ۔ تاکہ امن کی کوئی معقول راہ نکل سکے ۔ اور کوئی چارہ نہ رکھتا تھا ۔

اس کی انہوں نے کوشش کی۔ اور اگرچہ شنوار کے قبیلہ کے نمائندے اس جرگہ میں شامل نہ ہوئے۔ تاہم دیگر قبائل کے نمائندوں نے جرگہ میں شامل ہونا قبول کر لیا۔ دوران جرگہ میں معلوم ہوا۔ کہ حکومت کے برخلاف مواد اس درجہ پک چکا ہے۔ کہ اب موجودہ حکومت کے حق میں امن قائم ہونا ناممکن سا ہو گیا ہے۔ اس جرگہ کا پہلا مطالبہ یہ تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان تخت افغانستان سے بالکل دست بردار ہو جائیں۔ جب تک وہ تخت پر ہیں قبائل کسی طرح ہتھیار رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ حکومت کی طرف سے ہر قسم کے وعدے وعید دیئے گئے۔ مگر چونکہ ان کو ان وعدوں پر اب اعتبار ہی نہ رہا تھا۔ اس لئے وہ ان وعدوں کی طرف چنداں اعتنا ہی نہ کرتے تھے۔ اب قارئین خود ہی ملاحظہ کریں۔ کہ جب جرگہ میں اس قسم کا مطالبہ زیر بحث ہو۔ تو اس سوال کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر تھا کہ اچھا اگر تم غازی امان اللہ خان کا عزل چاہتے ہو۔ تو اس کے بعد کون ایسا آدمی موجود ہے۔ جسے تم اپنا آئندہ بادشاہ منتخب کرو گے۔ کوئی ایسی شخصیت جس پر قبائل کا کلی اعتماد ہو۔ افغانستان میں موجود نظر نہ آتی تھی۔ اگر غازی امان اللہ خان اپنے بڑے یا چھوٹے بیٹے کے حق میں دست بردار ہو جائے۔ تو قبائل کو اس سے طمانیت نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس صورت میں انہیں یہ خوف ہو سکتا تھا۔ کہ ملک میں امن قائم ہو جانے کے بعد کہیں غازی امان اللہ خان نئے سرے سے پھر بادشاہ نہ بن جائے۔ ان کی معین السلطنت سردار عنایت اللہ خان پر نظر پڑ سکتی تھی۔ مگر اس کی شخصیت کو ملک میں چنداں اہمیت حاصل نہ تھی۔ سردار محمد نادر خان ملک سے باہر اور تقریباً اس وقت لوگوں کے ذہن سے بالکل بھولا ہوا تھا۔ چوتھی شخصیت خود اس شخص کی تھی جس نے یہ جرگہ طلب کیا تھا یعنی خود سردار علی احمد جان کی شخصیت۔ اور چونکہ اس وقت مہم کی سربراہی بھی اسی کے سپرد تھی۔ یہ بالکل ایک طبعی امر تھا۔ کہ جرگہ میں قبائل کے نمائندوں کی ایک

کثیر تعداد اسی کے حق میں رائے دے ٭

یہ بعد میں ثابت ہو چکا ہے۔ کہ سردار علی احمد جان نے ان تمام واقعات کی اطلاع غازی امان اللہ خان کو کر دی تھی۔ مجھے اس امر کی تصدیق محمود خان یاور سے ہوئی تھی۔ جبکہ وہ اور میں اکٹھے ایک ہی کوٹھڑی میں بچہ سقاؤ کی قید میں تھے۔ البتہ اس نے اپنی نسبت مجھ سے یہ بیان کیا تھا۔ کہ سردار علی احمد جان نے گو اپنے وہاں پہونچنے کے ساتھ ہی اسے قبائل کی قید سے چھڑا لیا تھا۔ تاہم اسے کابل واپس لوٹنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ اسے شاہی نظر بند کے طور پر اپنے ساتھ رکھا تھا ٭

محمود خان یاور کے اس ایک بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے۔ کہ سردار علی احمد جان کے دل میں چونکہ بادشاہت لینے کی ٹھن چکی تھی۔ اس لئے اس نے اسے اس خوف سے کابل نہ جانے دیا۔ کہ یہ اس کا اندرونی راز غازی امان اللہ خان کے پاس جا کر نہ سنا سکے۔ مگر میرے پاس اس مذکورہ بالا خیال کی تردید کرنے کے لئے کافی وجوہات موجود ہیں۔ اولاً یہ کہ سردار اور یاور کی آپس میں سخت عداوت اور رقابت تھی۔ اور شاید یہ رقیبانہ جذبہ بھی اس کی نظر بندی کے منجملہ بواعث میں سے ایک ہو۔ کیونکہ ہم اندرونی جذبات کے مطالبات کو فطرت انسانی پر اثر انداز ہونے سے نہیں روک سکتے۔ دوم سردار نے یاور کو قبائل کی قید سے اپنی شخصی ذمہ داری پر چھڑایا تھا۔ اور ممکن ہے۔ کہ قبائل نے سردار سے یہ شرط لے لی ہو۔ کہ وہ اسے کابل جانے کی اجازت نہیں دیگا۔ یہاں یہ ایک خیال بھی آتا ہے۔ کہ اگر سردار یاور کا صفایا چاہتا۔ تو یہ اس کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس کا ایک اشارہ انہی قبائل کے ہاتھوں اسے محو کرا دیتا جن کی قید میں وہ موجود تھا۔ یہ ایک خیال اس رقیبانہ جذبات کی قدر و قیمت کو

اور بھی کم کر دیتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر سردار نے یاور کو نظر بند رکھا ہو۔
سوئم محمود خان یاور خود قبائل کے مطالبۂ عزل غازی سے باخبر تھا۔ اور اس کی اپنی ناکامی کا اصل باعث بھی اس مطالبہ کے بالمقابل اس کی اوسان خطائی تھی یعنی وہ قبائل کے اس مطالبہ کو سنکر اتنا ہراسان ہو گیا تھا۔ کہ اسکی عقل کوئی سیاسی توڑ پیدا ہی نہ کر سکتی تھی۔ اس نے قبائل سے یہ کہکر کہ ایسا ہونا ناممکن محض ہے۔ اپنے اور ان کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل کر لی تھی۔ مگر سردار نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے تدبّر کو برتا۔ اور وہ کسی حد تک باغی قبائل کا اعتماد رفتہ پھر حاصل کر سکا۔ ایسے حالات کے ہوتے ہوئے یہی ایک سیاسی حربہ رہ گیا تھا۔ جو بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی کی سریع الرفتاری میں ضرور ی روک پیدا کر سکتا تھا۔ اور باغی قبائل کے غصہ اور جوش کو بتدریج ٹھنڈا ہونے کی طرف مائل کر سکتا تھا۔ لہٰذا محمود خان یاور کی قبائل کے اس مطالبہ سے باخبری بجائے خود ایک زبردست تردیدی دلیل ہے۔ جو سردار کی نیک نیتی کے حق میں استعمال کی جا سکتی ہے۔ اگر سردار کے آنے سے پہلے قبائل کا یہ مطالبہ موجود نہ ہوتا۔ تو یہ کہا جا سکتا تھا۔ کہ سردار نے آ کر اپنی طرف سے یہ مطالبہ قبائل کے منہ میں ٹھونس دیا تھا۔ مگر جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ واقعات ایسا ظاہر نہیں کرتے۔ تاہم یہ ایک فطرتی امر رہ جاتا ہے۔ کہ سردار جیسے امنگ پرور دل میں اپنے لئے بھی امید کی کوئی کرن موجود ہو۔ اور وہ اس کھیل کو جہاں تک غازی امان اللہ خان کی ذات سے اس کا تعلق تھا۔ باہمی رضامندی سے ختم کرنا چاہتا ہو۔

اور اگر تھوڑی دیر کے لئے بفرض محال یہ امر مان بھی لیا جائے۔ کہ سردار کے دل میں غازی امان اللہ خان سے تخت سلطنت چھیننے کی ٹھان چکی ہوئی تھی۔

اور وہ اس بات کا عزم کر چکا ہوا تھا۔ کہ انہی مشرقی قبائل کی مدد سے اپنے مقصد کو حاصل کریگا۔ تو لازمی طور پر اسے کابل پر چڑھائی کرنی پڑتی تھی۔ اور غازی امان اللہ خان سے اس کا مقابلہ ہونا ناگزیر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی فوجوں کو لے کر کابل کی طرف اقدامات کرتا۔ اس کے لئے مقدم تر یہ تھا۔ کہ سمت مشرقی کے کل قبائل سے اپنی بادشاہت منواتا۔ اور اپنے حکام و افسر ہر جگہ مقرر کر کے وہاں امنیت پیدا کرتا۔ اور پھر کابل کی طرف بڑھتا۔ مگر جب وہ کابل پر چڑھائی کرنے کے لئے کوچ کرتا۔ تو بعینہ اسی طرح جیسا کہ بغاوت منگل کے موقعہ پر ہوا تھا۔ ایسی جنگ مذہبی جنگ نہ رہتی۔ بلکہ یہ مذہبی جنگ سے ایک ملکی جنگ میں تبدیل ہو جاتی۔ اور مرکزی حکومت جس کی ماتحتی میں باقی سارا افغانستان ہوتا۔ اس ملکی جنگ کو بڑی آسانی سے کچل سکتی تھی۔ کیونکہ لوگوں کے خیالات کا نقطہ محور بالکل بدل جاتا۔

سرداران امورات سے کوئی ناآشنا نہ تھا۔ وہ اپنے ملک اور اپنے قبائل کے حالات و طبائع کو خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ اور اگر اس کے دل میں اپنی بادشاہت کے قائم کرنے کا کوئی خیال تھا بھی (اور میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایسا خیال اسے ضرور تھا)۔ تو اس کو وہ غازی امان اللہ خان کی اجازت و رضامندی سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر صورت حالات ایسے ہو جاتے۔ جن سے غازی امان اللہ خان یہ نتیجہ اخذ کر لیتا۔ کہ اب اس کا افغانستان میں رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ تو وہ بڑی خوشی سے سلطنت کی باگ سردار کے حوالہ کر دیتا۔ جیسا کہ اس نے کابل سے کوچ کرتے وقت سردار عنائت اللہ خان کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ یا جیسا کہ بقول بعض قندھار سے جاتے وقت خود سردار کو اس نے اپنی بادشاہت تشکیل کرنے کا امر فرمایا تھا۔

میں کسی گذشتہ مقام پر کہہ آیا ہوں ۔ کہ سردار کو امان اللہ خان کے ہاتھوں جو ذلت نصیب ہوئی تھی ۔ اس کا سردار جیسے غیور دل پر جو اثر ہو سکتا تھا ۔ قارئین بخوبی اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ لیکن سردار کا وہ ماحول جس کے اندر اس کی شخصیت محصور تھی ۔ اتنا قوی نہ تھا ۔ کہ وہ غازی امان اللہ خان سے تخت چھین لینے کے ماحول میں تبدیل ہو سکتا ۔ اور چونکہ سردار خود ایک عقلمند آدمی تھا ۔ وہ خوب جانتا تھا ۔ کہ غازی امان اللہ خان کی شخصیت کو اس طرح سے وہ گہن نہیں لگا سکتا ۔

اور اگر تھوڑی دیر کے لئے پھر ایک دفعہ ہم فرض کر لیں ۔ کہ اسکے دل میں اسطرح سے ہی تخت حاصل کرنیکی ٹھن چکی تھی ۔ خواہ نتیجہ اس کی تباہی کی صورت ہی میں کیوں نہ نکلتا ۔ تو پھر ہمیں دونوں فریقین کی طاقتوں کا موازنہ و مقابلہ کرنا پڑے گا ۔ اور جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے ۔ غازی امان اللہ خان سمت مشرقی کو چھوڑ کر اب تک سارے افغانستان کا حکمران تھا ۔ اس کے پاس خزانہ تھا ۔ اعلےٰ قسم کا سامان حرب تھا ۔ حکومتی تنظیم تھی ۔ دوسرے علاقے شورو شر سے محفوظ تھے ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صرف چند ہفتوں کے اور گذر جانے کے بعد سردیوں کے موسم کے خاتمہ تک اس کو سردار علی احمد جان کی طرف سے چڑھائی کا کوئی خطرہ ہی نہ ہو سکتا تھا ۔ کیونکہ سمت مشرقی کے لوگ اپنی بے سروسامانی کی وجہ سے برفانی علاقوں سے گذر کر کابل تک نہ پہونچ سکتے ۔ اس اثنا میں امان اللہ خان کو اس قدر کافی وقت مل سکتا تھا ۔ کہ وہ تازہ دم فوجوں کا ایک لشکر جرار سردار علی احمد جان کی سرکوبی کے لئے از سر نو تیار کر سکتا ۔ ادھر سردار کے پاس بے سروسامانی کے سوا اور کچھ میسر نہ تھا ۔ سمت مشرقی کا خزانہ لٹ چکا تھا ۔ رسد و رسائل کے جو ذخیرے تھے وہ بھی نہ رہے تھے ۔ صوبہ کے اندر آمد و رفت کے ذرائع سب کے سب پامال خراب اور منقطع ہو چکے ہوئے تھے ۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا ۔ اور وہ چند لاکھ روپے جو سردار کے

خزانہ میں موجود تھے۔ موسم سرما کے گذر جانے سے پہلے پہلے صرف ہو جانے یقینی تھے۔ قبائل جنہوں نے ابھی ابھی لوٹ مار سے اپنے دامن بھرے تھے۔ کسی حالت میں بھی سردار کی مالی مدد کرنے پر تیار نہ ہو سکتے تھے۔ سردار ایسے وقت میں ان سے زمینوں کا مالیہ بھی وصول نہ کر سکتا تھا۔ بغیر پیسہ کے سردار کے لئے یہ بالکل غیر ممکن تھا۔ کہ وہ کسی باقاعدہ فوج کو اپنے جھنڈے تلے جمع رکھ سکے۔ سردار کے پاس حکومت کی جو باقاعدہ فوجیں موجود تھیں۔ ان کی تنخواہ وہ کسی طرح روک نہ سکتا تھا۔ اور جب اس کے خزانے ہی خالی ہوتے۔ تو ان کو تنخواہیں کہاں سے دے سکتا تھا۔ جب ان باقاعدہ سپاہیوں کو تنخواہیں نہ ملتیں۔ اور وہ اپنی مرکزی حکومت کو بھی ابھی کابل میں موجود پاتے۔ تو وہ ایک دن کے لئے بھی سردار کے پاس نہ ٹھہرتے۔ بلکہ بہت جلد تتر بتر ہو جاتے۔ اور کیا عجب تھا۔ کہ جیسے جلال آباد میں امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد مشتعل سپاہیوں نے سردار محمد نادر خان کی مشکیں کس لی تھیں۔ اور غازی امان اللہ خان کے پاس اس کو اس کے باپ کے قاتل کی حیثیت میں پکڑ کر لے آئے تھے۔ ویسے ہی سردار علی احمد جان کی مشکیں کس کر ایک باغی کی حیثیت میں اس کو کابل کو نہ لیجاتے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوتا۔ تو قبائل کی باہمی دشمن داریاں اس دوران میں قبائل ہی کو نچلا نہ بیٹھنے دیتیں۔ اور وسائل کی کوتاہی سردار کو ان میں نظم قائم رکھنے سے باز رکھتی جس سے سردار خود ان کی باہمی جنگ کا نشانہ بن جاتا۔ چنانچہ بالآخر ٹھیک اسی طرح ہو کر رہا۔

غرضکہ ان حالات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے۔ تو سردار کی عقلمندی ہرگز ان کمیوں کے محسوس کرنے سے قاصر نہ رہ سکی ہو گی۔ اور اسلئے ہرگز اپنی تباہی کے اقدام پر جرأت نہ کر سکتا تھا۔ اس کی زور و طاقت کے پلڑے میں ایک ہی شئے وزنی تھی۔ اور وہ غازی امان اللہ خان کے برخلاف مذہبی جوش تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں۔ سردار کے اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہی اس جوش کی نوعیت بدل جانی تھی۔

جس کو سردار گذشتہ تجربہ کی بنا پر اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا۔ پس میرا یقین ہے۔ کہ سردار نے جو وضعیت سمت مشرقی میں جا کر اختیار کی تھی۔ وہ قبائل کو رام کرنے کے لئے صرف ایک سیاسی چال تھی۔ اور جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا۔ یا کرتا تھا۔ اس میں غازی امان اللہ خان کے علم و مرضی کو ضرور دخل تھا۔

مابعد کے واقعات کیا کچھ ظاہر کرتے اور افغانستان میں کیا کچھ ظہور میں آتا۔ سوء اتفاق سے اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ابھی سمت مشرقی میں جرگہ بازی اور بادشاہ کے عزل کے مطالبے ہو ہی رہے تھے۔ کہ بچہ سقاؤ نے ایک دو سو مسلح اور تین چار سو نہتے آدمیوں کے ساتھ اچانک کابل پر حملہ کر دیا۔ ہم اس اچانک حملہ کی روئداد ذرا بعد میں بیان کرینگے۔ اس سے پہلے قارئین کو ہم اس اچانک حملہ کی تحریک کے اسباب پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ان پر یہ اچھی طرح روشن ہو جائے۔ کہ اس دوران میں سمت شمالی میں کیا کچھ واقعات گذرے۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے ایسی من چلی تحریک کا باعث بن گئے۔ ایسا کرتے ہوئے ہم سب سے پہلے قارئین کو بچہ سقاؤ سے متعارف کرتے ہیں:-

دراصل اس شخص کا نام حبیب اللہ تھا۔ مگر رہزنی کا پیشہ اختیار کرنے کے ساتھ ہی یہ بچہ سقاؤ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ ایک بالکل معمولی غریب اور گمنام شخص تھا۔ اس نے افغانستان کی اس فوج میں جسے ۱۹۲۱-۲۳ء میں جمال پاشا نے آکر ترتیب دیا تھا ملازمت کی تھی۔ اس فوج کا نام قطعۂ نمونہ رکھا گیا تھا۔ یہ گویا ایک نمونہ تھا جس پر افغانستان کی کل فوج نے تیار ہونا تھا۔ بشرطیکہ غازی امان اللہ خان اس کو پسند کریں۔ اس فوج میں میں خود بھی کپتان کا عہدہ رکھتا تھا۔ لیکن کسے خبر تھی۔ کہ ان سپاہیوں میں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے۔ جس نے آگے چل کر اس حکومت کا تختہ الٹ دینا ہے۔ جس کے بالمقابل وہ خود ایک ذرہ بیمقدار سے بھی کمتر اور کہتر تھا۔ غازی جمال پاشا کے

افغانستان سے چلے جانے کے کچھ مدت بعد اس فوج کو توڑ دیا گیا تھا۔ مگر ابھی اس کو توڑے ہوئے بہت عرصہ نہ گذرا تھا۔ کہ بغاوت منگل پھوٹ پڑی تھی۔ اور حکومت کو پھر ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ کہ اس فوج کو پھر جمع کیا جائے۔ چنانچہ اسی قطعہ نمونہ کی فوج نے بغاوت منگل میں خوب خوب داد شجاعت دی تھی۔ اور افغانستان کی کل دیگر افواج پر اپنی فوقیت کا سکہ جما دیا تھا۔ اس فوج کے سپاہی زیادہ تر شنش کردہی کابل اور کوہستان یعنی سمت شمالی کے باشندے تھے۔ اور ان کو بغاوت منگل کے فرو ہونے تک محاذ پر ہی رکھا گیا تھا۔ بچہ سقاؤ بھی اس تمام عرصہ میں اپنے بادشاہ کی طرف سے باغی منگلوں سے لڑتا رہا تھا۔ جب ایک ڈیڑھ سال کی مشقت کے بعد یہ فوج کابل میں واپس آئی۔ تو اس کو ارک کابل میں جگہ دی گئی تھی۔ اس فوج کے سپاہی اب اپنے گھروں کو رخصت پر جانے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ مگر حکومت ابھی ان کو رخصت دینا نہ چاہتی تھی۔ ان کی طرف سے رخصتی کا مطالبہ بہت دیر سے ہو رہا تھا جس کو حکومت نے اب تک قبول نہیں کیا تھا۔ لہذا اب یہ تنگ آکر ایک ایک دو دو کر کے بلا رخصت فوج سے غیر حاضر ہونے لگ گئے تھے۔ اور چونکہ وہ آس پاس کے ہی علاقوں کے باشندے تھے۔ اس لئے وہ باسانی دو تین دنوں کے اندر اندر اپنے گھروں سے ہو کر فوج میں پھر حاضر ہو سکتے تھے۔ ان کے گھروں کی قربت نے ان کو بلا رخصت چلے جانے پر اور بھی دلیر کر دیا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسری فوجوں میں بھی غیر حاضریاں کثرت سے ہو رہی تھیں۔ لہذا حکومت نے اس عدم ضبط کی وبا کو دیکھ کر کابل کے ہر چہار طرف ان گذرگاہوں پر جو قریب قریب کی دیہاتی آبادیوں کی طرف جاتی تھیں۔ پہرے مقرر کر دیئے تھے۔ تاکہ جو سپاہی بھی ان کو جاتا ہوا ملے۔ اسے واپس کر دیں بچہ سقاؤ بھی اپنے چند ساتھیوں کو لے کر اپنے گھر کوہستان کی طرف جا رہا تھا۔ کہ راستہ میں اس کی مٹھ بھیڑ حکومت کے پہرہ داروں سے ہو گئی۔ جنہوں نے بچہ سقاؤ اور اس کے

ہمراہیوں کو ٹوکا۔ پہرہ داروں اور ان کے درمیان آپس میں تو تو میں میں ہوگئی۔ اور نوبت گالی گلوچ سے گذر کر ایک دوسرے کو مارنے کی دھمکیوں تک جا پہونچی۔ آخر الامر بچہ سقاؤ جو ایک کہنہ مشق نشانچی تھا۔ غصہ میں آکر اپنی بندوق کو داغ بیٹھا جس کی گولی پہرہ داروں میں سے ایک کے سینے کے پار ہوگئی۔ اور وہ وہیں پر ڈھیر ہوگیا۔ پھر تو ان دونوں فریقوں میں جنگ شروع ہوگئی اور کچھ دیر تک گولیوں کے تبادلہ کے بعد پہرہ داروں کا ایک آدھ آدمی اور زخمی ہوگیا۔ اور وہ بھاگ نکلے۔ بچہ سقاؤ نے اس مردہ سپاہی کی بندوق بھی اٹھالی۔ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے راستہ پر ہولیا۔ لیکن اب اسے حکومت کا خوف تھا۔ اول وہ بے اجازت فوج سے نکل آیا تھا۔ دوسرے اس نے اپنے ایک بھائی سپاہی کو مارا تھا۔ اور اس کی بندوق چھین لی تھی۔ اب وہ اپنی فوج میں واپس نہیں جاسکتا تھا۔ اور اس ڈر سے کہ مبادا کل کو اسے حکومت گرفتار کرکے مار دے۔ اس نے یاغی گری کا پیشہ اختیار کرلیا تھا افغانستان میں یاغی اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو کسی جرم کی بنا پر حکومت کے خوف سے روپوش ہوکر قطاع الطریقی اور قتل و راہزنی کا پیشہ اختیار کرلے۔ اور اپنے آپ کو قانونِ وقت کے حوالہ نہ کرے +

ایسے یاغی لوگ ملک کے پیشہ ور ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہوجاتے تھے۔ اور اپنی بقیہ زندگی ڈاکوؤں کی طرح گذار دیتے تھے۔ بچہ سقاؤ کچھ دنوں ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر ڈاکے وغیرہ ڈالتا رہا۔ لیکن بعد میں اس نے خود اپنی ایک جماعت مرتب کرلی۔ جو غیر محفوظ قافلوں اور اکے دکے مسافروں کو ادھر ادھر کوہستان و کوہ دامن وغیرہ میں لوٹتی پھرتی تھی۔

عام طور پر ڈاکو سردیوں میں منتشر ہوجاتے تھے۔ کیونکہ برفباری کے سبب ان کی پناہ لینے کی جگہیں جو اکثر پہاڑوں کے دشوار گذار حصوں میں واقع ہوتی تھیں۔ ناقابل رہائش ہوجاتی تھیں۔ اور گرمیوں میں یہ گروہ پھر اپنی پناہ گاہوں سے نکلکر اکٹھا ہوجاتا تھا۔ سردیوں سے بچنے کے لئے ان کی پناہ گاہیں یا تو سرحد پار کے علاقہ جات تھے۔ اور یا پھر

ان ہی کے اپنے علاقوں میں ان کے خویش اقربا یا رفیق و دوست ان کے لئے پناہ گزینی کے مسکن مہیا کرتے تھے۔ اگر ڈاکو عادی اور قدیمی ہیں۔ تو ان کے چند ساتھی ضرور بستیوں میں عام شہریوں کے لباس میں رہ کر ان کی محافظت خوراک اور سودیگر ضروریات کا بندوبست کرنے پر مامور ہوتے تھے۔ اور اگر حوادث نے ان کو ڈاکو بنادیا ہے۔ تو پھر ان کے عزیز رشتہ دار جن کا ان سے خونی رشتہ وغیرہ ہوتا تھا۔ ان کی حاجات کو ہی کے کفیل اور بروقت ضرورت ان کو محفوظ کرنے کے سررشتہ دار ہوتے تھے۔ پھر ان ڈاکوؤں کے تعلقات یہیں تک محدود نہیں رہتے تھے۔ بلکہ جب انہیں کسی قدر شہرت نصیب ہو جاتی تھی۔ تو حاکم اور خوانین وغیرہ اکثر ڈر یا طمع سے ان کے ساتھ مل جایا کرتے تھے۔

اسی عادت جاریہ کے ماتحت بچہ سقاؤ کا گروہ شدہ شدہ طاقت اور شہرت پکڑتا گیا۔ وہ اب پہلے کی نسبت دلیری کے ساتھ ڈاکے ڈالنے لگ گیا تھا۔ اور لوگ اس کی دہشت اندازی سے اب لرزہ براندام رہتے تھے۔ عام لوگ اس ڈر سے کہ کہیں اس کی مخالفت کرنے سے ان کی جانیں خطرہ میں نہ پڑ جائیں۔ وقت بے وقت اس کو پناہ بھی دیدیتے تھے۔ اور چھوٹے موٹے حاکم اور تعلقہ دار بھی اس غرض سے کہ ان کے علاقوں میں وہ ڈاکے نہ ڈالے۔ اور یا اس لئے کہ وہ اس کی ناجائز لوٹ کے حصے دار بن جائیں۔ اس کے ساتھ سازباز کرنے لگ پڑے تھے۔

غازی امان اللہ خان کے سفر یورپ جانے سے کچھ قبل کوہستان و کوہ دامن میں ڈاکوؤں کا بے حد زور ہو گیا تھا۔ اس لئے حکومت کو ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ کہ اس علاقہ کو اس امن شکن گروہ سے پاک و صاف کیا جائے۔ گو اس وقت بچہ سقاؤ نئی نئی شہرت حاصل کر رہا تھا۔ تاہم ابھی اس کی اتنی دھوم نہیں مچی ہوئی تھی۔ اس وقت سید حسین کوہستانی اپنے گروہ کے ساتھ بہت زیادہ سرگرم نظر آتا تھا۔ یہ شخص عادی ڈاکو نہ تھا۔ بلکہ اس شخص کی معقول جائداد تھی۔

اور یہ خود اہل سادات سے تھا کسی عورت کے معاملہ میں اس سے ایک دو خون ہو گئے تھے۔ مگر حاکموں کو رشوت دیکر یہ قصاص سے بچ گیا تھا۔ تاہم اسے ترکستان کی طرف جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ اس طرح جلاوطن رہنے کے بعد یہ اپنے اہل و عیال کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے خفیہ وہاں سے واپس آیا تھا۔ مگر اس کے سسرال کے انکار نے اسے بے حد سیخ پا کر دیا تھا جس پر اس نے چند ایک اور کو ہلاک کر کے یاغی گری اختیار کر لی تھی۔ یاغی گری اختیار کرنے کے بعد اس نے کوہستان میں ہر چہار طرف اودھم مچا رکھی تھی۔ اور اس کو بہت سی شہرت نصیب ہو گئی تھی۔ لوگ اس سے بے حد ڈرتے تھے۔ اور یہ اس قدر دلیری سے ڈاکے مارتا تھا۔ کہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شہروں کے اندر گھس آتا تھا۔ اور لوٹ مار کر چل دیتا تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہ آگے بڑھ کر اس سے مقابلہ کرے۔

ان ڈاکوؤں کی شہرت نے ان کے قبیل کے آدمیوں کی تعداد کو بڑھا دیا تھا۔ اور متعدد منچلے لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ڈاکہ زنی کے لئے ترتیب دیتے چلے جا رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر غازی کی حکومت نے سردار علی احمد جان کو جو اس وقت کابل کا گورنر تھا۔ رئیس تنظیمیہ سمت شمالی بنا کر بھیجا تھا۔ تاکہ وہ وہاں جا کر ڈاکوؤں کا استیصال کرے۔

سردار نے وہاں جا کر اگرچہ بہت سے ڈاکوؤں کو پکڑ کر کیفر کردار کو پہونچایا تھا۔ مگر سید حسین تک اس کا ہاتھ نہیں پہونچ سکا۔ تاہم اس وقت سے غازی امان اللہ خان کی واپسی یوروپ تک اس علاقہ میں نسبتاً ڈاکوؤں سے امن ہی رہا۔ لیکن اس اثنا میں بچہ سقاؤ اور سید حسین کبھی کبھار ڈاکے مارتے ہی رہے۔ جہاں تک ان دو ڈاکوؤں کا تعلق ہے۔ ان کی سرگرمیوں کو معطل رکھنے والا

سردیوں کا موسم ہی ہوسکتا تھا۔ جس میں بوجہ ہر چہار طرف برفباری کے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ غازی نے جب واپس آ کر ملک میں اصلاحات کا دور شروع کیا۔ تو موسم تابستان کے شروع ہوتے ہی بیوڑا کو بھی اپنے حسب معمول کام میں مصروف ہو گئے لیکن انہیں اس وقت تک سیاست ملکی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور نہ وہ اس کو جانتے ہی تھے۔ کہ یہ کیا بلا ہے۔ وہ تو اتنا ہی جانتے تھے۔ کہ جس دن وہ حکومت کے ہتھے چڑھ گئے۔ اسی دن ان کی فنا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی فرصت کے ایام کو غنیمت سمجھ کر اپنے دل کا شوق پورا کر رہے تھے اور بس۔

بچہ سقاؤ اب بھی کم شہرت یافتہ تھا۔ اس کی شہرت کو تو اس وقت عام مقبولیت نصیب ہوئی ہے جس وقت اس نے اول بار اپنے پیشہ کو سیاسی رنگ دینا شروع کیا ہے۔ اس وقت تک وہ شہرت میں سیدین سے بدرجہا کمتر تھا۔

جب غازی کے اصلاحات کا دور شروع کرنے پر مخالفانہ چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ تو خاص طور پر چند ایک اصلاحات کو کوہستان اور کوہ دامن کے باشندوں نے بھی بری طرح محسوس کیا۔ ان میں سے ایک تو صغر سنی کی شادی کی ممانعت تھی۔ اور دوسرے بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی راہ میں حکومت اور پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنے کی قانونی مجبوریاں اور پابندیاں حائل تھیں۔ اور تیسرے اسی شادی کے ضمن میں لڑکی والوں کو لڑکے والوں سے نقد روپیہ بطور تویانہ[1] لینے کی گرانبار بندش تھی۔

گو حکومت کی یہ اصلاحات سمت شمالی کے لوگوں پر بہت ہی گراں گذر رہی تھیں۔ اور حکومت کے اس فعل کو خلاف شریعت کہا جا رہا تھا۔ تاہم ان میں حکومت کے برخلاف بغاوت کرنے کی اصلا ہمت نہ تھی جس طرح افغانستان کے دوسرے

[1] تویانہ۔ یہ افغانستان میں رواج ہے کہ لڑکی والے لڑکے والے سے ایک کثیر رقم بطور تویانہ وصول کرتے ہیں

حصے حکومت کی مجبدوانہ روح سے بیزار ہو رہے تھے ۔ یہ حصہ بھی انہی کی طرح اپنی بیزاری اور نفرت کا مختلف چہ میگوئیوں کی صورت میں اظہار کر رہا تھا ۔ اس سے زیادہ نہ وہ کچھ کر سکتا تھا ۔ اور نہ اس نے کرنا ہی تھا ۔

مگر سمت مشرقی میں مذہب کے نام پر بغاوت پھوٹ پڑنے سے جس طرح اور صوبوں میں ایک مسرت کی لہر سی پیدا کر دی تھی ۔ اس حصۂ ملک میں بھی باغیوں سے ہمدردی پیدا ہونی طبعی تھی ۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح جنگ یوروپ کے دوران میں اتحادیوں سے نفرت کرنے والے وہ ممالک جو خود توان کے برخلاف جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے ۔ یا اقدام نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ جرمن فتوحات پر خواہ مخواہ خوش ہو رہے تھے ۔ ٹھیک وہی ذہنیت یہاں بھی موجود تھی ۔ اور بوجہ اور علاقوں کی نسبت کابل سے زیادہ قریب ہونے کے ہر قسم کی افواہات کا چرچا یہاں جلد جلد اور کثرت سے ہوتا تھا ۔ جو اشتعال انگیز اور بے قابو طبیعتوں پر بہت ہی جلد اپنے اثرات کو پھیلاتا تھا ۔ باغیوں کی فتوحات کی خبروں کو لوگ نہایت شوق اور اطمینان سے سنتے تھے ۔ لہٰذا یہ امر طبعی تھا ۔ کہ ایسی فضا میں ملک کا باغی اور ڈاکو طبقہ اپنی بقا اور تجدید زندگی کے مسئلہ کی طرف اپنے ذہن کو مشغول کرے ۔ اور یہ کوئی مشکل نہ تھا ۔ کہ ان کا دل و دماغ حکومت کی تباہی کے تصورات میں اپنی حیات تازہ کی تصویریں کھینچنے سے معذور و قاصر رہے

جلال آباد کے سقوط نے اس گروہ کی سرگرمیوں کو اور بھی تیز کر دیا تھا ۔ اور چونکہ حکومت کی ساری توجہ سمت مشرقی کی بغاوت کے دبانے کی طرف مشغول ہو رہی تھی ۔ اس لئے حکومت نے اس گروہ کی سرگرمیوں کو معمولی اور عادی قسم کا جان کر آخر تک نظر انداز کئے رکھا جس کے سبب ان ڈاکوؤں کی ہمتیں اور بھی بلند ہوتی گئیں ۔ ہم اس کو ایک حد تک حکومت کی غفلت بھی نہیں کہہ سکتے ۔

دور کیوں جائیں۔ ہم خود اپنے ملک کے اندر دیکھ رہے ہیں۔ کہ جب سیاسی طور پر پبلک کا مطلع مکدر ہو جاتا ہے تو محکمۂ پولیس کی تمام تر توجہ کا مرکز سیاسی گنہگار بنے رہتے ہیں۔ ایسے وقت میں چور ڈاکوؤں اور رہزنوں وغیرہ کی طرف بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ غرضنکہ ادھر حکومت کو شنواریوں کی بغاوت کے فرو کرنے میں ناکامیاں ہو رہی تھیں۔ تو ادھر بچہ سقاؤ اور اس کے ساتھی ڈاکوؤں نے ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ ترکستان کی طرف سے آنے والے ایک بڑے تجارتی قافلے کو انہوں نے لوٹ لیا۔ اس ڈکیتی نے بچہ سقاؤ کی بہادری کے شہرہ اور غلغلہ کو دفعتہً بلند کر دیا۔ اور چونکہ طبیعتیں بغاوت شنوار کی وجہ سے آگے ہی سے چوکنی ہو رہی تھیں۔ اس کی شہرت کا آوازہ ہر دل پہ نقش ہو کر رہ گیا۔ لوگ اس کے متعلق اور بھی سننے کے لئے ہمہ تن گوش بن گئے حتٰے کہ اس کے اس بہادرانہ ڈاکے اور ایک دوسرے اقدام کے درمیانی وقفہ میں وہ جب کبھی آپس میں ملتے تھے۔ تو ایک دوسرے سے سب سے اول جو سوال پوچھا کرتے تھے۔ وہ یہی ہوتا تھا۔ کہ سناؤ یار! بچہ سقاؤ کے متعلق کچھ اور بھی سنا؟ اور کابل کے باشندوں میں یہ چہ میگوئیاں عام طور پر ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ کہ کہیں سمت شمالی بھی حکومت کے برخلاف نہ اٹھ کھڑی ہو۔ ناراضگی تو ہر جگہ تھی ہی۔ یہ خیال آرائیاں دراصل ان باشندوں کے اپنے دلوں کا بخار ہوتی تھیں جسے وہ اور کسی طرح سے نہیں نکال سکتے تھے۔

جلال آباد کے سقوط کے بعد حکومت نے بطور حفظ ماتقدم مزید بھرتی شروع کر دی تھی۔ اور قطغۂ نمونہ والی فوج کے نام بھی بازطلبی کے احکام جاری ہو چکے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا۔ کہ اس فوج کا اکثر حصہ کوہ دامن و کوہستان کے علاقہ کا رہنے والا تھا۔ جہاں تک عام بھرتی کا تعلق ہے۔ اسے ہمیشہ سے اقوام

افغانستان نے ایک بار تصور کیا ہے۔ وہ حکومت کو بھرتی ہونے والے کے عوض مقررہ تاوان تو ادا کر دینگے۔ مگر بھرتی دینے پر راضی نہیں ہوں گے۔ غرضکہ کوہستان اور کوہ دامن والے ایک تو پہلے ہی سے حکومت کو کوس رہے تھے۔ دوسرے ان پر یہ نئی افتاد آ پڑی تھی۔ اور وہ بھی خدا کے دشمنوں سے جنگ کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹنے کی خاطر جو ان کے اپنے نقطۂ نظر سے دین اور مذہب کے لئے لڑ رہے تھے۔ ظاہر ہے۔ کہ ان کی اس ذہنیت کے ہوتے ہوئے بھرتی کی مانگ نے ان پر کس قدر بجلیاں گرائی ہونگی۔ یہی نہیں۔ بلکہ وہ اپنے ملّاں اور صاحب زادوں سے یہ مسئلہ بھی پوچھنے لگ گئے تھے۔ کہ شریعت کی رو سے حکومت کی امداد کرنی کہاں تک روا ہے۔ یقیناً ایسے نیم ملانوں کا وہاں قحط نہیں تھا۔ جنہوں نے ان کو یہ فتوے نہ دیا ہو۔ کہ اگر تم حکومت کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے مارے جاؤگے۔ تو تمہارا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا ؞

بچہ سقاؤ کو ابھی تک براہ راست بھرتی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یعنی بھرتی کے اعلان نے اس کے دماغ کو دفعتہً کسی نئی راہ کی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ مگر اس کا دماغ قطعۂ نمونہ کی بازطلبی کا سنکر ضرور متوجہ ہوا۔ کیونکہ اس کو اس قطعۂ فوج سے دلی مناسبت تھی ؞

وہ اس اثنا میں جو کچھ سمت مشرقی کی جانب ہو رہا تھا۔ سن تو رہا تھا۔ اور لوگوں کی عام ناراضگی کو بھی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ اگر آگے اس کو دس گھرانے پناہ دینے کے لئے تیار تھے۔ تو اب اس کی جگہ بیس گھرانے موجود ہو گئے تھے۔ گویا لوگوں کے دلوں میں جو اس کا خوف بیٹھا ہوا تھا۔ وہ محبت سے اگر نہیں تو مانوسیت سے ضرور بدل رہا تھا۔ نہ اس کو معلوم ہو سکا تھا۔ کہ لوگوں کی طبائع میں یہ دفعتہً تبدیلی کیوں واقع ہو رہی ہے۔ اور نہ لوگ ہی جان رہے تھے۔ کہ وہ اب بچہ سقاؤ کو بجائے حقارت

اور خوف کے دیکھنے کے ایک قسم کی محبت مانوسیت اور پرستارانہ نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ یہ علم النفس کا گہرا مسئلہ تھا جس کا حل دریا میں ڈوبتے ہوئے آدمی کا تنکے کی طرف دستِ امید بڑھانے کی خواہش میں مضمر ہے۔ ایک طرف ملک میں ہنگامہ برپا تھا۔ اور اگرچہ وہ خود اس ہنگامہ آرائی میں شریک و سہیم نہ تھے۔ تاہم چونکہ بنائے ہنگامہ ان کے بھی "دل لگتی" تھی۔ اس لئے ان کو ہنگامہ آراؤں سے قدرتاً ہمدردی اور انس تھا۔ دوسری طرف حکومت تھی۔ جس کے برخلاف ہنگامہ آرائی جاری تھی۔ مگر چونکہ وہ ان کے نزدیک ملزم تھی۔ اور اب تک انہیں رنج پہونچا رہی تھی۔ اس لئے وہ اس کی فکر و تشویش کو جب کبھی زیادہ ہوتے ہوئے پاتے تھے۔ خوش ہوتے تھے۔ اور جو کوئی اس کی تشویش کی زیادتی کا باعث ہوتا تھا۔ اس کی طرف خواہ مخواہ ان کا انس بڑھنے لگتا تھا۔

جب بچہ سقاؤ کو اس کا احساس ہوا۔ کہ لوگ اس سے ڈر اور محبت کی درمیانی منزل میں ہیں تو وہ اپنے ہمراہی ڈاکوؤں کے ساتھ کھلے بندوں اپنے پناہ دہندوں کے ہاں آنے جانے لگ پڑا۔ اور وہاں اس کو حکومت اور شنواریوں کے درمیان جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کے متعلق معلومات حاصل ہونے لگیں۔ اب بھلا وہ ڈاکو جن کی حکومت خون کی پیاسی ہو رہی ہو۔ اور جن کی زندگیوں کا بچاؤ محض اسی میں ہو۔ کہ یہ حکومت ہی نہ رہے۔ وہ کیونکر دوسرے لوگوں کو حکومت کے برخلاف اکسانے سے رہ سکینگے۔ اور پھر علی الخصوص جبکہ معاملہ مذہبی بنیادوں پر ہو۔ اور حکومت مذہب کے نام پر ملزم قرار دی جا چکی ہو۔

بچہ سقاؤ کے دل و دماغ میں حکومت کو پلٹ دینے کے واہمہ کا دور سے بھی گذر نہ ہو سکتا تھا۔ نہ اس کی اتنی حیثیت تھی۔ اور نہ ہی وہ ایسے توہمات کا اہل ہی تھا اس کے تو پیش نظر ایک ہی خیال تھا۔ وہ یہی کہ وہ حکومت کا باغی تو ہے ہی۔ حکومت

جب کبھی اسے گرفتار کریگی۔ فوراً اسکو ماردیگی۔ لہٰذا اس وقت جبکہ سمت مشرقی میں علی الاعلان حکومت کے برخلاف بغاوت ہورہی ہے۔ اگروہ بھی ایسے وقت میں سمت شمالی میں اودھم مچادے گا۔ تو خواہ نتیجہ اس کے اور اس کے یاران سرپل کے حق میں ہلاکت کن ہی کیوں نہ ہو۔ مگر "مرگِ انبوہ جشنے دارد" کے سامان تو اس کے لئے خوب ہی میسر آئیں گے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ اس کی موت ایک ڈاکو کی موت نہ ہوگی۔ بلکہ ایک شہید کی موت ہوگی۔

ان تاثرات کے ماتحت جن کا ایسی فضا میں پیدا ہونا اور جاہل عوام کے دل و دماغ پر مسلط ہوجانا یقینی تھا۔ بچہ سقاو نے اپنے گذشتہ اعمالِ سیئہ کا کفارہ غازی امان اللہ خان کے برخلاف غزا یعنی جہاد کی صورت میں ادا کرنا چاہا۔ حالات اس کی رہبری اور معاونت کرنے والے تھے۔ جن سے دن بدن اسکی جسارت بڑھتی گئی۔ اس کی جسارت اور تہوّر کے سمندِ ناز پر سید حسین کوہستانی کی رقابت نے تازیانہ کا کام دیا۔ قارئین پڑھ چکے ہیں۔ کہ سید حسین کی شہرت بچہ سقاؤ سے کہیں زیادہ تھی۔ اور جیساکہ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں آپ باہمی تقابلہ پاتے ہیں۔ ڈاکوؤں کے طرز حیات میں بھی اس کی کمی نہ تھی۔ آپس میں رقابت اور ہم چشمی کا کیف یہاں بھی سرفروشانہ زندگی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ چنانچہ بچہ سقاؤ اپنی ٹھیٹھ ڈاکوؤانہ زندگی میں سید حسین کی شہرت کو مات کرنے کی ہوس رکھتا تھا۔ اور جب سید حسین کو اطلاعیں پہونچتی تہیں۔ کہ بچہ سقاؤ حکومت کے برخلاف بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنا چاہتا ہے۔ تو وہ اور بھی شہ پاکر جسورانہ اقدامات کرنے لگ جاتا تھا۔

اوپر کہا جاچکا ہے۔ کہ حکومت کی طرف سے بھرتی کا اعلان جاری ہوچکا تھا اور غازی امان اللہ خان نے کابل کے رئیس بلدیہ احمد علی خان ایک شخص کو جو کچھ مدت پہلے سمت کوہستان و کوہ دامن کا حاکم کلاں رہ چکا تھا۔ اس طرف مقرر کر کے

بھیج دیا تھا۔ تاکہ ایک تو ڈاکوؤں کی شر انگیزی سے ہمت شمالی کے لوگوں میں ہلچل واقع نہ ہونے پائے۔ اور دوسرے حکومت کو خاطر خواہ بھرتی مل جائے۔ اس شخص نے اپنا دار الصدر "جبل السراج" میں قائم کیا تھا۔ اور کوہستان کے بڑے بڑے خوانین ملاؤں و دیگر ذی اثر لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کر کے وہ اس نازک موقع پر ان سے حکومت کی امداد کرنے کو کہہ رہا تھا۔ یہ بالکل ایک قدرتی امر تھا۔ کہ ایسے موقع پر وہاں کے بڑے بڑے لوگ حکومت کے برخلاف اپنی شکایات کے دفتر کھول بیٹھیں۔ اور ان شکایات کے جلد از جلد دور کرنے کی طرف اس کی توجہ منعطف کرائیں۔ بلکہ بعض انتہا پسند طبائع تو ایسے موقع پر اپنے مطالبات کو حکومت کی مدد و معاونت کرنے کی واحد شرط قرار دینے لگ جاتی ہیں۔ اور جب کونسل یا جرگہ میں ایسی گفت و شنید ہو رہی ہو۔ تو باہر پبلک کی چہ میگوئیوں کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہوتا جس کا نتیجہ بعض اوقات عام اشتعال پذیری فساد اور بغاوت کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔

شوریدہ سر عنصر کی کسی جگہ بھی کمی نہیں ہوتی۔ مگر یہاں فضا کی مخصوصیت اور ڈاکوؤں کی موجودگی نے اس عنصر کی تقویت اور کمر بندی کے خاطر خواہ سامان مہیا کر رکھے تھے۔ صرف یہی ایک سبب نہ تھا۔ بلکہ بعض حکام جو وہیں کے باشندے تھے۔ اپنی قومی راہ و رسم کی وجہ سے عام باشندوں کو اپنی بات پر اڑے رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ اور ان میں سے بعض کا ہاتھ تو عملاً ڈاکوؤں کا پشت و پناہ بنا ہوا تھا یہی وجہ تھی۔ کہ چند ایک فوجی مہمیں جو بچہ سقاؤ اور سید حسین کو گرفتار کرنے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ ڈاکوؤں کو چاروں طرف سے گھیر لینے پر بھی ناکام رہیں اور ڈاکو صاف بچ نکل جاتے رہے۔ اکثر دفعہ تو ان ڈاکوؤں کو پہلے ہی سے خبر مل جاتی تھی۔ کہ کوئی تازہ مہم ان کے پیچھے آ رہی ہے۔ چنانچہ وہ یا تو پہاڑوں پر چلے جاتے تھے۔ اور یا ایسی

مخدوش جگہوں پر گھات میں بیٹھ جاتے تھے۔ جہاں سے یہ تعاقب کرنیوالی فوج کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہونچا سکیں۔ مجھے قارئین کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ کہ حاکموں کا ان سے میل جول دولت کی فراہمی کی غرض سے ہوتا تھا خواہ بصورت ظاہر یہ کیوں نہ کسی دوسری رقیب طاقت پر حاوی و مسلط ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہو۔ یا خود حکومت سے ان کے دل کسی نہ کسی طرح سے دکھی ہو چکے ہوں۔ بنیادوہی کچھ ثروتی واقتصادی ہوتی تھی طاقت یا رتبہ حاصل کرنے کی خواہش اقتصادی مفاد کی ایک دوسری شکل ہے۔ غرضکہ انہی حاکموں میں سے ایک حاکم جو بعد میں بچہ سقاؤ کا وزیر دربار بنا۔ اور جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔ بچہ سقاؤ کی شروع سے معاونت کر رہا تھا۔ اور اس کو حکومت کے چنگل سے وقت بوقت بچاتا رہتا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے اوپر بیان کر دیا ہے۔ اس کے طرز عمل کی تہ میں حکومت کو منقلب کر دینے کا کوئی نقشہ نہ تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ اس کو غازی امان اللہ خان نے کوئی ترقی نہیں دی تھی۔ وہ اسی طرح اپنے دل کا بخار نکال رہا تھا۔

ایسی فضا میں کچھ تعجب نہ تھا۔ کہ اس علاقہ کا ڈاکو عنصر ایسے موافق ماحول کی موجودگی میں اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل کر حالات کو اور بھی تیرہ و تاریک نہ بنانے لگ جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور اب انہوں نے کھلے بندوں آبادیوں میں پہونچ کر لوگوں کو دھمکانا شروع کر دیا۔ کہ غازی امان اللہ خان کی حکومت کو ایک سپاہی بھی نہ دیا جائے لوگ کچھ تو خود ہی بھرتی کو ایک بار سمجھ رہے تھے۔ اور کچھ ڈاکوؤں کی اس دلیری نے انہیں مزید خائف کر دیا تھا۔ جس کا اثر یہ ہوا۔ کہ رئیس بلدیہ کابل احمد علی خان نے جرگہ کے بعض اعضاء کو سمجھا بجھا کر جو چند سو رضا کار فراہم کرلئے تھے۔ وہ اس نئی صورت کے پیدا ہوتے ہی تتر بتر ہونے شروع ہو گئے۔

جب یہ خبریں کابل میں پہونچیں۔ تو غازی امان اللہ خان کو واقعی بیحد تشویش لاحق ہوئی۔ اور انہوں نے احمد علی خان کو کابل میں بلا کر کچھ خفیہ مشورہ کرنے کے بعد پھر واپس

جبل السراج روانہ کردیا جس نے وہاں پہونچ کر سید حسین اور بچہ سقاؤ سے گفت و شنید شروع کردی۔ چند ایک پیش بندیوں کے بعد وہ ان سے علیحدہ علیحدہ ملا۔ اور ان سے ایک سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہوگیا ۔

اس سمجھوتہ کا لب لباب یہ تھا۔ کہ بچہ سقاؤ۔ سید حسین اور ان کے ہمراہی نیز وہ جنگی یہ دونوں سرڈاکو سفارش کریں۔ اور ان کا آیندہ کے لئے ذمہ لیں۔ ان سے حکومت کچھ باز خواست نہ کرے گی۔ بادشاہ ان کو بخش دے گا۔ خود بچہ سقاؤ اور سید حسین کو حکومت کی طرف سے فوج میں کرنیلی کے ممتاز عہدے دئے جائینگے اور بچہ سقاؤ اور سید حسین اپنے اپنے ڈاکوؤں اور دیگر ملکی رضاکاروں کے فوجی دستے بنا کر بادشاہ کی حمایت میں سمت مشرقی کے باغیوں سے لڑنے کے لئے جائیں گے۔ اس کے لئے حکومت ان کو دو سو کے قریب بندوقیں کارتوس وردیاں اور دیگر ضروری سامان دیگی۔ تاکہ یہ اپنے اپنے آدمیوں کو فوجی لباس و سامان سے آراستہ کرسکیں۔ اس کے عوض میں بچہ سقاؤ اور سید حسین عام بھرتی کی مخالفت نہیں کرینگے۔ بلکہ حاکم کلاں کو اس سلسلہ میں عملاً مدد دیں گے ۔

مذکورہ بالا سمجھوتہ پر تبصرہ فضول ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ حکومت بے حد مخوف تھی۔ اور اس نے اپنی انتہائی کمزوری کا نشان دیا تھا۔ اس راز کے انکشاف ہوتے ہی نہ صرف مقامی علاقے کے ڈاکو بلکہ دیگر دور و نزدیک کے علاقوں کے رہزن بھی بچہ سقاؤ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے تھے۔ اور اب چونکہ وہ کھلم کھلا اور بغیر کسی خطرہ کے سرائے خوجہ میں بیٹھ کر ان ڈاکوؤں کو جمع کر رہا تھا۔ اس لئے طبعاً اس کا اعتبار لوگوں میں بڑھ گیا تھا۔ اس نے قطعہ نمونہ کے عسکریوں کے نام بھی اعلان جاری کردیا تھا کہ وہ بھی اس کے پاس حاضر ہوجائیں۔ تاکہ وہ ان کو بھی اپنی ہمراہی میں سمت مشرقی میں بادشاہ کے باغیوں سے جنگ کرنے کے لئے لیجا سکے ۔

بچہ سقاؤ کو اس طرف مشغول رکھ کر رئیس بلدیہ کابل احمد علی خان نے کوہستان اور کوہ دامن کے علاقہ سے چند سو افراد فوجی بھرتی کے لئے حاصل کر کے کابل کی طرف بھیجدئے تھے۔ اور حکومت اپنی کامیابی پر خوش تھی۔ کابل کے اخبار بچہ سقاؤ کی تعریف میں صفحوں کے صفحے سیاہ کر رہے تھے جس کی خبریں یقیناً اس کو بھی پہونچ رہی تھیں۔ اور غالباً اب اسے اول بار احساس ہونا شروع ہوا ہوگا۔ کہ وہ بھی کوئی چیز اور ہستی ہے۔ وہ ایک نہایت ہی بے بضاعت اور جاہل مطلق شخص تھا۔ وہ اپنی ہستی کا پورا جائزہ نہ لے سکتا تھا۔ اس کے جہل نے اس کی خواہشات کی دنیا میں ایک آگ لگا رکھی تھی۔ اور وہ اس آگ کو اپنے بس میں کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی پہلی ہمت و مردانگی اس کو اپنی طاقت کا غلط اندازہ لگانے میں ممد تھی۔ اور اس کا یہ خیال کرنا کہ بادشاہ پر اس کی ہیبت طاری ہو چکی ہے۔ اسے اگر ایک طرف اور شوخ کر رہا تھا۔ تو دوسری طرف ایک قسم کا ڈر اور عدم اطمینان اس کی طبیعت میں پیدا کرنے کا باعث ہو رہا تھا۔ وہ ڈر اور عدم اطمینان کیا تھا۔ وہ یہی کہ کہیں بادشاہ اس سے فریب نہ کر رہا ہو۔ اور موقع پا کر اس کی نو پیدا شدہ تمناؤں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ نہ کر دے۔ بدقسمتی سے ملائے لنگ کی مثال آگے ہی موجود اور زبان زدِ عوام تھی۔ اور اس کے دل میں پیدا شدہ شکوک کو اور بھی استحکام بخش رہی تھی۔ بالآخر اس کے اندرونی تذبذب نے اسے اس فیصلہ پر لا ٹھیرایا۔ کہ وہ کسی حیلہ سے بادشاہ کا مافی الضمیر معلوم کرے ؎

اپنے جی میں یہ بات ٹھان کر اس نے بادشاہ کے حضور میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجا دی۔ اور جب بادشاہ نے پوچھا۔ کہ کون بول رہا ہے۔ تو بچہ سقاؤ نے جواب دیا۔ کہ احمد علی خان رئیس تنظیمیہ سمت شمالی۔ اور پھر اس نے بادشاہ کو بتلانا شروع کیا۔ کہ اس وقت بچہ سقاؤ اس کے پورے بس میں آ چکا ہے۔ اور پہردل کے

درمیان ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ جہاں پناہ اس سے کس قسم کے سلوک کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔ اس پر غازی امان اللہ خان نے جوش سے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ کہ اس کتے کو فوراً موت کے گھاٹ اتار دو۔ اور اس کا سر اتار کر کابل روانہ کردو۔ بچہ سقاؤ نے یہ سُنکر اپنے آپ کو ظاہر کردیا اور بادشاہ کو برا بھلا کہتے ہوئے ٹیلیفون کو ہاتھ سے رکھ دیا۔

یہ افواہ آن کی آن میں سارے کوہستان و کوہدامن میں پھیل گئی۔ اور ڈاکوؤں میں ایک غریو بلند ہوا۔ کہ بادشاہ ان سے فریب کرنا چاہتا تھا۔ حسین نے جو کہ جہاریکار کے اطراف میں اپنے آپ کو جمع کر رہا تھا۔ مگر جبکی شہرت کو بچہ سقاؤ کے حال کے اقدامات نے مات کرنا شروع کردیا تھا۔ یہ معلوم کرکے کہ حکومت ان سے دہوکا کر رہی تھی۔ اپنے آدمیوں کو لے کر جبل السراج کی طرف بڑھا۔ اور بڑھکر احمد علی خان کو جو اس وقت جبل السراج کے قلعہ میں تھا محصور کرلیا۔

بچہ سقاؤ نے جب یہ سنا۔ کہ سید حسین نے جبل السراج کا محاصرہ کرلیا ہے تو اس کی رقابت نے اسے اس سے بھی بڑھ کر شجاعت کے میدان میں قدم مارنے کے لیئے اکسایا۔ کوہدامن جہاں بچہ سقاؤ مقیم تھا۔ کوہستان اور کابل کے درمیان واقع تھا۔ اور بچہ سقاؤ حسین کی بجائے کابل سے بہت نزدیک تھا۔ لہذا اس نے اپنے آدمیوں کو لے کر کابل پر حملہ کرنے کی دفعتہً ٹھان لی۔

لہذا میں کابل پر بچہ سقاؤ کے دفعتہً آپڑنے کو براہ راست سید حسین کی رقابت کا اثر و نتیجہ سمجھتا ہوں۔

مقامی حالات جس فوری سرعت کے ساتھ بدلے۔ اور واقعات کے رُخ پلٹا کھایا۔ وہ اتنے دفعتہً تھے۔ کہ حکومت کو سنبھلنے اور خبر ہونے تک

بچہ سقا اپنے ساتھیوں کو لے کر کابل کے شمالی دروازہ کی حد پر تھا۔

میں اس حملہ کی باقی داستان ذرا بعد میں بیان کرونگا۔ یہاں میں اپنے قارئین کی توجہ کو اس حقیقت کے ذہن نشین کر لینے کی طرف پھیرتا ہوں۔ کہ کوہستان اور کوہدامن میں عملاً ان ڈاکوؤں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اور عمال کے ہاتھوں سے ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں طاقت کا یہ انتقال خود حکومت کے علم و ارادہ سے ہوا تھا۔ کوئی شک نہیں۔ کہ یہ عمال ہی غفلت کا نتیجہ تھا۔ اس نے بالآخر حکومت کے ہاتھ پیر باندھ دئے تھے۔ تاہم بچہ سقاؤ کی اٹھان کے ان آخری ایام میں وہ باوجود حاکم ہونے کے رعیت پر براہ راست کوئی اثر قائم نہیں رکھ سکے تھے۔ گویا حکومت کی اس کمزور پالیسی یا سیاست نے حاکموں کو رعیت سے بالکل علیحدہ کر دیا تھا اور اس کی جگہ رعیت پر ڈاکوؤں کا حکم چلنے لگ گیا تھا۔ اور حاکم محض ڈاکوؤں کی خواہشات اور احکام کی تعمیل کا ایک آلہ کار بن کر رہ گئے تھے۔ رعیت پر اس تغیر کا جو کچھ اثر ہو سکتا تھا۔ قارئین خود اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ گو ان کے دلوں میں حکومت کے برخلاف لاکھوں شکایات ہی کیوں نہ تھیں۔ پھر بھی وہ اپنے اندر اس امر کی جرأت ہرگز نہ پاتے تھے۔ کہ وہ حکومت کے برخلاف آمادۂ جنگ ہو جائیں۔ جس طرح واقعات نے اپنا رُخ بدلنا شروع کیا تھا۔ ان کی موجودگی میں چاہئے تو یہ تھا۔ کہ سارے کوہستان اور کوہدامن میں ایک عام طوفان بے تمیزی مچ جاتا۔ اور حکومت کے برخلاف عام بغاوت ہو جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ڈاکوؤں نے حاکموں کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ مگر رعیت اسی طرح خاموش تھی۔ اگر رعیت کے دلوں میں ڈاکوؤں کی دہشت جاگزین ہو چکی تھی تو کیا ہوا دوسری طرف اب تک ان کے دل حکومت کی تعزیر و سیاست سے بے پرواہ نہ تھے۔ اگر حکومت کی تعزیر و سیاست کے خوف سے وہ یکسر بے پرواہ

ہو چکے ہوتے۔ تو بچہ سقاؤ کے کابل پر حملہ کرنے کے وقت ان کی تعداد ہزاروں تک پہونچی ہوتی۔ حالانکہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے۔ بچّہ سقاؤ کی ہمراہی میں صرف ایک ڈیڑھ سو مسلح اور دو تین سو نہتے آدمیوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ تغزیر و سیاست کا ڈر صرف رعیت ہی پر ہنوز باقی نہ تھا۔ بلکہ سید حسین ڈاکو بھی اپنے آپ کو اس کے اثر سے آزاد نہ پاتا تھا۔ گو بچہ سقاؤ اور سید حسین میں باہمی رقابت موجود تھی۔ تاہم وہ آپس میں بحیثیت ہم پیشہ ہونے کے ملتے جلتے رہتے تھے۔ ان کے درمیان یہ رقابت دشمنی کے درجہ تک اس وجہ سے نہ پہونچ سکتی تھی۔ کہ ان کے ڈاکہ مارنے کے علاقے ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ پہلا اگر کوہدامن میں ڈاکہ مارا کرتا تھا۔ تو دوسرا کوہستان میں۔ حکومت کے ساتھ گفت و شنید کا دروازہ کھلنے پر جہاں تک حکومت کے ساتھ ان کا تعلق تھا۔ ان کے منفاد ایک سے تھے۔ اور ان کے درمیان اس سلسلہ میں نامہ و پیام بھی جاری ہو چکا تھا۔

سید حسین نے جب جبل السراج کا محاصرہ کیا تھا۔ تو بچّہ سقاؤ کو اس نے بعد میں خبر کی تھی۔ مگر بچّہ سقاؤ نے اپنے حملۂ کابل کے پیشتر اس کو اپنی جمعیت کے ساتھ آملنے کی تاکید کی تھی۔ اور اگرچہ بچّہ سقاؤ کابل تیرہ دن تک کابل کی آس پاس کی پہاڑیوں پر سرکاری فوجوں سے لڑتا رہا۔ اور اس اثنا میں سید حسین کو امداد کے لئے متواتر پیغام بھیجتا رہا۔ پھر بھی وہ نہ آیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ہنوز تغزیر حکومت سے اصلاً بے پرواہ نہ ہوا تھا۔ اور جو کچھ بچہ سقاؤ یاوہ خود کر رہا تھا۔ وہ یہی تصور کرتا تھا۔ کہ حکومت جلد یا بدیر ان کو کچل دے گی۔ فلہذا جب بھی ایسا وقت آئے۔ اسے کم از کم ایسی جگہ پر ہونا چاہئے۔ جہاں سے ادہر ادہر بھاگ کر اپنی جان بچا سکے۔ مگر بچہ سقاؤ کو اب یہ خیال نہیں رہا تھا۔ اس کو اپنی جان سے زیادہ اپنے نام کی پرواہ تھی۔ اور اگرچہ اسے بھی یہ ہرگز توقع نہ تھی۔ کہ وہ حکومت کے برخلاف

غالب آسکیگا۔ پھر بھی وہ اپنے نام کی بڑائی پر مرجانا چاہتا تھا۔ اور یہی جذبہ اس کو اندھا و ہند کابل پر چڑھا کرلے گیا تھا۔

غرضکہ اسی تعزیر و سیاست کا ڈر جس سے ڈاکوؤں کا کوئی ایک گروہ بھی مستثنےٰ نہ تھا۔ رعیت کو ان کی ہزار ہا شکایات کی موجودگی کے باوجود بھی حکومت کا وفادار رکھ سکتا تھا۔ بشرطیکہ حکومت کی سیاست مضبوط اور حکام کا گروہ دیانتدار اور عالی خیال ہوتا۔

کیا وضعیت (Situation) کو جس طرح میں نے پڑھا ہے۔ اس کی تائید میں یہ ایک زبردست دلیل نہیں ہے۔ کہ کابل سے بچہ سقاؤ کے ناکام لوٹنے پر جب حکومت نے سمت شمالی والوں کو ہوائی اعلان بازی کے ذریعے سے لعنت و ملامت کرنا اور دھمکانا شروع کیا ہے، تو اس پر بھی سمت شمالی کے باشندے بچہ سقاؤ کے دل سے ساتھی نہیں بنے۔

اور یہ جو آبادی کے لحاظ سے خال خال اشخاص بچہ سقاؤ کی معاونت کرتے ہوئے ہمیں نظر آئے۔ یہ حکومت کا خود اپنی رعیت کے سر سے اپنا ہاتھ اٹھا لینے اور اس کی جگہ ڈاکوؤں کو ان پر مسلط کرنے کا واحد نتیجہ تھا۔

غازی امان اللہ خان نے جب تک تخت سے دست بردار ہو کر قندھار کی راہ نہیں لی۔ سمت شمالی اس سے باغی نہیں ہوئی۔ چنانچہ خود غازی امان اللہ خان نے بچہ سقاؤ کے حملہ کابل کے بعد باغ عمومی میں جو تقریر کی تھی۔ وہ بیان مذکورہ کی تائید میں ہے۔ اپنی تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا تھا:-

"کہ پریشان نہ شوید۔ ایں چند دزد ہا بودند۔ کہ حکومت راسوئے بغاوت متوجہ دیدہ بارادۂ چور کردن کابل آمدہ بودند"

(ترجمہ) آپ پریشان نہ ہوں۔ کہ یہ (سمت شمالی کے لوگ نہ تھے۔ بلکہ) چند

ڈاکو تھے۔ جو حکومت کو بغاوت کی طرف متوجہ پاکر کابل کو لوٹنے کے ارادہ سے آئے تھے "

ان مذکورہ بالا واقعات سے قارئین اب یقیناً آسانی کے ساتھ میرے اس بیان کی موافقت میں اپنی رائے قائم کر سکینگے۔ کہ سمت شمالی کے باشندوں نے من حیث الکل غازی امان اللہ خان کے برخلاف بغاوت نہیں کی۔ اور اگرچہ وہ قوائے ثلاثہ کے دائرہ مذمومیت میں اسی طرح چکر کاٹ رہے تھے۔ جس طرح ملک کی اور افغان بستیاں۔ تاہم اس کے اثر بد کو زائل کرتے رہنے والی زندگی بھی ان کو میسر تھی۔ جو ان شکایات کے موجود ہونے پر بھی حکومت کے برخلاف انہیں کسی متحدہ اقدام سے روکے رہتی تھی۔ اگر حکومت دوراندیش محتاط اور اس کے عمال دیانتدار ہوتے۔ تو کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ ڈاکوؤں کے سر اٹھاتے ہی وہ کیوں محو نہ کر دیئے جاتے ؟

اب ہم بچہ سقاؤ کے پہلے حملۂ کابل کی تفصیل بیان کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو ماہ اکتوبر ۱۹۲۸ء کے آخری ایام میں ہوا۔

میں نے اوپر کہیں لکھا ہے۔ کہ ڈاکوؤں اور حکومت کے باہمی سمجھوتہ نے اول الذکر کے اعتماد کو دوچند بڑھا دیا تھا۔ اور اس خبر کے پھیلتے ہی نہ صرف سمت شمالی کے علاقہ کا شوریدہ سر گروہ بلکہ قرب وجوار کا ڈاکو عنصر بھی جوق در جوق آکر ان کے جھنڈے تلے جمع ہو رہا تھا۔ جب ان ڈاکوؤں نے اپنے اہل پیشہ کو اس طرح اپنی طرف جاذب ہوتے دیکھا۔ اور ادھر سے حکومت کے عہد و مواثیق کا اعتبار بھی ان سے اٹھ گیا۔ تو جاہلانہ جوش و خروش کی حالت نے انہیں اپنے انجام سے بالکل بے پرواہ کرکے حکومت سے اس کی بدعہدی کا انتقام لینے پر آمادہ کر دیا۔ دریں اثناء ان کو آبادیوں کے اندر آنے جانے کی کھلم کھلا اجازت اور سہولت تو حاصل تھی ہی۔ بلکہ ایک طرح وہ

مقامی حکام کی جگہ عملاً خود کام کر رہے تھے۔ اور ان کے مسلح گروہ ان کے ساتھ ہر جگہ موجود رہتے تھے۔ لہذا حکومت کے جملہ کل پرزوں کو معطل اور بے دست وپا کر دینے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہ آسکتی تھی:۔

چونکہ احمد علی خاں ہی ان کے اور حکومت کے درمیان مفاہمت کا تنہا واسطہ بنا تھا اس لئے ڈاکوؤں کا فوری غصہ اسی کی شخصی تباہی کا مرکز بن سکتا تھا۔ بچہ سقاؤ تو شاید ابھی حیص بیص ہی کر رہا تھا۔ مگر سید حسین جو جبل السراج سے صرف آٹھ دس میل کے فاصلہ پر تھا۔ اپنے ساتھی ڈاکوؤں اور مقامی شوریدہ سر عنصر کو ساتھ لے کر جبل السراج پر چڑھ دوڑا۔ اور اس نے چاروں طرف سے جبل السراج کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ مجھے قارئین کی توجہ کو اب اس طرف منعطف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کہ ڈاکوؤں نے اپنے اس اقدام کے بعد عام باشندوں کو اپنے برچھیوں کی نوکوں پر ان کی ہر طرح امداد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان بیچاروں میں سے جو کوئی ان کی امداد کرنے سے ذراسی پہلو تہی بھی کرتا تھا۔ اسے فوراً گولی سے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ پھر بھلا کون ایسا تھا جو ان دہشت انداز ڈاکوؤں سے سرتابی کی جرأت کر سکتا۔

بچہ سقاؤ نے یہ سُنکر کہ سید حسین نے جبل السراج پر حملہ کر دیا ہے۔ اپنے گروہ کو اکٹھا کر کے کابل کا رُخ کیا۔ اور اگرچہ وزارت حربیہ کو چند گھنٹے قبل اس کے کوچ کی اطلاعیں مل چکی تھیں۔ مگر یہاں کسی کو اس قسم کے جرأت آزما اور تہورانہ اقدام کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ اور اسے محض بازاری گپ ہی تصور کیا گیا۔ نہ کسی بندۂ خدا نے اتنی تدبیر نہ کی۔ کہ ایک دستہ فوج کو موٹروں پر سوار کرا کے کابل سے چند میل آگے کی طرف بغرض تحقیق یا بطور مثر گشت روانہ کرتا۔ جو صحیح کیفیت سے آن کر اطلاع دیتا۔ مجھے سمت شمالی کے ایک رئیس اعظم مسمی حاجی عبدالرحمن کے لڑکے نے بیان کیا کہ جس وقت بچہ سقاؤ کابل آنے کی طرف تیار ہو رہا تھا۔ وہ بذات خود وہاں موجود تھا۔ اس نے

ان حالات کو دیکھ کر بذریعہ موٹر فوراً کابل کی راہ لی۔ اور سیدھا وزارت حربیہ پہنچا۔ اور وہاں اپنے چند ایک شناسا فوجی منصبداروں سے مل کر کل کیفیت بیان کر دی۔ انہوں نے الٹا دوستی کے لہجہ میں اس کو نصیحت کی۔ کہ وہ ہرگز کسی افسر بالا سے ایسی خبر بیان نہ کرے۔ وگرنہ وہ بحیثیت سمت شمالی کا باشندہ ہونے کے مشکوک نظروں سے دیکھا جائے گا۔ مگر اس پر بھی اس نے پرواہ نہ کرتے ہوئے حکومت کو اصل حقیقت سے واقف کر دیا تھا۔ لیکن مغرور وزیر حربیہ عبدالعزیز خان نے اس خبر کو کوئی اہمیت نہ دی۔

غضب یہ ہے۔ کہ غازی امان اللہ خان کو بھی انہوں نے اس خبر کی جسے وہ افواہ سمجھ رہے تھے۔ اطلاع تک نہیں دی۔ اور افغانستان میں تو یہ عموماً بالادست افسروں کا دستور ہی رہا کیا ہے۔ کہ وہ یا تو بادشاہ کے رعب کی وجہ سے یا اس کی ملامت کے ڈر اور خوف سے ایسی خبریں جنہیں وہ بُری سمجھتے ہوں۔ بادشاہ سے چھپا لیا کرتے تھے۔ اور جب ان کے اثرات پھیل کر ایک وخیم صورت اختیار کر جاتے تھے۔ تو اس وقت اُسے بہت ہی معمولی پیرایہ میں بادشاہ کے گوشگذار کر دیتے تھے۔ مگر اب وقت جا چکا ہوتا تھا۔ اور ان افسروں کی غلطیوں اور شخصی اغراض کا خمیازہ بری طرح حکومت کو بھگتنا پڑتا تھا۔

سردار عبدالعزیز خان جو اس وقت وزیر حربیہ تھا۔ حد درجہ کا مغرور اور راشی تھا بلکہ میں اگر اُسے افغانستان کا راشیٔ اعظم کہوں۔ تو خدا کی قسم ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کے اصطبل کا روزانہ خرچ ہی سوڈیڑھ سو روپیہ کا تھا۔ ایک دفعہ مجھے اس کے کئی ایک ناظموں میں سے ایک کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ گھر جہاں ہم گئے۔ اس ناظم کے منجملہ کئی گھروں میں سے ایک تھا۔ اور کابل سے باہر تھا۔ مجھے اپنے چند دوستوں سمیت یہاں شب باشی کا اتفاق ہوا۔ رات کو ہمارے سونے کے لئے جو بستر آئے۔ وہ تمام کے تمام کمخواب زربفت اور سنجاب کے تھے۔ اور ہر ایک بستر پر جو لاگت

آئی ہوگی۔ وہ کسی طرح بھی ایک ہزار روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ ایسے کئی درجنوں بستر ہم نے وہاں موجود دیکھے۔ میں نے اپنے ایک ہمراہی دوست سے جو مجھ سے زیادہ اس کا واقف کار تھا۔ پوچھا۔ کہ کیا یہ مال وزیر کا اپنا ہے۔ تو اس نے مجھے ہنس کر کہا کہ نہیں یہ لوٹ امی کے اپنے حصہ میں آئی ہوئی ہے۔ یہ اس ناظم کی ایک تفریحی مقامگاہ تھی۔ اب اس ناظم کے کل مال اور اس آمدنی کا جس سے یہ سب میسر آیا ہوگا۔ خود ہی اندازہ لگالیں۔ اس کی تنخواہ جو وزیر صاحب کے حضور سے اُسے ملتی تھی۔ کسی طرح بھی ہزار بارہ سو روپیہ سالانہ سے بیشتر نہ تھی۔ مگر رشوتوں کے وہ خزانے جو سمٹ سمٹا کر وزیر صاحب کے پاس جمع ہو رہے تھے۔ یہ ان کے تلچھٹ کا ایک حصہ تھا۔ اور بس۔

جب بغاوت منگل شروع ہوئی تھی۔ تو یہی صاحب وزیر حربیہ تھے۔ اور انہوں نے ان ایام میں اپنے ایک دو ہم مشربوں کی امداد و معاونت سے جس طرح سے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ اس کی کہانی اگر میں سنانے لگوں۔ تو مجھے ایک اور دفتر چاہیئے۔ جو یقیناً فعلاً میری طاقت سے باہر ہے۔ اور اب بد قسمتی سے اس بغاوت شنوار میں بھی یہی وزارت کے پردھان تھے۔ ان کا دل و دماغ تو دولت جمع کرنے کی طرف مصروف تھا۔ اور یہ دولت اتنی ہی زیادہ جمع ہو سکتی تھی۔ جتنی زیادہ بغاوت کو طوالت نصیب ہو۔ ایسے مواقع بھلا بار بار پھر کب آ سکتے تھے لہٰذا جس کے دل و دماغ کا مطلوب ہی یہ کچھ ہو۔ وہ کہاں اخلاص اور دیانتداری کے ساتھ حکومت کے نازک وقت کو ٹالنے کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ اس قسم کے وزراء بادشاہ کو محض دھوکے میں رکھنے کے لئے کہ وہ اس کے حد سے زیادہ خیر خواہ ہیں۔ اور حکومت کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھ رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات جو اختیار کرتے تھے۔ وہ یہ ہوتی تھی کہ ایسے موقعوں پر گھروں سے اپنی چارپائیاں اور بستر وزارت ہی میں اٹھوا

منگواتے تھے۔ اور شب و روز وہیں رہنے لگ جاتے تھے۔ مگر قسم ہے خدا کی۔ ان کے اس فعل میں ان کے اخلاص سے ہزار ہا درجہ زیادہ یہ خواہش مضمر ہوتی تھی۔ کہ وہ ہر ایک امو اور شعبہ کی خود نگرانی کریں۔ تاکہ ان کی تقسیم کا روپیہ کوئی اور نہ ہڑپ کر سکے۔

غازی امان اللہ خان کی حکومت کے زوال کے باعث اور جو کچھ بھی ہیں۔ مگر بچہ سقاؤ کے ہاتھوں اس کی ذلت کا اولین اور اہم ترین باعث یہی سردار عبد العزیز خان تھا۔ اگر یہ ہوشیار ہوتا۔ یہ دیدہ ور ہوتا۔ تو بھلا ایک بے مایہ ڈاکو کی کیا مجال تھی۔ کہ وہ دار السلطنت کی طرف طبل جنگ بجاتا ہوا محض چند سو آدمیوں کے ساتھ آئے۔ اور اسے کوئی بھی روکنے والا نہ ہو۔ حتےٰ کہ وہ انگریزی سفارت کے محافظ سپاہیوں کو غیر مسلح کر کے اپنی طرف سے محافظ کھڑا کر دے۔ وزارت حربیہ کو پھر بھی اس کی خبر نہ ہو۔ وہ اور آگے آئے اور فوجی مکتب کے سپاہیوں سے بندوقیں وغیرہ چھین لے۔ اور اب بھی وزارت حربیہ سوئی ہوئی ہو۔ ہاں اوہ وزارت حربیہ جو ملک میں برپا شدہ بغاوت کو فرو کر رہی تھی۔ کیا سردار عبد العزیز خان غفلت مجرمانہ کے ان صریح الزامات سے بچ سکتا ہے؟ قسم ہے خدا کی۔ غازی محمد نادر خان کو سخت غلطی ہوئی۔ کہ اس نے بجائے اس شخص کے محمد ولی خان بیچارے کا محاسبہ کیا۔ اور یہ جس نے افغانی حکومت کو بچہ سقاؤ کے ہاتھوں حوالہ کیا۔ صاف چھوٹ گیا۔

بہر حال نہ تو غازی امان اللہ خان کو اور نہ ہی وزارت حربیہ کو کچھ خبر تھی۔ کہ بچہ سقاؤ چند سو مسلح اور غیر مسلح آدمیوں کے ساتھ کابل کی طرف آ رہا ہے۔ اور اگر کسی نے حکومت کے ذمہ دار کانوں تک اس کی آمد کی خبر پہنچائی بھی تھی۔ تو اس کو افواہ سمجھ کر اعتنا کے قابل نہ سمجھا گیا۔

بچہ سقاؤ کے ساتھ بمشکل ایک ڈیڑھ سو آدمیوں کا مسلح گروہ ہوگا۔ باقی دو تین سو آدمی ہیں جن کے پاس نہ تو بندوقیں تھیں اور نہ لٹھ اور نہ چھوٹے موٹے خنجروں کے

سوا اور کوئی کارآمد اسلحہ تھا۔ اس کے ساتھ محض تماشائی کی حیثیت میں ساتھ ہو لئے تھے۔ جن کی نیت سوائے اس کے اور کچھ نہ ہو سکتی تھی۔ کہ موقع پڑے پر لوٹ مار سے اپنے آپ کو غنی کریں۔ یہ گروہ راستہ بھر میں ڈھول طبل بجاتا ہوا اور لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہوا کابل کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ کابل اور کوہدامن اور کوہستان کے درمیان سلسلہ ٹیلیفون اس وقت تک منقطع ہو چکا ہوا تھا۔ اور خواجہ سرائے سے کابل تک جس کا درمیانی فاصلہ بیس بچیس میل سے زیادہ نہ تھا۔ کوئی فوجی چوکی موجود نہ تھی۔ اس لئے یہ گروہ بغیر کسی روکاوٹ یا مزاحمت کے پیش آنے کے خواجہ سرائے سے قلعہ مراد جو کابل سے محض سات آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور قلعہ مراد سے سفارت برطانیہ کی حدود تک جو بمشکل ڈیڑھ دو میل کابل سے دور ہے۔ بڑھا چلا آیا *

بچہ سقاؤ کے ایک رفیق ساتھی سے جو ہم پر قید خانہ میں محافظ مقرر تھا۔ اور جو خود اس پہلے حملہ میں شامل تھا۔ ہمیں معلوم ہوا۔ کہ بچہ سقاؤ کی نیت یہ تھی۔ کہ شہر میں داخل ہوتے ہی وہ یہ مشہور کرے گا۔ کہ وہ بادشاہ کی امداد کے لئے اپنی نفری کو لے کر آیا ہے۔ اور اس طرح بغیر مٹھ بھیڑ کے وہ سیدھا ارک میں داخل ہو کر بادشاہ کو بے دست و پا کر دیگا۔ اور اس وقت فوج اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے گی *

مگر اس کی یہ نیت بر نہ آئی عین شہر آرا کے دروازہ کے متصل جو کابل سے ایک دو فرلانگ سمت شمالی کی طرف واقع ہے۔ مکتب حربیہ تھا۔ اور اس مکتب حربیہ اور سفارت انگریزی کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک قلعہ تھا۔ جس میں گولہ بارود رہتا تھا۔ بچہ سقاؤ نے سفارت انگریزی کے

پہرہ داروں کی بندوقیں چھین کر اور وہاں اپنے پہریدار مقرر کرکے سیدھا اس بلندی کی طرف رُخ کیا۔ اور قلعہ میں جو چند پہرہ دار تھے۔ ان کو مار کر قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ کچھ آدمی وہ قلعہ پر چھوڑ کر خود مکتب حربیہ کی طرف بڑھا۔ وہاں چونکہ دفعتہً آپڑا تھا۔ اس لئے بغیر مزاحمت کے وہ یہاں بھی قابض ہو گیا۔ اور یہاں سے اس کو چند سو بندوقیں بھی ہاتھ آئیں۔ اب ارک تک پہونچنے میں اس کو ایک اور مکتب سواری کا سامنا تھا۔ اگر وہ اس کو بھی سر کرلیتا۔ تو یقیناً اسی دن غازی امان اللہ خان کا آفتاب اقبال غروب ہوجاتا۔ اس مکتب میں شاہیوں کا ایک رسالہ رہتا تھا۔ اور یہ شہر آرہ دروازہ کے عین اندر کی طرف واقع تھا۔ جس وقت شہر کے باہر کی طرف بندوقوں کے چلنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تو افواہات تو پہلے ہی سے گرم تھیں۔ فوراً سب کو یقین آگیا۔ کہ سمت شمالی والے ٹوٹ پڑے ہیں۔ شاہیوں کے رسالے نے اسی وقت کمر ہمت باندھ لی۔ اور بغیر وزارت حربیہ کے امر کا انتظار کئے ہوئے سقاویوں سے لڑنے لگ پڑے اور سقاویوں کا بڑھتا ہوا سیل شہر کے دروازے پر رُک گیا ؛

کتاب کا حجم اجازت نہیں دیتا۔ کہ میں اس دن کے اضطراب و بے چینی کا مرقع کھینچوں۔ تاہم مختصر سا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا ؛

میں اس وقت اپنے ریسٹورانٹ (چائے خانہ) میں اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھا ہوا انہی واقعات پر تبصرہ کررہا تھا۔ کہ اچانک میرے چند جرمن شناسا ایک گھبراہٹ کے عالم میں اندر جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ گھس آئے۔ اور بڑے متوحشانہ انداز میں بیان کرنے لگے۔ کہ بچہ سقاؤ شہر کے اندر گھس آیا ہے۔ یہ محترم اشخاص بھی ریسٹورانٹ میں باہر کی طرف بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ یہ تو اتنا کہہ کر اپنی ٹوپیاں سنبھالتے ہوئے اپنی اپنی جائے پناہ کی طرف لپکے ہوئے۔

مگر ہم نے باہر نکل کر شاہراہ کی طرف کا رُخ کیا۔ باہر نکلتے ہی ہم نے وزیر صاحب حربیہ کو دیکھا کہ ایک ناقابل بیان گھبراہٹ اور سراسیمگی کے انداز میں آپ اپنے نامکمل شاف کے ساتھ پاپیادہ ہی شاہراہ کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ اور آگے بڑھے۔ تو وزیر دربار کو دیکھا۔ کہ وہ بھی بندوق کو ہاتھوں میں لئے اور کارتوسوں کی پیٹی گلے میں لٹکائے اپنی موٹر پر بیٹھا میدان معرکہ کی طرف جا رہا ہے۔ ہم بھی پاپیادہ جتنی جلدی ہم سے ہو سکا۔ شہر ارہ کے مکتب اردی میں جا داخل ہوئے۔ واقعی شاہیوں نے کمال کر دکھایا تھا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہونگے۔ جب کہ انہوں نے سقاویوں کا روکنا شروع کیا تھا۔ اور ابھی آدھ گھنٹہ سے کچھ زیادہ ہی دن باقی رہتا ہوگا۔ جبکہ شاہی رسالہ نے سقاویوں کو شاہراہ کے برج سے باہر نکال دیا۔ مگر شاہراہ کے دروازہ سے باہر سڑک کے دونوں کناروں پر تین چار فرلانگ مربع تک گھر آباد تھے جس میں شہر کی آبادی کا ایک حصہ رہتا ہے۔ ان گھروں میں سقاوی گھس چکے تھے۔ اور وہاں انہوں نے اپنی مورچہ بندی کر لی تھی۔ جس کی وجہ سے شاہیوں کو سڑک پر سے گذر کران گھروں تک پہونچنے کا کوئی یارا نہ تھا۔ جو ذرا آگے بڑھتا تھا۔ وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔ انہی گھروں کے درمیان ایک رعیتی قلعہ تھا۔ یعنی اس گھر کی چاردیواری قلعہ نما تھی۔ کئی منچلے شاہیوں نے اپنے مرنے کا عہد کر کے اس قلعہ تک پہونچنے کی ٹھان لی۔ اور یا چاریار کا نعرہ بلند کرتے ہی گولیوں کے دریا میں پیر گئے۔ کوئی شک نہیں۔ کہ ان میں سے چند ایک تو دس قدم کے اندر اندر ہی خاک کا ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ مگر باقی تمام سقاوی گولیوں کی دو طرفہ بوچھاڑ سے صاف نکل کر قلعہ پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے اپنی طرف کے گھروں سے سقاویوں کو خارج کر کے مکتب اردی سے اپنا رشتہ

آمد و رفت قائم کرلیا۔ اب کم از کم شہر محفوظ ہو گیا تھا۔ اور بچہ سقاؤ کسی طرح بھی آج کی رات شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم سارا شہر رات بھر گوش برآواز رہا اور تقریباً ساری رات ہی جانبین سے بندوقوں کی باڑھیں چلتی رہیں۔ صبح گویا صبح قیامت تھی۔ ابھی نور کا تڑکا ہی تھا۔ کہ توپوں نے بھی اپنے دہن ہائے آتشین کھول دئیے تھے۔ اور راتوں رات ہی سرکاری توپیں آس پاس کی پہاڑیوں پر مورچہ بند ہو چکی تھیں۔ بازاروں میں خوف زدہ خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ ہر کوچہ و بازار و ہر مقام وگذر پر لوگ حفظ ما تقدم پشتہ بندیاں قائم کر رہے تھے۔ اور اپنے آپ کو دروازہ بند کر کے سقاوی لٹیروں کی دست برد سے محفوظ ہو جانا چاہتے تھے۔ شہر گویا سینکڑوں قلعہ بندیوں کی صورت میں تقسیم ہو رہا تھا۔ اور حکومت بھی کچھ کم خوفزدہ نہ تھی۔ ارک کے دروازے چاروں طرف سے رات ہی کو بند ہو چکے تھے۔ تمام وزراء و امراء اور شاہی خاندان کے لوگ ارک کے اندر آ چکے تھے۔ بادشاہ نے رعیت میں عام بندوقیں تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ لوگ ارک کے مشرقی دروازہ کے آگے کھچا کھچ جمع ہو رہے تھے۔ اور اپنے اپنے کلانتروں کی ذمہ داری پر بندوقیں اور کارتوس لئے جا رہے تھے۔ حکومت کا خیال تھا۔ کہ یہ لوگ اسلحہ لے کر سیدھے لڑائی کے میدان کی طرف جائینگے۔ مگر سینکڑوں میں سے خال خال لڑائی میں شریک ہوتا تھا۔ وگرنہ سب کے سب اپنے کندھوں پر بندوقوں کی نمائش کرتے ہوئے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ یہ بندوقیں جو حکومت کی طرف سے ان کو دی گئی ہیں۔ ان کی حفاظت خود اختیاری کے لئے ہیں۔ اور اگر سقاوی شہر کے اندر آ گئے۔ تو وہ اس وقت اپنے اپنے کوچوں اور محلوں کو ان کی تاخت سے محفوظ رکھنے کے لئے جنگ کرینگے۔ اسی لئے وہ

پشتہ بندیوں اور دروازوں کے ذریعہ سے اپنی اپنی مسکن گاہوں کو محفوظ کر رہے تھے۔ مگر آہ جب سقاوی سچ مچ آ گھسے۔ تو ان میں سے ایک محلہ یا گذر نے بھی ان کا مقابلہ نہ کیا۔ بہرکیف ارک کے اندر شاہی خاندان میں بھی ایک کہرام برپا تھا۔ بچوں اور عورتوں کا خوف و غم سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ بادشاہ کے لئے کسی طرف ان کا منتقل کر دینا سب راستا سخت ضرررساں ہوتا۔ اور اگر اس سراسیمگی کی حالت میں اس قسم کے اقدام کرنے کا عزم ہوتا بھی۔ تو غازی امان اللہ خان کے خاندان کو امن و امان کیساتھ کسی محفوظ سمت کیطرف نکل جانے کی کوئی راہ بھی نہ رہی تھی۔ سمت مشرقی کا راستہ بغاوت شنوار نے بند کر رکھا تھا۔ سمت شمالی کو بچہ سقاؤ روکے ہوئے تھا۔ سمت مغربی یعنی قندھار کا راستہ جو بادشاہ کے لئے ایک ہی محفوظ مقام رہ گیا تھا۔ بوجہ برف باری کے بند ہو چکا تھا۔ اور سمت جنوبی کی طرف سے بھی سخت خطرہ لگ رہا تھا۔ اور یہ خطرہ اسی دن جس کی صبح قیامت کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اور بھی وہ چند ہو چکا تھا۔ اس کی کیفیت یہ تھی۔ کہ میر غوث الدین خان جس سے قارئین متعارف ہو چکے ہیں۔ کابل میں بادشاہ کی امداد کے لئے احمدزائیوں کا ایک لشکر جمع کر رہا تھا۔ کچھ لشکر اس نے اب تک جمع کر لیا ہوا تھا۔ جس کو بادشاہ نے بندوقیں اور کارتوس دے رکھے تھے۔ باقی لشکر کا اسے انتظار تھا۔ اور جب تک وہ نہ آ جائے۔ یہ بادشاہ کی طرف سے سمت مشرقی کے باغیوں کے ساتھ لڑنے کے لئے کابل سے کوچ نہیں کر سکتا تھا۔ کہ اتنے میں بچہ سقاؤ کا حملہ ہو گیا۔ حکومت کے بچنے کے کوئی آثار نہ پاتے ہوئے اس کے جی میں نامعلوم کیا کچھ اٹھا کہ یہ راتوں رات ہی اپنے موجودہ لشکر سمیت سمت جنوبی کی جانب اپنے علاقہ کو کوچ کر گیا۔ صبح ہوتے ہی اس کے چلے جانے کا آوازہ بلند ہو چکا تھا۔ اور بادشاہ اپنے آپ کو چاروں طرف سے اس طرح محصور پا کر اپنے خاندان کے ساتھ تن بہ تقدیر

رہنے پر مجبور تھا۔ اپنی عظمت گذشتہ اور اپنی موجودہ بے بسی کا احساس کرتے ہوئے وہ اندر ہی اندر شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا۔ اور اسد ن غصہ اور تہور نے اسے کئی بار آپے سے باہر کر دیا تھا۔ وہ اپنے وزراء کو حالات کے صحیح طور پر اس کے ذہن نشین نہ کروانے کا الزام دے رہا تھا۔ اور اب ان پر ہرگز اعتبار نہ کرنے کے ارادہ سے وہ تمام حالات کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ حتےٰ کہ وہ میدان جنگ میں خود موجود رہنا چاہتا تھا۔ اس نے وزراء و معتمدین اور غمخواروں کے حلقہ سے اسدن کئی بار نکل کر میدان جنگ کی طرف جانے کی کوشش کی۔ مگر ہر بار کئی سر اس کے پاؤں پر جھک گئے۔ اور بصد منت و لجاجت اور گریہ و زاری سے اس کو ارک سے باہر جانے سے روک دیا جاتا رہا۔

بادشاہ اور دیگر خاندان شاہی کے افراد کی یہ بے بسی اور آہ و بکا ہی اس کے جان نثاروں کے دل ہلا رہی تھی۔ اور ارک کا محافظ دستہ اور باقی شاہی رسالہ وحشیانہ جوش کے عالم میں آپے سے باہر ہوا جاتا تھا۔ اور اپنے بادشاہ اور اس کی سلطنت پر اپنا آخری قطرۂ خون نچھاور کر دینے کے لئے سیماب پا تڑپ رہا تھا اور ضبط فوجی کی تمام حدود کو بالائے طاق رکھ کر وہ اس وقت سقاویوں پر یک لخت حملہ کر کے ان کو کچل دینے کے لئے آتش بداماں ہو رہا تھا۔ مگر علیاحضرت ان کی بلائیں لے کر ان کو ضبط میں رکھ رہی تھی۔ اور با چشم زار ان سے یہ کہہ رہی تھی۔ کہ خدا کے لئے تم ارک کو چھوڑ کر باہر نہ جاؤ۔ ہم یہیں اکٹھے مرینگے۔ وہ کونسا دل ہوگا۔ جو اس سنگین وضعیت کو دیکھ کر غم و اندوہ سے ٹکڑے نہیں ہوا جاتا تھا۔ آہ! ایک مصیبت کبرٰے تھی۔ جو چاروں طرف سے سلطنت امانیہ پر ٹوٹ پڑی تھی۔

ایسے تشویش انگیز حالات میں حکومت کا تمام ضبط و انتظام جا رہا تھا۔ اور اب جو کچھ کام ہو رہا تھا۔ رضاکارانہ حیثیت سے ہو رہا تھا۔ وزراء اور ارکین حکومت کی حالت

دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر ایک کے چہرے کی رونق فق ہو چکی تھی۔ لباس اور وضعداری کا خیال اب کسے رہا تھا۔ جو جس لباس میں تھا۔ مصروف تگ و پو نظر آرہا تھا۔ وہ وزیر اور ارکان حکومت بھی جو آج سے پہلے غازی امان اللہ خان سے کشیدہ تھے۔ حکومت کو اس مصیبت میں دیکھ کر پیچھے نہیں رہ سکتے تھے۔ اور ان کی دوڑ دھوپ اور عرق ریزیوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ حکومت کو اس ہولناک خطرہ سے نکال کر ہی دم لیں گے۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت جو حکومت کے درپیش تھی وہ یہ تھی۔ کہ اسے تحقیق طور پر ابھی یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا۔ کہ آیا سمت شمالی کے عام باشندے حکومت کے برخلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ یا یہ محض چوروں کی ہنگامہ آرائی ہے۔ اس وقت عام خیال یہی تھا۔ کہ یہ سمت بھی کلاً باغی ہو چکی ہے۔ اور اس ایک خیال کے دل و دماغ پر قابض ہونے نے عام حالت تشویش و غصہ میں بادشاہ کے منہ سے چند ایک ایسے کلمے نکلوا ڈالے۔ جو سیاستاً کسی طرح بھی نہیں کہنے چاہئے تھے۔ یہ کلمات یہ تھے۔ کہ میں سمت مشرقی والوں سے تو جس طرح بھی ہو سکا۔ صلح و صفائی کر ہی لونگا۔ لیکن ان سمت شمالی والوں کی اگر میں نے اینٹ سے اینٹ نہ بجا دی۔ تو مجھے کسی نے امان اللہ خان نہ کہا ہوگا۔

یہ کلمات ادھر بادشاہ کے منہ سے نکلے ہی تھے۔ کہ ادھر سارے شہر میں ان کا چرچا پھیل گیا تھا۔ اور چونکہ کابل میں ایسے لوگوں کی ایک خاصی تعداد آباد تھی جن کے خویش و اقارب اور عزیز دوست سب کے سب سمت شمالی میں بود و باش رکھتے تھے۔ اس لئے یہ ان کے لئے طبعی تھا۔ کہ وہ بہرصورت وہاں کی صحیح خبریں منگوائیں۔ اور یہاں کے حالات سے انہیں باخبر رکھیں۔ ان کی اس خط و کتابت یا نامہ و پیام کا جو اثر ہوا۔ اسے ہم اپنے وقت پر بیان کرینگے۔ یہاں اس ذکر سے مطلوب یہ تھا۔ کہ ایک تو ہم اپنے قارئین کو حکومت کی دماغی تشویش سے روشناس

کروائیں۔ اور دوسرے اپنے ایک پچھلے دعوے کی تائید مزید کر ڈالیں۔ جو سردار علی احمد جان اور اس کے سمت مشرقی میں اپنی بادشاہت کے اعلان کرا دینے سے متعلق ہے۔ بادشاہ نے مذکورہ بالا فقرات عین حالت اضطراب و تشویش میں کہے تھے۔ اور ہم اسے فطرت انسانی کے بالکل برعکس پاتے ہیں۔ کہ ایسی تشویش و اضطراب کے وقت منہ سے سوائے سچ کے اور کچھ نکل سکے۔ بادشاہ کو ابھی تک یقین تھا کہ وہ سمت مشرقی والوں کو رام کر سکیگا۔ اور سردار علی احمد جان جس طرح سے سمت مشرقی میں کام کر رہا ہے۔ وہ گو اس کی اپنی مرضی کے مطابق نہ سہی۔ تاہم اس کی برداشت کی حدود کے اندر ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ حکومت کی سب سے بڑی مصیبت اس کی سمت شمالی کے حالات سے بے خبری تھی۔ اور اب جبکہ حکومت کا تمام ضبط و انتظام جاتا رہا تھا۔ وہاں کے پورے حالات معلوم کرنے کا سوائے افواہوں کے اور کوئی ذریعہ باقی نہ تھا۔ یہ افواہیں حکومت کے ہمیشہ برخلاف ہی اٹھتی تھیں۔ اور ایسے وقت میں وہ طبائع جو حکومت کے مخالف تھیں۔ فطرۃً افواہوں کے متعلق جدت آفرینی کی ٹھیکیدار بن چکی تھیں۔ اور اگر شہر کابل کے ایک سرے پر توپوں بندوقوں اور مشین گنوں اور ہوائی جہازوں سے پھٹنے والی بمبوں کی گرم بازاری تھی۔ تو شہر کے اندر دوسرے سرے تک مختلف قسم کی افواہوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگوں کا وہ حصہ جو تماشائی بن کر بچہ سقاؤ کی لڑائی کا نقشہ دیکھنے میں مشغول رہتا تھا۔ جب شہر کے اندر واپس ہوتا تھا۔ تو شہر کے اندر والے اس سے میدان جنگ کی تمام کیفیت پوچھ لیتے تھے۔ اور خود اس کو وہ تمام افواہیں جو وہ مختلف سمتوں کے متعلق اب تک حاصل کر چکے ہوتے تھے۔ کہہ سناتے تھے۔ مگر سب کی غالب توجہ بچہ سقاؤ کی لڑائی کی طرف ہی مرکوز تھی۔ اس دوران میں حکومت

کی کوششوں کا اصل مرکز بھی یہی تھا۔ لہذا حکومت کے نزدیک سمت شمالی کے اندرونی علاقہ کی معلومات حاصل کرنا اس وقت فوری اور مقدم ترین تھا۔ حالات جیسے کچھ بھی تھے۔ یہ حکومت کی سخت غفلت تھی ؛

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ بچہ سقاؤ کو یہ امید تھی۔ کہ وہ پہلے ہی دن جا کر ارک پر قابض ہو جائے گا۔ مگر عین اس کی توقع کے برخلاف شاہی رسالہ کے جانبازوں نے بڑھ کر اس کی اس امنگ کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور شہر کے اندر گھسنے سے پہلے ہی اسے روک دیا تھا۔ اور اگرچہ اس کا ایک کالم شام کی تاریکی میں نوآباد اور وہ افغاناں میں گھس آیا تھا۔ تاہم وہ صبح ہوتے ہی ہوتے وہاں سے جا چکا تھا۔ صبح تک آس پاس کی تمام پہاڑیوں پر حکومت نے اپنے لڑئیے چڑھا دئیے تھے۔ جو ان حصوں پر اندھا دھند گولیوں کی بارش برسا رہے تھے۔ جن پر سقاویوں کا قبضہ تھا۔ ان کے قبضہ میں جو مقامات تھے۔ وہ ایک تو باغ بالا تھا۔ جہاں سے کابل پر بخوبی گولہ باری ہو سکتی تھی۔ مگر شک ہے۔ کہ اس وقت بچہ سقاؤ کے پاس نہ کوئی توپ تھی۔ اور نہ اس کے ساتھیوں میں سے کوئی توپ کو چلانا جانتا ہی تھا۔ دوسرا مقام جو اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ قلعہ نوبرجہ تھا۔ یہ ایسی نازک جگہ پر واقع تھا۔ کہ اس کے اور سفارت برطانیہ کی عمارت کے درمیان صرف چند گز کا فرق تھا۔ حکومت کی طرف سے اس قلعہ پر گولہ باری کرنے سے یقینی خطرہ تھا۔ کہ کہیں سفارت کی عمارت بھی گولوں کا نشانہ نہ بن جائے۔ تیسرا مقام جو بچہ سقاؤ کے قبضہ میں تھا۔ وہ باغ بالا اور مکتب عسکری شہر آراء کے درمیان والا قلعہ تھا۔ جس میں ہر قسم کا گولہ اور بارود موجود رہتا تھا۔ اور چوتھا مقام شہر آرا کی بستیاں تھیں۔ جہاں وہ لوگوں کے گھروں میں پناہ لیے کر لڑ رہے تھے ؛

سقاویوں سے یہ آخری مقام تو تیسرے ہی دن لے لیا گیا تھا۔ مگر وہ باقی

مقامات پر برابر تیرہ دن تک قابض رہے۔ اس دوران میں بچہ سقاؤ کی امداد کو نہ تو حسین خود آیا۔ اور نہ ہی اس نے کوئی امداد ہی بھیجی۔ اور نہ ہی بچہ سقاؤ کو اس کے اپنے علاقہ کے لوگوں نے ہی کوئی سپاہ مہیا کر کے دی۔ البتہ فواکہات اور خوراک کی رسد برابر پہونچتی رہی۔ لیکن یہ سب بچہ سقاؤ کے خوف و جبر کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت سمت شمالی کے لوگ اب دوہری مصیبت میں تھے۔ ایک طرف بچہ سقاؤ پہلے کی نسبت سے وہ چند طاقت حاصل کر چکا تھا۔ اور دوسری طرف انہیں حکومت وقت کا خوف تھا۔ ان کی حالت بالکل مذبذبین کی سی تھی۔ وہ نہ ہی بچہ سقاؤ سے بگاڑ سکتے تھے۔ اور نہ ہی حکومت وقت کے برخلاف بغاوت کا اعلان کرنے کی انہیں جرأت تھی۔ چند ایک چھوٹے درجہ کے حاکم اور ملاں جو حکومت سے آگے ہی ناراض تھے۔ بچہ سقاؤ کے ساتھی بن چکے تھے۔ اور اس کے حکومت کے بالمقابل اتنے دنوں تک ڈٹے رہنے نے چند ایک اور کو بھی اس کے ساتھ لا ملا دیا تھا۔ اس تمام عرصہ میں حکومت سمت شمالی سے غافل تھی۔ ان تیرہ دنوں میں حکومت کا ایک اعلان بھی ان تک نہیں پہونچا۔ اور نہ ہی کسی قسم کے تبلیغ و پروپیگنڈا کی ضرورت سمجھی گئی۔ اتنے دنوں تک حکومت کی طرف سے ایک آواز کا بھی ان کے کانوں میں نہ پڑنا جتنا کچھ ان کے اپنے شوریدہ سروں کے لئے سامان ہنگامہ فراہم کر سکتا تھا میں اس کا اندازہ خود قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں۔ ان فوری اثرات کے ماتحت ایک طبقہ اندر ہی اندر ضرور تیار ہو رہا تھا۔ جو طمع لالچ ترہیب اور ترغیب کے پیش نظر بچہ سقاؤ کی کمر ہمت اور مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی پوری ملت ایک ڈاکو پر اعتماد نہیں کر سکتی تھی۔ اور اس لئے اس نے بیک دست ہو کر آخر تک بچہ سقاؤ کی معاونت نہیں کی۔ ہاں کوئی شک نہیں۔ کہ اگر بچہ سقاؤ کی جگہ سمت شمالی کا کوئی خان یا عالم بغاوت کا علم بلند کرتا۔ تو بہت ممکن تھا۔ کہ سمت شمالی کلاً حکومت کے برخلاف

باغیانہ اقدام کرتی۔ مگر بچّہ سقاؤ کی اپنی شخصیت کسی طرح بھی قابلِ اعتماد نہ تھی ؛

وہ لوگ جو محض لوٹ کے خیال سے بچّہ سقاؤ کے ساتھ آئے تھے۔ بچّہ سقاؤ کے سخت ڈسپلن نے ان کو بے حد مایوس کر دیا تھا۔ اس کا حکم تھا۔ کہ جس نے کسی کو لوٹا۔ فوراً وہیں گولی سے مار دیا جائیگا۔ جب قلعہ بلند پر قبضہ ہو گیا۔ اور وہاں سے بچّہ سقاؤ کے ہمراہیوں نے گولی بارود سمتِ شمالی کے اندرون حصّہ میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اس وقت بھی اس کے ساتھ والوں میں سے کسی کی یہ مجال نہ تھی۔ کہ کارتوسوں کا ایک بکس بھی اِدھر اُدھر کر سکے۔ ایسے ضبطیہ (ڈسپلنیری) احکام اور نگرانی نے گو بعد میں جا کر اس کو بلا مزاحمت کابل کا مالک بنا دیا۔ تاہم اس کے پہلے حملہ میں لوٹ مار پر نظریں رکھنے والوں کی ہمتیں سرد ہو چکی تھیں۔ اس ایک امر نے بھی نا معلوم طور پر بچّہ سقاؤ کی معاونت کے جوش کو ٹھنڈا پڑے رہنے دیا ؛

قلعہ بلند میں میگزین نہایت کثرت سے تھا۔ اور بچہ سقاؤ کے ساتھی برابر اسے قلعہ مراد کی طرف منتقل کر رہے تھے۔ سرکاری فوجوں نے اب انہیں شہر کی بیرونی حدود سے بالکل خارج کر دیا ہوا تھا۔ اور جن مقامات پر وہ اب تک قابض تھے۔ ان پر حکومت شب و روز توپوں اور ہوائی جہازوں سے گولہ باری کر رہی تھی۔ اس حملہ کے پانچویں چھٹے دن ہوائی جہازوں سے پھٹنے والے بمب کے ایک ٹکڑے نے بچّہ سقاؤ کو زخمی کر دیا۔ اور اگرچہ اس کے شانہ کا زخم خاصہ گہرا تھا۔ تاہم وہ دلیری سے لڑتا رہا۔ اور اپنے ساتھیوں کی ہمتیں اس امید پر بڑھاتا رہا۔ کہ سید حسین یا اس کے اپنے اہلِ وطن اس کی امداد کو ضرور آئینگے۔ اس کے زخمی ہونے کے بعد اس کے متعلق یہ افواہ مشہور ہوئی۔ کہ وہ قلعہ مراد کی طرف چلا گیا ہے لیکن بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ قلعہ بلند سے نکلکر باغ بالا میں آ رہا تھا۔ تاہم اس افواہ نے سرکار کی طرف سے لڑنے والوں کے دل بڑھا دئے تھے۔ اور توپوں کی امدادی آتشباری میں انہوں نے بڑھ کر قلعہ بلند پر ایک

سخت حملہ کرکے اب اسے سقاویوں سے چھین لیا تھا۔ اب سقاوی باغ بالا اور قلعہ نوبرجہ کے سوا اور کہیں نہ رہے تھے۔ اور حکومت کی توپیں پیہم ان پر شدید گولہ باری کر رہی تھیں۔ ان ہر دو مقامات پر اس کثرت سے ہر چہار طرف سے توپوں کی گولہ باری ہو رہی تھی کہ الامان والحفیظ لیکن پھر بھی کمبخت سقاوی وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ جبکہ ہم نے بعد میں ان مقامات کو جا کر دیکھا کہ اس قدر شدید گولہ باری کے باوجود عمارتوں کو کوئی قابل ذکر نقصان نہ پہونچا تھا۔ اور بچہ سقاؤ آخری دم تک اسی باغ بالا میں پناہ گزین رہا تھا۔

بچہ سقاؤ کی ایک خاصی جمعیت نے قلعۂ نوبرجہ میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یہ قلعہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ سفارت برطانیہ کے عین دوسرے سرے پر تھا۔ چوروں کو یہ سوجھی ہوئی تھی۔ کہ سفارت برطانیہ کی عمارت کے اس قلعہ سے ملحق ہونیکی وجہ سے شاید حکومت اس پر گولہ باری نہیں کرے گی۔ مگر ان کی توقعات کے بالکل برخلاف حکومت کی طرف سے ممتاز توپچیوں کو حکم دے دیا گیا تھا۔ کہ وہ کامل احتیاط کو ملحوظ رکھ کر قلعۂ نوبرجہ پر گولہ باری شروع کردیں۔

میں نے اوپر کہا ہے۔ کہ قلعۂ نوبرجہ اور سفارت انگریزی کی عمارت کے درمیان چند گز کا فرق تھا۔ اور یہ امر قرین یقین تھا کہ خواہ مخواہ کوئی نہ کوئی گولہ چند گز کے فرق سے سفارت کی عمارت پر بھی آلگیگا۔ اس امکانیہ یقین کی روشنی میں حکومت کا اپنے توپچیوں کو گولہ باری کا حکم دینا ایک اچنبھا معلوم ہوتا تھا۔ کیا حکومت امانیہ ایسے نازک وقت میں سلطنت برطانیہ سے بگاڑ لینا چاہتی تھی۔ یا کیا وہ اپنے توپچیوں کی نشانہ بازی کی صحت کے متعلق پورا اعتماد رکھتی تھی۔ اور اس امر کا امتحان کرنا چاہتی تھی۔ کہ افغانی توپیں چند گز کے فرق کا بھی امتیاز کر سکتی ہیں۔ . . . . . شنواریوں کی بغاوت کے سلسلہ میں . . . . . اب تک انگریزی حکومت کے رویہ کے

متعلق بہت سی افواہیں زور شور کے ساتھ گرم تھیں۔ کہ وہ باغیانِ سمت مشرقی کی ہر طرح سے امداد کر رہی ہے۔ اور غازی امان اللہ خان کے برخلاف اس کی رعیت کو اکسانے اور مشتعل رکھنے کے لئے ہر گونہ وسائل سے کام لے رہی ہے۔ مگر حکومت افغانیہ ان افواہات کو اب تک چنداں اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ گو وزارت خارجہ انگریزی حکومت سے بعض امورات کی توضیح حاصل کرنے کے متعلق اپنی یادداشتیں فراہم و مرتب کرنے میں مشغول تھی۔ جو اس نے بعد میں بغاوت کے خاتمہ پر اگر حکومت امانیہ برقرار رہتی۔ تو حکومت انگریزی کے پاس بھیجنی تھیں۔ لیکن بچہ سقاؤ کے حملۂ کابل نے ایک نئی صورتِ حالات پیش کر دی تھی۔ وہ یہ کہ سفارت برطانیہ کی حفاظت اب حکومت کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ گویا کابل کے اس حصہ میں جہاں سفارت برطانیہ آباد تھی۔ حکومت امانیہ کا خاتمہ ہو چکا ہوا تھا۔ اور سفارت کی حفاظت جس کی ذمہ داری تمام تر حکومت امانیہ کے سر تھی۔ اس کے وہاں پر معطل یا سقوط کر جانے کی وجہ سے اب سوائے اس کے کہ سفارت کو باغیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ یا سفارت اپنی حفاظت کا خود ہی کوئی انتظام کرے۔ اور کسی طرح سے بھی ممکن نہ تھی۔ جہاں تک باغیوں کا تعلق تھا۔ وہ ۱۸۷۹ء کے قتلِ سفارت کے انجام سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اور اس لئے وہ کسی سفارت خارجی کی طرف خواہ وہ انگریزی ملت کی ہو۔ یا کسی اور قوم کی۔ بُری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ بچہ سقاؤ جب سفارت کے قریب اول مرتبہ پہونچا تھا۔ تو اس نے دُور ہی سے سفارت کے افسروں کو چلّا کر کہنا شروع کر دیا تھا۔ کہ ہمارا آپ سے کوئی مطلب نہیں۔ بلکہ ہم تو اُلٹا آپ کی حفاظت کریں گے۔ اور امان اللہ کافر کے سپاہیوں کی جگہ اپنے سپاہیوں کے پہرے کھڑے کریں گے۔ گو بچہ سقاؤ کا یہ اعلان سفارت برطانیہ کے ابتدائی خوف کو قدرے کم کرنے کا باعث ہو سکتا تھا۔ تاہم سفارت برطانیہ کی نظروں میں بچہ سقاؤ

ایک چور اور ڈاکو کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے اس پر زیادہ دیر تک اعتماد کرنا بالکل ہی خلاف عقل تھا۔ اور پھر نہ معلوم واقعات کیا کچھ صورت اختیار کر جائیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سفارت کی حدود خود میدانِ محاربہ بنی ہوئی تھی اور سفارت کے ساکنین کی جانیں ہر آن خطرہ میں تھیں۔ اس تیرہ روزہ جنگ کے دوران میں سفارت کی اندرونی اور بیرونی دیواروں پر ہزاروں گولیاں برس چکی تھیں۔ اور میں نے خود بعد میں جا کر جب سفارت کی عمارت کو دیکھا۔ تو مجھے دیواروں پر گولیوں کے نشانات نظر آئے۔ اس موقع پر مجھے شیخ محبوب علی سفارت کے انڈین سکرٹری نے بتلایا تھا۔ کہ کس طرح وہ اور ان کی بیوی جو اپنے ایک پرائیویٹ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ گولیوں کی بوچھاڑ سے بال بال بچ گئے تھے۔ غرضکہ ایسی ہلاکت آفرین صورتِ حالات میں جبکہ سفارت کے معدودے چند آدمی اپنی حفاظت خود اختیاری کے بھی محض قابل نہ تھے۔ ان کی جانوں کو اس تہلکہ سے بچانے کے لئے برٹش حکومت کو ضروری پیشبندی کرنی لازمی تھی۔ چنانچہ حملۂ بچہ سقاؤ کے دوسرے یا تیسرے دن ہی حکومت برطانیہ کے جہازوں نے کابل اور سمت شمالی کے علاقہ جات میں پشتو اور فارسی زبانوں میں لکھے ہوئے اعلانات پھینکنے شروع کر دیئے تھے۔ ان اعلانات میں ملتِ افغانیہ کو براہِ راست مخاطب کیا گیا تھا۔ کہ جس صورت میں ان کی ملکی شورش نے کسی طرح بھی سفارت برطانیہ کے اعضاء کا جانی یا مالی نقصان روا رکھا۔ یا سفارت کی عمارت کی حدود کے اندر کوئی مداخلت کی۔ یا اُسے کسی طرح کا نقصان پہونچایا۔ تو برٹش گورنمنٹ کسی طرح بھی اس کی متحمل نہ ہوگی۔

ان اعلانات کا لہجہ التجائیہ یا دوستانہ ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ اس کے برعکس

ان سے تحکم اور ترہیب کی بو آتی تھی۔ افغانستان کے دیگر حصص پر ان اعلانات کے آوازے نے کیا اثر کیا ہوگا۔ اس کے متعلق تو میں تحقیق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن حکومت اور کابل کے گرد و نواح کی آبادی پر ان اعلانات کا بہت بڑا اثر پڑا تھا۔ اور غازی امان اللہ خان اور لوگوں کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔

ملت نے اب یقین کے ساتھ یہ سمجھنا شروع کر لیا تھا۔ کہ حکومت برطانیہ ہی در پردہ اس بغاوت کی آگ کو مشتعل کر رہی ہے۔ اور ملک پر یہ تباہی جو چھا رہی ہے یہ اسی دشمن دین و ملت کی آوردہ ہے۔ حکومت کا ملت کے اس یقین میں حصہ دار ہونا کوئی تعجب نہ تھا۔ لیکن اس کے علاوہ حکومت افغانیہ برطانیہ کے اس فعل کو بین الاقوامی روایات کے بالکل خلاف سمجھ رہی تھی۔ اور یہ خیال کیا جا رہا تھا۔ کہ حکومت برطانیہ ایک آزاد سلطنت کے داخلی معاملات میں مداخلت بیجا کرنے کا جرم کر رہی ہے۔ اعلانات میں حکومت امانیہ کے بجائے ملت افغانیہ کو براہ راست خطاب کرنا ایک صریح مداخلت سمجھا جا رہا تھا۔ اور اعلانات کے لب و لہجہ کو ہر پہلو سے اشتعال آور اور معاندانہ تصور کیا جا رہا تھا۔ میں اس کے تصور سے بالکل قاصر ہوں۔ کہ اگر حکومت امانیہ ان داخلی شورشوں کے دبانے میں بالآخر کامیاب ہو جاتی۔ تو حکومت برطانیہ کے تعلقات افغانستان سے کس درجہ انتہائی تک کشیدہ ہو جاتے۔ افغانستان میں غازی امان اللہ خان کی شکست و دست برداری نے بین الاقوامی سیاست وسط ایشیا کے رخ کو بالکل بدل دیا ہے۔ اور حالات نے اپنی نئی مساوات (...) پر بنیاد رکھ دی ہے۔ اس جملہ معترضہ سے قطع نظر کرتے ہوئے جہاں تک حکومت برطانیہ کے اس قسم کے اعلانات پھینکنے کی کارروائی کا تعلق تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس بنا پر حق بجانب سمجھ رہی تھی۔ کہ حکومت امانیہ اس قدر کمزور ہو چکی ہے۔ کہ وہ ان جگہوں کو بھی بغاوت کے دائرہ سے محفوظ

نہیں رکھ سکی۔ جو اس کے دار السلطنت کی عین حدود کے اندر اور ملل خارجہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اگر عملاً وہاں حکومت امانیہ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ تو پھر اس سے ان جگہوں کی حفاظت کی درخواست کرنا ہی عبث ہے۔ اور یہ احتجاج کہ اس نے کیوں ان جگہوں کی حفاظت کے لئے شروع سے ہی ضروری اقدامات نہیں کئے تھے۔ اس وقت سے تعلق رکھتا تھا۔ جبکہ وہ باغیوں سے اپنے دار الصدر کو محفوظ کر کے سفارت برطانیہ تک آمد و رفت کا سلسلہ پھر قائم کر لیتی۔ اس وقت تو حکومت برطانیہ کے پیش نظر ایک ہی چیز تھی۔ اور وہ یہ کہ ان کی سفارت متعینۂ کابل کے جملہ اعضاء اور ان کے اہل و عیال و نوکر چاکر اور دیگر مال و اسباب و سرکاری نوشتہ و کاغذات وغیرہ سخت خطرہ میں ہیں۔ اور حکومت افغانیہ اور ان کے درمیان باغیوں نے ہر قسم کی رفت و آمد و سلسلۂ پیغام رسانی کے تعلقات منقطع کر دیئے ہوئے ہیں۔ اور اگر باغیوں نے ایک خارجی دولت کے سیاسی افراد کو چشم گزند پہونچایا تو اس صورت میں حکومت برطانیہ کو انتقامیہ مہم بھیجنی پڑے گی۔ اور نہ معلوم واقعات کیا کچھ نازک صورت اختیار کر جائیں۔ جن کے نتائج اپنی وضاحت کے لحاظ سے نہایت ہی اہم اور گہرے ہوں۔ لہذا اس نے (حکومت برطانیہ) اپنی محصور سفارت کے بچاؤ اور ان دُور کے اندیشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی ایک فوری کارروائی کو ضروری سمجھا۔ کہ وہ ملّت افغانیہ کے اس گروہ کو جو اپنی حکومت سے برسر پیکار ہے۔ صاف صاف الفاظ میں متنبہ کر دے۔ کہ اگر انھوں نے اعضائے سفارت کو کوئی چشم زخم پہونچایا۔ تو ان کی سرزنش اور زجر و توبیخ میں حکومت برطانیہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گی۔

قارئین لطفاً آگاہ رہیں۔ کہ میں یہاں واقعات نگاری کر رہا ہوں۔ ان پر تبصرہ کرنا سردست میرا مقصود نہیں۔ لہذا اپنے اپنے خیال میں کون حق بجانب تھا۔ اور کس نے

زیادتی کی تھی۔ اس کے متعلق یہاں کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں قارئین اپنے اپنے علم و معلومات قوانین بین الاقوامی کے ماتحت ان مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس موضوع پر میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر حکومت امانیہ زندہ رہتی۔ تو لامحال ان تمام واقعات کی دیکھ بھال کے لئے غیر طرفدار منصفوں کی ایک کمیٹی کا تقرر ہونا تھا۔ جو دونوں طرف کے الزامات کو سُنکر اپنا فیصلہ صادر کرتی۔ مگر مقدرات نے اس امر کی نوبت ہی نہ آنے دی ۔

بہرکیف ان اعلانات کی نشر و تبلیغ نے ملت افغانیہ کی اس یاد کو تازہ کردیا تھا۔ جو ۱۸۷۹ء میں "قتل لوئیس کویگناری" سے متعلق تھی۔ اور جہاں بعض طبیعتوں پر اس نے حسب دلخواہ اثر پیدا کیا تھا۔ وہاں اکثر طبیعتیں انگریزی حکومت کے اس فعل سے بغایت مشتعل ہو گئی تھیں۔ اور توپوں کے دہانوں کے قلعۂ نوبرجہ پر بے تحاشا کھل جانے نے ملت میں یہ یقین پیدا کر دیا تھا۔ کہ اب سفارت انگریزی کی کسی طرح خیر نہیں ۔

روسیوں اور جرمنوں نے حکومت امانیہ کو تباہی سے بچانے کے لئے آخری دم تک ساتھ دیا۔ روسیوں نے سیاسی وجوہات کے مدنظر اور جرمنوں نے اقتصادی اسباب کی خاطر۔ اور یہ شکر کا مقام ہے۔ کہ زیادہ تر انہی دو ملتوں کے مشورہ کی شنوائی نے حکومت امانیہ کے ہوش و حواس کو قائم رکھا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر افغانی فوجی منصبدار جو توپوں پر مامور تھے۔ بنہایت محتاط رہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان منصبدار جو حکومت امانیہ کے دل سے والا و شیدا تھے۔ اور جو موجودہ بغاوت کو انگریزی حکومت کی معاندانہ سرگرمیوں کا نتیجہ سمجھ رہے تھے۔ اپنی حکومت کے سقوط کر جانے کے یقین و خوف کے پیش نظر جان بوجھ کے بھی بے احتیاطی کرنے

کے روادار ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہی ایام میں ایک دفعہ میں میدان طیارہ کی ملحقہ بلندی پر چڑھ گیا۔ جہاں سے میرا ایک ہم اتالیق فوجی منصبدار سامنے کے میدان میں سقاویوں پر دو توپوں سے گولہ باری کر رہا تھا۔ اگرچہ ضبط عسکری کی رُو سے میرا وہاں جانا یا اس افسر کا وہاں مجھے ٹھیرنے کی اجازت دینا خلاف قاعدہ تھا۔ لیکن جیسا کہ میں اس سے پہلے کہیں بیان کر چکا ہوں۔ کہ ان دنوں کسی قسم کا ضبط رہا ہی نہ تھا۔ اور پھر ہماری باہمی ہم اتالیقی اور میرے اپنے تعلقات اور جان و پہچان کچھ ایسے کم اہم واقعات نہ تھے۔ جیسے میرے شناسا اغماض کرنے کی جرأت کر سکتے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ہم کئی گھنٹوں تک اس دن سقاویوں پر گولہ باری کئے جانے کا تماشا دیکھتے رہے۔ اور حین محاربہ ایک دفعہ میرا فوجی افسر دوست پھٹنے والے گولوں کو فیوز (یعنی ان کے پھٹنے کے وقت اور رفتار کا حساب کرنے کی کارروائی) لگانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور میں بھی توپ سے کچھ فاصلے پر ہٹ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا توپیں چلانے والا افسر متواتر توپیں چلا رہا تھا۔ کہ اتنے میں اس کے ایک ماتحت افسر نے اس سے بڑی لجاجت سے توپ چلانے کی آرزو کی جس کی اس نے اجازت دیدی اور جب اس نے نشان وغیرہ لے کر گولہ چلا دیا۔ تو ہم نے بھی گولہ کے تعاقب میں اپنی دُوربینوں کو سیدھ پر رکھ لیا۔ یہ گولہ جیسا کہ توقع ہو سکتی تھی۔ جا کر بالکل ہی بے راہ پڑا۔ اس پر میرے دوست نے توپوں کے ذمہ دار افسر کو سخت ملامت کرتے ہوئے کہا۔ کہ کیا تجھے خبر نہیں ہے۔ کہ انگریزوں کی سفارت وہاں سے جہاں پر تو گولہ باری کر رہا ہے کس قدر نزدیک ہے۔ اور ہمیں اس بارہ میں کتنا تاکیدی حکم آچکا ہے۔ اس پر بھی تو اناڑیوں سے گولے پھینکوا رہا ہے۔ اس پر اس شخص نے جس نے دراصل گولہ چلایا تھا۔ ناز اور بے تکلفی کے انداز سے اپنے کرنیل کو جواب دیا۔ کہ اگر وہاں کوئی گولہ جا لگا۔ تو کونسا آسمان نیچے گر پڑے گا۔ انہی نفریوں (اس نے نفریوں کے لفظ

کی بجائے ایک فحش گالی دی تھی) نے تو یہ سارا فساد برپا کر رکھا ہے۔ اس جواب کو پاتے ہی افسر کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ اور اب وہ بھی اپنے افسرانہ انداز میں اسے جواباً کہہ رہا تھا۔ او خوک ہر شے وقتِ خود دارد) اور سور ہر چیز کے کرنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔

حکومت برطانیہ کا اس بغاوت میں کس قدر ہاتھ ہو سکتا تھا۔ میں ایک علیحدہ باب میں اس پر ضرور تبصرہ کرونگا۔ یہاں میں نے ملت اور حکومت امانیہ کے اس وقت کے احساسات سے بحث کی ہے۔ جو اس یقین کا نتیجہ تھے۔ کہ اس بغاوت کے پس پردہ حکومت برطانیہ کا ہاتھ ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے میں قارئین پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا۔ کہ احساسات کی ایسی گرما گرمی میں یہ کوئی جائے تعجب نہ تھی کہ اگر حکومت امانیہ اپنی ناکامی کے رنج و غصہ سے بیتاب ہو کر اپنی ملت کی باغیانہ ذہنیت کو جہاد کے قالب میں ڈھالنے کے لئے انگریزوں سے ایک دفعہ اور حرب مول لے لیتی۔ اور حکومت امانیہ ایسا کرنے سے ہرگز نہ چوکتی۔ اگر کم از کم اس کا مشرقی صوبہ باغی نہ ہوا ہوتا۔ یا اسے اس موقعہ پر روسیوں کی طرف سے ذرا بھی اشارہ مل جاتا۔

حکومت امانیہ اپنے ایک گذشتہ تجربہ کے غلط اثر کے ماتحت تھی۔ یہ تجربہ اسے انگریزوں اور افغانوں کی تیسری جنگ میں حاصل ہوا تھا۔ اور اس کی اپنی ملت کے متعلق تھا۔ قارئین اس حقیقت سے بے خبر نہ ہونگے۔ کہ امیر حبیب اللہ خان سابق بادشاہ افغانستان کے قتل کے وقت غازی امان اللہ خان کابل کا گورنر تھا۔ اور سردار نصر اللہ خان اور ولیعہد سلطنت سردار عنایت اللہ خان دونوں امیر مقتول کی ہمراہی میں جلال آباد میں تھے۔ جس وقت سردار نصر اللہ خان کی بادشاہت کا اعلان جلال آباد میں کیا گیا۔ اور یہ خبر کابل پہونچی۔ تو غازی امان اللہ خان نے اپنے چچا کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر کے خود اپنے آپ کو تختِ سلطنت کا مالک قرار دیا۔ مگر ایسا کرتے ہوئے وہ چند در چند خطرات سے دوچار تھا۔ پہلے تو یہی کہ ممکن ہے۔ کہ ملت ہی

اس کی بادشاہت کو تسلیم نہ کرے۔ اور مختلف دعویداران سلطنت اس سے جنگ کرنے لگ پڑیں۔ دوسرے یہ کہ غالباً انگریز بھی جو اس وقت افغانستان کے سیاسی امورات میں دخیل تھے۔ غازی امان اللہ خان کی بادشاہت کو تسلیم نہ کریں۔ اس لئے اس نے ان خطرات سے بچنے اور ملت کی توجہ کو جہاد کی طرف پھیرنے کی خاطر انگریزوں سے لڑائی چھیڑی تھی۔ تیسری افغانی انگریزی جنگ کی تہ میں یہی راز تھا۔ کہ ایک تو ملت افغانیہ کو نئی بادشاہت کے جواز و عدم جواز کی تحقیقات کرنے کی طرف مہلت ہی نہ ملے۔ اور دوسرے انگریزوں سے اپنی سلطنت کو منوایا جائے۔ چنانچہ یہ غازی امان اللہ خان کی خوش قسمتی اور خوش بختی تھی۔ کہ وہ باوجود بے حد کمزور ہونے کے اپنے ان ہر دو ارادوں میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس جنگ مذکورہ میں جہاں تک اس کی ملت کا تعلق تھا۔ اس کو غازی امان اللہ خان نے بآسانی استعمال کر لیا تھا۔ اور اس کی خیال آرائیوں کے مرکز کو بادشاہت کے مسئلہ سے ہٹا کر انگریزوں سے جہاد اور غزا کرنے کے مسئلہ کی طرف پھیر دیا تھا یہی وہ تجربہ تھا۔ جسے بچہ سقاؤ کے حملۂ کابل کے وقت غازی امان اللہ خان کی حکومت اگر ممکن ہو۔ تو پھر آزمانا چاہتی تھی۔ اور انگریزوں کے نشر و تقسیم کردہ اعلانات نے جو غم و غصہ کی لہر عام طور پر پھیلا دی تھی۔ اس پر تکیہ کر کے ملت کی اپنے برخلاف باغیانہ ذہنیت کو ایک فوری سیاسی تبدیلی کے ساتھ انگریزوں کے برخلاف پھیر دینا چاہتی تھی۔ مگر جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ وہ اس تجربہ کو اس لئے دوہرا نہ سکی۔ کہ ایک تو سمت مشرقی جہاں سے وہ انگریزی سرحد پر مؤثر اقدام کر سکتی تھی۔ اس سے باغی ہو چکا تھا۔ اور دوسرے اسے اس سیاسی جنگ کو چھیڑ کر کسی خارجی امداد کی توقع نہ تھی۔

روسی حکومت اگرچہ اس موقع پر ہر قسم کی ممکن اخلاقی مدد سے دریغ نہیں کر رہی

تھی۔ تاہم غالباً بین الاقوامی سیاست کے ماتحت یہ اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ کہ حکومت افغانیہ کی اس خام خیالی کی تائید کرے۔ اور خواہ مخواہ مشرق وسطی میں ایک عظیم الشان جنگ چھیڑنے کی ذمہ داری اپنے اوپر عاید کرلے ؛

ان حالات کی روشنی میں کہ ایک طرف برطانیہ کی "سیاست متعلق افغانستان" پر بہت سی چہ میگوئیاں اور لے دے ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف روسیوں اور جرمنوں کا رویہ بظاہر دوستانہ اور ہمدردانہ تھا۔ بین الاقوامی الجھنوں کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ضرور تھا۔ اور قارئین آگے جاکر مناسب جگہ پر پڑھیں گے۔ کہ انقلاب افغانستان کے دوران میں ایسے وقت ضرور آئے۔ جو اگر حالات کسی اور سانچے میں نہ ڈھلے ہوتے تو عجب نہ تھا۔ کہ انگریزوں اور روسیوں کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ؛

بچہ سقاؤ کے پہلے حملہ کابل کے ضروری واقعات اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اور قارئین کو بتلایا گیا ہے۔ کہ اس حملہ کے پانچویں یا چھٹے دن خود بچہ سقاؤ بھی زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے زخمی ہو جانے اور امداد موعودہ کے نہ پہونچنے نے بچہ سقاؤ کے ساتھیوں کی ہمتیں پست کرنا شروع کر دی تھیں۔ اور گنتی میں تھے بھی وہ مٹھی بھر۔ آخر کہاں تک تاب مقابلہ لا سکتے تھے۔ ان میں سے جو نہتے تھے۔ وہ کچھ تو دوسرے یا تیسرے دن ہی جا چکے تھے اور باقی رہے سہے بچہ سقاؤ کے زخمی ہونے پر فرو ہو گئے تھے بمشکل دو ایک سو کی جمعیت بچہ سقاؤ کے ہمراہ بچ رہی تھی۔ اور ان میں سے بھی ایک خاصی تعداد یا تو زخمی ہو چکی تھی۔ یا مر چکی تھی۔ اس حملہ کے دسویں یا گیارہویں دن قلعۂ نو بر جہ بھی سقاویوں سے خالی کروا لیا گیا تھا۔ اور اب وہ باغ بالا اور ان کی پشت پر کی بلندیوں پر رہ گئے تھے۔ تیرہویں دن وہ اسے بھی چھوڑ چھاڑ کر چل دئے تھے۔ اور اب حوالی کابل ان سے بالکل پاک ہو چکی تھی ؛

حکومت امانیہ کی باقاعدہ فوجوں کا بیشتر حصہ سمت مشرقی میں مصروف تھا دارالسلطنت

کابل میں شاہیوں کے صرف چند باقاعدہ فوجی دستوں اور ایک قندہاری پلٹن کے سوا اور کچھ موجود نہ تھا۔ سمت جنوبی سے باقاعدہ فوج کے کسی حصہ کا دارالسلطنت کی حفاظت کے لئے واپس بلانا خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ احمدزائیوں کا ایک زبردست خان کابل سے اپنی جمعیت کے ساتھ بھاگ کر چلا گیا ہوا تھا۔ ممکن نہ تھا۔ البتہ ترکستان اور ہرات سے کچھ فوج منگوائی جا سکتی تھی۔ جس کے لئے احکام بھیجے جا چکے تھے۔ مگر جب تک وہ پہونچے۔ مزید فوجی بھرتی اشد ضروری تھی۔ فوجی بھرتی کے اہم مقامات میں سے سمت مشرقی تو بالکل ہی باغی تھا۔ سمت جنوبی سے بھرتی کا مطالبہ کرنا ایسے وقت میں سیاستاً سخت مضر تھا۔ سمت شمالی کا امن ابھی ابھی درہم برہم ہو چکا تھا۔ اور حکومت وہاں رہی ہی نہ تھی۔ ہزارہ جات میں شدید برفباری ہو چکی تھی۔ اور راہیں تقریباً مسدود تھیں۔ لے دے کر کابل کی کشش کرہی اور میدان پرہی حکومت کا سارا دارومدار رہ گیا ہوا تھا مگر بدقسمتی سے یہاں بھی غازی امان اللہ خان کے متعلق کفر و الحاد کے افسانے اس قدر زوروں پر تھے۔ کہ کابلی حکومت قانون کی طاقت سے اب بھرتی حاصل کرنے کی سیاست نہیں برت سکتی تھی۔ ایسے مدہش حالات میں چارۂ کار صرف ملّت کے رضاکارانہ پیش کش پر منحصر تھا۔ اس مطلب کے لئے حکومت کے کارندے جابجا جا چکے تھے اور قبائلی رضاکار جوق در جوق دارالسلطنت میں پہونچ رہے تھے۔ جنکو حکومت ساتھ ہی ساتھ مسلح کر رہی تھی۔

بچہ سقاؤ کے حملہ کے دوران میں ایسے رضاکاروں کی کافی تعداد آ چکی تھی۔ حتےٰ کہ منگل اور جدران کے قبائل سے بھی رضاکار پہونچ چکے تھے۔ جنہوں نے بچہ سقاؤ کے پسپا کرنے میں بے حد معاونت کی تھی۔ وہ کشش جوان رضاکاروں کو مرکز کی طرف کھینچ کر لا رہی تھی۔ وہ حکومت کی طرف سے انعام و اکرام کے ملنے کی توقعات سے کہیں زیادہ بندوق کے میسر آنے کی تھی

لہذا بچہ سقاؤ کے پہلے حملہ کی پسپائی پر کابل مختلف اطراف کے رضاکاروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہاں قارئین سے التجا ہے۔ کہ وہ رضاکاروں اور رنگروٹوں کے باہمی فرق کو ملحوظ رکھیں۔ رضاکار حکومت کو مل رہے تھے۔ رنگروٹ نہیں۔ رنگروٹوں کو ضبط عسکری کے ماتحت رہنا پڑتا تھا۔ رضاکاروں کو نہیں۔ بلکہ وہ براہ راست اپنے اپنے خوانین وملکوں کے ماتحت ہوتے تھے۔ اور یہ ماتحتی بھی جبری نہ تھی بلکہ قومی روایات پر مبنی تھی ::

اور گو سمت جنوبی کی طرف سے حکومت کو میر غوث الدین کے چلے جانے سے ایک خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس سمت سے رضاکار میسر آنے کی بہت سی توقع تھی۔ وہ اس وجہ سے کہ بغاوت منگل کے دوران میں کوہستانی فوجوں نے وہاں بہت سی دست درازیاں روا رکھی تھیں۔ اور اب جبکہ کوہستانیوں کے باغی ہونے کی افواہیں وہاں پہونچ رہی تہیں۔ تو انتقام کا جوش اور لوٹ کی طمع انہیں ابھارنے سے نہ رہ سکتی تھی۔ لہذا میں کوئی وجہ نہیں پاتا۔ کہ حکومت باوجود اپنی کوتاہیوں کے کم از کم رضاکاروں کی طرف سے گھاٹے میں رہتی ::

مگر افغانستان کی بدقسمتی یہ کہ وزارت حربیہ محض رضاکاروں کی طاقت پر تکیہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ کھوئے ہوئے اعتبار کو خارجی نظروں میں پھر بحال کرنے کے لئے فوجی ربط وضبط کے ماتحت فوجوں کو فراہم کرنا چاہتی تھی۔ اور اس وقت سے پہلے بچہ سقاؤ کے تعاقب میں اپنے لاؤ لشکر کو ہرگز بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ وزارت حربیہ کی یہ غلطی حکومت امانیہ کے حق میں مہلک اور کارگر ثابت ہو کر رہی ::

اس مہلک غلطی کی ایک دوسری وجہ حکومت کا یہ فرض کر لینا تھا۔ کہ سمت شمالی کے باشندے تمام کے تمام اس کے برخلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ لہذا اگر ضرورت سے زیادہ زبردست باقاعدہ تیاریوں کے بغیر سمت شمالی میں لشکروں کو سوق دیا گیا۔

تو نتائج کہیں اور بھی مضر ثابت نہ ہوں ۔

وزارت حربیہ میں گرم خون نوجوانوں کا عنصر زیادہ تھا ۔ اور اگرچہ وہ تعلیم و تربیہ عسکری میں اپنے ہم صنف قدیم خیال منصبداروں سے ہر حیثیت میں بڑھ چڑھ کر تھے ۔ مگر جہاں تک ملک کی قومی جنگ کا دستور تھا ۔ انہیں بہت زیادہ تجربہ نہ تھا ۔ دورِ حاضر کی فوجی تعلیم و تربیت نے ان کے جنگی احساسات کو جو شکل دے رکھی تھی ۔ وہ ہر طرح اس بات کی آئینہ دار تھی ۔ کہ وہ بالمقابل کے بے ضبط و ربط باغیوں کو ایک باقاعدہ غنیم تصور کرتے ہوئے باقاعدہ فوجوں کی فراہمی کے بعد ہی ان سے مقابلہ کریں ۔

ایسے وقت میں جبکہ ہر ایک قسم کا نظم و نسق و فوجی ضابطہ داری رخصت ہو چکی تھی ۔ ان باقاعدہ فوجوں کی فراہمی کسی طرح بھی ممکن نہ تھی ۔ نہ تو وقت ہی رہا تھا ۔ اور نہ مکمل ذرائع ہی موجود تھے ۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا ۔ جو اس امید موہوم کے پیچھے ضائع کیا جا رہا تھا ۔

میں نے اپنی دوستانہ حیثیت میں جب حکومت کے ایک وزیر کو اس پیشقدمی کے التوا کے مہلک اثرات کی طرف توجہ دلائی ۔ تو اس نے نہایت اطمینان کے لہجہ میں مجھے جواباً کہا ۔ کہ ہماری وزارت حربیہ ابھی اقدام کا نظریہ نہیں رکھتی ۔

یہ وزیر میرا نہایت ہی مہربان دوست تھا ۔ مگر آج ضرورت سے زیادہ پر توقع اور خاصکر مجھ سے مستغنی نظر آ رہا تھا ۔ اس کے پر توقع نظر آنے کی وجہ تو یہ تھی ۔ کہ کاظم پاشا کے عین اس نازک موقع پر پہونچ جانے سے حکومت کے بچ جانے کی امید پیدا ہو چکی تھی ۔ مگر جہاں تک اس کے استغنا کا تعلق تھا ۔ اس کی غایت یہ تھی ۔ کہ میں ان دنوں حکومت امانیہ کی اصلاحی اور جنگی پالیسی پر کھلم کھلا نکتہ چینی کر رہا تھا ۔ جو کچھ بھی ہو ۔ مجھے حکومت امانیہ سے محبت تھی ۔ اور میری سچی اور پر اخلاص محبت ایسے موقع پر اس کو غلطیاں کرتے ہوئے صبر سے نہیں دیکھ سکتی تھی ۔

جہاں تک سمت شمالی کا تعلق تھا ۔ مجھے سخت کاوش تھی ۔ کہ وزارت حربیہ جس قدر

فوجی طاقت بھی اسے سرِ دست میسر ہے۔ اس طرف روانہ کر دے۔ تاکہ بچہ سقاؤ کو جو بُری طرح زک اٹھا کر جا چکا ہے۔ سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ اور کوہستان و کوہدامن میں جلد از جلد حکومت کو از سرِ نو قائم کیا جائے۔ میں نے اپنے چند حربی دوستوں کو بھی جو اس وقت وزارت حربیہ کے ذمہ وار ارکان تھے۔ اپنے خیال سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت انہیں بھی میں نے اونچی ہوائیں اڑتے ہوئے پایا۔ آہ! انہی چند دوستوں نے انقلاب کے بعد بالآخر میری رائے سے اتفاق کیا۔ مگر کیا اب یہ کچھ سودمند ہو سکتا تھا؟

کاظم پاشا عین اس وقت پہونچا ہے۔ جبکہ بچہ سقاؤ شکست کھا کر جا رہا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک چوٹی کے جنگی مدبروں میں سے تھا۔ مگر اس کے لئے افغانستان کا ملک اور اس کی ہر ایک شے بالکل نئی تھی۔ اس کو نہ تو حکومت کی جنگی استعداد کا پتہ تھا۔ نہ باغیوں کی صحیح کثرت و طاقت کا اور نہ ہی داخلی حالات کا۔ اس نے سفر کی کوفت و تکان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سب سے پہلے وزارت حربیہ سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ اور جو معلومات اس کے آگے رکھی گئیں۔ اس کی روشنی میں اس نے جو کچھ کیا۔ اس پر کسی قسم کا ایراد وارد نہیں ہو سکتا۔

حکومت کی سب سے بڑی غلط فہمی یہ تھی۔ کہ وہ سمت شمالی کو کاملاً باغی تصور کر رہی تھی۔ حالانکہ جو حالات پیشتر لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی روشنی میں ایسا تصور کر لینا بالکل صحیح نہ تھا۔ احمد علی خان جسے سید حسین کے ڈاکو گروہ نے جبل السراج میں محصور کر لیا تھا کسی نہ کسی طرح بچ کر زندہ واپس آ چکا تھا۔ چونکہ رئیس تنظیمہ کی حیثیت سے سمت شمالی کے نظم و نسق کا یہی شخص ذمہ وار تھا۔ اور اسی شخص کی حاکمانہ غفلت نے بچہ سقاؤ کو کابل پر بے خبر آ پڑنے کا موقع بہم پہونچایا تھا۔ لہٰذا اس نے کابل واپس پہونچ کر اپنے آپ کو بادشاہ کے غصہ و عتاب سے بچانے کے لئے سمت شمالی کے صحیح حالات حکومت کے سامنے رکھنے کی بجائے بہت زیادہ غلو سے کام لیا۔ اور اپنی ناکامی کو فوق العادۃ

حالات کا باعث ظاہر کیا۔ ان حالات کو سُنکر حکومت اور بھی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اور اسی خوف نے جہاں ایک طرف اُسے حربی اقدام کرنے سے روکے رکھا تھا۔ وہاں دوسری طرف اس سے مزید سیاسی غلطیاں بھی سرزد کروائی تھیں۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں۔ کہ سمت شمالی کے لوگ دوہری مصیبت میں تھے۔ اگر ایک طرف ان کو بچہ سقاؤ کا خوف تھا۔ تو دوسری طرف وہ حکومت سے لرزہ براندام تھے اس واقعیت نے انہیں مذبذب بنا رکھا تھا۔ والّا کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ بچہ سقاؤ کے ان تیرہ دنوں کے حملہ میں وہ اسے کمکی لشکر نہ بھیجتے۔

جب بچہ سقاؤ زخمی اور شکست خوردہ واپس وہاں پہنچا۔ تو اس نے لوگوں کو اپنے آپ سے بہت ہی مکدّر پایا۔ لوگوں میں یہ یقین قطعی طور پر پیدا ہو چکا تھا۔ کہ حکومت کی فوجیں بچہ سقاؤ کے تعاقب میں ضرور آئیں گی۔ اور یہ تو ڈاکو ہے۔ بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپیگا۔ ساری مصیبت و بدنامی ہم باشندوں پر آپڑے گی۔ اس لئے اس ڈاکو سے ہمیں کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہیئے۔

حکومت امانیہ اس وقت سمت شمالی میں بالکل سقوط کر چکی ہوئی تھی۔ نہ کوئی حاکم تھا اور نہ کوئی کاردار۔ لوگ بے تنظیم منتشر اور بے سر تھے۔ خوانین میں سے کسی میں اتنی جرأت نہ تھی۔ کہ وہ ایسے نازک موقع پر لوگوں کی صحیح راہنمائی کر سکے۔ انہیں ڈر تھا۔ کہ اگر انہوں نے ڈاکوؤں کے برخلاف کچھ بھی کہا۔ تو ڈاکو جو اپنی اپنی کمینگاہوں سے بھڑوں کی مانند فضا میں منتشر ہو چکے تھے۔ آن کی آن میں ان کو تباہ کر دینگے۔ ان کو ایک اور خوف بھی حکومت کے حق میں کسی قسم کا اقدام کرنے سے مانع تھا۔ وہ یہ کہ ان دنوں ان مّلانوں کی خوب بن آئی ہوئی تھی۔ جو غازی امان اللہ خان کو اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے کافر سمجھ رہے تھے۔ اور ملک میں عام شورو فساد دیکھ کر اس سے جہاد کرنے کی لوگوں کو ترغیب دے رہے تھے۔ ان موانعات کے ہوتے ہوئے لوگ جن پر بچہ سقاؤ کی

شکست کے نتیجہ نے حکومت کا رعب اور خوف طاری کر رکھا تھا کسی طرف سے راہنمائی نہ پانے کے سبب عضو معطل بنے رہے۔ اور اکثر باشندوں نے حکومت کی فوجوں کی آمد آمد کے خوف و آوازے سے متاثر ہو کر حکومت کے غصّہ اور انتقام سے بچنے کی خاطر اپنے ملک ہی کو خیرباد کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور بہت سے لوگ بچہ سقاؤ کی شکست پر اپنے اہل و عیال سمیت آس پاس کے علاقوں کی طرف نکل گئے تھے۔ ایک عنصر ایسا بھی تھا۔ جو چپکے ہی چپکے اس امر کی جستجو کر رہا تھا۔ کہ جونہی کہ حکومت کی فوجیں سمت شمالی کی حدود میں داخل ہوں۔ وہ کسی ترکیب سے بچہ سقاؤ اور اس کے ہمراہیوں کو بے دست و پا کر کے گرفتار کر لیں۔ اور حکومت کے حوالہ کر دیں۔ تاکہ وہ اپنی سمت کو حکومت کے غصّہ و عتاب سے بچا سکیں۔ مگر جب تک ان کو حکومت کی نیت اور اقدامات کا پتہ نہ لگے۔ ان میں اس قسم کی مہم سرانجام دینے کی جرأت ہی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔

غرضکہ بچہ سقاؤ کے شکست کھا کر جانے پر وہاں کے باشندوں میں حکومت امانیہ کی دھاک پھر بندھ گئی تھی۔ اگر اس وقت سرکاری فوجیں سمت شمالی کی حدود میں گھس جاتیں۔ تو بچہ سقاؤ کا نیست و نابود ہو جانا یقینی تھا۔ مگر برعکس اس کے اس شکست کے تین ساڑھے تین ہفتوں تک حکومت نے ٹس سے مس نہ کی اور اس اثنا میں بچہ سقاؤ اور اس کے ساتھیوں کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے آپ کو نئے سرے سے جمع کر کے اپنے قدم پھر ایک دفعہ مضبوطی سے جما لیں۔ ان کے ساتھ کٹھ ملاؤں کا ایک گروہ بھی تھا۔ جو حکومت امانیہ کے برخلاف جاہل طبقات میں زبردست پروپیگنڈا پھیلا رہا تھا۔ اور اسی دوران میں حکومت امانیہ نے ان کو چند ایک حسب دلخواہ مواقع بھی بہم پہونچا دئیے۔ جن سے ان کی نرخ بازاری اور بھی تیز ہو گئی۔

سب سے اول حکومت امانیہ نے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے سمت شمالی

میں اشتہارات پھینکنے شروع کیے۔ ان اشتہارات کے مضامین سے صاف ٹپکتا تھا۔ کہ حکومت سمت شمالی کے سارے باشندوں کو اس بغاوت کے لیے مسئول قرار دے رہی ہے۔ اور عنقریب فوجی مہم بھیجکر ان سے سخت باز پرس کرنے والی ہے۔ سیاستاً اس قسم کی اشتہار بازی غلط اور خوفناک تھی۔ اسلئے کہ فوجی نقل و حرکت کی عدم موجودگی میں اس کا فوری پیدا شدہ اثر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اس پر مستزادیہ۔ کہ آبادی میں فی ہزار ایک آدمی بھی لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا اور ڈاکو و دیگر اہل غرض جو اس وقت وہاں کے کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے۔ ان اشتہارات کے مضامین و مطالب کو اور بھی خوفناک بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اب یہ افواہات پھیلا رہے تھے۔ کہ بادشاہ نے اپنی فوجوں کو ان کے قتل عام کا حکم دیدیا ہے۔ اور نہ صرف یہی کہ ان کی جائدادیں اور املاک ہی ضبط کیے جائینگے۔ بلکہ ان کے اہل و عیال کی بے ناموسی اور بےحرمتی کرنے تک سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا۔

جب طبیعتیں ایک ہنگامی دور میں ہوں۔ تو یہ ایک کلیہ ہے۔ کہ وہ بے حد بیدار اور ہمہ وقت گوش برآواز ہوتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے اوقات میں افواہیں بہ یک سرعت برق ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پھیل جاتی ہیں۔ اب ان افواہوں کی نوعیت کو مقامی حالات سے جسقدر گہرا تعلق ہوگا۔ اسی قدر یہ زیادہ دیر تک دل و دماغ کو کھٹکتی رہیں گی۔ اور اتنا ہی متضاد افواہوں کا اثر کم قبول کریں گی۔

اس کلیہ کے ماتحت ان غلط اور مبالغہ آمیز افواہوں کی تردید میں حکومت کے طرفداروں کی طرف سے جن خیالات کو منتشر کیا جاتا تھا۔ وہ اول تو اپنی اصلی شکل میں لوگوں تک پہونچتے ہی نہ تھے۔ اور اگر ایک آدھ ان تک بغیر کتر و بیونت کے پہونچ بھی سکا۔ تو پہلے سے دل و دماغ پر چھائے ہوئے اثرات کے بالمقابل

اس کی حقیقت ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ مگر طرفہ ہے۔ کہ پہلی قسم کی ایک ادنےٰ افواہ بھی قائم شدہ اثرات کی مقدار میں متحیر کن اضافہ کرنے والی ہوتی تھی۔

بچّہ سقاؤ کے حملہ نے سمت شمالی والوں کی وضعیت پہلے ہی سے نازک کر رکھی تھی۔ اور وہ حکومت سے ترساں اور خائف تھے۔ کہ نہ معلوم حکومت ان سے کس طرح کا سلوک کرے۔ اب اشتہارات کے مضامین کے غلط پروپیگنڈا نے ان کو حکومت کی سخت گیر تدبیر سیاست کا اور بھی یقین دلاتا تھا۔ انہوں نے ہوائی جہازوں کو اشتہارات پھینکتے تو دیکھا ہی تھا۔ لہذا ان کو اس امر کا وہم گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ ان سے اشتہارات کے مضامین و معانی کو توڑ مروڑ کر اور مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ وہ یہ سنکر کہ حکومت ان سے باغیوں کا سا سلوک کرے گی۔ اور بھی خوف زدہ اور بددل ہو رہے تھے۔ اور ان کی ہمتیں اس خصوص میں اور بھی پست ہو گئی تھیں۔ کہ وہ شکست خوردہ بچہ سقاؤ اور اس کے یاران سرپل کے ساتھ کوئی معاندانہ سلوک روا رکھیں۔ بچّہ سقاؤ اور اس کے ساتھی ملانوں اور چند ایک دیگر موقع شناسوں نے باشندوں کی اس مذبذب حالت کو بھانپ لیا تھا۔ اور چونکہ حکومت کی کامیابی اور اس کے از سر نو قائم ہو جانے میں ان کو اپنی ہلاکت اور خانمان ویرانی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس لئے یہ ان کے لئے بالکل ایک طبعی امر تھا۔ کہ وہ لوگوں کو حکومت کی آئندہ تدبیر سیاست سے بے حد مخوف اور بدظن کر کے اپنے حق میں ان کی ہر قسم کی امداد و معاونت کو حاصل کریں۔ اس کے لئے جو انہوں نے تدبیر اختیار کی۔ وہ یہ تھی۔ کہ سقاوی ملانوں نے بچّہ سقاؤ کو اپنا امیر مقرر کر کے سمت شمالی کے لوگوں کی توجہ کو ایک نئے رنگ میں اپنی طرف مرکوز کرنا چاہا۔ لیکن یہاں انہیں ایک مشکل درپیش تھی۔ وہ یہ کہ سید حسین اور اس کے ہمراہی کوہستان کے عملاً مالک بنے ہوئے تھے۔ اور

جب تک سید حسین اور بچہ سقاؤ ایک مفاہمت کے ماتحت ملکہ کام نہ کریں۔ سمت شمالی کا ان دونوں کے درمیان متفرق ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے بچہ سقاؤ نے اپنے مشیران کار کے مشورہ سے سید حسین کو اطلاع دی۔ کہ وہ ایک مقررہ جگہ پر اکٹھے ہو کر امارت کے مسئلہ پر غور کریں۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ کی رو سے اس وقت تک بادشاہ وقت کے برخلاف جہاد نہیں ہو سکتا جب تک کسی نئے دعویدار حکومت پر لوگ جمع نہ ہو جائیں۔ پس اگر غازی امان اللہ خان کے وجود کو تخت افغانستان سے علیحدہ کرنے کی آرزو ہو۔ تو وہ اسی طرح پوری ہوگی۔ کہ ہم میں سے یعنی بچہ سقاؤ اور سید حسین میں سے کوئی ایک اپنے آپ کو امیر مقرر کرلے اس پیغام میں بچہ سقاؤ نے یہاں تک سید حسین کو کہلا بھیجا تھا۔ کہ اس لحاظ سے کہ وہ اہل سادات میں سے ہے۔ بچہ سقاؤ اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہے۔ سید حسین جس کے متعلق ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ کہ اسے حکومت کی طاقت پر غالب آنے کی قطعیاً کوئی توقع نہ تھی۔ اور نہ ہی اس میں اس قسم کے طفلانہ اقدام کی کوئی جرأت ہی موجود تھی۔ اس لئے اس نے بچہ سقاؤ کو صاف کہلا بھیجا تھا۔ کہ وہ امیر بننا نہیں چاہتا۔ اگر بچہ سقاؤ کو خواہش ہے۔ تو وہ خود ہی امیر بن جائے۔ اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا سید حسین کے فرشتوں کو بھی یہ سان و گمان نہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ سارے مل کر بھی حکومت کو کبھی شکست دے سکینگے۔ اور یہ کہ بچہ سقاؤ سچ مچ حکومت امانیہ کو زیر و زبر کر کے خود امیر بن جائیگا۔ بعد میں جب واقعات نے حیرت انگیز طور پر پلٹا کھایا۔ تو سید حسین سے بڑھ کر کسے اپنے امیر نہ بننے کا پچھتاوا ہو سکتا تھا۔ بہر حال ہم اس کا ذکر بچہ سقاؤ کی حکومت کے باب میں کرینگے۔

بچہ سقاؤ نے اب کوہدامن میں اپنی امارت کا اعلان کر دیا تھا۔ اور ہر ایک جگہ اپنے کاردار اور حاکم مقرر کر کے بھیج دئے تھے۔ اس کی دیکھا دیکھی سید حسین بھی کوہستان

میں اپنے کاردار اور حاکم مقرر کر رکھا تھا۔ یہ کاردار اور حاکم خود چور یا ڈاکو تھے۔ اور میدان میں صرف اپنے آپکو موجود پا کر بے بس لوگوں پر شمشیر بدست حکم چلا رہے تھے۔ ایسی حالت میں سوائے اس کے کہ لوگ اپنے ناموس اور جان و مال کی حفاظت کے خیال سے ان کے ہر ایک حکم کی تعمیل کریں۔ اور کیا کر سکتے تھے۔ حکومت امانیہ سوئی پڑی تھی۔ تقریباً دو ہفتے بچہ سقاؤ کی شکست کو گذر چکے تھے۔ مگر اب تک سوائے ہوائی جہازوں کی اشتہار بازی کے اور کسی قسم کی معقول تدبیر حکومت نے اختیار نہ کی تھی۔ وہ ابھی اپنی باقاعدہ فوجیں جمع کر رہی تھی۔ اور ادھر بچہ سقاؤ اور اس کے ڈاکو بجبر اپنا تسلط لوگوں پر بٹھا رہے تھے۔ اور لوگوں سے جبری بھرتی حاصل کر رہے تھے۔ جس نے ذرا سا انکار کیا اسے وہیں ڈھیر کر دیا گیا۔

ان اطلاعات کو سن کر اگر حکومت امانیہ نے کوئی اقدام کیا۔ تو وہ یہ تھا۔ کہ کابل ہی سے لمبی مار والی توپوں کے دہانے بلا امتیاز اپنی اس مفروضہ باغی رعیت پر کھول دئیے اور قلعہ مراد پر گولہ باری شروع کر دی۔ اور پھر یہی نہیں۔ بلکہ دوسرے ہفتہ کے آخری ایام میں چند ایک جگہوں پر ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے بمباری کرنے کا حکم بھی دیدیا۔ سقاویوں نے حکومت امانیہ کے اعلانات کے مطلب کو پہلے ہی سے غلط طور پر پھیلا رکھا تھا۔ اب اوپر سے اس بلا امتیاز گولہ باری نے لوگوں کے دلوں سے حکومت کا رہا سہا یقین بھی زائل کر دیا تھا۔ اور اب سمت شمالی کے لوگوں نے بلا شبہ سمجھ لیا تھا۔ کہ حکومت امانیہ کی کامیابی میں ان کی بربادی یقینی ہے۔ پھر بھی ابھی تک آبادی کا ایک کثیر حصہ حکومت کے برخلاف لڑنے کی بجائے ملک سے ہجرت کر جانے کو ترجیح دے رہا تھا۔ اور جب بچہ سقاؤ نے دیکھا۔ کہ لوگ زیادہ تعداد میں ہجرت کر کے نجرو اور پنج شیر وغیرہ کی طرف جا رہے ہیں۔ تو اس نے ان کو بالجبر روکنا شروع کیا۔ اس پر بھی لوگ یہ عذر بہانہ پیش کر کے کہ نہ معلوم حکومت اور اس سمت کے باشندوں کے درمیان کب تک جنگ

جاری رہے۔ اور جنگ کن کن مقام پر لڑی جائے۔ اپنے بال بچوں کو کسی محفوظ مقام پر بھیجدینے کے لئے مصروف ہو رہے تھے۔ اور چونکہ ان کا عذر و بہانہ معقول تھا۔ اس لئے وہ اپنے بدلے کے آدمیوں کو بطور یرغمال دے کر نکلتے جا رہے تھے۔

اس منزل پر قارئین اچھی طرح سمجھ گئے ہونگے۔ کہ میرے اس دعوے کی بنیاد کہ سمت شمالی کلاً حکومت وقت سے آخر تک باغی نہ ہوئی تھی۔ کن واقعات پر تھی اگر حکومت امانیہ بچہ سقاؤ کی شکست کے بعد فوراً ہی جس قدر طاقت اسے میسر تھی۔ اسی سے اس کا تعاقب کرتی۔ تو یقیناً بچہ سقاؤ یا پہاڑوں میں روپوش ہو جاتا۔ یا اندرون ملک گھس جاتا۔ اور حکومت کی فوجیں کوہدامن کے مہم مقامات پر قابض ہو جاتیں۔ جہاں سے وہ انہی باشندوں کے ذریعہ اندرون ملک کی خبریں منگوا سکتی اور موقع شناسی کو برتتے ہوئے رعیت کا دل ہاتھ میں لینے کے لئے مختلف وسائل سے کام لیتی۔ لوگ حکومت کی طاقت کو زندہ اور موجود دیکھ کر شکست خوردہ بچہ سقاؤ کی ہمراہی میں اپنی نجات اور زندگی مشکل پاتے۔ اور حکومت کے طرفدار ہوتے جاتے۔ پھر جوں جوں اس کی فوجی طاقت بڑھتی جاتی۔ وہ اندرون ملک اقدام کرتی۔ اور ڈاکوؤں کو مار پیٹ کر اپنا نظم و نسق قائم کرتی چلی جاتی۔ حکومت نے جو لمبی مار والی توپوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے آتشباری کی۔ یہ فوجی نقطۂ نظر سے بھی بالکل غلط تھی۔ کیونکہ ایسی گولہ باری اس وقت کی جاتی ہے۔ جبکہ یہ متعارض فوج کی پیشقدمی کی پناہ کا کام دے سکے۔ فوج کا تو ایک لنگڑا سپاہی بھی پیش قدمی نہیں کر رہا تھا۔ مگر بمباری اور گولہ باری تھی۔ کہ دم نہیں لیتی تھی۔ پھر ایسی بلاامتیاز گولہ باری کا رعیت پر بجز اس کے اور کیا اثر ہو سکتا تھا۔ کہ لوگوں کی رہی سہی ہمدردی بھی حکومت سے جاتی رہے۔ جن مشیران حکومت نے ایسی بے فائدہ مگر پرضرر گولہ باری کا مشورہ دیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا۔ کہ لوگ اس تخریبی گولہ باری سے ڈر جائینگے اور حکومت کا سامنا کرنے کا خیال چھوڑ دیں گے۔ مگر یہ ان کی انتہائی غلطی اور کم نظری تھی

کیونکہ ایسی تعزیری گولہ باری تو وہاں موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ جہاں لوگ بالکل غیر مسلح اور طریق حرب و ضرب سے قطعیاً ناواقف ہوں۔ مگر جہاں معاملہ اس کے بالکل ہی برعکس ہو۔ وہاں یہ ترہیب زاکارروائی بجائے آتش فساد کو دبانے کے اسے اور بھی مشتعل کرتی ہے۔ اور لوگ یہ خیال کرکے کہ ان کی بربادی و خانماں ویرانی کا وقت تو آ ہی پہونچا ہے۔ پھر کیوں نہ وہ اپنے جی کے حوصلے نکالتے ہوئے فنا سے دوچار ہوں۔ اپنے سروں سے گذر جاتے ہیں۔ اور نڈر ہو کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ اور گو حکومت امانیہ کی غلط تدبیر سیاست نے سمت شمالی کے لوگوں کو اس سے بے حد بدول کر دیا تھا تاہم ابھی تک ان پر حکومت کا اس قدر رعب غالب تھا۔ کہ وہ اس کے مقابلے پر بچہ سقاؤ کی ہمراہی میں اپنی نجات کو نہایت ہی مشکل تصوّر کرتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کے خوانین اور معتبرین اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ آخر تک بچہ سقاؤ کی مدد کو نہیں آئے۔ یہ چور اور ڈاکو ہی تھے۔ جو آخر تک لڑتے رہے۔ اور انجام میں غازی امان اللہ خان کے اپنے تذبذب کے صدقہ میں کامیاب ہو گئے۔ البتہ یہ ٹھیک ہے۔ کہ ان کی ہمراہی میں زور و جبر یا ترغیب و تحریص سے ایک قلیل جماعت قلاش اور تہیدستوں کی ضرور موجود تھی۔ مگر ان کا کام لڑائی لڑنا نہ تھا۔ بلکہ یہ محض ڈاکوؤں کو ان کی ضروریات کی اشیاء ادرگرد سے مہیا کرنے پر مامور تھے۔ انہیں اسی ذریعہ سے اپنے لئے روزی کمانے کا ایک مرغوب موقع مل گیا تھا۔ اور یہ بالکل معمولی اور قدرتی ہے۔ کہ ایسی ہنگامہ زا حالت میں ایسے لوگوں کا ایک عنصر خواہ مخواہ پیدا ہو جائے ٭

غرضکہ حکومت امانیہ کی اس تضیع اوقاتی نے بچہ سقاؤ کو ایک دفعہ اور سنبھلنے اور شرارت کرنے کا موقع بہم پہونچا دیا تھا۔ اس دفعہ اس نے ملانوں کی ستہ پاکر اپنی امارت کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ تاکہ وہ لوگوں کو اپنی طرف اچھی طرح متوجہ کر سکے۔ اور گو وہ جبر و ظلم سے اپنے جھنڈے تلے ایک خاصی تعداد میں رنگروٹ مہیا کرنا چاہتا تھا۔ تاہم ابھی تک اس کو

اس میں سقّہ کو کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس کو پھر کابل پر چڑھ دوڑنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔ میں نے بچہ سقاؤ کے حملہ کابل کو پہلا حملہ اس لئے کہا ہے۔ کہ عام طور پر لوگوں میں یہ خیال اب تک پھیلا ہوا ہے۔ کہ بچہ سقاؤ نے کابل پر دوبارہ حملہ کرکے اس کو اپنے زور و طاقت کے بل پر سر کیا تھا۔ درحالانکہ یہ حقیقت سے کوسوں دور اور بالکل لغو ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک خیال کرتا ہوں۔ کہ اگر سمت شمالی سب کی سب حکومت کے مقابلہ پر آجاتی۔ پھر بھی یہ ممکن نہ تھا۔ کہ وہ کابل کو سر کر سکتے۔ اور جیسا کہ میں ابھی اوپر بیان کر آیا ہوں۔ یہ غازی امان اللہ خان کا اپنا تذبذب اور گھبراہٹ تھی جس نے ایسی ناشدنی چیز کو شدنی کر دکھایا۔ اور آن کی آن میں کایا پلٹ کر رہ گئی۔ وگرنہ با ایں ہمہ اس غلط تدبیر سیاست کے جس کا میں تفصیل کے ساتھ اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ حکومت کی اپنی تدبیرات جنگ بھی اس غلط تدبیرِ سیاست کے ازالہ کو بہت کافی وشافی ہو سکتی تھیں۔ بشرطیکہ غازی امان اللہ خان کا تذبذب دفعتہً اُن کے عمل کے جریان کو قطع نہ کر دیتا۔ قارئین کو میں ابھی تھوڑی دیر میں غازی کے اس تذبذب سے روشناس کئے دیتا ہوں

بچہ سقاؤ کے کابل سے شکست خوردہ واپس چلے جانے کو اب تقریباً تین ہفتے گذر چکے تھے۔ اور اس اثنا میں حکومت نے خاصی تعداد میں رضاکار اور فوج فراہم کر لی تھی۔ تقریباً بائیس ہزار کا لشکر کابل کی حفاظت کے لئے جمع ہو چکا تھا حضرت لمسی کاظم پاشا کے منشاد کے عین مطابق کابل کے جنوب مغرب اور مغرب شمال کے خطوط مدافعت تشکیل کر لئے گئے تھے۔ اور مختلف جرنیلوں کی ماتحتی میں مختلف محاذ تقسیم ہو چکے تھے۔ باغ بالا کو بے حد مستحکم کیا گیا تھا۔ کیونکہ سمت شمالی کی طرف سے کابل پر براہ راست حملہ کرنے والوں کے لئے راستہ میں پہلا مقام یہی پڑتا تھا۔ اس باغ کے خاصی بلندی پر واقع ہونے کے سبب دور تک سڑک اور دیگر میدانی اطراف کی خاطر خواہ حفاظت ہو سکتی تھی۔ اور یہ مقام اگر ہر طرح سے مسلح ہو

تو گویا یہ حملہ آوروں کے لئے بلائے مبرم ہے۔ اس کی آتشباری کے سامنے وہ تو کیا پرندے بھی پر نہیں پھڑک سکتے۔ یقیناً کاظم پاشا کی نظروں نے اس مقام کی اہمیت کو دیکھ کر اسے ہر طرح سے مسلح و محفوظ کر لیا تھا۔ اور اس کی پشت کی پہاڑیوں کو بھی اس کی امدادی آتشباری کے لئے مسلح کیا جا چکا تھا۔ باغ بالا کے جناح چپ سے لیکر میدان طیارہ یعنی قلب کی طرف اور پھر وہاں سے دُور تک شمال میں جناح راست کی طرف خط جنگ مکمل کیا جا چکا تھا۔ تپہ بلند اور میدان طیارہ کی بلندیوں پر بھی توپیں چڑھ چکی تھیں۔ کابل کی اس طرح سے مکمل حفاظت کرنے کے بعد بالآخر فوجوں کو پیشقدمی کا حکم دیا گیا۔ اور کمان محمد عمر خان سور جرنیل[1] کے سپرد کی گئی۔ جو افغانستان میں ایک بہادر جرنیل مانا جاتا تھا اور خود بھی سمت شمالی کا باشندہ تھا۔ اس کی زیر کمان جو فوجیں تھیں۔ ان میں کثرت سے نئے رنگروٹ اور قومی رضا کار شامل تھے۔ قومی رضا کار جرنیل کی براہ راست ماتحتی میں نہ تھے۔ بلکہ وہ اپنے اپنے سرداران قبائل کے زیر حکم تھے۔ اور اگرچہ یہ ایک نقص عظیم تھا۔ مگر افغانستان میں اس سے کسی طرح مفر نہیں۔ قومی رضا کار لڑتے ہی جب ہیں۔ جبکہ وہ اپنے قبائلی سرداروں کے ماتحت رکھے جائیں۔ حکومت کی فوجوں سے وہ تعاون ضرور کرینگے۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ کمان افسران سرداروں کو اپنے اعتماد میں لے کر ان سے صلاح و مشورہ کرتا ہوا فوجوں کی تقسیم و پھیلاؤ کا کام کرے۔ اور جہاں تک ان رضا کاروں کا تعلق ہے۔ ان کے خوانین اور سرداروں کے ذریعہ سے انہیں لڑائے۔

سور جرنیل بلحاظ اس خصوصیت کے نا اہل نہ تھا۔ وہ ایک ٹھیٹھ افغان تھا۔ اور ان

---

[1] سور پشتو میں سرخ کو کہتے ہیں۔ اس جرنیل کا رنگ بہت زیادہ سرخ ہونے کی وجہ سے لوگ اس کو سور جرنیل کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

الجھنوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اپنے افغانی رنگ میں قبائلی سرداروں سے گھل مل جایا کرتا تھا۔ اور بروقت ان سے کام لینے کے ہنر سے واقف تھا مگر اس کے ساتھ ہی یہ ظالم اور راشی بھی بڑا تھا۔ اور انہی جرموں میں یہ کئی بار ماخوذ بھی ہو چکا تھا۔ مگر اس کی خوش قسمتی کہ ہر بار حکومت پر کسی نہ کسی افتاد کے آپڑنے کی وجہ سے یہ اپنی سخت اور لمبی سزاؤں سے بچ جاتا رہا۔ اور قابل فوجی افسروں کے قحط الرجال کے سبب یہ پھر اپنی سابقہ جگہ پر بحال ہو جاتا رہا۔ اب کے بھی یہ سزا یافتہ تھا۔ اور قید خانہ سے اسے نکال کر کمان دی گئی تھی۔ جن قبائل کے رضاکار اس وقت اس کے ساتھ تھے۔ ان میں منگل اور جدران بھی تھے۔ اور بغاوت منگل کے وقت سے وہ اس کے ساتھ آویزش رکھتے تھے۔ حکومت کی یہ غلطی تھی۔ کہ ایسے نازک وقت میں ایسے دو مخالف عنصروں کو باہم اکٹھا رہنے دے۔ مگر تذبذب کی اس گھڑی میں ایسی غلطی کو کسی نے خیال بھی نہ کیا تھا۔

القصہ یہ کہ سور جرنیل اپنی فوج کو لے کر کابل سے دس میل تک آگے بڑھ گیا تھا۔ اور اس نے ایک دو گاؤں اپنے قبضہ میں کر کے قلعہ مراد بیگ کے اس طرف پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے مورچے قائم کر دئیے۔ اور اپنا دار الصدر بھی وہیں قائم کر کے ہر قسم کے حرب و ضرب کا سامان وہاں موجود کر لیا۔ اس جگہ دار الصدر بنانے اور ہر قسم کا حربی ذخیرہ جمع کرنے کا مطلب یہ تھا۔ کہ یہیں سے ان فوجوں کے لئے گولی بارود اور رسد وغیرہ مہیا کی جائے۔ جن کو اندرون ملک بھیجا جاتا تھا۔ اب تک چوروں کے ساتھ کوئی قابل ذکر مقابلہ پیش نہ آیا تھا۔ سقاویوں کا گروہ یہاں سے دو تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اور ان کی ایک نہایت ہی قلیل و حقیر تعداد سامنے کی پہاڑیوں پر سنگر[۵۱] انداز تھی۔ بچہ سقاؤ کا زخم

۵۱ سنگر مورچہ بندی کو کہتے ہیں۔

ابھی تک ویسے ہی ہرا تھا۔ اس لئے وہ خود تو زیادہ تگ و دو نہ کر سکتا تھا۔
البتہ اس کے ہمراہی ڈاکو اس کے حکم سے کوہدامن کے باشندوں سے بزور بھرتی
لینے کے لئے ادھر ادھر گردش کناں تھے۔ لیکن ابھی تک ان کو کوئی معتد بہ
کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اور اگر کبھی دس بیس پچاس آدمیوں کا گروہ اس کے پاس
آ بھی جاتا تھا۔ تو وہ نہتا ہوتا تھا۔ اور بچہ سقاؤ کے پاس کوئی فالتو بندوق نہ
تھی۔ کہ وہ ان کو مسلح کر سکتا۔ کیونکہ جس قدر بندوقیں وہ حملۂ کابل کے وقت
لے گیا تھا۔ وہ سب کی سب اس کے ہمراہی ڈاکوؤں اور چند ایک خیر خواہوں
میں تقسیم ہو چکی ہوئی تھیں۔ باقی رعیتی لوگوں کے پاس جو اپنا اسلحہ تھا۔ وہ
انہوں نے پہلے ہی سے اپنے دیگر مال و اسباب کے ساتھ پوشیدہ طور پر
اپنی اپنی زمینوں اور گھروں میں دفن کر رکھا تھا۔ تاکہ اگر کوئی مصیبت
ان پر آ پڑے۔ تو وہ بعد میں ان کے گذران کے کام آئے۔ پس اس طرح رعیت
کے طبقہ میں سے جو ایک قلیل تعداد بچہ سقاؤ کے خوف سے اس کے ارد گرد جمع
ہو رہی تھی۔ اس کے نہتے ہونے کے باعث وہ اس سے جنگجویانہ کام نہیں
لے سکتا تھا۔ ہاں البتہ وہ اس سے انتظامی اور شخصی خدمت متواتر لے رہا تھا۔

سرکاری فوجوں کی آمد آمد کا سنکر دراصل اس کے ہاتھ پاؤں پھول چکے
تھے۔ لیکن چونکہ اب اس کو اپنی مرگ قریب نظر آ رہی تھی۔ وہ میدان سے
بھاگ کر اپنی جان بچانا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ سرکاری فوجوں سے لڑ بھڑ کر اپنے
آپ کو فنا کر دینا چاہتا تھا۔ اس سر سے گذر جانے والی روح نے اس کی
تب و تاب میں اب تک کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیا تھا۔ اور وہ اپنے یاران
سر پل کے ساتھ اب تک جما بیٹھا تھا۔ اس نے اس دفعہ سید حسین سے امداد
کے لئے ایک نہایت ہی زبردست اپیل کی تھی۔ اور اس کو اپنا وزیر جنگ بھی

مقرر کیا تھا۔ سیدین نے بہت سے حیص بیص کے بعد اپنے ساتھیوں کی ایک تھوڑی سی جماعت اس کی امداد کو روانہ کر دی تھی۔ مگر خود ابھی پیچھے ہی تھا۔ اور اس بہانہ سے کہ وہ ایک بڑا لشکر تیار کر رہا ہے۔ محاذ جنگ سے دور ہی دور رہتا تھا۔ حکومت امانیہ کو کوہدامن اور کوہستان میں عملاً معدوم دیکھ کر اس کے دل میں بھی اب کبھی کبھی یہ خیال آنے لگ گیا تھا۔ کہ کیا عجب ہے۔ کہ ہم کامیاب ہی ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بچہ سقاؤ کی اپیل کا اثر اس دفعہ اس پر کاری ہوا تھا۔ اور وہ اب کوہستان سے نکلکر کوہدامن میں آگیا تھا جہاں اس نے لوگوں سے بزور بھرتی لینی شروع کر دی تھی۔ یہ ہمہ وقت پستول بدست رہتا تھا۔ جہاں ذرا کسی نے کوئی ناپسند حرکت کی نہیں۔ کہ یہ اسے وہیں گولی مار دیتا تھا جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ یہ خوجہ سرائے میں تھا۔ اور بذریعہ موٹر ایک گھنٹہ میں بچہ سقاؤ کے پاس پہونچ سکتا تھا۔ اس کا اتنا نزدیک ہو کر بچہ سقاؤ کے پاس نہ آنا سوائے اس کے کہ اس کے اندرونی تذبذب اور عدم یقینی کا پتہ دیتا ہو۔ اور کوئی باعث نہ تھا۔ مگر بچہ سقاؤ کی بہ نسبت زیادہ عاقل ہونے کی وجہ سے یہ دو نکھی کھیل کھیل رہا تھا۔ اپنی نفری تو اس نے بچہ سقاؤ کے پاس بھیج ہی دی تھی۔ اس لئے کل کو بچہ سقاؤ اس کو یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ اس نے خود کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق تھا۔ وہ اب بچہ سقاؤ کا وزیر جنگ تھا۔ اور بحیثیت وزیر جنگ ہونے کے وہ ملک کے اندر پھر کر گویا لشکر تیار کرنے اور محاذ جنگ پر لڑنے والوں کو کمک پہونچانے کی ضروری اور نہایت ہی اہم خدمت انجام دے رہا تھا۔ اور نہایت ہی ہوشیاری سے اس نے اپنے آپ کو بچہ سقاؤ کے اس قدر نزدیک لا رکھا تھا کہ درصورت غیر متوقع کامیابی وہ اپنے آپ کو علی الفور موقع پر موجود کر سکے ؂

ہم نے اوپر کہا ہے۔ کہ پہاڑوں کے ایک طرف امانیہ فوجیں اور دوسری طرف

ایک قلیل تعداد میں ڈاکو مورچوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور آپس میں اندھا دھند گولہ باری کے سوا ایک دوسرے کی طرف سے حملہ شروع کرنے کے آثار ابھی نہیں پائے جاتے تھے۔ مگر سرکاری فوجیں اب تک پیشقدمی کر کے سامنے کی بلندیوں کو حاصل کر چکی ہوتیں۔ اگر ایک ناشدنی واقعہ کی وجہ سے ساری فوجوں میں گھبراہٹ اور بے چینی نہ پھیل چکتی ۔

یہ واقعہ ایک نزاع سے متعلق تھا۔ جو جرنیل سور اور منگلی سرداروں کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔ نزاع کا اصلی سبب پرانی عداوت اور کینہ تھا۔ جو جرنیل سور کے برخلاف منگلی سرداروں کے دل میں بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے موقع تاڑ کر جرنیل سور سے تو تو میں میں شروع کر دی۔ اور بالآخر نوبت آپس میں گولیاں چلنے تک پہونچ گئی۔ طرفین سے چند آدمی زخمی ہوئے۔ اور جرنیل سور کو خود بھی پاؤں پر ایک گولی آ کر لگی۔ اور وہ میدان سے اپنے خیمہ کی طرف پھر گیا۔ بہت ہی جلد یہ افواہ فوجوں اور رضا کاروں میں منتشر ہو گئی۔ اور ایک عام بے چینی کے آثار خط اولین جنگ پر پیدا ہو گئے۔ جب یہ خبر کابل میں پہونچی ۔ تو محمد ولی خان (سابق وکیل اعلحضرت) جو بچہ سقاؤ کے حملہ کے وقت سے اب تک شب و روز بلا سکون و آرام پیہم ادھر ادھر دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ فوراً موقع پر پہونچا۔ اور اس نے مشتعل منگلی سرداروں کو جا کر رام کیا۔ اور فوجوں میں پھر اطمینان پیدا کرنے کی ان تھک کوشش کی ۔

بالکل اتفاقی طور پر اسی رات بچہ سقاؤ کے بھائی حمید اللہ نے صرف پچاس آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر اور انہیں بارہ بارہ اور چودہ چودہ کی چار جماعتوں میں تقسیم کر کے ہر چہار طرف سے شبخون مارنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس شبخون مارنے کا مقصد سوائے اس کے کہ سرکاری فوجوں اور بیچاری لشکر کو تھوڑی دیر کے لئے حیران کیا جائے۔ اور کچھ نہ تھا۔ مگر یہاں آج ہی کے تازہ واقعہ نے فوجیوں اور بیچاریوں میں

ایک قسم کی بدظنی اور بددلی پھیلا رکھی تھی۔ پس جونہی کہ آدھی رات کے وقت شبخون آکر پڑا۔ ایک حصہ نے تو یہ سمجھا۔ کہ کوہستان کے لشکر جس کے جمع ہونے کی افواہیں گرم تھیں۔ ایک دم آکر ٹوٹ پڑا ہے۔ اور ایک حصہ فوج نے یہ خیال کیا۔ کہ قبائلی لشکر نے صبح کا قضیہ پھیر چھیڑ دیا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ فوجیں جو سخت سردیوں کی وجہ سے آرام سے اپنے خیموں میں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک عالم اضطراب میں خیموں سے باہر نکل آئیں۔ اور یہ دیکھ کر کہ چاروں طرف گولیاں چل رہی ہیں۔ وہیں بیدل ہو کر رہ گئیں۔ رات کی اس خوفناک تاریکی میں جس کا جس طرف منہ اٹھا۔ بھاگ کر غائب ہو گیا۔ اور ایک گھنٹہ کے اندر ہی اندر یہ فوج اپنا تمام سازوسامان سقاویوں کے لئے چھوڑ کر منتشر ہو گئی ۔

رات کی تاریکی میں بھاگنے والوں کی ہائے وغل نے حمید اللہ کو واقعہ کی اصلیت سے باخبر کر دیا تھا۔ اور صبح ہوتے ہی وہ اس تمام سامان حرب و ضرب خیمہ و خرگاہ کا مالک تھا۔ جو باغی سمت شمالی کی تادیب و سرزنش کے لئے حکومت نے یہاں جمع کر رکھا تھا۔ بھگوڑے اپنی بندوقیں تو درکنار اپنے کپڑے اور بوٹوں تک چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ اور اس طرح بچہ سقاؤ کے قبضہ میں سینکڑوں کی تعداد میں بندوقیں لاکھوں کی تعداد میں گولی و بارود درجنوں کی تعداد میں مشین گنیں اور کئی ایک توپیں بھی ہاتھ آگئی تھیں۔ اس غیر متوقع فتح نے اس کی دھاک ہر کہ و مہ پر بٹھا دی تھی۔ اور اس کا اعتبار آگے سے ہزار چند فزوں ہو گیا تھا۔ کوئی شک نہیں۔ کہ اگر اسی شام کو اس کی نفری کابل میں داخل نہ بھی ہو سکتی۔ تو اس فتح کے اعتبار کے صلہ میں وہ اب سمت شمالی کو پورے طور پر اپنی مدد پر آمادہ کر سکتا تھا ۔ اور اس حربی قوت پر جواب اسے حاصل ہو گئی تھی۔ وہ کئی مہینوں تک حکومت کو ابھی اور پریشان کر سکتا تھا۔ مگر کسے خبر تھی۔ کہ واقعات اپنی غیر معمولی معجز نمائی کے ساتھ دم کے دم ہی میں یعنی آج کی رات ہی اسے

کابل کے تخت و تاج کا مالک بنا دیں گے۔

حکومت کی اس تباہ کن شکست کے بعد بھی ابھی بچہ سقاؤ کا کابل پر چڑھائی کر کے اسے سر کر لینا اگر ناممکن محض نہیں۔ تو اک امر محال ضرور تھا۔ کابل کی مدافعت کی استحکامیہ وضعیت کچھ اس طرح مضبوط کی گئی تھی۔ کہ سمت شمالی کی پوری قوت بھی اس سنگین حصار کو توڑ کر اندر آ گھسنے کے نااہل تھی۔ مگر غازی امان اللہ خان کے اپنے تذبذب اور سراسیمگی نے اک آن واحد میں اس سنگین حصار کو ریگ رواں کی طرح ثابت کر دکھایا تاکہ بالمقابل کو اس کے مقابلہ میں ایک ادنےٰ طاقت کے خرچ کرنے کی ضرورت بھی باقی نہ رہے۔

اس حصار سنگین کے ٹوٹنے کی خبر غازی امان اللہ خان کو اسی دم آدھی رات کے وقت لگ گئی تھی۔ اور اسی خبر کے ملنے پر اس نے افغانستان پر آئندہ حکومت کرنے کی جملہ توقعات کو رخصت کر دیا تھا۔ فطرت انسانی کا یہ ایک خاصہ ہے۔ کہ خوف و مایوسی کے عالم میں انسان ایک ادنےٰ سی آہٹ سے بھی تھرا اٹھتا ہے۔ اور اپنے رفیقوں غمگساروں اور جانی دوستوں تک کو بھی شکوک اور تردّد کی نگاہوں سے دیکھنے لگ جاتا ہے۔

ان حالات میں کہ ایک طرف سمت مشرقی میں ابھی تک سکون و امن نہیں ہوا۔ بلکہ اس طرف سے بھی کابل پر زود از زود چڑھائی کی خبریں مل رہی ہیں۔ اور دوسری طرف بچہ سقاؤ عین کابل کے سر پر پہونچ چکا ہے۔ غازی امان اللہ خان کا تذبذب بالکل فطرتی تھا۔ وہ بہادر تو ضرور تھا۔ مگر صاحب تہوّر بالکل نہیں تھا۔ اے کاش وہ بہادری کی صفت کے ساتھ تہوّری کی صفت سے بھی ناآشنا نہ ہوتا۔ تو یقیناً افغانستان کا تاج و تخت ابھی تک اسی کی زیب و زینت ہوتا۔ جن طبائع میں بہادری کے جذبات کے علاوہ تہور کے انداز بھی پلئے جائیں۔ ایسی طبائع نازک

لمحات میں اس فطرتی تذبذب پر غالب آکر مقابلہ میں استقلال کے ساتھ ڈٹ جایا کرتی ہیں۔ اور یا وہ مقابل کی قوت سے ٹکرا کر خود پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ اور یا پھر نئے سرے سے ہوا کے رخ کو اپنے موافق کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اور اپنے دشمنوں پر ایک ہی سانس میں غالب آجاتی ہیں:۔

غازی امان اللہ خان میں اس جوہر تہور کی کمی نے اسے اس آخری شکست کے فوری اثر سے نجات پانے کی مہلت نہ دی۔ واقعات کی رفتار کو اس تیزی سے اپنے مخالف دیکھ کر اس کی رہی سہی کمر ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ اب اسے چاروں طرف مایوسی ہی مایوسی گھیرے ہوئے تھی۔ اور آدھی رات کے پر سکوت اور ہیبت زا سماں نے اس فطرتی منظر کو اس کی نگاہوں میں اور بھی گھناؤنا تاریک اور پر خوف بنا دیا تھا۔ اس وقت جو خیال اس کے دل و دماغ پر چھا رہے تھے۔ وہ یہ تھے:۔

سمت شمالی کے باغی کل تک کابل کی دیواروں کے نیچے پہونچ جائیں گے۔ میری فوج میری طرف سے بالکل نہیں لڑتی۔ پھر اگر وہ کل ہی کابل میں پہونچ گئے تو میرا کیا حشر کیا ہوگا۔ مجھے وہ گرفتار کرتے ہی مار دینگے۔ مجھے ضرور جان بچا کر فوراً ہی نکل جانا چاہئے۔ آہ! مگر کس طرف کو جا کر جان بچاؤں۔ سمت شمالی باغی سمت مشرقی باغی سمت جنوبی اسے بھی باغی ہی سمجھو۔ ترکستان۔ آہ! مگر میں تو اپنے بال بچوں کو قندھار بھیج چکا ہوں۔ میرے ترکستان کی طرف نکل جانے سے نہ معلوم ان کا کیا حشر ہو۔ اور یقیناً وہ ہی ہمدردی جو قندھاریوں کو بوجہ ہم قومی کے مجھ سے ہو سکتی ہے۔ وہ بھی نہ ہیگی اس سے بھی قطع نظر ترکستان میں جا کر کیا کرونگا۔ وہاں تو تمام غیر افغان قومیں آباد ہیں۔ مجھ کو بھگوڑا سمجھ کر نہ معلوم کس قسم کا سلوک کریں۔ نہیں نہیں مجھے ایسی دور و دراز جگہ ہرگز نہ جانا چاہئے۔ اور پھر میں وہاں پہونچ بھی کیسے سکتا ہوں۔ اگر غیر از سمت شمالی دوسری راہ بھی اختیار کروں تو موٹر کی راہ اس طرف بھی نہیں ہے ہوائی جہاز! آہ!! یہ میرے لئے

خاصکر پُرخطر کھیل ہے۔ نہیں نہیں مجھے ہوائی جہاز پر تو سفر کرنے کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہئے موٹر اور صرف موٹر۔ ہاں ہاں بس یہی سواری ٹھیک ہے۔ تو پھر کیا قندہار کا رُخ کروں۔ بیشک بیشک یہی آج سارے افغانستان میں امان اللہ خان کے لئے بجز اس کے اور کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے۔ مگر غزنی اور قندہار کے مابین کا راستہ بھی تو مسدود ہو چکا ہے۔ اوہ! اس کی مجھے پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ برفوں کو ہٹوا کر راستہ بنایا جا سکتا ہے۔ تو پھر کیا ابھی چل دوں۔ نہیں نہیں۔ صبح ہونے تک کا مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔ ارغندی تک تمام فوجیں ہی فوجیں ہیں۔ مجھے دیکھ کر کہیں شک نہ کر جائیں۔ اور بچہ سقاؤ کی بجائے خود ہی میری مشکیں نہ کس ڈالیں +

اس رات ان خیالات کی موجوں کے آغوش میں غازی امان اللہ خان کے اقبال و عروج کا ستارہ غروب و فنا ہو رہا تھا۔ اس نے اس رات ایک لمحہ کے لئے بھی آرام نہیں کیا۔ بلکہ اپنے بھائی سردار عنائت اللہ خان معین السلطنت کو اسی وقت اپنے پاس بُلا کر اپنا عندیہ اس سے ظاہر کیا۔ اور اسے بہ کمال منت و الحاح اس بات پر راضی کر لیا۔ کہ وہ ایسے نازک وقت میں افغانستان کی بادشاہت قبول کرے +

سردار عنائت اللہ خان جانتا تھا۔ کہ ان بھڑوں کے چھتے کو جو ملک کے طول و عرض میں ہر طرف چھڑ بیٹھا ہے۔ پھر سکون دینا اس کی طاقت سے باہر ہے۔ تاہم اس خیال و اُمید سے کہ بغاوت شخص امان اللہ خان کی ذات کے برخلاف ہو رہی ہے۔ شاہی خاندان کے برخلاف نہیں۔ اور باغی بھی صرف امان اللہ خان کی برطرفی اور دست برداری تخت و تاج کا مطالبہ پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ غازی امان اللہ خان کے دست بردار ہو جانے کی خبر جب باغیوں تک پہونچے گی۔ تو وہ اپنے آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب دیکھ کر بغاوت و لڑائی

سے باز آجائیں گے ۔

پہلے پہل جب غازی امان اللہ خان نے اس کو اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ تو سردار عنائت اللہ خان دل میں یہ خیال کر کے ڈر گیا تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان شاید اس کا مافی الضمیر معلوم کرنے کے لئے اس کو ایسا کہہ رہا ہے۔ مگر آخر کار تھوڑی دیر میں اس کو پتہ لگ گیا۔ کہ اس کا بھائی افغانستان کے تاج و تخت کو اس کے حق میں ترک کر کے کابل سے چلے جانے کا قطعی اور مصمم ارادہ کر چکا ہے ۔

نہ معلوم اس رات ان دو بھائیوں کے درمیان کیا کچھ سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ مگر نتیجہ یہ تھا۔ کہ صبح ہوتے ہی غازی امان اللہ خان ایک تیز رفتار موٹر پر قندھار کی طرف رخصت ہو چکا تھا۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ ہمیں بعد میں جا کر یہ افسوسناک مگر قدرے عجیب حقیقت معلوم ہوئی۔ کہ غازی امان اللہ خان نے جس موٹر کو قندھار تک سفر کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ اسے جب اس نے چلنے کے وقت منگوایا۔ تو وہ دفعتہً موڑتے وقت الٹ گئی۔ اور جب اس نے جھنجلا کر شاہی موٹربان سے چند دوسری موٹروں میں سے کسی ایک کو لانے کے لئے کہا۔ تو اسے جواب ملا۔ کہ کسی میں پٹرول موجود نہیں ہے۔ پشاور کا راستہ بند ہونے کی وجہ سے اگرچہ کابل میں پٹرول کا قحط پڑا ہوا تھا۔ تاہم شاہی موٹروں میں پٹرول کا موجود نہ ہونا ایک اچنبھا تھا۔ کیا کوئی گہری سازش غازی امان اللہ خان کے برخلاف موجود تھی؟ اس کے متعلق باوجود تحقیقات کے کوئی صحیح بات معلوم نہیں ہو سکی۔ ہاں غازی امان اللہ خان کے کابل چھوڑنے کے کوئی دو ایک دن پیشتر یہ واقعہ ضرور پیش آچکا تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان کا اپنا موٹربان جو ایک ہندوستانی تھا۔ صبح کو شاہی موٹروں میں سے

ایک میں مُردہ پایا گیا۔ بعض لوگوں کو یہ گمان گذر رہا تھا۔ کہ موٹربان کا خاتمہ شاہی حکم سے کیا گیا ہے۔ مگر ڈاکٹری ملاحظہ نے اس کی قطعی تردید کر دی تھی بات یہ تھی کہ موٹربان جو نوکری (ڈیوٹی) پر ہوتے تھے۔ ان کو موٹروں کے ہمہ وقت تیار رہنے کا حکم ملا ہوا تھا۔ اس رات اس جواناں مرگ ہندوستانی موٹربان کی باری تھی۔ اور چونکہ ان دنوں سخت سردی کا موسم تھا۔ اس لئے انجن کے جکڑ جانے کے خوف سے اس نے اس کو چلتا رہنے دیا۔ اور آپ موٹر کے تمام دروازے اور پردے بند کر کے اندر سو رہا۔ پٹرول کی بو وار گیس نے اندر کی ہوا کو زہریلا بنا دیا تھا۔ اور چونکہ وہ گہری نیند سو رہا تھا اِس لئے جب تک اسے ہوش آتا۔ اس کی طاقت اس ہوا کے اثر سے بالکل زائل ہو چکی ہو گی۔ اور وہ ایک نیم غشی اور سراسیمگی کی حالت میں موٹر کا دروازہ کھولنے کے ناقابل ہو گا۔ اور بالآخر اسی سے اس کی موت وارد ہوئی ہو گی۔

غازی امان اللہ خان کے اس خاص موٹربان کی موت اور غازی کی روانگی قندھار کا درمیانی وقفہ چونکہ بہت ہی قلیل تھا۔ اس لئے شاید دوسرے موٹربانوں کی عدم توجہی یا غفلت کی وجہ سے موٹروں وغیرہ میں پٹرول نہ رہا ہو۔ خیر وجہ جو کچھ بھی تھی حقیقت یہ تھی۔ کہ جس موٹر کار پر غازی امان اللہ خان سوار ہو کر قندھار کی طرف راہی ہوا۔ اس میں ایک دو گیلن سے زیادہ پٹرول نہ تھا۔

معزول بادشاہ کا اس بے سروسامانی کے ساتھ کابل سے نکلنا اس کی بے انتہا مایوسی اور گھبراہٹ کا صاف پتہ دے رہا تھا۔ دارالسلطنت اور اس کے اردگرد میں وہ اپنے لئے پناہ کی کوئی جگہ نہ پاتا تھا۔ اور معتمد سے معتمد ترین شخص پر سے اس کا اعتبار اب اٹھ چکا تھا۔ اس لئے وہ اپنے قیمتی لمحوں کا ایک حصہ بقدر کفایت پٹرول کے حاصل کرنے میں ضائع کئے بغیر اسی ایک دو گیلن پٹرول پر سہارا

کئے ہوئے کابل سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک فوجی افسر اور اس کے وزیر دربار کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ یہ پٹرول اس کو کم از کم غزنی تک لے جا سکتا تھا اور شاید اسے امید ہو۔ کہ وہ قندہار سے پٹرول لانے والی لاریوں سے جن کے وہاں سے چل پڑنے کا اس کو ضرور علم ہو گا۔ مزید پٹرول حاصل کر سکے گا۔ پس اسی امید پر تکیہ کر کے وہ بتاریخ ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء دن کے آٹھ بجے کے قریب کابل سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

ابھی وہ کابل سے چند ہی میل کے فاصلہ پر گیا ہو گا۔ کہ اسے ایک موٹر لاری پٹرول سے بھری ہوئی مل گئی۔ اس نے اس کو ٹھیرا کر موٹربان سے پٹرول قیمت پر خریدنا چاہا۔ مگر موٹربان چونکہ اس کو پہچانتا تھا۔ اس لئے اس نے نہایت ہی ادب سے محروم النصیب بادشاہ کی خدمت میں اس کی خواہش کے مطابق پٹرول پیش کر دیا۔

اس خزانہ سے مالا مال ہو کر غازی امان اللہ خان نے اپنی موٹر کی رفتار کو بلا کی آندھی کی طرح تیز کر دیا۔ اور ایک دو گھنٹوں کے اندر وہ میدان کو طے کرتا ہوا شیخ آباد جو کہ غزنی اور کابل کے عین درمیان میں واقع ہے پہونچ گیا۔ وہاں اس نے ٹیلیفون گھر کے افسر کو بلا کر ہدایت کر دی۔ کہ جب تک وہ غزنی پہونچکر اسے مزید ہدایت نہ دے۔ کابل اور غزنی کے درمیان ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع رہے۔ اپنے بادشاہ کا حکم سنکر افسر نے اپنا سر اطاعت جھکا دیا اور بادشاہ سیاستاً اس افسر کا نام اپنی انعامی فہرست میں لکھکر آگے کو روانہ ہوا۔ یہ کہنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ کہ جب تک امان اللہ خان کی دستبرداری کا آوازہ بلند ہو کر سمع بہ سمع اس ٹیلیفونچی تک نہیں پہونچا۔ اس نے غزنی اور کابل کا سلسلہ ٹیلیفون منقطع ہی رکھا۔

اب بادشاہ کے لیئے غزنی اور مقر کا درمیانی علاقہ طے کرنا مشکل رہ گیا تھا جو برفباری کی وجہ سے بعض جگہوں پر ناقابل عبور ہو رہا تھا۔ غزنی سے قندہار پہونچنے تک بادشاہ نے فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ گویا وہ ایک فوجی منصبدار کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ ایک جگہ موٹر برف اور کیچڑ میں بالکل ہی دھنس گئی۔ چنانچہ نزدیک کی آبادی سے چند ایک آدمی لائے گئے۔ جو ایک دو فرلانگ تک کے خراب راستہ کو بیلچوں وغیرہ سے صاف کر دیں۔ مگر افسوس کہ بیلچے وہاں کام نہیں دے سکتے تھے۔ برف پگھل کر کیچڑ بن چکی ہوئی تھی۔ اور سڑک کے نیم خام ہونے کی وجہ سے موٹر کا پہیہ ایک ایک گز تک نیچے دھنس جاتا تھا۔ آخر خشک گھاس اور جھاڑیوں کو کاٹ کر سڑک پر بچھائے جانے کی تجویز ٹھیری۔ مگر یہ کام بہت آدمیوں سے ہو سکتا تھا۔ اور اس قدر آدمی مفت نہیں مل سکتے تھے۔ ایسی سنسان اور لق ودق جگہ میں بادشاہ کے ہمراہی اس کی جان کی حفاظت کے بارے میں سخت مشوش تھے۔ اگر کہیں یہاں کے لوگ بادشاہ کو پہچان لیں۔ اور پھر ان کو یہ گمان بھی ہو جائے۔ کہ بادشاہ بھاگ کر جا رہا ہے۔ تو نہ معلوم اس سے کیا سلوک کریں۔ اس ایک خیال کے آتے ہی بادشاہ کا ایک ہمراہی ان آدمیوں کو جنکو وہ سڑک صاف کرنے کے لئے نزدیک کی آبادی سے لایا تھا۔ کہنے لگا۔ کہ اگر تم یہ راستہ ہمارے لیئے قابل گذر بنا دو۔ تو اس قدر پونڈ تم کو انعام دیئے جائینگے۔ صحیح مقدار پونڈوں کی مجھے معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن وہ اسقدر زیادہ تھی۔ کہ ان لوگوں کو چوکنا کر دے۔ مگر غازی امان اللہ خاں نے موقعہ کو فوراً ہی بھانپ کر معاً ایک زور دار دھپڑ اپنے اس ہمراہی کے رسید کیا۔ اور غصہ میں آکر بولا۔ کہ کیا ہم سے باز خواست کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ جب ہمارا بادشاہ یہ سنیگا۔ کہ ہم نے اتنی رقم ایک اتنے سے معمولی کام پر صرف کر ڈالی۔ تو گیا وہ ہماری کھال ادھیڑ کر نہیں رکھ دیگا۔ اگر ان لوگوں

کو یہ کچھ قبول ہے۔ (ایک معمولی مقدار) تو بیشک یہ ہمارے لئے سڑک صاف کر دیں۔ وگرنہ ہم ابھی غزنی واپس لوٹ کر بادشاہ کو ان لوگوں کے غیر واجب سلوک کی خبر دیتے ہیں۔ پھر وہ جس طرح چاہے گا۔ ان سے بازپرس کرے گا۔ ہم جس کام پر قندہار جا رہے ہیں۔ وہ اتنا اہم ہے۔ کہ اگر ان لوگوں کی وجہ سے ہم اس کو تکمیل نہ کر سکے۔ تو ان پر بادشاہ کی طرف سے یقیناً سخت عتاب نازل ہوگا۔

اس تدبر آمیز دھمکی کا اثر کارگر ثابت ہوا۔ اور ان آدمیوں نے جھٹ اِدھر اُدھر سے اور نفری جمع کر کے راستہ درست کر دیا۔ اور غازی امان اللہ خان بہ صحیح و سلامتی قندہار جا پہنچا۔

ہم قارئین کی توجہ کو کابل کے حالات کی طرف پھر متوجہ کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ سردار علی احمد جان نے خواہ سیاستاً بہ مشورہ غازی و یا ارادتاً بغداراً خود اس سے خیانت کرتے ہوئے اپنی بادشاہت کا اعلان سمت مشرقی میں کر دیا ہوا تھا۔ اور یہ حالات بادشاہ کو قبل از روانگی قندہار مل چکے ہوئے تھے۔ اور سردار علی احمد جان نے اقوام مشرقی کے متفقہ مطالبہ کو جو کہ کابل پر خروج کئے جانے کے متعلق تھا۔ مان لیا ہوا تھا۔ مگر فوجی نقل و حرکت کے کافی لوازم مہیا نہ ہونے کے سبب نافراہمی جملہ ساز و سامان اس نے کابل پر چڑھائی کرنے کی مہم عمداً یا ضرورتاً روک رکھی ہوئی تھی۔ اور اس لئے کوئی تعجب نہیں۔ اگر بادشاہ کو اس خروج کے متعلق ایسی متضاد خبریں ملتی رہی ہوں جنکی بنا پر وہ سردار علی احمد جان کے وطیرہ کے متعلق مذبذب اور متوہم سا ہو گیا ہو۔ اور اس طرف سے بھی مستقبل قریب میں لشکر کشی کا خطرہ اس کے نزدیک یقینی صورت اختیار کر چکا ہو۔ اور اس طرح اس کی انتہائی مایوسی کا موجب بنا ہو۔ لہذا چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی پاکر اس نے بالآخر افغانستان کے تخت سے دستبردار ہو کر کابل سے چل دینے کا عزم کر لیا ہو۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ کہ غازی امان اللہ خان کوئی آٹھ بجے صبح چل دیا تھا۔ ارک کے تمام دروازے رات ہی سے بند ہو چکے ہوئے تھے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی لوگوں میں بچہ سقائی کی فتح پانے اور ارک کے دروازوں کے پھر بند ہونے کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ مگر اس بات کا کسی کو بھی وہم و گمان نہ تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان تخت افغانستان سے دست بردار ہو کر قندہار کی طرف جا چکا ہے۔ ایک دو گھنٹوں کے اندر تمام اکابرین و عمائدین شہر کو ارک کے اندر طلب کر لیا گیا تھا۔ مگر لوگوں کو غازی امان اللہ خان کے چلے جانے اور اس کی جگہ معین السلطنت سردار عنائت اللہ خان کے بادشاہ ہونے کے متعلق اس وقت تک خبر نہیں لگی۔ جب تک مذکورہ بالا اکابرین ارک سے واپس نہیں پھرے۔ دو بجے دوپہر تک سارے شہر میں یہ حال بخوبی روشن ہو چکا تھا۔ اور نئے بادشاہ کی رسم تخت نشینی کے طور پر توپوں کے چلنے نے اس خبر کی مزید تصدیق کر دی تھی۔ وہ اکابرین و عمائدین دولت ملت جو ارک کے اندر طلب کئے گئے تھے۔ ان کو غازی امان اللہ خان کا خطِ دست برداری پڑھ کر سنائے جانے کے بعد معین السلطنت نے لوگوں سے اپنے ہاتھ پر بیعت لی تھی۔ بادشاہ گری کی رسم حضرت صاحب شور بازار کے چھوٹے بھائی نے ادا کی تھی۔ جس کو غازی امان اللہ خان نے ابھی چند دن ہوئے۔ قید خانہ سے رہا کیا تھا۔ ضروری ہے۔ کہ ہم اس موقعہ پر کچھ مختصر سا حال حضرات شور بازار کا بیان کر دیں۔ تاکہ قارئین پر ان حضرات کی سیاسی اور ملکی زندگی کے چند نمایاں پہلو روشن ہو جائیں ٭

یہ خاندان ایک عرصۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ اور افغانستان میں اپنا مخصوص مذہبی اثر رکھتا ہے۔ دور و نزدیک کے قبائل میں ان کی پیری و مریدی کا سلسلہ نہایت وسیع اور گہری بنیادوں پر قائم ہے۔ اور اعتقادیات کی اس مخصوص فضا میں جو

جہل کا خاصۂ اولین ہے۔ لوگوں میں یہ گھرانہ برکت والا سمجھا جاتا ہے۔ شروع ہی سے اس گھرانہ کے جانشین بادشاہوں کی تخت نشینی کے موقع پر ہر نئے بادشاہ کی دستار اور کمربندی کی رسم ادا کرتے آئے ہیں۔ اس ایک امتیازی چیز نے ان کی عزت و حرمت کو اور بھی چار چاند لگا رکھے ہیں۔ غازی امان اللہ خان کے اوائل عہد میں اس خاندان کی قدر و آبرو بدستور قائم تھی۔ مگر رفتہ رفتہ دورِ امانیہ کی تیز گردشوں نے اعتقادیات و ملائیت کو ہر چہار طرف سے محصور و بے دست و پا کرنے کے لئے جب حصار بندی شروع کی۔ تو ان کے وقار اولین میں خود بخود گھن لگنا شروع ہوا۔ ملائے لنگ کی پر از زیاں بغاوت نے غازی امان اللہ خان کو بالکل ہی ملائیت سے متنفر کر دیا تھا۔ اور اب وہ عزم راسخ کے ساتھ ملک سے اس کے اخراج کے درپے تھا۔ بغاوت منگل کے دوران میں حضرت صاحب شور بازار کا مشن جو ملائے لنگ کے پاس بدیں غرض بھیجا گیا تھا۔ کہ وہ بغاوت سے باز آ کر حکومت سے صلح و آشتی کرے۔ بالکل ناکام رہا تھا۔ اور اس لئے حضرت صاحب شور بازار کی رہی سہی اہمیت بھی اس کی نظروں میں کم ہو چکی تھی اور یہ کچھ بھی عجیب بات نہیں ہے۔ کہ جب کسی دو شخصوں کے درمیان جو کبھی آپس میں محبت و آبرو داری کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہوں۔ بعد میں آپس کے تعلقات میں فرق آ جائے۔ تو مزید غلط فہمیاں یا اتفاقی حادثات و واقعات ان میں الفت و احترام کی جگہ دشمنی و حقارت کے بیجوں کے بوئے جانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ بیج غازی امان اللہ خان اور حضرت صاحب شور بازار کے خاندان کے درمیان بغاوت منگل کے بعد سے بوئے جا چکے تھے۔ ان بیجوں کے ہر دو دلوں میں مضبوطی سے جڑ پکڑے جانے کا ایک اور چیز بھی باعث ہوئی۔ اور وہ سلیمان خیل قبائل کے متعلق حکومت کی ملکی سیاست تھی۔ جس کا ذکر اس سے پہلے کہیں گذر چکا

ہے۔ سلیمان خیل قبائل بہ نسبت اور افغانی قبائل کے ثروت میں زیادہ تھے۔ اور حضرت صاحب شوربازار کی پیری مریدی کا سلسلہ بھی یہیں سب سے زیادہ گہرا اور وسیع تھا۔ یہ محض ایک اتفاقی بات نہ تھی۔ بلکہ طبعاً ایسا ہی کچھ ہونا بھی چاہئے تھا لوگوں میں جہالت تھی۔ اور اس لئے مذہبی راہنمائی ملانوں کی ایک امتیازی شئے بن چکی ہوئی تھی۔ ادھر ملک جس عمرانی ماحول میں سے گذر رہا تھا۔ اس کے ماتحت یہ لابد تھا۔ کہ حکومت بھی ایک بڑی حد تک اس مذہبی راہنمائی کی امتیازی صفت کو قبول کرے۔ اور مذہبی لوگوں کو اپنے آپ سے خوش رکھنے کے لئے ان کا بہت زیادہ احترام اور دلجوئی کرتی رہے۔ حکومت کو یہ احترام اور دلجوئی کئی صورتوں میں ظاہر کرنی پڑتی تھی۔ اور ان میں ایک اہم صورت یہ تھی۔ کہ وہ ان مذہبی لوگوں کی پیشکردہ سفارشات کو قبول کیا کرے۔ گویا مذہبی راہنمائی کے امتیاز کی بدولت یہ عنصر حکومت اور لوگوں کے درمیان ایک نہایت مؤثر وسیلہ سفارشات بن چکا ہوا تھا۔ گنہگاروں کی جان بخشی کروانا۔ ظالموں کو انصاف کی گرفت سے پناہ دلوانا۔ امیدوار حکام و عمال کو عہدوں وغیرہ پر مامور کروانا۔ امراء اور گروہوں کو حکومت سے بعض رعائتیں دلوانا۔ وغیرہ وغیرہ اس وسیلہ سفارشات کے نمایاں جوہر بن گئے ہوئے تھے۔ اسی سے پیروں، ملانوں اور گدی نشینوں کی گرم بازاری زیادہ رونق پکڑتی ہے۔ اور ان کے حلقۂ ارادت و عقیدت کو بے انتہا آمدنیوں کے وسائل و ذرائع کے ساتھ وسیع و عریض کرتی رہتی ہے۔ لہذا حضرت صاحب شوربازار کے خاندان کا انہی قبائل سے زیادہ تعلق ہو سکتا تھا۔ جن سے ان کو معتدبہ آمدنی ہو سکے۔ اور جن کی خواہشات کو حکومت وقت تک پہنچانے اور ان کے لئے رعائتیں حاصل کرنے کا بجز اس ایک ذریعہ کے اور کوئی ذریعہ

موجود نہ ہو۔ اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ کہ ان قبائل میں سلیمان خیل ہی ایک ایسے تھے۔ جو بہ نسبت دوسروں کے ثروت میں زیادہ تھے۔ اور ان کی خواہشات بھی اسی نسبت سے کثیر درکثیر تھیں۔ نہ صرف یہی بلکہ حکومت افاغنہ جس خاندان کو نصیب تھی۔ وہ بھی اس قبیلہ سے رقابت رکھتا تھا۔ اس لئے سلیمان خیل کا یہ خیال تھا۔ کہ بالواسطہ حکومت تک اپنی خواہشات لے جانا شاید ان کے لئے مؤثر نہ ہو۔ لہذا ملک کے دستور اور رسم دروایات کے اثر کے ماتحت وہ اس خاندان کے اثر و قوت کو دیکھ کر اس کی طرف جھک پڑے ہوئے تھے۔ اور وقت ناوقت یہی ان کا وسیلہ سفارشات و شفاعت تھا۔

ایک اور بات بھی یہاں قابل ملاحظہ ہے۔ وہ یہ کہ یہ بھی ایک طبعی امر ہے کہ جس جماعت یا گروہ کی پشت قوی ہو۔ وہ اوروں کی نسبت زیادہ شوخ اور دست دراز ہوا کرتا ہے۔ اور اس خیال کے پیش نظر کہ اگر کبھی ان پر کوئی آفت آبھی گئی۔ تو وہ اسی وسیلہ کے ذریعہ سے ٹالی جاسکے گی۔ دوسروں پر ظلم کرنے سے نہیں چوکتے۔ بیچارے ہزاروں کی سوشل اور سیاسی حالت امیر عبدالرحمن اور امیر حبیب اللہ خان کے وقتوں میں نہایت ہی ابتر تھی اس وقت سلیمان خیل قبائل نے جس جس طرح سے چاہا۔ ان کی پامالی پر کمر باندھے رکھی۔ مگر اب غازی امان اللہ خان نے چونکہ ان کی گری ہوئی اور مظلومانہ حالت کے اصل اسباب کو معلوم کرلیا ہوا تھا۔ اور وہ ان کو اس ذلت سے نکالنا بھی چاہتا تھا۔ اس لئے وہ سلیمان خیلی ظلموں کا دوام ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ سیاست داخلی کی رو سے بھی ان مظالم کا جلد خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔ دوسری طرف سلیمان خیل قبائل کے پاس بجز حضرت صاحب شور بازار کے اور کوئی وسیلہ نہ تھا لیکن اب وہ بھی بدقسمتی سے غازی امان اللہ خان کے اس خاندان

سے دل گرفتہ ہو جانے کی وجہ سے موجود نہیں رہا تھا۔ اس لئے ایک طرف سلیمان خیل قبائل حکومت امانیہ کی اس سیاست سے جو براہ راست ان پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ناراض ہو رہے تھے۔ تو دوسری طرف ان کے پیر و مرشد کی قدر و منزلت بادشاہ کی نگاہوں میں کم ہو جانے کے سبب سے ان کی حسیات آتش زار بن رہی تھیں۔ حضرت صاحب شور بازار خود بھی اپنی سبکی کو محسوس کر رہے تھے۔ اور اب حکومت میں چونکہ ان کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے یہ اپنے مریدین کے وسیع حلقہ میں بادشاہ کی سیاستِ مذہبی پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ اور بقول حکومت امانیہ کے غازی امان اللہ خان کو تخت سلطنت سے برطرف کرنے اور اس کی جگہ اپنی پسند کا کوئی بادشاہ بٹھانے کے لئے سمت جنوبی کے قبائل کو جہاں ان کا بے حد اثر و رسوخ تھا۔ ایک اور دفعہ شورش پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس مطلب کے لئے وہ کابل کے اندر بیٹھ کر خود کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ (کیونکہ ذرا سے راز کے انکشاف پر فوراً بادشاہ کی گرفت میں آ سکتے تھے) اس لئے حضرت صاحب شور بازار حج کرنے کے حیلہ سے افغانستان سے چلے آئے ہوئے تھے۔ اور حج سے واپسی پر انہوں نے افغانستان واپس جانے کی بجائے ہندوستان کے مقام سرہند شریف میں قیام کر لیا ہوا تھا۔ یہاں سے وہ اپنے مریدان افغانستان سے برابر راہ و رسم رکھتے تھے۔ اور سلیمان خیل قبائل کے تاجر لوگ جو کثرت سے ہر سال ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے رہتے تھے۔ ان کے اور ان کے مریدوں کے درمیان واسطہ بنے ہوئے تھے۔ حضرت صاحب شور بازار کا باقی سارا خاندان معہ ان کے چھوٹے بھائی شیر آقا کے افغانستان ہی میں تھا۔ اور یہی وہ شیر آقا تھے۔ جن کو غازی امان اللہ خان نے اپنی معزولی سے چند یوم قبل قید و بند سے مخلصی دی تھی۔

یہ اوران کے چند ہمراہی غازی امان اللہ خان کے یوروپ جانے سے کچھ دن پیشتر ہی سے قید تھے۔ شیر آقا کے قید کرنے کی یہ وجہ تھی۔ کہ یہ اوران کے چند ساتھی سمت جنوبی کے علاقہ میں جاکر حکومت کے برخلاف کھلم کھلا جہاد کی تبلیغ کرتے ہوئے کسی مقررہ امن کی جگہ پر محفوظ ہو جانا چاہتے تھے۔ کہ عین بروقت پکڑے جاکر کابل کی طرف بھیجدئے گئے تھے۔ اور اس وقت سے قید ہی میں تھے۔ ان کے ایک ہمراہی کو جو علماء میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ غازی امان اللہ خان نے فوراً ہی دار پر لٹکا دیا تھا۔ مگر بوجہ حضرت صاحب شور بازار کے افغانستان سے باہر ہونے کے اس کو شیر آقا کے قتل کرنے کی جرأت نہ پڑی تھی۔ اور یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی۔ کہ اگر غازی امان اللہ خان کو اپنی اصلاحات میں کامیابی نصیب ہوتی۔ تو شیر آقا بھی ضرور تہ تیغ کر دئے جاتے ہ:

اس ضروری معرفت کے بعد ہم پھر اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں نئے بادشاہ کی مراسم تخت نشینی کے ادا کرنے اور لوگوں سے بیعت وغیرہ لینے میں نہایت ہی قیمتی وقت کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو چکا تھا۔ اب دن کے دو بج چکے تھے۔ سرکاری فوجیں جو دارالسلطنت کی محافظت کی غرض سے اس کے سہ طرف حصار ڈالے بیٹھی تھیں۔ ان کو ابھی تک اس انقلاب کا جو ارک کے اندر ہو چکا تھا۔ مطلق علم نہ ہوا تھا۔ اور ان کی موجودگی میں یہ کسی کو وہم بھی نہ تھا۔ کہ بچہ سقاؤ آج ہی کابل کے شہر پر قبضہ کر لیگا۔ کیونکہ گو اس کو گذشتہ شب ایک نہایت ہی شاندار کامیابی ہو چکی تھی۔ اور اب وہ بھی ہر قسم کے اسلحہ توپ بندوق مشین گنوں وغیرہ سے مسلح تھا۔ تاہم کابل کے فوجی حصار کو توڑ کر اندر آجانا قطعیاً غیر ممکن تھا۔ اور اب چونکہ غازی امان اللہ خان نے

تخت سے دست برداری اختیار کر لی تھی۔ اور وہ خود بھی چلا جا چکا تھا۔ اور اس کی جگہ سردار معین السلطنت بادشاہ بن چکا تھا۔ جس کی بادشاہت پر ملت کو کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے بچہ سقاؤ کو قتل مسلمین سے مزید ہاتھ رنگنے کے لئے کوئی عذر و حیلہ شرعی باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ فلہٰذا امید کی جا رہی تھی۔ کہ نئے بادشاہ کا پیغام پہونچتے ہی وہ سر اطاعت خم کر لے گا۔ اور آج ہی مزید لڑائی بند ہو جائے گی ٭

پس ان خیالات کی روشنی میں بعد از مراسم تخت نشینی سب سے پہلا کام جو نئی حکومت نے انجام دینا چاہا۔ وہ یہی تھا۔ کہ حکومت کی طرف سے علماء کا ایک وفد بچہ سقاؤ کی طرف بھیجا جائے۔ جو اس کو سارے واقعات سمجھا کر مزید ہنگامہ آرائی سے روک دے ٭

اس وفد کا سرکردہ شیر آقا منتخب کیا گیا۔ اب گویا سارا کھیل شیر آقا کے ہاتھ میں تھا۔ ابھی ابھی دو گھنٹہ پہلے شیر آقا نے معین السلطنت کے سر پر بادشاہی دستار باندھی تھی۔ اب دیکھیں کہ وہ کس حد تک اپنے اس فعل کی پیچ کرتا ہے۔ اور جس کو اس نے اپنے ہاتھ سے ابھی بادشاہ بنایا ہے۔ اس کے استقلال اور بحالی کی خدمت جو اس کے ذمہ کی گئی ہے۔ اسے وہ کس نیک نیتی سے انجام دیتا ہے ٭

اس وقت قریباً دو تین بجے کا وقت تھا۔ جبکہ یہ وفد موٹروں پر سفید جھنڈے لہرائے ارک سے بچہ سقاؤ کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت لڑائی بڑی شدت سے جاری تھی۔ اور اگرچہ بچہ سقاؤ کی فوج لگاتار دو گھنٹوں سے حملے کر کے آگے بڑھ آنا چاہتی تھی۔ مگر سرکاری فوجوں کی بے پناہ آتش باری انہیں سانس بھی پورا نہ کرنے دیتی تھی۔ کہ وہیں ڈھیر کر دیتی تھی۔ حتٰی کہ وہ وقت آن پہونچا۔ جبکہ شیر آقا صلح کروانے کی اہم خدمت کو انجام دینے کی غرض سے سرکاری فوجوں کے حصار میں سے گذرنے والا تھا۔

اس کے یہاں پہونچنے سے کوئی پاؤ گھنٹہ پیشتر فوجوں کو حکم مل چکا تھا۔ کہ وہ فیر کرنا بند کردیں۔ یہ اس لئے کہ وفد گزر سکے۔ مگر فوجوں کو کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ شہر میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اور انہیں فیر کے بند کرنے کا دفعتہً کیوں حکم ملا ہے۔ جبکہ بچہ سقاؤ کی طرف سے برابر آتشباری ہو رہی ہے۔ ابھی لشکری اپنی اس حیرت طبعی کو رفع بھی نہ کرنے پائے تھے۔ کہ اتنے میں یلغ بالا کے پاس سے شیر آقا کی موٹر نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ فوجی خط کے قریب پہونچ کر شیر آقا نے اپنی موٹر کو کھڑا کر لیا۔ اور آس پاس کی فوجوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ کہ " او بچہ ہا حالا شما برائے چہ جنگ مے کنید؟ اگر برائے امان اللہ خان جنگ میکنید۔ من بشما میگوئم کہ اوگریختہ است " (اے لڑکو! اب تم کس کے لئے جنگ کر رہے ہو۔ اگر تم امان اللہ خان کے لئے جنگ کر رہے ہو۔ تو میں تم کو کہتا ہوں۔ کہ وہ بھاگ چکا ہے)

یہ دو طلسمی فقرے کہہ کر وہ تو آگے کو چل دیا۔ اور یہاں فوج یہ نہ جانتے ہوئے کہ کوئی نیا بادشاہ بھی بن چکا ہے۔ اپنے آپ کو بے سر پا کر آن کی آن میں اپنے استحکامات کو چھوڑ کر تتر بتر ہو گئی۔ اب بچہ سقاؤ کی بجائے اگر عورتیں بھی ہوتیں۔ تو وہ بھی بلا مزاحمت کابل کو فتح کر سکتی تھیں۔ کیونکہ راہ میں کوئی روکنے ٹوکنے والا موجود ہی نہ رہا تھا۔

اگر معین السلطنت مراسم تخت نشینی کے فوراً ہی بعد بچہ سقاؤ کی طرف وفد بھیجنے سے پہلے ایک دفعہ محاذ جنگ پر آکر فوجوں میں پھر جاتا۔ اور ان کو خود آپ ساری کیفیت سے آگاہ کر دیتا۔ تو میں کوئی وجہ نہیں پاتا۔ کہ وہ کیوں محاذ پر ڈٹ کر جمی نہ رہتیں۔ مگر اس وقت کی ہیجان آور فضا میں کسی کا دماغی توازن ہی قائم نہ رہا تھا۔ کہ اس ایک اہم مصلحت وقتی کی طرف توجہ دیتا۔

دوسری طرف بچہ سقاؤ نے جب دیکھا۔ کہ دفعتہً فیر بند ہو گئے ہیں۔ اور پھر کچھ عرصہ

کے بعد اسے غازی امان اللہ خان کے تخت چھوڑ کر چلے جانے کی خبر ملی۔ تو وہ پھیل بیٹھا اور اس نے شیر آقا کو صاف جواب دیدیا۔ کہ چونکہ اس نے بزور شمشیر فتح حاصل کی ہے اس لئے وہ اپنے سوا کسی کو بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور جب اس کے آدمیوں نے اس کو سرکاری فوجوں کے بھاگنے کی اطلاع پہونچائی۔ تو اس نے جھٹ اپنے بھائی اور سید حسین کو کابل پر قبضہ کر لینے کے لئے روانہ کر دیا۔ آہ! شام کے عین قریب بچہ سقاؤ کا لشکر فاتحانہ طور پر کابل میں داخل ہو رہا تھا۔ شہر کے اندر کسی نے ان سے مزاحمت نہ کی۔ بلکہ لوگ پیشتر ہی سے اپنے گھروں میں بند ہو چکے تھے۔ اور ڈر کے مارے شہر کی ساری کوچہ بندیاں انہوں نے بند کر لی تھیں۔ اس دن ساری رات بچہ سقاؤ کے "اعلان چی" بازاروں میں اور کوچہ بندیوں کے آگے زور زور سے اعلان کرتے رہے۔ کہ وہ دین کی خدمت کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اور وہ اپنے دین کی حمایت میں اپنے کافر بادشاہ سے لڑتے رہے ہیں۔ اس لئے کسی کو ان سے خوف نہ کرنا چاہیئے۔ وہ نہ کسی کو لوٹیں گے۔ نہ کسی کو چور کریں گے اور نہ ہی کسی کو ایذا دیں گے۔ بلکہ وہ اپنے کابلی بھائیوں کو ظلم کافر سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لہذا اس نعمت کے لئے ہم سب کو خدا کا شکر بجالانا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ارک میں نیا بادشاہ اپنے وزراء و امراء اور تھوڑی سی فوج کے ساتھ محصور تھا۔ ان محصورین میں کاظم پاشا بھی تھا۔ ارک کی دیواروں کے پاس کوئی پھڑک نہیں سکتا تھا۔ اور اگرچہ شہر کابل سقاویوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ تاہم نہ تو سقاوی اور نہ ہی ارک کے محصورین آپس میں لڑ رہے تھے۔ شیر آقا رات کے وقت واپس آکر نئے بادشاہ کو بچہ سقاؤ کی عدم صلح جوئی کی منحوس خبر پہونچا چکا تھا اور ارک کے اندر دلشکن واقعات کی روشنی میں جنگی کونسل ہو رہی تھی۔

اس جنگی کونسل میں کاظم پاشا بھی شریک تھا۔ اور فطرتاً سب کی نظریں اس کی لب کشائی کی مشتاق بنی ہوئی تھیں۔ ملکی حالات سے بے خبر کاظم پاشا اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔ کہ اگر بادشاہ کو امید ہو۔ کہ ایک دو ہفتوں کے اندر اندر اطراف ملک سے کوئی امداد اس کو پہونچ جائے گی۔ تو پھر تو ارک میں محصور رہ کر لڑنا چاہئیے۔ سقاوی اس مدت میں کسی طرح بھی ارک کو فتح نہ کر سکینگے۔ اور اگر کسی دوسری طرف سے کمک پہونچنے کی توقع نہ ہو۔ تو پھر مقابلہ بیفائدہ ہے۔ چنانچہ شکست خوردہ اور مایوس افراد کی اس جنگی کونسل نے بجائے مقاومت کرنے کے بچہ سقاؤ کے حق میں حکومت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ تاکہ کم از کم ان کی جانیں بچ جائیں۔ دوسرے دن بچہ سقاؤ باغ بالا میں آچکا تھا۔ اور وہیں سے بمعرفت شیر آقا ارک والوں سے گفت و شنید کر رہا تھا۔ بالآخر یہ طے پایا۔ کہ یک روزہ بادشاہ اپنے اہل و عیال و متعلقین سمیت مامون ہے اور اگر وہ افغانستان میں رہنا چاہے۔ تو اس کا وہی درجہ و مرتبہ بحال رہیگا۔ جو امان اللہ خان کے عہد میں تھا۔ پر اگر وہ افغانستان میں رہنا نہ چاہے۔ تو وہ بحفاظت تمام کسی طرف جا سکتا ہے۔ اس دوسری صورت میں وہ خزانہ سے تین لاکھ روپیہ سے زیادہ نہیں لے جائے گا۔ اور اس کی جملہ جائداد و جاگیر حکومت سقاوی ضبط نہیں کرے گی ؛

جو کچھ بھی ہو۔ سردار عنایت اللہ خان کی حمیت کب گوارا کر سکتی تھی۔ کہ وہ ایک چور کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے اس کے سامنے سر جھکائے۔ اور پھر ساتھ ہی اس بات کا اعتبار ہی کب ہو سکتا تھا۔ کہ کل کو اس کی اور اس کے عائلہ و اطفال کی جانیں محفوظ رہیں گی۔ لہٰذا اس نے اپنی جان بچا کر نکل جانے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ اور اس مطلب کے لئے انگریزی سفارت سے . . . .

امداد طلب کی گئی تھی۔ کہ وہ سردار عنائت اللہ خان اور اس کے عائلہ و اطفال و چند ہمراہیوں کو اپنے ہوائی جہازوں پر بٹھا کر بحفاظت تمام حدود افغانی سے باہر نکال لے جائیں۔ سفارت انگریزی اور عنائت اللہ خان کے درمیان بھی شیر آقا ہی گفتگو کر رہا تھا۔ انگریزی سفارت نے بخوشی خاطر اس امداد کو دینا قبول کر لیا تھا۔ اور چونکہ یہ خوف ابھی تک موجود تھا۔ کہ سقاوی سپاہ معین السلطنت کی روانگی کے وقت اس پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیں۔ انگریزی سفارت نے بچہ سقاؤ سے اسبات کا تحریری ذمہ لے لیا تھا۔ کہ وہ اس قسم کے تعارض سے محترز رہیں گے ان امور کے طے پانے کے بعد معین السلطنت کی بادشاہت کے تیسرے دن قریباً دس بجے صبح کو انگریزی ہوائی جہازات آکر محروم النصیب بادشاہ اور اس کے ہمراہیوں کو لے کر پشاور کی طرف پرواز کر گئے۔

ارک کے پچھلے دروازے سے جب معین السلطنت نے قدم باہر رکھا۔ تو فرط الم سے اس پر بے حد رقت طاری ہو رہی تھی۔ اور بالآخر جب اس سے نہ رہا گیا۔ تو وہ لوٹ کر دروازے سے چمٹ کر بُری طرح رو دیا۔ جب وہ ہوائی جہاز کے میدان میں پہونچا ہے۔ تو اس کی آنکھیں ابھی تک اشکبار تھیں۔ یہاں سفارت برطانیہ کے تمام اعضا ایک سوگوارانہ نمائش کے ساتھ پہلے ہی سے موجود تھے۔ بیشک یہ ایک عجیب سوگوارانہ منظر تھا۔ جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کئی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اور کئی دل اسدن خون ہو رہے تھے۔ سفارت برطانیہ کے ہندوستانی سکرٹری شیخ محبوب الٰہی کی تو یہ حالت ہو رہی تھی۔ کہ اس کی روتے روتے گھگیاں بندھ گئی تھیں۔ اور جب تک ہوائی جہاز اڑ کر نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ اس وقت تک اس کی حالت میں سکون نہ آسکا۔ بعد میں ایک دن جب مجھے اس سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تو میں نے اس سے اس قدر

غمناکی کی وجہ پوچھی۔ تو اس نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ اوہ آپ نہیں جانتے۔ خاندانِ امانیہ کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ اور اس کے ساتھ صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی امیدوں کا بھی۔ امانی دور کا اثر اور کسی جگہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ اس کی موجودگی اور بحالی کم از کم صوبہ سرحد کے مسلمانوں کو جلد ہوش میں لانے والی تھی۔ اور ہم امید کر سکتے تھے۔ کہ ہم بہ نسبت ہندوستان کے دیگر صوبوں کے جلد آزاد ہو سکینگے۔

ہاں اس کے کہنے میں ایک حقیقت تھی۔ اور یہی اس کے انتہائی غم و الم کا ایک راز تھا۔

درانی پھریرا جو ارک کے مشرقی برج پر اب تک لہرا رہا تھا معین السلطنت کے جاتے ہی اتار دیا گیا تھا۔ اب ارک کے اندر محصور اور چند امانی منصبداروں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ دروازے ابھی تک بدستور بند تھے۔ ان محصورین کی بھی جان بخشی کا عہد بچہ سقاؤ سے لیا جاچکا تھا۔ قلعہ دار اپنی نفری کو ارک کے اندر غیر مسلح کرچکا تھا۔ اور اس امر کے انتظار میں تھا۔ کہ بچہ سقاؤ کا مقرر کردہ کوئی منصبدار پہونچے۔ اور وہ قلعہ کو اس کے حوالہ کرکے ماتحی باجہ کے ساتھ محصورین کو لے کر قلعہ سے رخصت ہوجائے۔

ارک میں بچہ سقاؤ کے داخلہ کو ہم اگلے باب میں بیان کرینگے۔ یہاں ہم چند ایک باتیں اپنے قارئین کو اور بتلا کر اس باب کو ختم کرتے ہیں:۔

سٹیر آغا اگر چاہتا۔ تو معین السلطنت کو افغانستان کے تاج و تخت سے محروم ہونے سے بچا سکتا تھا۔ اولاً بچہ سقاؤ کی طرف پہلی بار جاتے وقت وہ بجائے ان دو طلسمی فقروں کے استعمال کرنے کے فوجیوں کو صاف زبان میں سمجھا سکتا تھا۔ کہ ملک و ملت کی خیر خواہی کے لئے غازی امان اللہ خان نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ کہ وہ خود تخت سلطنت سے علیحدہ ہوجائے

اور اپنی جگہ اپنے بڑے بھائی کو بادشاہ بنائے۔ چنانچہ آج ہم نے تمہارے نئے بادشاہ کی تاجپوشی کی رسم ادا کر دی ہے۔ اور اب ہم تم کو مبارکباد دیتے ہوئے بچہ سقاؤ کی طرف یہ اچھی خبر لے کر جا رہے ہیں۔ تاکہ آپس کا قتل و خون بند ہو کر ملک پھر آرام کی نیند سو سکے۔ اس لڑائی کے جواز میں بچہ سقاؤ نے جو شرعی حجت پیش کی تھی۔ وہ اب غازی امان اللہ خان کی تخت سے دستبرداری کی وجہ سے زائل ہو چکی ہے۔ اور اب جو کوئی نئے بادشاہ کے برخلاف لڑائی جاری رکھے گا۔ خدا و رسولؐ اور شریعت کا مجرم ہوگا۔ لہٰذا تم اپنے نئے بادشاہ کی تاجپوشی کی خوشی مناؤ۔ اور اپنی جگہوں پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہو۔ تاوقتیکہ ہم بچہ سقاؤ کی طرف سے پھر کر واپس نہ آجائیں۔ اور اس دوران میں فیر بند رکھو۔ اگر بچہ سقاؤ نے ہم علماء و سادات کا کہنا مان لیا۔ تو وہ ہمارا بھائی ہوگا۔ وگرنہ تمہاری تلواروں کی ضرورت ہنوز باقی ہے ؛

یہ ممکن نہ تھا۔ کہ اس قسم کی تقریر کا فوجیوں پر حسب دلخواہ اثر نہ ہوتا۔ اور وہ اپنی جگہوں پر ڈٹے نہ رہتے۔ اور بچہ سقاؤ در صورت نہ ماننے کے اگر آگے بڑھنا چاہتا۔ تو شہر کابل اور اس کے درمیان ایک آتشی دریا حائل ہو جاتا۔ جس سے پیر کر اس پار آنا اگر ناممکن نہیں تو امر محال ضرور تھا۔ اور اگر اسے ایک دو شکستیں ہو جائیں تو وہ بہت جلد راہ پر آجاتا ؛

مگر حضرت صاحب نے جن کا دل اس خاندان سے جل بھن چکا ہوا تھا۔ اپنا انتقام لینے کے لئے ایسے نادر موقع کو ہاتھ سے گنوانا قطعیاً روا نہ سمجھا اور دیدہ دانستہ وہ کلمات کہہ ڈالے۔ جن کے طلسمی اثر نے آن کی آن میں ساری رُت کو بدل کر رکھ دیا ؛

پھر اگر اس امر کو مان بھی لیا جائے۔ کہ اس کی نیت بخیر تھی۔ اور اس وقت گھبراہٹ میں وہ اس سے زیادہ اور کچھ کہہ سن نہ سکا تھا۔ تو پھر بھی یہ بات باور کرنے میں نہیں آتی۔ کہ اگر وہ بچہ سقاؤ سے معین السلطنت کی بادشاہت منوانے پر مصر ہوتا۔ تو بچہ سقاؤ کس طرح مزید ہٹ کر سکتا۔ شرعی حجت اب اس کے لئے کوئی باقی رہی ہی نہ تھی۔ اور اگر وہ اپنے پیدا کردہ زور کا سہارا لینا چاہتا۔ تو وہ تمام افغانی قبائل کا زور جن میں سے چند ایک خود حضرت صاحب کے خاندان کے زیر اثر تھے۔ اس کے مقابلے پر لے آنے کی دھمکی دے کر بچہ سقاؤ کو اچھی طرح ڈرا دھمکا سکتا تھا۔ اور چونکہ ساری گفت و شنید اسی کی معرفت ہو رہی تھی۔ اگر وہ چاہتا۔ تو مذکورہ بالا دو طلسمی فقروں کے علاوہ اور کئی طلسمی فقرے اس طرح کے پھینک سکتا تھا۔ جو معین السلطنت کے حق میں استحکام آور اور بچہ سقاؤ کے حق میں ضعیف کن ثابت ہو سکتے۔ مگر نہیں انتقامی جذبات تو اسے ہر بار معین السلطنت کو ہی ڈرانے پر مجبور کر رہے تھے۔ پھر کس طرح وہ اس نہ ماہ تباہی کی ذمہ داری سے بچ سکتا ہے۔ جو بچہ سقاؤ نے بادشاہ بن کر ملک و ملت پر نازل کئے رکھی"۔

دوسری بات جو ہم اس باب کے خاتمہ پر اپنے قارئین کو بتلانا چاہتے ہیں۔ وہ معین السلطنت کی دو تین روزہ بادشاہت کے تصرفات شاہانہ ہیں۔ اور خزانہ حکومت سے متعلق ہیں معین السلطنت نے یہ معلوم کر کے کہ اب اس کے لئے کوئی امید باقی نہیں رہی سب سے پہلا کام جو کیا۔ وہ یہ تھا۔ کہ تمام فوجیوں اور منصبداروں کو ان کی چھ چھ ماہا تنخواہ پیشگی دیدی۔ اپنے مصاحبوں یا حکومت کے بڑے منصبداروں کو کیا کچھ دیا۔ اس کے متعلق کوئی آگاہی نہیں ہو سکی۔ مگر البتہ کاظم پاشا ترکی جرنیل کے مالا مال ہو جانے کی اطلاع لوگوں تک ضرور پہونچ گئی۔ اس کے ساتھ حکومت امانیہ

کا سالانہ ایگریمنٹ تھا۔ معین السلطنت نے یہ احساس کر کے کہ بچہ سقاؤ اس کو کیا دے گا۔ اس کی سہ اسٹاف کے تین سالہ تنخواہ وہیں چکادی ۔

اس تین لاکھ روپیہ کے علاوہ جو بچہ سقاؤ سے مفاہمت کے طور پر طے ہوا تھا۔ معین السلطنت اور کیا کچھ لے گیا۔ اس کا علم خود اس کو یا خدا کو ہو سکتا ہے لیکن یہ ضرور مشہور ہوا۔ کہ اس کی خانم نے روانگی کے وقت جو چرمی کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس میں تمام پونڈ و نوٹ سلے ہوئے تھے ۔

اتنے کچھ اصراف کے بعد بھی بچہ سقاؤ کے ہاتھ جو خزانہ لگا۔ وہ چھ سات کروڑ روپیہ کے اندازہ سے تھا۔ کل رقم خزانہ محفوظ میں چالیس کروڑ کابلی سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ بجٹ میں ہر سال کچھ نہ کچھ بچت ہوتی ہی رہتی تھی۔ چند ایک کروڑ بغاوت منگل پر صرف آچکا تھا۔ باقی بجنسہٖ موجود تھا۔ اس میں سے کس قدر روپیہ حکومت موجودہ بغاوت پر خرچ کر چکی تھی۔ کس قدر غازی امان اللہ خان خود اپنے ساتھ یا اپنے اہل و عیال کی معرفت لے جا چکا تھا۔ اس کے متعلق ہم کوئی صحیح اندازہ نہیں بتلا سکتے ۔

باب ہشتم

بچہ سقاؤ کی نہ ماہہ حکومت

۱۹۲۹ء

معین السلطنت کے جانے کے ساتھ ہی علم اتار دیا گیا تھا۔ اور غلام دستگیر خان قلعہ بیگی اپنے محصور فوجی دستوں کو غیر مسلح کر کے اس انتظار میں تیار بیٹھا تھا۔ کہ ارک کو فاتح کے حوالے کر دے۔ خود بچہ سقاؤ باغ بالا سے ایالت کابل یعنی گورنری کی جگہ جو ارک سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہو گی۔ آچکا تھا۔ مگر قلعہ شاہی کے قبضہ میں لینے کا کام اس نے سید حسین کے ذمہ کر دیا تھا۔ چنانچہ لوگ سید حسین کی آمد اور اس کے قلعہ شاہی کے تصرف حاصل کرنے کے عبرت آموز نظارہ کو دیکھنے کے لئے کثیر در کثیر تعداد میں مشرقی و جنوبی دروازوں پر جمع ہو رہے تھے۔ بالآخر قریب چار بجے شام سید حسین معہ اپنے سٹاف کے آیا۔ اور اس نے قلعہ بیگی سے ارک کو تحویل میں لینے کی کارروائی شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد قلعہ بیگی نے اپنے غیر مسلح دستہ ہائے فوج کو جمع کیا۔ اور ماتمی باجہ بجاتا ہوا ارک سے باہر نکل گیا۔ وہ خود سیاہ جھنڈے کے ساتھ فوج کے سرے پر تھا۔ اور باچشم نم اور رومال کو آنسوؤں سے تر کرتا ہوا جا رہا

تھا۔ ابھی وہ ارک کے جنوبی دروازہ سے چند قدم باہر نکلا ہی تھا۔ کہ سب کی توقع و امید کے برخلاف بچہ سقاؤ چند مسلح موٹروں کی ہمراہی میں ارک کے داخلہ کی نیت سے سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ بیچارے غلام دستگیر خان کے لئے یہ ایک نہایت ہی صعب وقت تھا۔ اس کا دل اپنی حکومت کے زوال پر غم و الم سے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ ایسے وقت میں اس کے دشمن فاتح کا سامنے سے دفعتہً نمودار ہو جانا اس کے سبھی فرائض میں ناقابل برداشت اضافہ کرنے والا تھا۔ کہاں تو وہ ماتمی نوحوں کے کیف سے ہم آغوش تھا۔ اور کہاں اسے دفعتہً ان نوحوں کو بند کرکے بچّہ سقاؤ کی فتحمندی کا ترانہ گا کر اس کی مستانہ سلامی اتارنی پڑی۔ اس کے دل پر ایسا کرنے سے کیا کچھ گذر گیا ہوگا۔ اس کا اندازہ بیان قلم سے مشکل ہے۔

اور یہ جو ہم نے کہا۔ کہ بچّہ سقاؤ کا آنا سب کے لئے غیر متوقع تھا۔ تو اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ چوروں کی کونسل نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ جب تک ارک کو خوب دیکھ بھال نہ لیا جائے۔ بچّہ سقاؤ خود اس میں داخل نہ ہو۔ مبادا کہیں اس کے دشمنوں نے کوئی داؤں نہ کھیل رکھا ہو۔ گویا اس کا فوراً ہی ارک میں داخل ہونا حفاظتِ خود اختیاری کے خلاف سمجھا گیا تھا۔ اور اسی لئے سید حسین کو کہا گیا تھا۔ کہ وہ پہلے جاکر ارک کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے۔ مگر بچّہ سقاؤ کو یہاں ایک زبردست خوف بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ کہیں خود سید حسین ہی اس سے چار سو بیس[1] "نہ کھیل جائے۔ اور ارک پر قبضہ کرتے ہی اس سے آنکھیں نہ پھیر لے۔ دونوں کے پاس اپنی اپنی علیحدہ مسلح جماعتیں تھیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے سید حسین کی نفری تعداد میں زیادہ تھی۔ دونوں باہم رقیب تھے۔ اور اگر سید حسین نے پوری تندہی کے ساتھ حکومت امانیہ سے لڑائی کرنے میں حصّہ نہیں لیا تھا۔ تو اس کی وجہ محض یہ تھی۔ کہ اس کو

[1] ۴۲۰ تعزیرات ہند میں ا... دفعہ ہے۔ جو فریب سے دوسرے کو ٹھگ جانیکے متعلق ہے۔ جیسے اس کو محاورۃً یہاں استعمال کیا ہے

بچہ سقاؤ کی نسبت حکومت کے برخلاف اپنے فتح پانے کی بہت ہی کم امید تھی۔ اگر اسے امید ہوتی۔ تو وہ کب بچہ سقاؤ کو اپنے سے آگے بڑھنے دیتا تھا۔ لیکن اب جبکہ مال غنیمت ان دونوں کے سامنے تھا۔ تو کیا تعجب تھا۔ کہ سید حسین بچہ سقاؤ کو چوراہے میں رکھ کے مار دے۔ اسی خوف کی وجہ سے بچہ سقاؤ نے نہ صرف عام لوگوں کو بلکہ خود سید حسین کو بھی دھوکے میں رکھ کر عین اسی وقت ارک کے اندر داخل ہونے کی کی۔ جبکہ ابھی سید حسین اچھی طرح ارک کے تمام حصوں کو دیکھنے بھی نہ پایا تھا۔ ارک میں بچہ سقاؤ کو دفعتہً موجود پاکر سید حسین آگ بگولا ہو گیا۔ اور گو منہ سے تو اس نے بچہ سقاؤ کو کچھ بھی نہ کہا۔ مگر بچہ سقاؤ کے جھنڈے کے ساتھ اپنا جھنڈا بھی ارک پر لہرا دیا۔ اور اپنی کوہستانی مسلح نفری کو قلعہ کی فوجی بارکوں پر متصرف کر کے خود جلتا بھنتا ارک سے باہر چلا گیا۔

کیا کابل میں دو بادشاہ حکمران ہونگے یا کیا یہ دو دعویدار آپس میں تخت حکومت کے لئے لڑنا شروع کر دیں گے۔ اور کوئی ایک کسی دوسرے کو مار بھگا کر اپنا راستہ صاف کرے گا۔ ارک پر دو جھنڈوں کو لہراتا ہوا دیکھ کر لوگوں کے کان کھڑے ہو رہے تھے۔ اور ادھر بچہ سقاؤ کو بھی اتنی جرأت نہوتی تھی۔ کہ سید حسین کے جھنڈے کو اتار دے۔ کامل تین دن تک شہر کابل اسی طرح گوش بر آواز رہا۔ کہ کب یہ دو آپس میں لڑنا شروع کرتے ہیں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی۔ کہ ملانے اور چند ایک صاحب علم شخص بچہ سقاؤ کے بہت زیادہ طرفدار تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے بچہ سقاؤ کے لئے زبردست پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا۔ اور کابل پہونچتے ہی ہر قسم کے اعلانات و حکمنامے اسی کے نام سے نکالے جانے لگ گئے تھے۔ ڈھنڈورچیوں کو چودن میں سو سو کی تعداد میں پھر رہے تھے۔ سختی سے حکم دیا گیا تھا۔ کہ بچہ سقاؤ ہی کے نام سے حکم سناتے پھریں۔ اور اگرچہ سید حسین نے بھی

چند اپنے ڈھنڈورچیوں کے ذریعہ اپنے نام کے احکام سنانے کی نقل وکوشش کی۔ مگر اس کی یہ کوشش گنبد کی صدا کی طرح گنبد ہی کی چار دیواری کے اندر دب کر رہ گئی۔ یہی نہیں۔ بلکہ بچہ سقاؤ نے ارک میں داخل ہونے سے پیشتر ہی لوگوں کو حکم دے دیا تھا۔ کہ وہ سب کے سب حاضر ہو کر اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ جو کوئی حاضر نہ ہوگا۔ اس سے باغیوں کا سا سلوک روا رکھا جائے گا۔ بھلا وہ کون تھا۔ کہ جو نہ جا کر اپنے ناموس اور مال وجان کو چوروں کے ہاتھ سے برباد کرواتا ہر ایک دستہ دستہ اس کے حضور میں پہونچا۔ اور کڑوے گھونٹ کی طرح اس کی بیعت کی لذت سے آشنا ہوا۔ آہ یہ بھی عجب عبرت خیز سماں تھا۔ لوگوں کے یہی گروہ ابھی چھ ماہ نہیں گذرے۔ کہ افغانستان کی سلطنت کو غازی امان اللہ خان کی خدمات کے صلہ میں اس کی نسل کو بخش چکے تھے۔ اور اس عہد کے قائم و برقرار رکھنے کے لئے اپنے آپ کو پابند و مسئول بنا چکے تھے۔ اور یہی وہ تھے۔ کہ صرف ایک دو دن قبل معین السلطنت سردار عنائت اللہ خان کو اپنا ہاتھ دے چکے تھے۔ اور آہ آج بھی وہ یہی ہیں۔ جو بچہ سقاؤ کو اپنا بادشاہ بنا رہے ہیں۔ کیا یہ محض طاقت کی کرشمہ زائی نہیں ہے اور کیا طاقت اس سے بیشتر بھی انسانیت کے لئے ذلت اور لعنت آفرین ہو سکتی ہے؟

بہرکیف ان وجوہ کی بنا پر سید حسین کی اس وقت دال نہ گل سکی۔ اور شاید اس نے اس وقت تک اپنے دماغ میں کوئی اور سکیم سوچ لی ہوئی تھی۔ اور اس لئے وہ فی الحال چپ ہو گیا تھا۔ اب گویا بچہ سقاؤ بلا شرکت غیرے کابل کا بادشاہ تسلیم ہو چکا تھا۔ اور جہاں جہاں سقاوی فوجوں کا دخل واثر تھا۔ وہاں وہاں اسی کا حکم اور سکہ وخطبہ جاری ہو رہا تھا۔ سید حسین کا علم ارک سے اس کی رضامندی کے ساتھ اتار دیا جا چکا تھا۔

قبل اس کے کہ ہم بچہ سقاؤ کی بادشاہت کے متعلق سلسلہ وار واقعات کو بیان کریں۔ ہم اس کے اندرونی ضبط و ربط کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کابل میں سقاوی فوج کے داخلہ کے وقت کسی فرد بشر کو چشم گزند نہیں پہونچایا گیا سب سے اولین کام سفارت ہائے دول کی حفاظت کے متعلق تھا۔ جو فوراً کابل میں داخل ہوتے ہی بچہ سقاؤ کے پہرہ داروں نے سنبھال لیا۔ جرمنوں کی سفارت شہر سے دو ایک میل کے فاصلہ پر باغ بابر میں واقع تھی۔ اور چند جرمن اپنے اہل و عیال کے ساتھ شہر ہی میں رہتے تھے۔ انقلاب کے دن بچہ سقاؤ کے پہرہ داران کو بحفاظت تمام ان کی سفارت تک پہونچا آئے تھے۔ سفارتوں کی حفاظت کے انتظام کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے لوگوں کے نام اعلان شائع کر دیا تھا۔ کہ وہ بلا دھڑک ہو کر اپنی دوکانیں کھول کر کام و کاج میں مصروف ہو جائیں۔ اور اگر کوئی سقاوی ان کو ڈرا دھمکا کر کچھ حاصل کرنا چاہے۔ تو اس کو وہیں پکڑ کر باندھ لیں۔ اور گشت والے سپاہیوں کے حوالہ کر دیں۔ ان گشت کرنے والے سپاہیوں کے ہمراہ عموماً ایک دو سقاوی منصبدار بھی ہوتے تھے۔ یہ آگے پیچھے لگاتار تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ کوچوں و بازاروں میں گشت کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ صرف ایک دو دفعہ ایسے واقعات ہوئے۔ جبکہ چند ایک سقاویوں نے دوکانداروں سے بزور چیزیں حاصل کی تھیں۔ اور جب ان کے برخلاف گشت والے سقاویوں سے شکایت کی گئی۔ تو انہوں نے کھڑے کھڑے ہی دو ایک کو تو وہیں گولیوں سے ڈھیر کر دیا۔ اور دو ایک کے کانوں اور نتھنوں میں سوراخ کر کے چوراہے میں میخ کر دیا۔ اس کے بعد کسی سقاوی کو جرأت نہ رہی۔ کہ وہ کسی کے مال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ مگر یہ حال چند دنوں تک ہی رہا۔ پھر سقاویوں نے جس طرح لوگوں پر ظلم ڈھانے شروع کئے۔ اس کا ذکر آگے آئیگا۔ تاہم شروع شروع میں ان کا ضبط و ربط اور

حفظ امن واقعی قابل تعریف تھا۔ گو ان کے طریقے نہایت ہی بھدے اور غیر مہذب کیوں نہ تھے۔ لوگوں کا تو یہ خیال تھا۔ کہ سقاوی شہر میں گھستے ہی اودہم مچا دیں گے۔ اور ان کے پہونچتے ہی ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو جائے گا۔ مگر ایسا مطلق نہیں ہوا۔

سقاوی عہد حکومت کے واقعات کو سلسلہ وار بیان کرنے سے پہلے ہم سردار علی احمد جان کی تباہی کا قصہ اپنے قارئین کرام کو سناتے ہیں۔ جو سمت مشرقی میں اس وقت تک اپنی بادشاہت کا علم بلند کر چکا تھا۔ نسبتاً اور قبائل کے خوگیانی قبائل سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ اور گویا اس کی طاقت کا سرچشمہ یہی قبائل تھے۔ یہ قبائل آپس کے اندر مختلف گروہوں میں تقسیم تھے۔ اور قومی روایات کی بنا پر ایک دوسرے کے مدعی اور مخالف تھے۔ سردار علی احمد جان کے ماتحت باقاعدہ فوج کا ایک خاصہ حصہ تھا جس کو اس نے تھوڑی تعداد میں مختلف مقامات سمت مشرقی میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اور ایک کثیر تعداد اس کے اپنے ساتھ تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ اب قبائل کی خواہش کیمطابق اس کو کابل کی طرف چڑہائی کر کے جانا تھا۔ اس لئے ان قبائل سے والنیٹروں کی ایک کثیر تعداد اس کے پاس جمع ہو چکی تھی۔ تاکہ برفباری کی وجہ سے راستوں کے مسدود ہو جانے سے پہلے ہی کوچ کر دیا جائے۔ یہ والنیٹر اپنے اپنے خوانین کی ماتحتی میں ایک بالکل ہی غیر تنظیمی و سرخودانہ صورت میں موجود تھے اور کوئی کام تو درپیش تھا ہی نہیں۔ اس سلئے وہ یا تو نئی افواہوں کے سننے اور ان پر حاشیہ آرائی کرنے میں اپنا وقت گذار دیتے تھے۔ اور یا اپنی قبائلی رقابتوں اور دشمنیوں کے قصے ان کی محفلوں کا آوازہ ہوتے تھے۔ گویا یہ ایک مواد آتشیں تھا جو نئے بادشاہ نے اپنے گرد اکٹھا کر رکھا تھا۔ یوں تو سارے ہی قبائل گروہ در گروہ

تقسیم اور آپس میں سخت بغض وحسد رکھتے تھے۔ مگر جس بڑی طاقت یعنی خوگیانی قبیلہ پر سردار علی احمد جان کو بے حد ناز تھا۔ اس کے دو نہایت زبردست گروہ باہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور قدیمی دشمن دار تھے۔ اور یہ امر سردار علی احمد جان کے لئے بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ کہ کس طرح ان میں توازن کو برقرار رکھے۔ اپنی چند روزہ اور بے سروسامان بادشاہت میں وہ اسی قدر کر سکتا تھا۔ کہ جہاں تک اس کی زبان یاری دے۔ وہ ان دونوں گروہوں کے خوانین و سرکردگاں کو اپنی بادشاہت کے ملک میں قائم ہو جانے پر بڑی بڑی امیدیں دلائے۔ مگر شاید اس وقت تک یہ اس کو وہم دگمان میں بھی نہ آیا ہوگا۔ کہ غازی امان اللہ خان بچہ سقاؤ کی دہشت سے پایۂ تخت کو چھوڑ کر فرار کر جائے گا۔ اور بچہ سقاؤ کابل میں آگھسیگا۔

غازی امان اللہ خان کے فرار اور بچہ سقاؤ کے کابل پر متسلط ہونے کی خبریں آناً فاناً سمت مشرقی میں پھیل گئیں۔ اور جہاں ایک طرف ان خبروں نے خوانین پر بہت ہی بُرا اثر ڈالا۔ وہاں رضا کار اور باقاعدہ افواج میں بھی ایک عجیب سی اضطرارانہ کیفیت پیدا کردی۔ اور گو بچہ سقاؤ رہزن اور ڈاکو تھا۔ مگر اس وقت وہ ایک دین کے دشمن کے برخلاف جہاد کر رہا تھا۔ اور اس لئے جاہل طبقہ کی کامل ہمدردی اس کے ساتھ تھی۔ نہ صرف یہی۔ بلکہ سردار علی احمد جان کی فوجوں کا ایک معتدبہ حصہ خود کوہستان اور کوہدامن کے افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں دفعتہً اور بغتتہً اس خیال کا پیدا ہو جانا ایک طبعی امر تھا۔ کہ ان کے ہم قوموں نے ایک ملحد بادشاہ پر فتح ونصرت حاصل کی ہے۔ اب بادشاہی بھی انہی کے پاس رہیگی۔ پھر کیوں وہ سردار کی بادشاہت کے جھنڈے تلے رہ کر بلا عذر غازیان دین سے جو خود ان کے اپنے ہی بھائی بند ہیں۔ جنگ کریں۔

حالات کو اس درجہ متغیر و ناموافق پاکر خوانین میں بھی آپس میں اختلاف ہو گیا
دشمنیاں تو پہلے سے موجود تھیں ہی۔ جھٹ کسی بات پر آپس میں بگڑ بیٹھے۔ ایک
فرقہ خود بخود بچہ سقاؤ کا طرفدار بن گیا۔ تو دوسرا سردار علی احمد کی حمایت پر کھڑا رہا۔
اس دوسرے فرقہ کے آدمیوں نے پہلے فرقہ کے چند ایک خوانین کو قتل کر ڈالا۔
بس پھر کیا تھا۔ وہیں آپس میں جنگ چھڑ گئی۔ کوہستان اور کوہدامنی فوج جس قدر
تھی۔ اپنے اسلحہ و اسباب سمیت کابل کی طرف چلدی۔ اور خوگیانی آپس میں
خون کے دریا بہانے لگ پڑے۔ جو رضاکار کہ بادشاہ کی محافظت کر رہے تھے
ان میں ملے جلے افراد سبھی قبائل کے تھے۔ غیر از خوگیانی افراد تو اس طوفان
بے تمیزی کے برپا ہوتے ہی ادھر ادھر تتر بتر ہو گئے۔ کیونکہ یہ جنگ قبائلی تھی۔
اور وہ جس کے دشمن دار نہ ہوں۔ اس میں ہرگز حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ مگر خوگیانی
رضاکار اپنے اپنے گروہ کی حمایت کے جوش میں یہاں مستقر شاہی میں بھی آپس
میں دست و گریبان ہونے سے باز نہ رہ سکے۔ چنانچہ ان کو بھی لڑتا دیکھ کر سردار
علی احمد جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور نہ معلوم کیا کیا مصیبتیں اٹھاتا
اور کن کن طریقوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہوا بحال فلاکت چند دن کے بعد پشاور
جا پہونچا۔

اس طرح بچہ سقاؤ کی راہ سے یہ مدہش کانٹا بھی ایک معجز نما طریقہ سے
آناً فاناً ناپید ہو گیا۔ امان اللہ خان کے سمیت تخت کے تین دعویدار پردۂ
صفحہ سے یکے بعد دیگرے غائب ہو چکے تھے۔ اور اب ملک کی انتقالی حالت
کو دیکھ کر یہ گمان یقین سے بدل جانے کو تھا۔ کہ بچہ سقاؤ جس کو لوگوں نے
خادمِ دینِ رسول اللہ کہ کر پکارنا شروع کر دیا ہے سارے افغانستان کا بادشاہ
بن کر رہیگا۔

ملاؤں نے شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشینگوئی کا چرچا جہلا میں اتنی جلدی اور تیزی کے ساتھ پھیلا دیا تھا۔ کہ حیرت ہوتی تھی۔ اگر چائے فروش کو دیکھو۔ تو وہ اور اگر سرائے کے حمالی کو دیکھو۔ تو وہ اسی کو وردِ زبان بنائے ہوئے تھا اور بچہ سقاؤ کو اس پیشینگوئی کے مطابق وقت کا صاحبقران سمجھ رہا تھا:

کابل میں سقاویوں نے سردار علی احمد جان کے سمت مشرقی سے فرار کر جانے کی خبر کو نہایت خوشی اور شادمانی کے ساتھ سنا۔ اور اب جبکہ چوروں میں کسی حد تک آپس میں سمجھوتہ ٹھہر چکا تھا۔ انہوں نے نہایت تندہی سے اپنی حکومت کے قیام واستحکام کی کوششیں شروع کر دیں۔ اب ان کا کوہستان اور کوہدامن کے گنجان علاقوں کے ماسوا افغانستان کے پایہ تخت پر بھی قبضہ تھا۔ جس کی طاقت کی بنا پر وہ سارے افغانستان کو اپنے تصرف میں لا سکتے تھے۔ مگر ایسا کرنے کے لئے سب سے اولین چیز حکومت سقاوی کی تشکیل و تنظیم تھی۔ اور جب تک یہ نہ ہو۔ اس ضمن میں کسی قسم کا اقدام ممکن نہ تھا۔ بچہ سقاؤ کی خوش بختی سے اسے ایک ایسا شخص ہاتھ آیا ہوا تھا۔ جو علم و دانش اور سیاست ملکی میں غازی امان اللہ خان کے کسی عالی سے عالی وزیر سے کم نہ تھا۔ مگر غازی کے عہد میں با ایں ہمہ فضیلت اسے حاکم درجہ دوم کے رتبہ سے زیادہ ترفیع نصیب نہ ہوئی تھی۔ یہ بچہ سقاؤ کے خروج کے وقت کوہدامن ہی میں تھا۔ اور اس سے رابطہ رکھتا تھا۔ اور آخری ایام میں کھلم کھلا اس سے مل گیا ہوا تھا۔ اب بعد از تسلط کابل بچہ سقاؤ نے اسے اپنا وزیر دربار مقرر کیا تھا۔ اور اگر بچہ سقاؤ کو آٹھ تو مہینے افغانستان پر حکومت کرنی نصیب ہوئی تھی۔ تو یہ اسی شخص کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ تھا۔ اگر بچہ سقاؤ اپنے ہمپایہ چوروں کے ہنگامہ آفرین اور تضاد آور احکامات کی رَوؤں کو ملک میں جاری ہونے سے روک سکتا۔ اور شیر جان پر ہی تکیہ کرتا۔ تو

یہ ناممکن نہ تھا۔ کہ آج بھی بچہ سقاؤ تخت افغانستان پر متمکن نظر آتا ۔

بہرکیف مسرت و انبساط کے چند ابتدائی روز گذرنے کے بعد جس کے دوران میں غازی امان اللہ خان کی جدید اصلاحات کے الغا کئے جانے کے اعلانات ہوتے رہے۔ امیر حبیب اللہ خان مقتول کے عہد کے اساس پر حکومت کی تشکیل کی گئی۔ بچہ سقاؤ نے اپنے بھائی حمید اللہ کو معین السلطنت اور سید حسین کو نائب السلطنت بنایا۔ اور ملک محسن کو جو ایک نہایت ہی کینہ توز اور ظالم و سفاک شخص تھا۔ کابل کا والی یعنی گورنر مقرر کیا۔ شیر جان کو وزیر دربار اور اس کے ایک بھائی کو وزیر خارجہ بنایا۔ سید حسین کو وزارت جنگ کا قلمدان بھی سونپ دیا۔ باقی اپنے ہی افراد میں سے ایک کو وزیر مال اور ایک کو وزیر خزانہ بنا کر باقی تمام وزارتوں کو لغو قرار دیا۔ اپنے علاقے کے ملاّنوں کو جو شروع سے اس کے ساتھ تھے قضاۃ کے چھوٹے بڑے عہدے بانٹ دئے۔ اور اپنے چور ساتھیوں کو جنہیں اس نے فتح کابل سے قبل زبانی ہی زبانی بڑی بڑی فوجی عہدیداریاں دے رکھی تھیں۔ اب باقاعدہ شاہی اسناد عطا کیں۔ شروع شروع میں ان چوروں میں فوجی مناصب کے حاصل کرنے کی کشمکش قابل دید تھی۔ ہر ایک بندوق بردار کسی نہ کسی عہدے کا دعویدار تھا۔ جس سقاوی سے پوچھو۔ ان میں سے کوئی اپنے آپ کو کرنیل کوئی برگیڈ کوئی جرنیل اور کوئی نائب سالار کہہ کر پکارتا تھا۔ اور ایسے بیسیوں نائب سالار درجنوں جرنیل اور سینکڑوں کرنیل و برگیڈ خود بخود پیدا ہوگئے ہوئے تھے۔ کوئی اپنی منصبداری کی سند سید حسین سے لیتا تھا۔ تو کوئی حمید اللہ سے کوئی خود بچہ سقاؤ سے اس کو اپنا وعدہ یاد دلا کر فرمان حاصل کر لیتا تھا۔ تو کوئی اس کے سپہ سالار شیر دل خان سے۔ تاہم یہ بدتمیزی ایک ڈیڑھ ماہ بعد قدرے کم ہوگئی تھی۔

مذکورہ بالا تشکیلات سے پہلے بچہ سقاؤ کے مُہر و دستخطوں سے اس امر کے متعلق کہ نئی بادشاہت کن اصولوں پر حکومت کرے گی ۔ ایک اعلان شائع ہو چکا تھا۔ اس اعلان کی چند خصوصیات مندرجہ ذیل تھیں :-

ا ۔ امان اللہ خان نے ملک کے اندر جس قدر نظامنامے نافذ کئے ہیں ۔ وہ سب موقوف اور تنسیخ کئے گئے ہیں ؛

۲ ۔ حکومت کا آئندہ اساس شرع محمدی پر ہوگا ؛

۳ ۔ مکاتب میں تعلیم نسواں بالکل بند رہے گی ؛

۴ ۔ مستورات مکتبی برقعے جو امان اللہ خان کی ایجاد ہیں ۔ ہرگز نہیں پہن سکینگی بلکہ برقعہ و دُلّاق کے بغیر باہر آنا جرم متصور ہوگا ؛

۵ ۔ شرع محمدی کی رو سے چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے ۔ سو لوگوں کو شرع شریف کے مطابق عمل کرنے کی اجازت ہوگی ؛

۶ ۔ جن عورتوں نے امان اللہ خان کے زمانہ میں اپنے خاوندوں سے زبردستی طلاق حاصل کئے ہیں ۔ ان کے خاوندوں کو اپنی مطلقہ عورتوں کو پھر حاصل کرنے کی اجازت ہے ؛

۷ ۔ اموال داخلہ پر محصول نہیں لیا جائے گا ؛

۸ ۔ مالیہ زمین اس سال معاف رہیگا ؛

۹ ۔ خزانہ حکومت پر جن لوگوں کے مطالبات ہیں ۔ خواہ داخلی ہوں یا خارجی ۔ ان کو حکومت سقاوی ادا کرے گی ۔ اور جن سے حکومت نے لینا ہے ۔ ان سے حسبِ دستور وصول کرے گی ؛

۱۰ ۔ ہشت نفری یعنی جبری فوجی خدمت کا طریق موقوف رہے گا ؛

... دیا ہے ۔ ... ذ تشکیلا ...

لغو کئے جائینگے۔ اور حکومت امیر شہید کے زمانہ کی سی ہوگی ۔

۱۲ ۔ خارجی سفارتوں کو واپس بھیجدیا جائیگا۔ اور جن کا یہاں رہنا لازمی ٹھیرے گا۔ ان کو اسلامی ملک کی زمین خریدنے کی اجازت نہ ہوگی ۔

۱۳ ۔ پادشاہت کا لقب جو امان اللہ خان نے اختیار کیا تھا۔ یہ اسلام کے منافی تھا۔ اس لئے "خادم دین" اپنے نام کے ساتھ امیر کا لقب رکھے گا ۔

۱۴ ۔ جھنڈا بدستور پہلا رہے گا۔ اور جمعہ کی تعطیل ہوا کرے گی ۔

نظامات حکومت کے تنسیخ کئے جانے پر جن سے لوگ کچھ کچھ مانوس ہو چکے تھے۔ دَورِ عبدالرحمٰن اور حبیبیہ پھر عود کر آیا تھا جس نے نہ صرف تجارتی حلقوں میں کھلبلی ڈال دی تھی۔ بلکہ حقوق شہریت کی تمام ضمانتیں لغو ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب کمزور محض زبردست اور زور آور کے رحم و کرم پر تھے۔ اب وہ جس طرح چاہیں گے۔ کمزوروں سے سلوک روا رکھیں گے۔ نہ کوئی داد ملنے کی امید ہوگی۔ نہ فریاد کی گنجائش۔ لوگ حکومت کے مختلف کارداروں کے مابین تقسیم ہو جائیں گے۔ اور ان کے دست تظلم و بربریت سے بچنے کے لئے خوانین و ملک کی پناہ و شفاعت میں اپنی کم مایہ زندگیاں بسر کرنے کی طرف رجوع کریں گے گے خوانین لوگوں کے اس پُرزور مطالبہ سے تقویت پاکر دربار پادشاہی سے اپنا گہرا تعلق پیدا کرنے کی کوششیں کرینگے۔ اور اس طرح بادشاہ کے رسمی کارداروں کے رقیب و دشمن بن جائینگے۔ بادشاہ کی اپنی پوزیشن سخت نازک ہوگی۔ وہ ایک طرف اپنے اہل کاروں کی چیخ و فریاد کو سن رہا ہوگا۔ جن کے ذمے ملک میں امن بحال رکھتے ہوئے اس کی بادشاہت کو قائم رکھنا ہے۔ مگر جو خوانین کی مداخلت کی وجہ سے لوگوں پر براہِ راست حکومت نہیں کر سکینگے اور اس لئے بادشاہ سے مطالبہ کر رہے ہونگے۔ کہ وہ ان کو ان خوانین کی مداخلت سے بچائے۔ مگر دوسری طرف خوانین و ملک ہونگے۔ جو ان اہلکاروں کو بادشاہ کے سامنے لوگوں پر ظلم و شدت سے حکومت کرنے کا ملزم

گردانتے ہوئے ان کی موقوفی اور ان کی جگہ اپنی یا اپنے یاران سرپل کی بحالی چاہنے لگیں گے ۔

ان مطالبات کی دوہری کمان میں اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاکر بادشاہ کے لئے کوئی سا تیر چلانا مشکل ہو جائے گا ۔ اور ملک میں ردِعمل کے بہاؤ کی شدت بادشاہ کی حیثیت کو بتدریج کمزور کرتی چلی جائے گی ۔ آخری مرحلہ پہ یا تو ہم بادشاہ کو خوانین کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی بنا ہوا پائیں گے ۔ اور یا پھر بادشاہ کا وجود ہی گم ہو کر ملک میں ٹھیٹھ نیوڈلزم کی تجدید کے سامان پیدا کر دے گا ۔

کیا سقاوی حکومت دورِ ماضی کو لا رہی ہے گی ۔ یا قبل ازیں کہ وہ گرداب اوّلین سے نکل کر (جس میں انقلاب کے بعد کچھ دیر تک پھنسے رہنا "لازمۂ عملِ انقلاب ہے ۔ خواہ انقلاب تجدد آفرین ہو یا قدامت خواہ) ردِعمل کے بہاؤ پہ بہنا شروع کر دے اسی گرداب ہی میں پھنس کر فنا ہو جائے گی ۔

ہم نے دیکھا کہ سقاوی حکومت ابھی اس گرداب اوّلین سے نکلنے بھی نہ پائی تھی ۔ کہ موجۂ فنا کی آغوش میں جا رہی ۔

لیکن اگر کہیں اس کے لئے گرداب سے نکلنا نصیب ہو جاتا ۔ تو پھر ایک بر علیہ انقلاب کے بغیر ملک کو نجات میسر نہ آسکتی تھی ۔ مختلف دعویداران سلطنت یا ملک کے نجات دہندوں کا ظہور اس گرداب کی قوتوں کے نشانات ہوتے ہیں ۔ جس میں کوئی ملک انقلاب کے فوراً ہی بعد کچھ عرصہ تک پھنسا رہتا ہے ۔ اس لئے نادر خان کا ظہور اور اس کا غلبہ بھی اس گردابی قوت کا ایک نشان تھا ۔ یہ علیہ انقلاب نہیں ۔

ان ابتدائی کارروائیوں کے بعد جن کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے ۔ سقاوی

دور کس طرح گردش میں آیا۔ اسے ہم ذیل کے چار حصوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کی جُدا جُدا تفصیل لکھتے ہیں۔ تاکہ سقاوی دور کا جو کہ درحقیقت تاریخ انسانی کے لئے ایک قیمتدار دور ہے ہر ایک خط و خال ظاہر و نمایاں طور پر محفوظ کیا جا سکے"

ا۔ سقاوی حکومت کا مفتوحین سے سلوک +

۲۔ ملک کے مختلف صوبوں سے حکومت سقاوی کو تسلیم کروانے کی مہمات +

۳۔ سقاوی حکومت کے جنگی اقدامات +

۴۔ آخری مہم و فتح کابل +

لیکن ان تفصیلات میں پڑنے سے پہلے ضروری ہے۔ کہ ہم اس دور کی چند ایک متعلقہ باتوں کو جن کا ذکر اوپر کے عنوانات کے ماتحت موزونیت کے ساتھ نہ آسکیگا یہاں بیان کردیں۔ ان میں سے ایک خارجی لوگوں کے کابل کو خالی کر دینے کی کارروائی ہے۔ جو غازی امان اللہ خان کے فرار سے پہلے شروع ہوئی۔ مگر جس کی تکمیل بچہ سقاؤ کے وقت میں جا کر ہو سکی۔ ان دول غیر کی سفارتوں نے جب دیکھا۔ کہ بغاوت دن بدن زور پکڑ رہی ہے۔ اور حکومت افغانیہ ہر لحظ نحیف اور کمزور ہوتی چلی جا رہی ہے حتےٰ کہ اس میں پایہ تخت کی حفاظت اور بچاؤ کی اہلیت بھی باقی نہیں رہی۔ تو انہوں نے بچہ سقاؤ کے پہلے حملہ کے بعد اپنے تبعہ افراد اور نیز اپنی سفارتوں کے اعضا کم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ادھر حکومت برطانیہ نے اس خدمت کے لئے اپنے ہوائی جہاز پیش کر دئیے۔ جرمنی۔ فرانسیسی۔ اطالوی۔ ترکی۔ ایرانی اور ہندی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان تقریباً ہر روز ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے کابل کو خالی کرنے لگ پڑے۔ بعد میں غازی امان اللہ خان کے فرار اور بچہ سقاؤ کی کامیابی نے سفارتوں کو درحقیقت بہت مذبذب اور پریشان کر دیا تھا۔ اور وہ کابل سے اپنی اپنی سفارتوں کے اٹھا لینے کے تعلق اپنی اپنی حکومتوں سے استفسار کر رہے تھے۔ لیکن

انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ان کی حکومتوں نے بہت جلد ان کو چلے آنے کے احکام بھیج دیئے۔ اور اب وہ بھی اپنے اپنے سٹاف سمیت کابل کو خالی کر رہے تھے۔ آخر میں سفارت برطانیہ بھی کوچ کر آئی۔ اور اب کابل میں سوائے ترکی۔ ایرانی اور روسی سفارتوں کے کوئی باقی نہ رہا۔ اور اگرچہ روسیوں نے بھی اپنے تبعہ افراد کو جنہیں حکومت امانیہ نے ہوائی جہازوں کیلئے مستخدم کر رکھا تھا۔ روس واپس بھیجدیا تھا۔ تاہم اس انتشار داخلی کے دوران میں ان کی سفارت افغانستان سے نہ گئی۔

طیارہ گاہ میں ابتداءً امانی وزارت خارجہ کے آدمی موجود ہوتے تھے۔ اور بعد میں سقاوی افسر جانے والوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کو جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ جن کا حکومت سے کسی قسم کا لین دین یا معاملہ باقی ہوتا تھا۔ اس طرح چند جرمن جو کابل میں تجارت کیا کرتے تھے۔ باقی رہ گئے تھے۔ ان میں دارالامان کا مہندس بھی تھا۔ جو بعد میں بہ تبدیل لباس حاجیوں کی وساطت سے فرار ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ اس کے ذمہ حکومت کا کچھ روپیہ باقی تھا۔

اس ضمن میں ایک عجیب بات جو مشاہدہ میں آئی۔ وہ یہ تھی۔ کہ کابل کے نصف سے زیادہ باشندے سفارت برطانیہ کو عرضیاں بھیج رہے تھے۔ کہ انہیں بھی تبعہ انگریزی بنا کر ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے یہاں سے نکال لے جایا جائے۔ ایسے لوگ البتہ ظلم ظالم سے ڈر کر بھاگنا چاہتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے۔ جن کے پاس حکومت کا بہت سا روپیہ تھا۔ اور وہ اس کو ہضم کرنے کے لئے نیچ جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک شیر احمد خان مشہور بہ شیر خیاط جو کابل کے اہم تاجروں میں سے گنا جاتا تھا۔ ایک حیلہ سے بچہ سقاؤ کی مرضی حاصل کر کے کابل سے چلا آیا تھا۔ مگر دوسروں کو ایسے حیلے میسر نہ تھے۔ اس لئے وہ افغان تابعیت کے ترک کر دینے تک کے روادار ہو گئے

تھے۔ جو یقیناً افسوسناک امر تھا۔

احمد شاہ خاں موجودہ بادشاہ کا عم زادہ بھی انہی مسافرین ہوائی جہاز میں سے تھا۔ جسے بچہ سقاؤ نے سپہ سالار نادر خان کے فرانس سے واپس لانے کی خدمت پر مامور کر کے بھیجا تھا۔

سقاوی حکومت تمام ان لوگوں سے جو غازی امان اللہ خان کے معتوب رہ چکے تھے۔ خدمت لیکر اپنے اساس کو محکم و استوار کرنا چاہتی تھی۔ بچہ سقاؤ میں اتنی عقل ضرور تھی۔ کہ وہ اپنی بادشاہت کے قائم رکھنے کے لئے چند مقتدر افغانی خاندانوں کی معاونت حاصل کرے۔ ان خاندانوں میں سے ایک محمد نادر خان سپہ سالار کا خاندان بھی تھا۔ جو صداقت و نیکی میں افغانستان بھر میں مشہور تھا۔ اور اتفاق سے غازی امان اللہ خان کا چند سالوں سے معتوب بھی تھا۔ نیز شاید بچہ سقاؤ کو یہ بھی پاس ہو۔ کہ وہ خود ایک وقت ایک ادنٰے سپاہی تھا۔ اور محمد نادر خان اس کا سپہ سالار تھا۔ ان ملی جلی حسیات کے ماتحت اس نے محمد نادر خان کو اپنا طرفدار بنانے کی پوری پوری کوشش شروع کر دی تھی۔ اور البتہ یہ سب کچھ شیر جان اس سے کروا رہا تھا۔ میں تحقیق نہیں کہہ سکتا۔ کہ شیر جان کے دل کے اندر کیا کچھ مستور تھا۔ تاہم اتنا کہنے کی گنجائش موجود ہے۔ کہ وہ صاحب حیثیت و شخصیت لوگوں کا گروہ حکومت کے ارد گرد پیدا کرنے کا خواہشمند تھا تاکہ رفتہ رفتہ وہ چوروں کے اثر و اقتدار کو زائل کر کے یا تو خود بادشاہت کے مرتبہ پر پہونچ جائے۔ اور یا پھر کسی ایسے شخص کو بادشاہ بنا سکے جو اس کی نظروں میں سب سے زیادہ عزیز و منظور ہو۔ اور اس طرح نئی حکومت اسلامیہ کا بانی کہلائے۔ علم و معلومات سے کہیں زیادہ اس شخص میں جو عجیب چیز دیکھنے میں آئی۔ وہ یہ تھی۔ کہ وہ ہر ایک چیز کو دور اندیشی کے ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کی اہلیت کا مالک تھا۔ اور جیسا کہ میں کہیں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ کہ اگر بچہ سقاؤ ساری

باتوں کو اس پر چھوڑے رکھتا۔ تو شاید سردار محمد نادر خان کو موفقیت نصیب نہ ہوتی۔

قصہ کوتاہ یہ کہ احمد شاہ جان ایک معقول رقم کے ساتھ سردار محمد نادر خان اور اس کے بھائیوں کو فرانس سے اپنے ہمراہ لانے کی خدمت پہ مامور ہو کر یورپ کی طرف بھیجا گیا۔ اور بچہ سقاؤ کو بہت بڑی امید تھی۔ کہ وہ ضرور اس کے پاس آجائے گا۔ یہ امید اس کی ضرور بر آتی۔ اگر اعلحضرت محمد نادر خان خود اپنے لئے قسمت آزمائی کا حوصلہ اپنے دل میں نہ رکھتا ہوتا۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات جو ہم اس جگہ قارئین کی خاطر میں لانا چاہتے ہیں۔ وہ افغانستان کے موجودہ وزیر جنگ شاہ محمود برادر خورد شاہ حال کی سمت جنوبی کی طرف روانگی کے بارے میں ہے۔ یہ بچہ سقاؤ کے مقابلے میں ایک محاذ کا کمانڈر تھا۔ مگر چونکہ بچہ سقاؤ کے مدنظر اس کے خاندان کو اپنے ساتھ ملانا تھا۔ اس لئے اس نے اس کو کچھ نہ کہا۔ بلکہ سمت جنوبی کے قبائل کے درمیان جہاں شاہ محمود کو لوگ جانتے پہچانتے اور اس کی عزت کرتے تھے۔ اسے اپنے حق میں بیعت لینے کی خدمت پر مامور کر کے فرمان اور ضروری روپیہ کے ساتھ بھیجدیا تھا۔ اس طرح اعلحضرت محمد نادر خان کی بیگمات داخل خانہ چند نہایت ہی کم عمر نوجوانوں کی معیت میں کابل میں رہ گئی تھیں۔ اور بچہ سقاؤ کی امید کا ایک یہ بھی باعث تھا۔ کہ سردار محمد نادر خان ان وجوہات کی بنا پر اس سے سرکشی نہیں کرے گا۔ بہرکیف اب ہم حکومت سقاوی کے نہ ماہہ عہد کو سلسلہ وار روشنی میں لاتے ہیں:

(۱) سقاوی حکومت کا مفتوحین سے سلوک

شیر جان اور بچہ سقاؤ کے چند ایک سپہ سالاروں کو چھوڑ کر بچہ سقاؤ کی بادشاہت کے اہم ترین شریک اور رکن تعداد میں تین تھے۔ ایک اس کا بھائی حمید اللہ دوسرا

سید حسین اور تیسرا ملک محسن جس کے حصہ میں کابل کی گورنری آئی تھی۔ ان تینوں نے مختلف شاہی محلات پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور وہی گویا ان کے دربار آراستہ کرنے کی جگہیں تھیں۔ ہر ایک کے اپنے باڈی گارڈ اپنے پیشکار و محصل اور اپنے ہی خبر دہندہ تھے۔ اور گذشتہ حکومت کے کارداروں کے احوال سے ان کو واقف کار کرنے کے لئے کوہستانیوں اور کوہدامنیوں کا وہ گروہ موجود تھا۔ جو مدتوں سے کابل میں بود وباش رکھتا تھا۔ پہلا ہفتہ کسی قدر آرام سے گذرنے کے بعد ہر طرف ماردھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ امانی کارواروں میں سے کسی کو سید حسین پکڑ منگواتا۔ اور اگر وہ چھوڑ دیتا۔ تو حمید اللہ کی طرف سے ان کی گرفتاری کا حکم جا پہونچتا۔ اور اگر خوش قسمتی سے کسی کو اس کے چنگل سے بھی نکل جانے کا موقع مل جاتا۔ تو ملک محسن کے سپاہی بلائے مبرم کی طرح اس کو جا لپکتے۔ اور مار پیٹ کرتے ہوئے جانوروں کی طرح سے ہنکاتے ہوئے انہیں پھر لے آتے۔ اور اندھیری کوٹھڑیوں میں ٹھونس دیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا۔ کہ ایک ہی آدمی کی گرفتاری کے لئے سید حسین والی ملک محسن اور حمید اللہ کے سپاہی پہونچ جاتے۔ اور شخص اسیر کو اپنے ہی افسر کے پاس لے جانے کے لئے آپس میں تکرار و حجت شروع کر دیتے۔ اور جب ان کا آپس میں ایک دوسرے پر زور نہ چلتا۔ تو بیچارے اسیر پر غصہ اتارنے لگ پڑتے۔ ہر ایک فریق اس کو اس غرض سے مارتا۔ کہ وہ انہی کے ساتھ چلا چلے۔ اور جب وہ بیچارا اس کے ساتھ چلنے لگتا۔ تو دوسرا فریق اس کو پیچھے سے بندوقوں کے کُندے رسید کرکے اپنے ساتھ آنے کو کہتا۔ غرض اسی طرح کا طوفان بے تمیزی کابل کے ہر کوچہ و گذر میں روزمرہ مشاہدے میں آ رہا تھا۔

ان تینوں حکومت کے مختاروں کی آپس میں بھی خوب چل رہی تھی۔ مثلاً جس کو سید حسین نے آج چھوڑ دیا ہے۔ (اور البتہ یہ رہائی اس نے بہت سا روپیہ نذر کرکے

حاصل کی ہوتی تھی) تو کل ہی جب اس کو والی محسن نے پکڑوا منگوایا ہے۔ تو اس کے لواحق روتے پیٹتے سید حسین کے پاس پہونچتے ہیں۔ سید حسین والی کے نام غصہ سے خط لکھتا ہے۔ والی اس کا خط دیکھ کر پھاڑ دیتا ہے۔ یا کچھ یونہی سا جواب لکھ دیتا ہے جس پر سید حسین اور مشتعل ہو کر اپنی مسلح نفری والی کے گھر پر بھیج دیتا۔ تاکہ والی سے بجبر اپنے آدمیوں کو چھڑالائے۔ اس پر والی یا تو ڈر کے مارے گرفتار شدگان کو چھوڑ دیتا۔ اور یا ان کو اپنے بندیخانے سے نکال کر سید حسین کی مسلح نفری کے آنے سے پہلے ہی ارک میں بھجوا دیتا ؛

ان حالات میں ان لوگوں کی خوب بن آئی تھی۔ جن کی سابقہ حکومت کے عہد میں ایک دوسرے سے دشمنیاں تھیں۔ ایسے لوگ رضا کارانہ طور پر بچہ سقاؤ کے عمال کے مخبر بن گئے تھے۔ اور خواہ مخواہ لوگوں کے برخلاف سچی جھوٹی رپورٹیں دے کر لوگوں کو پھنسا رہے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام وزرا امانیہ اور دیگر بڑے بڑے رکن و عمال حکومت قید کر لئے گئے۔ بڑے بڑے تاجر بھی اس قید و بند سے نہ بچ سکے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر عمال و ارکان حکومت کے ساتھ حساب و کتاب رکھتے تھے۔ ان سب سے روپیہ اگلوایا جا رہا تھا۔ اور جب سقاوی افسر کے ہاتھے یہ چڑھ جاتے تھے۔ وہ ان سے بڑی بڑی رشوت کی رقمیں اس وعدے پر وصول کر لیتے تھے۔ کہ ان کی امیر سے کہہ کر خلاصی کروا دی جائے گی۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد ان کو پھر گرفتار کر کے منگوا لیا جاتا تھا اور اس دفعہ ان کی گرفتاری کسی نئے سقاوی افسر کے حکم سے عمل میں آتی تھی۔ اور چونکہ بے آئین چوروں سے ہر قسم کے عذاب کا خوف لاحق ہوتا تھا۔ اس لئے ناچار یہ اسیران بلا اپنی جان بچانے کے لئے اپنے ہر ایک گرفتار کرنے والے سقاوی افسر کو خوش کرنے پر مجبور تھے۔ ایسا کرتے ہوئے بجائے اس کے کہ ان کی گلو خلاصی ہوتی۔ سقاوی افسروں کو شک پڑ جاتا۔ کہ ان کے پاس کافی دولت موجود ہے۔ اس احساس کے ماتحت اکثر ایسا

ہوتا۔ کہ وہی افسر جس نے بھی رشوت لے کر ایک کو چھوڑ دیا تھا۔ پھر اس کو گرفتار کروا منگواتا۔ اور اس سے بیشتر رقمیں طلب کرتا۔ چوروں کو آنکھیں بدلتے دیر نہ لگتی تھی۔ اور ان کو کچھ کہا بھی نہ جاسکتا تھا۔ دلیل بحث حجت و تاویل کا وہاں گذر ہی نہ تھا۔ ذرا کسی نے جسارت کر کے کچھ کہا نہیں۔ کہ فوراً اوندھا کر کے اس کو وہ مار دی گئی۔ کہ الامان والحفیظ۔

اسی اثنا میں ہماری اپنی گرفتاری کی بھی نوبت آگئی۔ ہم میں سے ایک نہایت ہی بدباطن شخص تھا۔ اور دور امانیہ میں بھی یہ شخص محکمۂ جاسوسی میں کام کرتا رہا تھا۔ اس کا پیشہ ہی یہ ٹھہر چکا تھا۔ کہ حد سے زیادہ مبالغہ آمیز اور جھوٹی رپورٹیں دیکر بلا امتیاز ہندی افغانیوں کو مصائب و تکالیف میں مبتلا کرتا رہے۔ یہ شخص اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ اگر امان اللہ خان تخت افغانستان پر متمکن نہ رہ سکا۔ تو وہ بھی اسی کے ساتھ ہجرت کر کے چلا جائے گا۔ مگر بجائے خود اس کے ساتھ ہجرت کر جانے کے اس نے بچہ سقاؤ کے ساتھ مل کر ہمیں ہی اس دنیا سے ہجرت کروانی چاہی تھی غرضکہ اس بدطینت شخص نے نہ معلوم کیا کچھ بچہ سقاؤ کے والی کو جاکر کہا۔ کہ اس نے فوراً ہی تمام مہاجر ہندوستانیوں کی طلبی کے احکام صادر کر دیئے۔ اور ان سب کو حاضر کرنے کا کام بھی اس شخص کی خواہش پر اسی کے ذمہ کر دیا۔ دوسرے دن اس نے ہم سب کو اطلاع بھیجی۔ کہ ہم کو والی کابل دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلیئے ہم سب اس کی جگہ پر اکٹھے ہوں۔ اور اکٹھے ہی والی کے سامنے چلیں۔ ہم میں سے مولوی اللہ نواز خان جو آجکل موجودہ اعلحضرت کے یاور ہیں۔ چند دن پہلے ہی جرنیل شاہ محمود کے ساتھ سمت جنوبی کو جا چکے ہوئے تھے۔ اور چونکہ ہمیں کھٹکا رہا تھا۔ کہ ہم جاتے ہی گرفتار کر لئے جائیں گے۔ اس لئے ہم نے شاہ جی کو جو بعد میں فاتح کرونیہ بنا۔ اور آج جرنیل کے معزز عہدہ پر ممتاز ہے۔ والی کے سامنے پیش نہ ہونے کی تجویز پیش کی۔ تاکہ جس صورت میں ہم گرفتار ہو جائیں۔ ہمارے متعلق رہائی کی کوششیں کر سکے اور ہندوستان میں

کی عورتوں اور بچّوں کی حفاظت کے متعلق کوئی معقول تدابیر سوچ سکے۔ اس مسئلہ کو طے
کر کے ہم والی کے دربار میں پیش ہوئے۔ ہمارے ناموں کی ایک طویل فہرست جو
اس کے سرکاتب کے پاس آ گئے ہی سے موجود تھی۔ پڑھی گئی۔ اس فہرست کے
مطابق کئی ایک غیر حاضر تھے۔ اس پر والی کو سخت غصّہ آ گیا۔ اور وہ اس شخص کو
جس کی یہ سب کرتوت تھی۔ اور جو ہمارے خون کی قیمت چوروں کے ہاں عزت پانے
کی صورت میں حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔ بے حد فحش گالیاں دینے
لگ پڑا۔ اور اسی طیش میں آ کر اس نے میرے ساتھ اس کو بھی گرفتار کرنے کا حکم دیدیا۔
اس گروہ ہندوستانیوں میں سے قرعۂ گرفتاری صرف میرے نام ہی پڑا تھا۔ چنانچہ ہم
دونوں کو والی کی جگہ پر لے جا کر ایک نہایت ہی تنگ و غلیظ کوٹھڑی میں قید کر دیا
گیا۔ اس کوٹھڑی میں میرے ہوٹل کا نوکر دبر خان نامی دو روز پیشتر ہی سے گرفتار ہو کر
آ چکا تھا۔ یہاں اور چند ایک کابلی بھی تھے۔ اور ایک ہندوستانی تاجر سکندر شاہ
نامی بھی تھا۔ اس کوٹھڑی کے آگے جس میں ہم سات آٹھ آدمی قید تھے۔ ایک اور
کوٹھڑی بھی تھی۔ ان دوہری کوٹھڑیوں کی چھتیں نہایت ہی پست تھیں۔ اور باہر نکلنے
کا دروازہ ایک چھوٹی کھڑکی کی شکل میں ہماری آگے والی کوٹھڑی میں تھا۔ ہم پر جو
محافظ مقرر کئے گئے تھے۔ وہ ہم سے روپیہ اینٹھنے کے لئے نئی تدبیروں کو
کام میں لا رہے تھے۔ یعنی ہم سے آگے والی کوٹھڑی میں اپنا کھانا پکانے کے
بہانے سے گیلی لکڑیاں جلاتے تھے۔ جن کا دھواں باہر نکلنے کی بجائے اندر ہی جمع
ہوتا رہتا تھا۔ اور ہماری اندر والی کوٹھڑی اس دھوئیں سے اس قدر بھر جاتی تھی۔ کہ دم
لینا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں تو اس عذاب کی تاب نہ لا سکا۔ اور جھٹ ان کے بڑے افسر
کو بلوا کر اس سے کہدیا۔ کہ کھانا پکانے کے لئے جس قدر کوئلوں کا خرچ ہو۔ میں خود برداشت
کرونگا۔ لیکن تم لکڑی نہ جلایا کرو۔ بارے وہ اس بات پر رضامند ہو گیا۔ اور آئندہ

کے لئے لکڑی کے دھوئیں سے ہم بچ گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو مزید شرارتیں کرنے کی اور جسارت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ کچہ کا ناپھوسی کرنے کے بعد ہمارے پہرہ داروں میں سے ایک ہمارے پاس اندر آیا۔ اور جان بوجھ کر پانی کا گھڑا جو پاس ہی پڑا ہوا تھا اس نے پاؤں سے ٹھکرا کر زمین پر گرا دیا۔ تاکہ ہمارے کپڑے و بستر تر بتر ہو جائیں۔ اور ہمیں تکلیف ہو۔ اور ہم ان کو اور کچھ نقدہ دلوائیں۔ اگر ہم چند دن اور والی کے بندیخانے میں رہتے۔ تو نہ معلوم ہمارا کیا کچھ حشر ہوتا لیکن اسی اثنا میں شاہ جی کی دوڑ دہوپ نے سید حسین سے ہماری رہائی کا پروانہ حاصل کر لیا تھا اور اب وہ والی کے پاس اس پروانہ رہائی کو لے کر آیا تھا۔ تاکہ ہم کو اس کے پنجہ سے چھڑا کر لے جائے۔ مگر والی نے سید حسین کے پروانہ رہائی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ڈر کے مارے ہمیں ارک کے بندیخانہ میں راتوں رات منتقل کر دیا۔

بچہ سقاؤ کے ہاں اطلاعات پہونچائی گئی تھیں۔ کہ اگر مجھ جیسے لوگ باہر چھوڑ دئے گئے۔ تو شاید چند ہی دنوں میں اس کی بادشاہی کا تختہ الٹ کر رکھ دینگے۔ بدقسمتی سے انگریزوں جیسی دانا اور حقائق آشنا قوم کو بھی میری نسبت یہی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ نہ معلوم مجھ میں کونسی ایسی صفت ہے جس کے اثر سے لوگ اپنے اندام پر لرزہ پیدا کر لیتے ہیں۔ بہرکیف جن الزامات میں ہم ماخوذ تھے۔ ان میں سے ایک محمد نادر خان کی طرفداری میں کام کرنے کا الزام بھی تھا جس کے متعلق اب بچہ سقاؤ کو یقین آ چکا تھا کہ وہ اس کے پاس ہرگز نہیں آئے گا۔ وہ تو ہمیں یہاں تک خوف کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ کہ گویا کابل صرف ہمارے ہی اشاروں پر کام کر رہا ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے ہمیں کروا رہے ہیں۔ اس کا وزیر خزانہ ایک دن یا ور محمود جان کو ملنے کے لئے ہماری کوٹھڑی میں آیا۔ تو مذکورہ بالا الزامات اس کی زبانی ہم کو معلوم ہوئے۔

ہمارا بندی وان جو بچہ سقاؤ کے گاؤں کا ہی رہنے والا تھا۔ ہم کو دنیا میں

صرف چند دن کا مہمان تصور کر رہا تھا۔ اور ہم خود بھی ایسا ہی سمجھ رہے تھے۔ میری بیوی اپنے چھوٹے بچّوں کے ساتھ اس وقت کابل ہی میں تھی۔ اتفاق سے رشتہ داروں میں سے اور کوئی اس کے پاس موجود نہ تھا میں اگر کابل سے بھاگنا بھی چاہتا تو اپنی بیوی اور بچّوں کو بے سہارا چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ جس وقت مجھے قید کیا گیا ہے۔ میری بیوی بیمار تھی۔ میرے متعلق ایسی ہوشربا خبریں سُنکر وہ قریب المرگ ہو گئی تھی۔ مگر نہ اس نے ابھی بیوہ ہونا تھا۔ اور نہ ہی زندانِ فرنگ میں بیٹھ کر میں نے اس کتاب کے لکھنے سے محروم ہونا تھا۔ اس لئے باوجود بچہ سقاؤ کے چند دفعہ قتل کا حکم دے دینے کے میں اور میرے ساتھ دیگر چند ہندوستانی زندہ بچ رہے۔ میرے پاس بچنے کی ایک ہی تدبیر تھی۔ وہ یہ کہ چوروں کی ذہنیت کو ایکسپلائٹ کروں۔ اس کو میں نے عمل میں لانا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے چوروں کا غصّہ ہم پر بتدریج کم ہونا شروع ہوا۔ اور اس کی بجائے ان کے دل میں ہمدردانہ جذبات پیدا ہونے لگے اسی اثنا میں ہمارا ایک ہندوستانی بھائی جس کو غازی امان اللہ خان نے قطغن و بدخشان کی طرف فرار کیا ہوا تھا۔ اسکی اپنی فراری کے بعد وہاں کے لوگوں سے بچہ سقاؤ کے حق میں بیعت لیکر آپہونچا۔ اور اس کی وجہ سے ہم بال بال خطرے سے بچ گئے۔ یہاں یہ انتہا درجہ کی احسان فراموشی ہوگی۔ اگر میں اعلحضرت محمد نادر خان کے ہاتھوں سے اس کی جاندماری کئے جانے کا ذکر نہ کروں۔ مجھے اعتراف ہے۔ کہ اس نے تو بچہ سقاؤ کے ہاتھوں سے ہماری جان بخشی کروائی تھی۔ مگر ہم اس کو اعلحضرت محمد نادر خان کے ہاتھوں جن پر ہمیں بہت ساناز تھا۔ اور جن کی خاطر ہم سب کی جانیں خطرہ میں پڑ چکی تھیں۔ نہ بچا سکے۔ اس کی زیادہ تر وجہ مولوی اللہ نواز خان اور اس کی رقابت تھی۔ اگر طاقت پاکر انسان اپنے رقیب یا دشمن کو نہ بخش سکے تو اس میں اور ایک درندے کی سبعیت میں کوئی فرق کرنا محال ہو جائے گا۔

ابھی ہم بندیخانے ہی میں تھے۔ کہ شہزادہ حیات اللہ خان بھی ہماری کوٹھڑی میں بھیجدیا گیا۔ اس پر جرم یہ تھا۔ کہ اس نے بچہ سقاؤ کا تختہ الٹنے اور آپ بادشاہ بننے کی سازش کی ہے۔ اس رات بچہ سقاؤ نے اس کے ساتھیوں کو "زیر چوب" یعنی لکڑیوں کی مار کے نیچے قائل کروا لیا تھا۔ اور شہزادہ حیات اللہ خان کو بھی پٹوانے لگا تھا۔ مگر پھر کچھ خیال کر کے اسے بغیر پٹوائے واپس بندیخانہ میں بھیجدیا۔ اور دو مہینوں کے بعد خفیہ ہی خفیہ اسے پھانسی دے کر ارک کی ایک دیوار کے نیچے دبا دیا ٭

کئی درجن آدمیوں کو بچہ سقاؤ اور والی نے خفیہ مروا دیا تھا۔ اور والی تو اکثر آدمیوں کو زندہ دفن کر دیتا تھا۔ اور اس کی خبر بھی بچہ سقاؤ کو نہیں دیتا تھا یقاوی حکومت کے برطرف ہونے پر بیسیوں لاشیں والی کے مکان سے برآمد ہوئیں۔ جن کو طرح طرح کے عذابوں سے مارا گیا تھا ٭

کابل میں ایک مشہور شخص قاضی عبد الرحمٰن نام تھا۔ جو خود بھی کوہدامن کا رہنے والا تھا یہ غازی امان اللہ خان کے فرار پر بھی بچہ سقاؤ سے جنگ لڑتا رہا۔ اور بالآخر گرفتار ہو کر بچہ سقاؤ کے پیش ہوا۔ جس نے اس کی اعضاء بریدگی کا حکم دیکر اسے ملک محسن والی کے حوالہ کر دیا۔ تاکہ بہ سرچوک اس حکم کی تعمیل کی جائے۔ والی ملک محسن جو ہر طرح کے جبر و تشدد اور حیلہ و ہنر سے لوگوں سے دولت سمیٹ رہا تھا۔ قاضی عبد الرحمٰن کو دم دلاسا اور تشفی دیتا ہوا مقررہ قتل گاہ کی طرف لیگیا۔ اور پاس ہی ایک فالودہ کی دوکان تھی جس میں دونوں داخل ہو گئے۔ باہر سخت پہرہ کھڑا کر دیا گیا۔ اور اندر والی اس کی دولت کی تفصیل قلمبند کرنے لگا۔ وعدہ یہ تھا۔ کہ اگر قاضی عبد الرحمٰن اس کو اپنی ساری دولت کا پتہ بتا دیگا۔ تو اس کے عوض وہ بچہ سقاؤ سے کہہ کر اس کی جان بخشی کروا دیگا۔ مگر جب وہ اپنی جائداد منقولہ و غیر منقولہ کی ساری تفصیل قلم بند کروا چکا۔ تو والی اس کو یہ کہہ کر

کہ وہ ابھی اس سے بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ گالی گلوچ پر اتر آیا۔ اور ساتھ ہی اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ کہ فوراً قصاب کو حاضر کریں۔ قصاب تو پہلے ہی سے حاضر تھا۔ یہ محض والی کا ایک دکھاوا تھا۔ تاکہ اس دھمکی سے متاثر ہو کر اگر کچھ باقی رہ گیا ہو۔ تو وہ بھی منظرِ قرطاس پر آجائے۔ مگر غالباً وہاں کچھ باقی نہ تھا۔ اور قاضی نے اپنی موت کی جو اس کے سامنے کھڑی تھی۔ بالکل پرواہ نہ کرتے ہوئے مزاحاً والی سے کہا۔ کہ میرے بند بند تو تم نے کاٹنے ہی ہیں۔ مجھے پیٹ بھر کر فالودہ تو پی لینے دو۔ اس کے فالودہ پینے تک سینکڑوں تماشائی باہر جمع ہو چکے تھے۔ اور جب باہر لا کر اس کو فرشِ زمین پر چت لٹا دیا گیا۔ تو حیرت ہے۔ کہ ایسی موت کی سختی کا علم ہونے کے باوجود قاضی عبدالرحمٰن کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ گویا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ قاضی بدن پر تیل کی مالش کروانے کے لئے زمین پر لیٹ گیا ہے۔ غرضیکہ جب وہ لیٹ چکا۔ تو قصاب ایک آبدار چھرا لے کر آگے بڑھا۔ اور ایک ہی حرکت میں اس کا پہلے ہاتھ جدا کر دیا۔ پھر پھرتی سے دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا۔ اب وہ پاؤں کی طرف بڑھا۔ اور یکے بعد دیگرے دونوں پاؤں کاٹ دئیے۔ پھر دوسری طرف واپس لوٹا۔ اور بچے ہاتھوں کو کہنیوں سے بھی جدا کر دیا۔ اور پھر واپس پھر کر دونوں ٹانگوں کو زانوؤں سے بھی اڑا ڈالا +

ہاتھ کٹ رہے تھے۔ مگر قاضی ایک کوہ وقار کی سی استقامت کے ساتھ ان کے کٹنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ پاؤں جدا ہو چکے تھے۔ مگر ابھی تک اس کے لب پر اُف تک نہ آئی تھی۔ حتےٰ کہ کہنیاں بھی کٹ کر گر گئیں۔ مگر اسے جنبش تک نہ ہوئی۔ لیکن جب نوبت گھٹنوں پر پہونچی۔ تو ضبط اس سے جا چکا تھا۔ اور اب وہ ماہئ بے آب کی طرح زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کی چیخیں اب آسمان تک پہونچ رہی تھیں۔ اور خون کے فوارے جو اس کے بریدہ جسم سے نکل کر چاروں طرف خونیوں اور تماشائیوں کے دامنوں کو تر کر رہے تھے۔ ان چیخوں کی ہیبت کے ساتھ مل کر ایک نہایت ہی بھیانک اور محشر آفرین

منظر پیش کر رہے تھے۔ مگر وہ قسی القلب والی ذرا اس سے متاثر نہ تھا۔ بلکہ اس چیخنے والی لوتھ کے سر پر کھڑا اس کو ہنس ہنس کر سخت اور فحش مغلظات سنا رہا تھا۔ میں نے اسی والی کو خود اس کی چاندماری ہونے والے دن دیکھا۔ خوف اور بزدلی سے اس کی گردن سینہ تک دھنسی ہوئی تھی۔ بیشک ظالم ہمیشہ بزدل ہوا کرتے ہیں۔

اس قسم کے سنگین مظالم کے بکثرت واقع ہونے نے گردن فرازان کابل کی گردنیں بالکل ہی جھکا دی تھیں۔ اب وہ پہلی سی تیزی (ترت پھرت یعنی چالاکی و زبان بازی) ان سے جا چکی تھی۔ ہر ایک اپنی جان و مال بچانے کی فکر میں تھا لیکن چوروں کے عہد میں یہ دونوں چیزیں بچ جانی اگر ناممکن نہیں۔ تو محال ضرور تھیں۔ جان تو کسی حیلہ سے بچ بھی سکتی۔ مال کا بچانا ناممکن تھا۔ چوروں کی باریک نظر اسے سطح چھتوں دیواروں اور کنوؤں کی گہرائیوں اور پاخانوں کی تہوں کے اندر دیکھ لیتی تھی۔ اور کوہدامن اور کوہستان کی سڑک موٹروں گاڑیوں۔ خچروں سے پٹی پڑی تھی۔ جن کے ذریعہ سے یہ مال و منال کابل سے نقل کر کے ویرانوں کو آباد و منقش کرنے کے لئے جایا جا رہا تھا۔ یہ لوٹ مار اور ظلم و تشدد جو کچھ بھی ہو رہا تھا۔ نئی حکومت کے احکام بے آئینی کے ماتحت تھا۔ ہزاروں لاکھوں بندوقیں غازی امان اللہ خاں نے سراسیمگی کی حالت میں لوگوں میں تقسیم کر دی ہوئی تھیں۔ جن کا کثیر حصہ کابلیوں کے پاس تھا۔ اب بچہ سقاؤ نے حکم دے رکھا تھا۔ کہ حکومت کا سب اسلحہ واپس کیا جائے۔ مگر لوگوں نے بجائے واپس کرنے کے اس کو زمینوں کے اندر دبا رکھا تھا۔ لہذا مخبروں کی مدد سے سقاویوں کو اسلحہ تلاش کرنے کے بہانہ سے گھروں میں مداخلت کرنے کا خوب موقع ہاتھ آ رہا تھا۔ جسے وہ اچھی طرح استعمال میں لا کر نہ صرف اپنے دامن مال و زر سے بھر رہے تھے۔ بلکہ ایسا کرتے ہوئے اگر ان کی نظر کسی خوبصورت لڑکی پر پڑ جاتی تھی۔ تو وہ اہل خانہ کو مجبور کر کے جبریہ اس سے نکاح بھی پڑھوا لیتے تھے۔

خاندانی لڑکیوں کے ماں باپ تو ایک عجیب آفت و کشمکش میں مبتلا ہو چکے تھے۔

ان کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا۔ کہ کہیں کوئی سقاوی افسر آکر ان سے ان کی لڑکیوں کا رشتہ و ناطہ طلب نہ کر بیٹھے۔ اس ڈر سے بیچارے خفیہ ہی خفیہ اپنی لڑکیوں کا رشتہ و ناطہ اپنے خویش و برادری میں کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ کل تک جن رشتہ داروں کی ہوائیں تک تلوار میں ماری جاتی تھیں۔ آج اس لیئے ان کی منت اور الحاح وزاری کی جا رہی ہے۔ کہ وہ جلد ایک دو دنوں کے اندر اندر آکر لڑکیوں کے نکاح باندھ جائیں۔

سید حسین تو کئی نکاح اب تک کر چکا تھا۔ بچہ سقاؤ کے بھائی حمید اللہ کی بھی تین شادیاں ہو چکی تھیں۔ ستر برس کے بوڑھے کہوسط والی نے ایک دو نشانے خوب مار لئے تھے۔ خود بچہ سقاؤ نے بھی دو نئی شادیاں کی تھیں۔ (ایک اس کی سقاوی بیوی پہلے سے موجود تھی)۔ اور تیسری کے لیئے وہ کسی شاہی خاندان کی نوخیز کو تاک رہا تھا۔

سردار نصر اللہ خان کی ایک لڑکی عالیہ بیگم حسن و صورت میں نہایت مشہور تھی۔ بچہ سقاؤ نے اس کے لئے جستجو کی۔ حتےٰ کہ پہرے بٹھا دیئے۔ تاکہ اگر ضرورت پڑے۔ تو بزور نکاح پڑھوایا جائے لیکن خوش قسمتی سے عالیہ بیگم نے اپنا نکاح نامہ بچہ سقاؤ کے سامنے پیش کر دیا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان اس کا شوہر ہے۔ اور یہ نکاح ثانی بادشاہ نے اپنی کسی مصلحت سے کسی خاص وقت کے آنے تک پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ بچہ سقاؤ نے اس شرعی حجت کو قبول کر کے اس طرف سے اپنی توجہ ہٹالی۔ اور امیر کبیر دوست محمد خان کی ایک نواسی سے اپنی شادی رچا کر شرعی کورم یعنی چار کی تعداد کو پورا کر لیا۔

جب سرداران قطاع الطریق کا یہ حال تھا۔ تو قارئین خود ہی اندازہ کر لیں۔ کہ ان کے چیلے چانٹوں نے اس میدان میں کس طرح دھما چوکڑی مچا رکھی ہوگی۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہاں غازی امان اللہ خان کے اس نکاح ثانی کے متعلق کچھ حالات روشنی میں لائیں گے۔ اور ان پر ضروری تبصرہ کرینگے۔

یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے۔ کہ غازی امان اللہ خان نے عالیہ بیگم سے اپنا نکاح ضرور پڑھوایا تھا۔ عالیہ بیگم اس کے چچا کی لڑکی تھی۔ اور بے حد حسین و جمیل تھی پہلے بھی غازی امان اللہ خان کی یہ آرزو رہی۔ کہ وہ اس سے اپنا نکاح پڑھوا لے۔ لیکن عالیہ بیگم نے غازی امان اللہ خان کی درخواست یہ کہکر رد کردی تھی۔ کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کے ساتھ نکاح پڑھوانے پر ہرگز تیار نہیں ہے۔ یہ زمانہ بادشاہ کے ابتدائی عہد کا زمانہ تھا۔ اور بادشاہ اپنے نئے شغل حکومت میں اتنا مشغول تھا کہ کہ اس نے یہ روکھا پھیکا جواب سُنکر شاید مناسب نہ سمجھا تھا۔ کہ اسی کے درپے ہوتا ہے ؛

لیکن حسن کا جادو چل چکا تھا۔ اور کئی سالوں تک اس کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ بعد میں غازی امان اللہ خان واحد بیوی رکھنے کے اصول کا طرفدار ہوگیا تھا لہذا بظاہر یہ حیران کن بات تھی۔ کہ اس نے دنیا کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کی کوشش و جرأت کی ہو۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دوران انقلاب میں اس نے اپنا تخت و تاج محفوظ رکھنے کے لئے عالیہ بیگم سے نکاح رچالیا ہوگا۔ کیونکہ سمت مشرقی کے باغیوں کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا۔ کہ بادشاہ شہزادہ خانم کو طلاق دیدے۔ اور یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں ہے۔ کہ جس طرح اس کو پبلک کے سامنے آکر کلمے پڑھکر اپنی مسلمانی کا یقین دلانا پڑا تھا۔ اسی کا مزید ثبوت بہم پہونچانے کے لئے اس نے پیشتر ہی سے نکاح کر رکھا ہو۔ جس کے اعلان کرنے کی اسے بعد میں فرصت ہی نہ مل سکی +

البتہ اس اعتراض کے جواب میں خود غازی امان اللہ خان کی تشریحات کی ضرورت ہے۔ کہ وہ کیوں اپنی فراری کے وقت اپنی منکوحہ ثانی کو بجائے اپنے ساتھ لیجانے کے طلاق دیکر چھوڑ گیا۔ گو اس کی ایک توجیہ یہ بھی ہے۔ کہ چونکہ اس کو اب نظر آرہا تھا کہ اس نے اپنی بقیہ زندگی جلاوطنی میں یوروپ جیسے ملک میں بسر کرنی ہے جہاں

وہ ابھی چند ماہ بھی نہیں گذرے۔ کہ اس قدر عزت و توقیر سے دیکھا گیا تھا۔ لہٰذا
اگر وہ واحد بیوی کے اصول کا سرگرم حامی ہو کر دو بیویوں کے ساتھ وہاں جائے گا۔
تو شاید لوگوں میں اس کا رہا سہا درجۂ وقار بھی قائم نہ رہ سکے۔ اور وہ ایک بے اصول
آدمی شمار کیا جائے۔ تاہم بلند اخلاق کا یہ تقاضا نہیں تھا۔ کہ وہ عالیہ بیگم کو اس کس
مپرسی کی حالت میں چھوڑ جائے۔ اور یہ جو بعض لوگ اس ضمن میں اس کے عام اخلاق
پر نکتہ چین ہیں۔ تو میں غازی امان اللہ خان کو کوئی آسمانی فرشتہ نہیں سمجھتا۔
زور و طاقت کا یہ ایک ادنٰے کرشمہ ہے۔ کہ انسان اس کا سوء استعمال کرتا ہے۔
اگر انسان زور و طاقت کو عدل و اعتدال سے برتنے کے خوگر ہوتے۔ تو آج ہماری
دنیا اس قدر دکھی اور لعنتی نہ ہوتی۔ وہ جو اپنی فرشتہ صفتی کا ڈنڈوت پیٹتے ہیں۔
جب انہیں غور سے دیکھا جائے۔ تو

"چوں بخلوت میروند آں کار دیگر مے کنند"

مگر ایک بڑی حد تک یہ ان کا ذاتی قصور بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ طاقت اس سوء
استعمال کے میدان میں اپنا جوہر ضرور دکھا کر رہتی ہے۔ اور اپنے دائرۂ مذمومیت
کو خود تشکیل کر لیتی ہے۔ انسانی حیات کی منزل گاہ اولین میں یہ ایک نہایت
وسیع اور پیچیدہ مضمون ہے جس کے لئے قارئین کو میری ایک دوسری کتاب کا
انتظار کرنا پڑے گا۔

یوں تو سقاوی مظالم کی تعداد جو طرح طرح کے حیلہ و بہانوں سے ڈھائے جا رہے
تھے۔ اس قدر بیشمار ہے کہ موجودہ کتاب کسی طرح ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ
بچہ سقاؤ کے باپ عبد الرحمٰن کے حق میں ایک بڑی ناانصافی ہو گی۔ اگر اس پیر فرتوت کے
کرتوت قارئین کے سامنے نہ پیش کئے جائیں۔

بوجہ بچۂ سقاؤ کا باپ ہونے کے بیٹے کی کامیابی پر اس کی اہمیت خود بخود بڑھ

گئی تھی۔ شروع شروع میں تو یہ بچہ سقاؤ کو لوگوں پر رحم کرنے کی تلقین کرتا رہا لیکن جب بچہ سقاؤ کے قتل کر دینے کی سازشیں شروع ہوئیں۔ اور ایک دفعہ بچہ سقاؤ کی موٹر پر بمباری بھی ہو چکی۔ تو اس کا پارۂ انتقام عین درجۂ کمال پر تھا۔ میدان کی ایک لڑائی میں یہ اپنی فوج اور افسروں پر خود بخود نگران مقرر ہو کر ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ جب کچھ اسیر پکڑے آئے۔ تو چند ایک کو تو اس نے جانوروں کی طرح آہنی پنجروں میں بند کر دیا۔ اور ایک کو زندہ پوست کیا[1]۔ شامت اعمال سے یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ کہ بیٹے کا نام حبیب اللہ اور باپ کا نام عبدالرحمن تھا۔ قارئین فراموش نہ کریں۔ کہ امیر عبدالرحمن کے بعد امیر حبیب اللہ غازی امان اللہ خان کا باپ افغانستان کا بادشاہ تھا۔ اور چونکہ امیر عبدالرحمن اس قسم کے وحشیانہ مظالم روا رکھتا تھا۔ اس لئے سقاوی عبدالرحمن جذبۂ فقیری میں آ کر بکا کرتا تھا۔ کہ اگر لوگوں نے میرے بچے کی بادشاہت سیدھے ہاتھوں قبول نہ کی۔ تو میں اتنے مظالم روا رکھوں گا۔ کہ خود امیر عبدالرحمن بھی قبر میں لرز اُٹھے۔ مگر شکر ہے۔ کہ گنجے کے ناخن ہی خدا نے جلد لے لئے۔ ورنہ نہ معلوم کتنے حشر برپا کرتا۔

سقاوی موٹروں کی تلاش میں بہت پھرا کرتے تھے۔ کیونکہ افسروں کی تعداد نہ معلوم ہزاروں تک پہونچ چکی تھی۔ اور سرکاری موٹریں چند سو سے زیادہ نہ تھیں۔ میری ایک موٹر کار تھی۔ جو ایک دن اسی عبدالرحمن کا بھائی یعنی بچہ سقاؤ کا چچا زبردستی میرے موٹر خانہ سے نکال کر لے گیا ہوا تھا۔ یہ واقعہ میرے سقاوی بندیخانہ سے نکلنے کے بعد پیش آیا۔ اور چونکہ ہمیں اپنے گھروں کے اندر رہنے کا حکم مل چکا ہوا تھا۔ اس لئے نہ کہیں داد ہو سکتی تھی۔ نہ فریاد۔ بارے میں سقاوی میونسپلٹی کے رئیس تک ایک وساطت سے جا پہونچا۔ ابھی میں جا کر بیٹھا ہی تھا۔ کہ خود عبدالرحمن بھی

---

[1] اس سزا میں صرف اوپر کی چمڑی اتار لی جاتی ہے۔

وہاں آدھمکا۔ سب لوگ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر میں نے پرواہ نہ کی۔ یہ اس لئے کہ میں اس دن تک اس کی شکل تک سے آشنا نہ ہوا تھا۔ وگرنہ شاید میں اس کی تعظیم کرنے کے لئے اس قدر جھکتا۔ کہ دوہرا ہو جاتا۔ بہرکیف جب سب حضار اپنی اپنی جگہ پر مؤدب بیٹھ گئے۔ تو آپ رئیس بلدیہ یعنی میونسپلٹی کے صدر سے یوں گویا ہوئے :۔

بچہ سقاؤ کا باپ :۔ گھی کی تقسیم کا کیا انتظام ہے ؟

قارئین پر واضح رہے۔ کہ چونکہ ہر طرف سے راہوں کے مسدود ہو جانے کی وجہ سے کابل میں گھی کا قحط پڑ رہا تھا۔ اس لئے میونسپلٹی گھی کی تقسیم کا انتظام خود آپ کر رہی تھی ؎

رئیس بلدیہ :۔ جناب! لوگوں کو گھی بالکل نہیں ملتا ! . . . . .

بچہ سقاؤ کا باپ :۔ (جلدی سے بات کاٹکر) کیوں ؟ کیوں تمہارا انتظام معقول نہیں ہے ؟

رئیس بلدیہ :۔ جناب جس قدر گھی فراہم ہوتا ہے۔ اس میں سے اتنا شاہی مصرف کے لئے جاتا ہے۔ اتنا سید حسین وزیر جنگ کے ہاں۔ اور اتنا والی صاحب (ملک محسن) کے (یہاں رئیس نے دم لینے کے لئے تھوڑا رکنا چاہا)

بچہ سقاؤ کا باپ :۔ اور اور میرے بچے حمید اللہ جان کو تم بہت ہی قلیل مقدار گھی کی بھیجتے ہو یہ کیوں ؟ کیا سبب ؟ کیا تمہیں اپنی جان کی خیر درکار نہیں ؟

رئیس بلدیہ :۔ جی میں تو خادم ہی انہی کا ہوں۔ بھلا مجھ سے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ میں ان کے حکم سے سرتابی کر سکوں !

بچہ سقاؤ کا باپ :۔ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ تو والی کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ یاد رکھ کہ میں تجھے ایک دم سیدھا کر دونگا۔ سب اختیار میرا ہے ؎

رئیس بلدیہ :- (جو ایک جہاندیدہ آدمی تھا۔ وقت کی نزاکت کو ملحوظ رکھ کر) خیر جس طرح آپ حکم دیں گے۔ اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

بچہ سقاؤ کا باپ :- بس بس میں زیادہ زبان بازی نہیں جانتا۔ آج سے والی کو میرے مہر اور دستخطوں کے بغیر ایک مثقال بھی گھی نہ بھیجا جائے۔

(پھر میری طرف اشارہ کر کے)۔ ایں کیست ؟ یعنی یہ کون ہے ؟

میں یہ سوال سُن کر دل میں بہت ڈرا۔ کیونکہ ابھی تھوڑے دن نہیں گذرے تھے۔ کہ اس کے بیٹے حمید اللہ نے ڈاکٹر رشید الدین امرت سری کو جبکہ وہ اپنے ٹانگے پر سوار اپنے مریضوں کو دیکھنے کے لئے جا رہا تھا بمحض اس بنا پر زمین پر اوندھا لٹا کر پیٹ ڈالا تھا۔ کہ اس نے اس کی موٹر آتے دیکھ کر جلدی سے اپنا ٹانگہ سڑک کے ایک طرف کیوں نہیں کر لیا تھا ۔۔۔۔ لیکن ابھی تک میں یہ معلوم نہیں کر سکا تھا۔ کہ یہ ذات شریف ہیں کون!

رئیس بلدیہ :- یہ ایک ہندوستانی ہے۔ اور فریاد لایا ہے۔

خدا کا شکر ہے۔ کہ فریاد کے نام نے ہوا کے رُخ کو ہی بالکل بدل دیا۔ ورنہ نہ معلوم۔ اس دن کیا گت بنتی۔

بچہ سقاؤ کا باپ :- (فوراً متوجہ ہو کر)۔ چرا او فرزندم چہ فریاد مے کنی! یعنی کیوں او بیٹا کیا فریاد ہے ؟

میں نے اس کو ایک مخصوص اور موثر طریق پر اپنا قصہ سمجھایا۔ جس کو سُن کر وہ تھوڑی دیر تک سر ہلا کر خاموش ہو رہا۔ اور پھر جب وہ اور باتوں کی طرف متوجہ ہوا۔ تو میں وہاں پر نہیں تھا۔

یہی حضرت ایک دن ضراب خانہ (سکہ گھر۔ Mint House) بھی جا پہنچے وہاں کا انچارج عزیز اللہ خان ایک ہندوستانی انجنیئر تھا۔ دستور ملک کے مطابق جس قدر

روپے روزانہ ڈھلا کرتے تھے۔ فیصد ایک روپیہ کے حساب سے باہر ایک آہنی صندوق میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اور یہ صندوق بھرنے تک وہیں ضراب خانہ ہی میں پڑا رہتا تھا۔ انہوں نے جب اس صندوق کو دیکھا۔ تو چلا اٹھے۔ کہ اب چور پکڑ لئے اور لپک کر ایک دھپڑ عزیز اللہ خان کے رسید کیا۔ ایک دھپڑ ہی پر خیر گذری۔ وگرنہ ان چوروں سے جو کچھ نہ بن آتا۔ تھوڑا تھا۔

(۲) ملک کے مختلف صوبوں سے حکومت سقاوی کو تسلیم کروانیکی مہمات

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے۔ کہ کابل اور اس کے اردگرد چند میلوں کے سوا بچہ سقاؤ کی حکومت کہیں بھی موجود نہ تھی۔ لہٰذا سقاوی حکومت کے تسلیم کروانے کے لئے ہر طرف نامہ و پیام و وفود بھیجنے کی مہمات شروع کی گئیں۔

اوپر کہا جا چکا ہے۔ کہ سید حسین بچہ سقاؤ کے لئے ایک خطرہ تھا۔ اور لوگ اس بات کے متوقع و منتظر تھے۔ کہ دیکھیں کب یہ مواد آتشین آپس میں رگڑ کھا کر شعلوں کی صورت میں پھوٹ پڑے۔ سید حسین کو نہ تو حمید اللہ برادر بچہ سقاؤ ہی ایک آنکھ بھاتا تھا۔ اور نہ ہی والی ملک محسن کو وہ زندہ دیکھنا پسند کرتا تھا۔ علےٰ ہذا القیاس یہ دونوں بھی دل میں اس کے سخت دشمن تھے۔ اب ہر ایک کو یہ گمان تھا۔ کہ سلطنت میں اس کا برابر کا حصہ ہے۔ اور اسی زعم و گمان کی بنا پر ہر ایک کی بارگاہ سے متضاد احکام صادر ہوتے تھے۔ جو ایک دوسرے کے جذبات پر مزید تیل ڈالنے کا کام کرتے تھے۔ سید حسین نے دیکھا کہ وہ وزیر جنگ رہ کر بھی بچہ سقاؤ کے ہر طرح کے دباؤ کے نیچے رہیگا۔ اور اگر وہ کچھ حرکت بھی کرنا چاہے گا۔ تو چونکہ لوگ بچہ سقاؤ ہی کی طرف زیادہ رجوع ہیں۔ اور نیز حمید اللہ و ملک محسن شیر دل اور محمد غیاث جیسے بچہ سقاؤ کے حامی موجود ہیں۔ اس لئے شاید اس کا کھیل کابل میں بیٹھ کر رنگ

نہ لا سکے۔ پس یہ خیال کر کے اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ کہ وہ ترکستان قطغن و بدخشان کی طرف جا کر ان علاقوں کو سلطنت سقاوی کے ساتھ ملحق کرے گا۔ بچہ سقاؤ نے بھی یہ خیال کر کے کہ چلو فی الحال تو بلا سر سے ٹل رہی ہے۔ سید حسین سے اتفاق کیا۔ لہٰذا سید حسین اپنا لاؤ لشکر و ساز و سامان درست کر کے ان دور دست علاقوں کو تصرف میں لانے کے لیئے روانہ ہو گیا۔

کابل سے ترکستان کو دو راستے جاتے تھے۔ ایک بامیان و ہزارہ جات کے درمیان سے اور دوسرا گل بہار پنج شیر کی طرف سے مگر چونکہ ہزارہ جات کے لوگ بچہ سقاؤ کے دشمن تھے۔ اور ان کی طرف سے بہت اندیشہ تھا۔ کہ کہیں راہ ہی میں سید حسین کے سارے لشکر کو تباہ و برباد نہ کر دیں۔ اس لیئے سید حسین نے یہ دوسری راہ اختیار کی تھی۔ سید حسین اپنے لاؤ لشکر سمیت منزل بہ منزل قیام کرتا لوگوں کے مال و منال تاراج کرتا اپنے حاکم مقرر کرتا اور خوبصورت لڑکیوں سے نکاح پڑھوا تا۔ بغیر کسی مزاحمت یا مٹھ بھیڑ کے ترکستان کی حدود میں داخل ہو گیا۔

اس کے اس طرف جانے سے بچہ سقاؤ کو قدرے تسلی تھی۔ کہ اگر ترکستان پر سید حسین کا قبضہ ہو گیا۔ تو وہ ادھر سے ہرات کی طرف بھی بڑھے گا۔ اور امان اللہ خان اگر قندہار میں براجمان رہا۔ تو سید حسین ہرات کی طرف سے اور یہ خود غزنی کے راستہ سے قندہار پر حملہ کر کے اس کی طاقت کو پاش پاش کر دینگے۔

قندہار میں چونکہ غازی امان اللہ خان خود موجود تھا۔ اس لیئے اس طرف بچہ سقاؤ کا کوئی وفد نہیں گیا۔ ہاں ویسے اس کے حق میں پروپیگنڈا کرنے والے ہر جگہ خود بخود پیدا ہو چکے تھے۔ جو سادہ لوگوں میں اس کے مرتبہ کو ولی اللہ کے مرتبہ پر پہونچا کر اس کی بیعت کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ تاہم ابھی ان لوگوں کی تعداد بہ کثرت تھی۔ جو بچہ سقاؤ کی کامیابی کے باوجود اسے ابھی تک چور ہی سمجھ رہے تھے۔ غزنی اور کابل کا درمیانی علاقہ جس میں

وردک قوم آباد ہے۔ آخر دم تک بچہ سقاؤ سے لڑتا رہا۔ مگر شروع میں تھوڑی سی فوج جو بچہ سقاؤ نے غزنی کی طرف بھیجی تھی۔ غزنی تک پہونچنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اور چونکہ غزنی کے باشندے اپنے حاکموں کی رشوت ستانی سے بیحد تنگ آئے ہوئے تھے۔ اس لئے غزنی کا شہر بلا کسی مزاحمت کے اس تھوڑی سی فوج کے قبضہ میں آچکا تھا۔ مگر اس کے بعد وردک کا علاقہ بچہ سقاؤ کے برخلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جس سے کابل اور غزنی کا سلسلہ آپس میں منقطع ہو چکا تھا۔ لیکن وہ تھوڑی سی فوج جو غزنی میں تھی۔ تعداد میں چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اور غازی امان اللہ خان کے حملہ غزنی تک وردکوں کے ہاتھوں سے محض اس لئے بچی رہی۔ کہ ایک تو غزنی کے لوگ وردکوں سے زیادہ خوش نہ تھے۔ دوسرے سلیمان خیل قبائل کے لوگ جو غزنی کے آس پاس کے علاقوں میں آباد تھے۔ بچہ سقاؤ کی فوج کے ساتھ دوستانہ رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ اسی طرح غزنی اور مقر کا درمیانی علاقہ بھی امان اللہ خان سے خوش نہ تھا۔ تاہم جب تک وردک اور قندھار فتح ہو کر بچہ سقاؤ کی حکومت کو تسلیم نہ کر لیتے۔ سمت مغربی پر بچہ سقاؤ کا تسلط قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

ہرات کی طرف سقاوی حکومت فی الحال کابل سے کسی قسم کا اقدام نہیں کر سکتی تھی۔ راستہ میں قندھار تھا۔ جہاں غازی امان اللہ خان لشکر جمع کر رہا تھا۔ اور ہرات پر بھی اسی کا قبضہ تھا۔ بچہ سقاؤ کی امید سید حسین پر تھی۔ جو اب ترکستان کی طرف جا چکا تھا۔ مزار شریف پر سید حسین کا قبضہ ہونے کے بعد ادھر سے ہرات پر تسلط جمانے کا اقدام ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے نہیں۔

قطغن و بدخشان کے علاقوں میں امان اللہ خان کی فراری اور بچہ سقاؤ کے تسلط کابل کی جب خبریں پہونچی ہیں تو وہاں کچھ لوگ سید حسین کی آمد آمد کی خبر سنکر خود بخود ہی اپنے حاکموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان کو مار کر بھگا دیا۔

اور پھر ان چند اشخاص نے لوگوں کو جمع کرکے بچہ سقاؤ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا محضر تیار کیا۔ اس محضر کی تیاری میں عبداللطیف اور محمد نعیم مہاجرین کوہاٹ نے جو امان اللہ خان کے حکم سے اس طرف فرار ہوئے ہوئے تھے۔ خوب کام کیا۔ یہی عبداللطیف مہاجر تھا جس نے آکر ہماری جانیں بچہ سقاؤ کے ہاتھ سے بچائی تھیں۔ اور یہی موجودہ اعلیحضرت کے عہد میں ہلاک کردیا گیا۔

ہزارہ جات کی طرف جو آدمی بچہ سقاؤ کی طرف بیعت لینے پر مامور ہوکر بھیجے گئے۔ ان کو ہزاروں نے لوٹ لیا۔ اور چند ایک کو پھانسیاں بھی دے دیں۔ وردکیوں کے ساتھ ملکر ہزارے بچہ سقاؤ سے آخر تک لڑتے رہے۔ اور اطاعت پر راضی نہ ہوئے عبدالکریم خان جو قندھار کا گورنر رہ چکا تھا۔ اور ایک امانی خاندان کا شہزادہ ہزارہ جات کو غازی امان اللہ خان کی امداد پر اکسانے کے لئے وہاں جا چکا ہوا تھا۔ مگر جب غازی امان اللہ خان خود ہی قندھار سے چلا گیا۔ تو یہ بے سری کی حالت میں مزید کچھ نہ کر سکے۔ اور موجودہ اعلیحضرت محمد نادر خان کے حملۂ کابل سے کچھ ہی دیر پہلے شہزادہ تو ہندوستان کی طرف چلا گیا۔ اور عبدالکریم قاضی القضاۃ کا لڑکا اپنی جان بچانے کے لئے ہزاروں کے چند قبیلوں کی بیعت لے کر کابل میں بچہ سقاؤ کی خدمت میں پہونچ گیا۔

لیکن افغانستان میں بادشاہی اقتدار قائم کرنے کے لئے سب سے ضروری مقامات جن پر متسلط ہونا ایسے اقتدار کی محکمی اور پائداری کی ایک بدیہی نشانی تھی۔ سمت جنوبی اور سمت مشرقی کے علاقہ جات تھے۔ اور اگرچہ سمت مشرقی غازی امان اللہ خان سے باغی ہو چکی تھی۔ تاہم بچہ سقاؤ کے لئے یہ بے حد مشکل امر تھا۔ کہ ان سے بیعت کے معاملہ میں کوئی سختی برت سکے۔ بغاوت شنوار کا سرغنہ محمد عالم شنواری بچہ سقاؤ کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا۔ اور خوگیانی خوانین کا وہ طائفہ

بھی جو سردار علی احمد جان کی تباہی کا باعث ہوا تھا۔ کابل میں آ چکا تھا ۔ بچہ سقاؤ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی تھی۔ بچہ سقاؤ کو جو انہوں نے صلاح و مشورہ دیا۔ یہ تھا۔ کہ سمت مشرقی پر بجائے فوج کشی کرنے کے خود ان کو ہر طرح کی مدد دی جائے۔ تاکہ وہ اپنے مدعیوں اور مخالفوں میں روپیہ کے ذریعہ سے تفرقہ ڈال کر عام لوگوں کو اس کی بیعت پر آمادہ کریں۔ کیونکہ ان کی رائے تھی ۔ اور یہ رائے اس وقت صحیح بھی معلوم ہوتی تھی۔ کہ اگر فوج بھیجی گئی۔ تو خوگیانی اور مہمند سختی سے اس کی مزاحمت کرینگے۔ اور سمت مشرقی میں برسوں تک امن قائم نہیں ہوسکیگا۔ اور اگرچہ ان کے اس مشورے میں ان کی اپنی غرض و غایت مستور تھی۔ یعنی یہ کہ جسقدر بچہ سقاؤ سے طاقت مل سکے۔ اس کو حاصل کرکے شاید خود ہی سمت مشرقی کو اپنے زیر نگین کرلیں ۔ تاہم چونکہ بچہ سقاؤ کے لئے اور کوئی راہ مفر نہ تھی۔ اس لئے بہت مدت تک اسی رائے و مشورہ پر عمل ہوتا رہا۔ اور خوگیانی اور شنواریوں کے سردار بہت پھلے پھولے +

اس اثنا میں محمد نادر خان سپہ سالار اپنے بھائیوں سمیت حدود افغانی میں داخل ہو چکا تھا۔ اور اس نے اپنے بھائی سردار محمد ہاشم خان کو سمت مشرقی کی طرف بھیج دیا تھا۔ تاکہ وہاں لوگوں کو فراہم کرکے کابل پر فوج کشی کی کوئی صورت نکالے۔ لہٰذا اس خوف سے بھی بچہ سقاؤ اور اس کے ہوا خواہ اس سمت کی آفت کو ابھی سے اپنے سر بلانا نہیں چاہتے تھے۔ جب تک کہ وہ قندھار کی امانی مہم سے نپٹ نہ لیں +

سمت جنوبی کی طرف جیسا کہ آگے ذکر ہو چکا ہے۔ شاہ محمود خان برادر سپہ سالار محمد نادر خان کو ان اطراف سے قبائل کی بیعت لینے پر مامور کرکے بھیجا گیا تھا جو وہاں جاکر اپنے معظم بھائی کے انتظار میں بیٹھ رہا۔ اور جب وہ پہونچا۔ تو اس سے جا ملا۔ مگر لوگر کے احمد زائی جو غیاث الدین کی قوم سے تھے۔ اپنے خوانین و ملکوں کو بچہ سقاؤ کی خدمت میں اظہار اطاعت کے لئے بھیج چکے تھے۔ اور سقاوی فوجیں بڑھ کر لوگر پر

قابض بھی ہو گئی تھیں۔ غیاث الدین خان کے پاس بھی بچہ سقاؤ کے پیغام پہونچے۔ مگر چونکہ اس کو خود کچھ سوجھی ہوئی تھی۔ وہ خود تو کابل میں نہ آیا۔ یوں ویسے اس نے اپنی طرف سے اطمینان دلایا۔ اور مزید کمک مانگی۔ تاکہ اپنی طاقت کو مزید تقویت پہونچا کر سمت جنوبی میں اپنی بادشاہی کا اعلان رچائے ۔

اتفاق سے محمد صدیق خان۔ شیر جان وزیر دربار سقوی کا بھائی گردیز کے قلعہ کا حاکم تھا۔ اور جب اس کے بھائی نے اس کو کہا۔ تو تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد وہ بچہ سقاؤ کا اطاعت گذار بن کر اسی کی طرف سے وہاں کام کرنے لگ گیا۔ گویا محمد نادر خاں سپہ سالار کے پہونچنے پر بچہ سقاؤ کا گردیز تک قبضہ ہو چکا تھا۔ گردیز سے آگے خوست تک اور پھر جاجیوں کے علاقہ میں اور ادھر غزنی کی سمت میں جو افغان قبائل آباد تھے۔ وہ بچہ سقاؤ کی متابعت کرنے کے لئے تیار نہ تھے ۔

اس ساری وضعیت کو ناظرین کے پیش نظر کر کے اب ہم بچہ سقاؤ کی جنگی مہمات کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۔

(۳) سقاوی حکومت کی جنگیں

سید حسین کوہستان کے علاقہ سے دس ہزار کی نفری بھرتی کر کے اور ان کو ہر طرح کے سازوسامان سے مسلح کر کے درہ پنج شیر کے راستہ سے ترکستان کی طرف جا چکا تھا۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس راہ کی آبادی جنگجو نہ تھی۔ اس لئے اس کو ترکستان تک پہونچنے میں کچھ مشکل پیش نہ آئی۔ صرف قطغن کے علاقہ کے چند باغیوں نے کچھ نفری جمع کر کے مقابلہ کی ٹھانی۔ مگر جلدی ہی سقاویوں نے ان کو مغلوب کر لیا۔ اور پھر جرنیل غلام نبی کے روس سے آدھمکنے تک کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔ جسے ہم ابھی غازی امان اللہ خان کی مہم قندہار کے سلسلہ میں بیان کرینگے ۔

ملک میں جو واقعات پیش آرہے تھے۔ ان سے سقاوی وزارت حربیہ جواب حمید اللہ کی سرپرستی میں کام کر رہی تھی۔ قطعیاً غافل نہ تھی۔ بلکہ بڑے جوش و خروش اور سرگرمی و انہماک سے کوہدامن اور کوہستان سے رنگروٹ بھرتی کر رہی تھی۔ ان علاقوں کے باشندے یہ خیال کرکے کہ اب اگر امان اللہ خان پھر واپس آگیا۔ تو ان کی مطلق خیر نہیں۔ تن من دھن سے بچہ سقاؤ کی امداد کر رہے تھے۔ اور کیوں نہ کرتے جب وہ اب ایک شاہی قوم کہلانے لگ پڑے تھے۔ بچہ سقاؤ نے اپنے خاص علاقے میں سے تین ہزار آدمیوں کو شاہی فوج میں بھرتی کرلیا تھا۔ جن کی تنخواہیں وغیرہ بمقابلہ دیگر سپاہیوں کے بہت زیادہ تھیں۔ عام سپاہیوں کی تنخواہیں بھی جو سب کے سب سمت شمالی ہی سے لئے گئے تھے۔ امان اللہ خان کی سپاہ سے ہر حال میں زیادہ تھیں۔ غازی امان اللہ خان کی فوج کے بددل ہونے کا ایک یہ بھی راز تھا۔ کہ اس نے اپنے آخری سالوں میں متمدن ممالک کی نقل کرتے ہوئے سپاہیوں کی خوراک کا بندوبست سرکاری طور پر کر رکھا تھا۔ مبلغ دس روپیہ خوراک کے ضمن میں کاٹ لئے جاتے تھے اور صرف مبلغ چار روپیہ ان کو نقد ملا کرتے تھے۔ اس پر بھی ان کو کبھی پورا راشن نہیں ملتا تھا اور ان کے افسر نصف سے زیادہ خود کھا جاتے تھے۔ کئی دفعہ شکایات موجود ہو چکی تھیں مگر اس طرف اصلاح کرنے اور سپاہیوں کو خوش رکھنے کے مسئلہ سے ہمیشہ بے پروائی برتی گئی تھی۔ بچہ سقاؤ کم از کم ان باتوں کو خوب جانتا تھا۔ کہ وہ کس طرح اپنے سپاہیوں کا دل گرم کرکے ان سے کام لے سکتا ہے۔ قطاع الطریقی کے زمانہ میں اس نے اس علم میں خاص مہارت اور تجربہ پیدا کرلیا تھا۔ اور وہی اب اس کے کام آرہا تھا۔ کوہستانی اور کوہدامنی اب ایک تو غیرت قوم و ناموس کے لئے اور دوسرے بچہ سقاؤ کی جانفشانانہ توجہ کے صدقے میں اکثر یہ کہہ کر اس سے وداع ہوتے تھے۔ کہ یا تو تو سنیگا۔ کہ ہم فتحیاب ہو رہے ہیں۔ اور یا پھر ہم اپنے بدن کی بوٹی بوٹی تجھ پر نثار کر دینگے۔ کیا مجال ہے۔ کہ میدان محاربہ میں انہیں کسی قسم کی ضرورت در پیش آئے۔

اور وہ انہیں وہاں میسر نہ ہو۔ بچہ سقاؤ نے محاربہ اول کابل میں لڑنے والوں کے لئے نہایت بھنے ہوئے مرغ خطہ آتش میں پہونچائے تھے۔ اور ادھر امان اللہ خان کی فوجوں کے لئے نانِ خشک کا وزارتِ حربیہ انتظام نہ کر سکی تھی۔ اور اب جبکہ اس کو حکومت میسر آچکی تھی۔ قارئین خود اندازہ لگالیں۔ کہ اس نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ انہی لڑنے والوں پر تو اس کی بادشاہی کا سارا دار و مدار تھا۔ اس لئے وہ پیش افتادہ مہم کے لئے تیس ہزار کے لشکر جرار کا انتظام کر رہا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ سلیمان خیلوں سے امان اللہ خان کے مقابلہ میں امداد حاصل کرنے کے لئے ان کو کھلے دل سے روپیہ بھیج رہا تھا۔ تاکہ قندہار کی حوالی تک غازی امان اللہ خان کے برخلاف ایک دنیائے آتش موجود ہوجائے ؛

غرضکہ جو فوج تیار ہو رہی تھی۔ غزنی کی طرف بھیجی جا رہی تھی۔ کچھ وردک کے راستہ سے اور کچھ سمت جنوبی کی راہ سے۔ اگر غزنی اور کابل کے درمیان راستہ کو وردکوں نے مسدود نہ کر دیا ہوتا تو نہ معلوم غازی امان اللہ خان کو سقاویوں نے قلات سے بھی پرے جا دبوچا ہوتا۔ مگر وردکیوں کی جنگ نے بچہ سقاؤ کا بہت سا وقت اور ایک خاصی تعداد فوج کی ضائع کر دی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ غازی امان اللہ خان کو کافی وقت تیاریوں کے لئے مل گیا ؛

موسم سرما ابھی اچھی طرح تمام نہیں ہونے پایا تھا۔ کہ بچہ سقاؤ کی ایک فوج وردک کے راستہ سے غزنی تک پہونچنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اور ان چند سقاویوں سے جا ملی تھی۔ جو پہلے شروع ہی میں وہاں پہونچ چکے تھے۔ گویا سقاویوں کا کم و بیش غزنی و کابل کی سڑک پر قبضہ ہو چکا تھا۔ تاہم بچہ سقاؤ کی فوج اپنی پیش افتادہ مہم کے خوف سے وردک کے اندرونی حصہ میں داخل ہو کر لوگوں کو اپنا مطیع و منقاد

بنانے کی طرف متوجہ نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے وردک اب بھی سقاویوں کے راستہ میں بڑا بھاری خطرہ تھے۔ اور اپنے بے قاعدہ حملوں سے سقاویوں کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔

یہ وضعیت تھی۔ جبکہ غازی امان اللہ خان قندہار سے لشکر لئے ہوئے غزنی پہونچا تھا۔

اب ہم ذرا غازی امان اللہ خان کی ان سرگرمیوں کا حال بیان کرتے ہیں جو اس نے قندہار پہونچکر شروع کر رکھی تھیں۔ جب وہ راستہ کی مشکلات کو طے و عبور کرکے قندہار پہونچا ہے۔ تو قندہاریوں کو بے حد تعجب اور اچنبھا ہوا۔ قلعۂ قندہار کے محافظین نے چاہا۔ کہ بیرق شاہی بلند کر دی جائے۔ لیکن غازی امان اللہ خان نے اشارۃً ان کو منع کر دیا۔ اور خوانین و معتبرین کی مجلس بلا کر اپنے تخت سے مستعفی ہونے اور عنایت اللہ خان کے بادشاہ بننے کا ماجرا ان سے بیان کیا۔ لیکن ابھی تیسرا دن بھی گذرنے نہ پایا تھا۔۔۔۔۔ کہ اس کے بھی کابل سے فرار ہونے کی خبر کوئٹہ چمن سے پہونچ گئی۔ جس پر سردار عنایت اللہ خان کے قندہار پہونچتے ہی پہونچتے غازی امان اللہ خان نے پھر علم شاہی بلند کر لیا۔ یہ اس کو کسی طرح واجب نہ تھا۔ یہ ایک بڑی سیاسی غلطی تھی۔ جس کا اس نے اس طرح ارتکاب کیا۔

دول خارجہ نے بھی اس دوبارہ اعلان شاہی کو تسلیم نہ کیا۔ اور غالباً ان سب حکومتوں نے امان اللہ خان کی تلوّن مزاجی اور عدم استقلال پر اس کو محمول کیا۔

بہرکیف ان امور کی پرواہ نہ کرتے ہوئے غازی امان اللہ خان نے اپنے چند خاص معتمدین کا وفد تیار کرکے روسیوں کے پاس بھیجا۔ تاکہ اس آڑے وقت پر وہ اس کی مدد کریں۔ اور ادھر قندہاریوں سے بھرتی طلب کی۔ پہلے تو قندہاری ٹال مٹول کرتے رہے۔ کیونکہ ان کو سخت غصہ تھا۔ کہ یہ کابل کو چھوڑ کر کیوں چلا آیا ہے۔

لیکن بعد میں جب غازی امان اللہ خان روٹھ کر ہرات کی طرف جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ تو قندھاریوں نے غیرت میں آکر اس کی امداد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کو ہرات جانے کے ارادے سے باز رکھا۔ مگر وائے قسمت! کہ یہاں بھی اس نے سردار عبدالعزیز خان کو ہی اپنا وزیر جنگ مقرر کیا جس کی بدانتظامی اور رشوت خوری کے سبب اس کو پایہ تخت سے اس ذلت سے نکلنا پڑا تھا۔

کچھ فوج اور سامانِ حرب ہرات سے منگوایا گیا۔ کچھ اسلحہ یوروپ سے آگے ہی پہونچا ہوا تھا۔ بیس پچیس ہزار کے درمیان قندھار کے اطراف واکناف سے رضاکار جمع کئے گئے۔ اس طرح کل تیس ہزار فوج کی معیت میں غازی امان اللہ خان سرِ لشکر بن کر قندھار سے اپنا کھویا ہوا تخت پھر حاصل کرنے کے لئے کابل کی طرف روانہ ہوا۔ قلات اور مقر کے درمیان قبائل سے اس کو کچھ خطرہ لاحق تھا۔ لیکن قدرے مزاحمت کے بعد وہ مع الخیر غزنی کے نزدیک پہونچنے میں کامیاب ہو گیا یہاں سقاوی طاقت اس قدر زیادہ نہ تھی۔ کہ غزنی سے باہر آکر مقابلہ کرتی چنانچہ سقاوی قلعہ بند ہو گئے۔ اور قریب تھا۔ کہ غزنی فتح ہو جاتا۔ اگر عین وقت پر سلیمان خیلوں کا لشکر ایک غیبی امداد کی طرح سقاویوں کی طرف سے امانیہ فوجوں سے مقاتلہ ومجادلہ کرنے کے لئے آ نمودار نہ ہوتا۔ اس لشکر نے آن کر ایک گھمسان کے معرکہ کے بعد امانی فوجوں کے قدم پیچھے ہٹا دئیے۔ اب غازی امان اللہ خان بیدل ہو چکا تھا۔ سُنا گیا ہے۔ کہ اس وقت بہتیرا اس کو سمجھایا گیا۔ کہ وہ پیادہ فوج کے ایک حصہ کے ساتھ غزنی کو اسی حال میں چھوڑ کر ایک چکردار پہاڑی راستہ سے وردک کے علاقہ میں داخل ہو جائے۔ جہاں کے لوگ ابھی تک اس کی واپسی کے لئے چشم براہ تھے۔ اور برابر سقاویوں سے جنگ کر رہے تھے۔ مگر افسوس جان کا خوف غازی امان اللہ خان پر اس درجہ غالب آچکا ہوا تھا۔ کہ اس نے اس نہایت

ہی بیش قیمت مشورہ کو قبول نہ کرتے ہوئے فوجوں کو مقر کی طرف ہٹ جانے کا حکم دے دیا۔ اگر اس تجویز پر عمل کیا جاتا۔ تو کامیابی ننوٗ فی صدی یقینی تھی۔ کیونکہ پھر سلیمان خیلوں کی ہمت نہ پڑتی۔ کہ وہ وردکیوں سے قبائلی جنگ مول لیتے اور اگر ایسا ہو بھی جاتا۔ تو وردک اپنی گنجان آبادی سے اس کی تابِ مقاومت لا سکتے۔ اس سے پہلے موقع پر بھی یہ وردکی ہی تھے۔ جس نے منگلوں جدرانوں وغیرہ کی بغاوت کے دوران میں غزنی کو محاصرہ سے نجات دلوائی تھی۔ اور ان کو اپنے علاقوں میں گھس کر فساد نہیں مچانے دیا تھا۔ وردک کے علاقہ کے ساتھ مقام ارغندی تک جو کابل سے بمشکل دس میل کی مسافت پر ہوگا۔ میدان کا علاقہ واقع تھا۔ جس علاقہ میں سقاویوں کے مظالم انتہا تک پہونچے ہوئے تھے۔ حتٰے کہ لوگوں کے پاس ان کی معمولی زیست کا ساز و سامان بھی نہیں چھوڑا گیا تھا۔ یہ علاقہ سارے کا سارا غازی امان اللہ خان کے وجود سے تقویت پا کر اٹھ کھڑا ہوتا اور وہ آن کی آن میں پغمان اور کابل میں آگھستا۔ پھر نہ تو سلیمان خیلوں کی کمک ہی سقاویوں کے کچھ کام آسکتی۔ اور نہ ہی شاید وہ مزید مقابلہ کی جرأت ہی کرتے۔

غازی امان اللہ خان مقر پہونچ کر بھی نہ ٹھیر سکا۔ کیونکہ اس واپسی نے اس کی شکست کی خبر کو چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ اور اب سلیمان خیل دلیر ہو کر مقر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور سقاوی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ لہٰذا امان اللہ خان قلات کی طرف ہٹ گیا۔ اور وہاں سب کو اسی حال میں چھوڑ کر خفیہ خفیہ انتظام کر کے اپنے اہل و عیال سمیت چمن میں جا نکلا۔

جب اس کے سرحد عبور کر جانے کی خبر قندہاری فوج کو ملی تو وہ نہایت بددل اور شکستہ خاطر ہو کر اس کو برا بھلا کہتی قندہار کو واپس بھاگ آئی۔ اب قندہار کے

معتبرین اور عمائدین صورت حالات پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ سردار علی احمد جان بھی سمت مشرقی سے شکست کھا کر یہیں پہونچا ہوا تھا۔ اور غازی امان اللہ خان نے اس کو ارکِ قندہار کے ایک برج میں نظر بند کر رکھا ہوا تھا۔ یہ بھی اس کونسل میں شریک تھا۔ لوگوں نے سردار عبد العزیز خان کو بادشاہ بننے کے لئے کہا۔ مگر اس نے اس بوجھ کے اٹھانے سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ پھر لوگوں میں سے کسی نے سردار علی احمد جان کا نام تجویز کیا۔ ابھی کسی دوسرے نے تائید بھی نہ کی تھی۔ کہ یہ جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا۔ کہ میں بالکل تیار ہوں۔ چنانچہ لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور اسے دوبارہ اپنی بادشاہی کے اعلان کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

جو کچھ بھی ہو۔ یہ امان اللہ خان کی طرح سے شکست کھا کر بھاگا نہیں۔ بلکہ ہمت و جوانمردی سے قندہار کے سقوط تک برابر ڈٹا رہا۔ یہاں تک کہ جب سقاویوں نے چاروں طرف سے آ کر قندہار کو محاصرہ میں لے رکھا تھا۔ تو یہ ہر ایک مورچہ میں جاتا۔ اور لڑنے والی سپاہ کی ہمت بڑھاتا رہا۔ حتےٰ کہ جب قندہار کے ایک گروہ نے سقاویوں کے ساتھ ساز باز کر کے شہر کا ایک دروازہ ان کے اندر آ گھسنے کے لئے کھول دیا۔ تو یہ اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ خبر کے سنتے ہی آ پہونچا۔ اور بنفس نفیس سقاویوں سے جنگ میں مشغول ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک گولی اس کے گھوڑے کو آ کر لگی۔ اور وہ اپنے بہادر سوار سمیت زمین پر آ رہا۔ اس وقت وہ بے بس تھا۔ مگر پھر بھی مزید نفری جمع کر کے سقاویوں سے لڑنے کے خیال سے وہ ایک گھر میں پناہ لینے کے لئے گھس گیا۔ جہاں سے سقاویوں نے ایک دن بعد اس کو گرفتار کر کے نکالا۔ اور بڑی بے حرمتی سے کابل کی طرف بھیج دیا۔

قارئین کتاب کے شروع ہی میں پڑھ چکے ہیں۔ کہ اس بہادر سردار کو بچہ سقاؤ نے کس طرح کابل کے بازاروں میں ذلیل و رسوا کر کے چند دنوں اپنی قید میں رکھا۔ یہ ارک کی

جس کوٹھڑی میں مقید تھا۔ وہاں اسے کئی دنوں تک نہ تو اوڑھنے کے لئے کوئی کمبل ہی دیا گیا۔ اور نہ ہی نیچے بچھانے کے لئے کوئی اور چیز ہی مہیا کی گئی۔ مگر واہ رے جذبہ بسالت کہ اس حالت میں بھی یہ ایک ملکوتی صفت انسان کی طرح اپنے آپ میں ثابت و قائم رہا۔ اور جب دو تین دنوں بعد ایک سقاوی افسر اس کو زندان خانہ میں دیکھنے کے لئے آیا تو باوجود شقاوت قلبی کے وہ اندر کا منظر دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے دیکھا کہ سردار کوٹھڑی کے نمدار فرش پر چت لیٹا ہوا ہے۔ اور اس کے سر کے نیچے جو کبھی گدگدانے والے پروں کے تکیوں کا عادی تھا۔ صرف ایک کچی اینٹ دھری ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ سردی نے اس کے بند بند اور عضو عضو میں اینٹھن پیدا کر رکھی ہے یہ دیکھ کر اس افسر کا جی بھر آیا۔ اور اس نے رقت بھری آواز سے پوچھا۔ کہ اگر وہ "خادم دین" کی خدمت میں کچھ پیغام بھیجنا چاہتا ہے۔ تو وہ اس کی وساطت کو بخوشی استعمال کر سکتا ہے۔ یہ سنکر سردار نے مسکرا دیا۔ اور جواب میں کہا۔ کہ ہاں! اس سے جا کر کہہ دو۔ کہ اگر میں کسی گبرو کافر کا قیدی بنتا۔ تو مجھ سے وہ بھی اس قسم کا بہیمانہ سلوک روا نہ رکھتا۔ مگر تم دین کے خدمتگذاروں سے جو کچھ بھی ہو سکے تھوڑا ہے۔ اس پر بچہ سقاؤ نے اجازت دے دی۔ کہ وہ اپنی ضروریات و استعمال کی چیزیں گھر سے منگوا لے۔ مگر اس کے چند ہی دنوں بعد اسے توپ سے اڑا دیا گیا۔ جس کا قصہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اس طرح قندھار کی مہم کا بچہ سقاؤ کی فتح و کامیابی کی صورت میں فیصلہ ہوا۔ اور ہرات بے لڑے بھڑے ہی اس کے ہاتھ آ گیا۔ مگر ترکستان میں سید حسین کو جرنیل غلام نبی خان سے مقابلہ پڑ گیا۔ جو سرحد پار روس سے مزار شریف میں آ نکلا تھا۔ اس نے تھوڑی بھرتی سے لوگوں کو جمع کر کے ایک فوج بھرتی کر لی۔ اور سید حسین کو شکستوں پر شکستیں دیتا ہوا ترکستان کی حوالی سے خارج کر دیا۔ اس کے پاس چند ہوائی جہاز بھی تھے۔ اور ایسا یہ

روسیوں سے خریدے گئے تھے۔ اور میں تحقیق نہیں کہہ سکتا۔ مگر غالب خیال یہ ہے۔ کہ اس کے چلانے والے بھی روسی ہوا باز ہی ہوں گے۔ کیا جرنیل غلام نبی خان کو روس کی طرف سے امداد ملی تھی۔ اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ جو امداد روسی حکومت نے ہوائی جہازوں کے بارے میں کی تھی۔ وہ غالباً یہ تھی۔ کہ امانیہ حکومت نے چند ہوائی جہاز روسی حکومت سے خریدے تھے۔ اور چونکہ ان کی قیمت ادا ہو چکی تھی۔ اور وہ سفیر کبیر جرنیل غلام نبی خان کو سونپے جا چکے تھے۔ اس لئے وہ ان کی روانگی بطرف افغانستان نہیں روک سکتی تھی۔ شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن اگر یہ سچ ہے۔ کہ دول عالم اپنے اپنے دوستوں کی غیر علانی اور خفیہ امداد کرتی رہتی ہیں۔ تو میں کہوں گا۔ کہ جرنیل غلام نبی خان کا ورود ترکستان بھی اسی قبیل سے تھا۔ اور قرائن بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

غرضکہ جرنیل غلام نبی خان سید حسین کو پیچھے دھکیلتا ہوا بامیاں کے گرد و نواح تک لے آیا تھا۔ اور اگر غازی امان اللہ خان غزنی سے شکست کھا کر افغانستان سے نہ چلا جاتا۔ تو غالب یقین تھا۔ کہ وہ کامیاب ہو جاتا۔ مگر ادھر امان اللہ خان کا پردۂ منظر سے غائب ہونا تھا۔ کہ ادھر جرنیل غلام نبی خان بھی باوجود فاتح ہونے کے واپس چلا گیا۔ اور سید حسین کی فوج نے بڑھ کر ترکستان کو پھر زیر نگین کر لیا۔

اب گویا سمت مشرقی و جنوبی و سمت ہزارہ جات کے سوا تقریباً سارے افغانستان پر بچہ سقاؤ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مگر ان سارے مفتوحہ علاقوں میں وہ بغیر مستقل فوج رکھے اپنی حکومت قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان تمام جنگوں میں اس کی پندرہ بیس ہزار فوج تلف ہو چکی تھی۔ اور تیس ہزار کا لشکر اس نے مزید تیار کر کے قندہار۔ ہرات اور ترکستان کی طرف بطور کمک کے روانہ کیا تھا۔ جو بعد از فتح بھی وہی رکھنا پڑا تھا۔ سمت جنوبی میں بھی تین چار ہزار فوج موجود تھی۔ مگر یہ کافی نہ تھی۔ کیونکہ اگر اس نے سمت جنوبی پر اپنا تسلط قائم رکھنا تھا۔ تو سے اقلاً آٹھ دس ہزار فوج کی اور ضرورت تھی۔ کابل میں بھی اس کو کافی فوج رکھنی پڑی تھی

اور اس کی تعداد بھی پانچ چھ ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس طرح اندازہ لگایا جاتا ہے۔
کہ بچہ سقاؤ نے کم و بیش اسی نوے ہزار آدمیوں کو فوج کے لئے سمت شمالی سے بھرتی کیا
تھا۔ جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا۔ اور جن میں سے نصف سے زیادہ مقتول و مجروح ہوئے۔
اس میں قبائل کی وہ تعداد شامل نہیں ہے۔ جو بچہ سقاؤ کی طرفداری میں جنگ کر رہی تھی۔
اس سے قارئین ایک مجمل سا اندازہ لگا سکیں گے۔ کہ بغاوت شنوار سے لے کر بچہ سقاؤ کے
نیست و نابود ہونے تک افغانستان کے کس قدر نفوس کی بربادی ہوئی ہوگی۔

(۴) آخری مہم اور فتح کابل

بہرکیف شاطرِ ابن سقوی نے اس قدر کامیابی حاصل کرنے کے بعد اب اپنی توجہ سمت جنوبی کی طرف مبذول کی۔ جہاں غیرت و شجاعت کا مجسم پتلا محمد نادر خان سپہ سالار اپنی پوری بے سروسامانی کے ساتھ موجود تھا۔ پیشتر کہا جا چکا ہے۔ کہ اس کا ایک بھائی سردار محمد ہاشم خان سمت مشرقی میں موجود تھا۔ تاکہ اپنے معظم بھائی کی بروقت مدد کر سکے۔ خود محمد نادر خان اپنے تین بھائیوں اور چند ہندوستانی مہاجرین سمیت جنہوں نے اس خاندان کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ سمت جنوبی ہی میں رہا۔ خوست کی چھاؤنی میں کچھ اسلحہ و توپیں تھیں۔ جنہیں محمد نادر خان سپہ سالار قبائل کی رضامندی سے استعمال کر سکتا تھا۔ مگر یہاں ایک مشکل تھی۔ وہ یہ کہ بدقسمتی سے منگلوں کے دو گروہ ہو چکے تھے۔ جن میں سے ایک درپردہ بچہ سقاؤ کی حمایت کا خیال رکھتا تھا۔ مگر وہ گروہ جو سپہ سالار کے خاندان کو چاہتا تھا۔ تعداد اور قوت میں بیشتر تھا۔ اس لئے سقاوی پروپیگنڈا چنداں اثر نہیں کر سکا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ محمد نادر خان سیاسی اور جنگی نقطۂ نگاہ سے خوست میں اپنا ہیڈکوارٹر بنانے کی بجائے سمت جنوبی کے قلب میں قیام کرنا چاہتا تھا۔ فوجی نقطۂ نظر سے گردیز ایک اہم مقام تھا۔ مگر یہاں محمد صدیق خان فرقہ مشر کا قبضہ و دخل تھا۔ جو بچہ سقاؤ کا طرفدار بن چکا ہوا تھا۔

یہ محمد صدیق خان اپنے موجودہ عہدے اور مرتبے کے لئے سپہ سالار کے خاندان کے الطاف کا مرہون تھا۔ اور اس لئے محمد نادر خان کو امید تھی۔ کہ خط و کتابت و نامہ و پیام کے ذریعہ سے وہ اس کو اپنی طرف کر سکیگا۔ مگر مصیبت یہ تھی۔ کہ اس کا بھائی شیر جان بچہ سقاؤ کی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے کا بانی مبانی بن چکا تھا۔ اور اس طرح قدرتاً اس کا مطالبہ اس کے نزدیک زیادہ وزن و کشش رکھتا تھا*

محمد نادر خان جب سمت جنوبی میں پہونچا ہے۔ تو قندہار میں زور شور سے کابل کو از سر نو فتح کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اور عنقریب ہی غازی امان اللہ خان اپنا لاؤ لشکر لیکر نکلنے والا تھا۔ اس لئے جب تک محمد نادر خان صورت حالات سے کماحقہٗ واقف نہ ہو جاتا۔ اس کے لئے جلدی میں کوئی فیصلہ کرنا مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہ حالات کی رفتار کے بہاؤ کا رخ دریافت کرنے کی غرض سے اس وقت تک خاموش مشاہدہ میں مشغول رہا۔ جب تک غازی امان اللہ خان نے خود آپ اپنی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھوں سے نہ کر ڈالا*

ہندوستان میں اس امر کے متعلق بہت سی چہ میگوئیاں ہوئی ہیں۔ اور اب تک امانی اور نادری گروہ آپس میں بے فائدہ جنگ زرگری میں مشغول ہیں۔ کہ کیوں محمد نادر خان غازی امان اللہ خان کی خاطر نہیں لڑا۔ اور کیوں اس نے تخت افغانستان کو خود اپنے لئے منتخب و تجویز کیا۔ اس کے متعلق میں تفصیلی بحث اگلے باب میں چلکر کرونگا۔ یہاں گذرتے ہوئے میں قارئین پر ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ محمد نادر خان اگر امانی اقدام کے وقت خاموش بیٹھا رہا۔ تو اس میں اس کا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ کیونکہ نہ تو اس کے پاس دولت ہی تھی اور وہ نہ ایسے ذرائع و وسائل ہی رکھتا تھا۔ جن کی بنا پر وہ سمت جنوبی میں پہونچتے ہی کوئی بڑی فوج تشکیل کر سکتا۔ اور فوراً سمت جنوبی کی طرف سے کابل پر چڑھائی کر دیتا۔ وہ مدت کی جلاوطنی کے بعد ابھی سمت جنوبی کی

حدود میں داخل ہوا ہی تھا۔ اور وہ بھی خاص ایسے حالات میں جبکہ تمام قسم کا نظام و آئین ملک میں بگڑ چکا تھا۔ لوگ گروہ در گروہ تقسیم ہو کر ملک میں ہر قسم کا غدر مچانے پر آنکھیں سرخ کئے بیٹھے تھے۔ اور کسی شخصیت کے آگے سر جھکانے پر تیار نظر نہ آتے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ جو شخصیت ان سے کام لینے کے لئے موجود ہو گئی تھی۔ وہ بالکل ہی تہیدست اور بے سر و سامان تھی۔ اور اگرچہ اس علاقہ کے خوانین اور ملاّ ئوں کے طائفوں کو شخصاً محمد نادر خان سے کسی قسم کی عداوت و شکایت نہ تھی۔ پھر بھی ان کی باہمی نا اتفاقی یا اور دشمن داریاں ان کو کسی ایک شخص کا طرفدار بنانے کی راہ میں سنگلاخ سے کمتر نہ تھیں۔ پھر یہی نہیں۔ بلکہ بعض قبائل مثل احمد زائی و سلیمان خیل وغیرہ بچہ سقاؤ کی طرف میلان طبع رکھتے تھے۔ خود جدرانوں اور منگلوں کے کچھ گروہ بھی بچہ سقاؤ کے وسیع پروپیگنڈا سے متاثر ہو چکے تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سمت جنوبی میں غازی امان اللہ خان کے نام پر سو سو تبرّے پڑھے جا رہے تھے۔ ان تمام کیفیاتِ متضاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے محمد نادر خان کے لئے ایک ہی راہ کھلی تھی۔ اور وہ یہی کہ وہ سیاست تدبّر دانائی استقامت۔ صبر۔ حوصلہ اور دلائل کے زور سے قبائل سمت جنوبی کو اپنا طرفدار کر کے ان سے کوئی کام لے۔ اس لئے یقیناً اس کی خاموشی مجبوری اور بیچارگی کی وجہ سے تھی۔ تاہم وہ بالکل ہی غافل نہیں بیٹھ رہا تھا۔ اس نے تمام قبائل سمت جنوبی کا جرگہ طلب کر کے اپنا نقطۂ خیال ان کے سامنے رکھنے کی کوششیں شروع کر رکھی تھیں۔ اس ضمن میں وہ شاہ ولی خان کو گردیز کی طرف اور شاہ محمود خان کو جاجیوں کے علاقہ میں بھیج چکا تھا۔ اور خود بھی انہی کوششوں میں ایک دفعہ قریب تھا۔ کہ احمد زائیوں کی سازش سے سقاویوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے۔ مگر بر وقت خبر ہو جانے سے بچ نکلا تھا۔ اس آفت نے اسے بالکل ہی تہیدست کر دیا تھا۔ کیونکہ جو تھوڑا بہت ایک دو لاکھ کا شخصی سرمایہ بصورت قیمتی پتھروں کے اس کے پاس موجود تھا۔ وہ اسی

دوران میں بھاگتے وقت رہ گیا تھا۔

موجودہ اعلیحضرت محمد نادر خان پر یہ اتہام لگانا کہ اس کی خاموشی دیدہ و دانستہ اور اپنی شخصی اغراض پر مبنی تھی۔ انصاف کا خون کرنا ہے۔ اور ایک انسان سے اس کی بشری طاقت سے بڑھ کر مطالبہ کرنا ہے۔ اس پر بھی محمد نادر خان کا سمت جنوبی میں خالی وجود ہی بچہ سقاؤ کی فوجوں کے ایک کافی عصہ کو سمت جنوبی میں اشتغال کئے رہا۔ جو اگر وہاں موجود نہ ہوتا۔ تو بچہ سقاؤ انہی فوجوں کے ذریعہ سے وردکیوں کے قلب وجگہ میں گھس جاتا۔ اور انہیں اس مزاحمت کے جاری رکھنے سے روک دیتا جو وہ غازی امان اللہ خان کے غزنی پہونچنے تک اس کی راہ میں پیش کر رہے تھے۔ اور اس طرح شاید امان اللہ خان کو زندہ وسلامت بچ کر نکل جانے کا موقع ہی نہ مل سکتا۔

اسی تگ و دو کے دوران میں گردیز کا علاقہ نادری گروہ کے ہاتھوں میں پڑ کر پھر چھن گیا تھا۔ اور محمد صدیق فرقہ مشر اسی سلسلہ میں سخت زخمی ہو کر کابل میں آچکا تھا۔ حملۂ گردیز میں سلیمان خیل اور ان کے ہمنوا قبائل نے بہت دلیری سے نادری گروہ اور گردیزیوں کو جو سب کے سب بچہ سقاؤ کے سخت مخالف تھے۔ بری طرح شکست دی تھی۔ اور محمد نادر خان اب علاقہ جاجی میں جا رہا تھا۔

جب تک بچہ سقاؤ قندہار کی مہم کی طرف سے فارغ نہیں ہو لیا۔ اس نے اس وقت تک محمد نادر خان کے ساتھ نامہ وپیام کے ذریعہ سے صلح کا میلان ظاہر کئے رکھا اور یہ نامہ وپیام عبداللطیف مہاجر جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کی معرفت سے ہو رہا تھا بچہ سقاؤ آخر تک اس بات کا آرزومند تھا۔ کہ محمد نادر خان آکر سلطنت کے درست طور پر چلانے میں اس کی مدد کرے۔ وہ اس کو صدارتِ عظمےٰ کا فرمان بھی بھیج چکا تھا۔ اور اس کی ہر ایک خواہش برلانے کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کر رہا تھا۔ کوئی شک نہیں۔ کہ وہ اپنے ان جملہ اظہارات میں صادق تھا۔ لیکن دوسری طرف شرف اور ننگِ افغانی کو

تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ رکھ کر بھی دیکھا جائے۔ تو باوجود شکستہ حالی کے محمد نادرخان کے لئے یہ پیشکش ہرگز قابل قبول نہ ہو سکتا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا۔ کہ ناکندہ تراش اور جاہل ڈاکوؤں کا یہ گروہ کل کو اس کی کسی بات کو نہ سمجھ کر بگڑ بیٹھے۔ اور اس طرح محمد نادرخان اور اس کے عائلہ پر مصائب ادبار و ذلت کی گھٹائیں چھا جائیں۔ جو شاید سارے ہی خاندان کی تباہی و بربادی کا باعث ہوں۔ اور اگر ہم اس خوف و خیال کے ساتھ شرف و ننگ افغانی کی تھوڑی سی چاشنی بھی دے کر دیکھیں۔ تو نامرادی اور غربت کی موت ہزار درجہ کہیں بہتر تھی۔ بہ نسبت اس کے کہ محمد نادرخان جیسا شریف و غیور انسان ایک کم مایہ ڈاکو اور نااہل کی متابعت میں اپنا سر تسلیم خم کرتا۔ مگر خودداری کی شان کا کیا پوچھنا کہ اس ابتلائے ایوبی میں بھی محمد نادرخان آخر تک ثابت قدم رہا۔ اور ہر بار سفیر سقوی کو اپنا سا منہ لے کر واپس آنا پڑا ۔

اس کا بچہ سقاؤ سے ہر بار یہی مطالبہ تھا۔ کہ افغانستان کے ایک آزاد مقام پر قبائل و باشندگانِ ملک کا ایک جرگہ قائم کیا جائے۔ جو بادشاہت کا فیصلہ کرے۔ اور اگر یہ جرگہ بچہ سقاؤ کو اپنا بادشاہ منتخب کر لے۔ تو اس کو متابعت کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ مگر بچہ سقاؤ کب اس قسم کی تجویز کو منظور کر سکتا تھا۔ جبکہ فتح و کامیابی قدم قدم پر اس کا استقبال کر رہی تھی۔ اور ہر جگہ سے اس کو بیعت پر بیعت آ رہی تھی۔ لہٰذا اس وقت تک کہ قندھار فتح نہیں ہو لیا۔ بچہ سقاؤ محمد نادرخان کو اپنا طرفدار بنانے کی مساعی میں برابر کوشاں رہا۔ اور اگرچہ اس دوران میں طرفین کے لشکروں میں شدت کی جنگ بھی ہوتی رہی۔ اور محمد نادرخان کو چند ایک مہلک شکستیں بھی کھانی پڑیں۔ تاہم گفت و شنید کا دروازہ بند نہیں ہوا۔

انہی ایام میں غیاث الدین احمدزائی جو اپنی بادشاہی کے سودائے خام میں ایک مدت سے مبتلا تھا۔ اپنی تھوڑی سی قبائلی طاقت کو بہت زیادہ شمار کر کے اپنے آپ کو

بادشاہ کے لقب سے یاد کرنے لگا۔ اس نے چند ایک اپنے وزیر مقرر کئے۔ مگر بہت ہی جلد بچہ سقاؤ کی فوجوں نے آ کر اس کی طاقت کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا۔ اور وہ خود معہ اپنے اہل و عیال کے ہندوستان کی طرف فرار ہو گیا۔

اب بچہ سقاؤ مہم قندہار سے بھی فارغ ہو چکا تھا۔ اور افغانستان میں سوائے محمد نادر خان کی ذات کے اس کا مدِ مقابل کوئی باقی نہ رہا تھا۔ لیکن اس وقت تک وہ بھی اس کے ہاتھوں چند بڑی زکیں اٹھا کر جاجی کے قبائل میں پناہ گزین ہو چکا تھا۔ لہٰذا اب بچہ سقاؤ چاہتا تھا۔ کہ وہاں سے بھی محمد نادر خان کو بیدخل کر کے اپنی سلطنت کا زور و شور کے ساتھ دنیا میں نقارہ بجائے۔ اس کے لئے بچہ سقاؤ کا جنگی پلین یہ تھا۔ کہ ایک طرف سے سمت جنوبی کے عمق یعنی اضلاع خوست تک اپنی فوجیں پھیلا دے۔ اور دوسری طرف سمت مشرقی کی راہ سے جاجیوں کے علاقے میں گھس کر محمد نادر خان کو دونوں طرف سے محصور کر کے گرفتار کر لے۔ کابل میں اس وقت آٹھ دس ہزار کی تعداد میں سقوی فوج موجود تھی۔ اس میں سے چھ سات ہزار کے قریب سمت مشرقی کی طرف چند جانباز سقوی سپہ سالاروں کی معیت میں روانہ ہو گئی۔ جن کے پلے سپہ خوگیانی اور شنواری قبائل کے سرداروں کی اخلاقی اور معنوی مدد بھی موجود تھی۔ یہ فوج قطع مسافت کرتی ہوئی جگدلک اور پھر سرخ پل تک بلا مزاحمت جا پہونچی۔ اور سرخ پل سے آگے سردار محمد ہاشم خان کے طرفداروں سے ایک دو معمولی لڑائیوں کے بعد جلال آباد کی طرف بڑھ گئی۔ جلال آباد سے آگے شنوار کا علاقہ قریب تھا۔ لہٰذا یہ ان کی مدد پا کر ڈکہ اور تورخم کی سرحد تک جا پہونچی۔ سردار محمد ہاشم خان بھاگ کر ہندوستان کی طرف چلا گیا۔ اور سمت مشرقی کے ان قبائل نے بھی جو بچہ سقاؤ کے دشمن اور مخالف تھے۔ سقوی فوج کے سرفروشانہ جذبہ کے سامنے آنے کی جرأت نہ کی۔ اور گو سقوی فوج ڈکہ کے دامنوں تک پھیل چکی تھی۔ تاہم اس کا قبضہ و اثر کابل و ڈکہ کی سڑک ہی سڑک پر تھا۔ اندرونِ ملک میں اس قدر کمی تعداد کے ساتھ یہ

ابھی پھیل کر قبائل پر اپنا سکہ نہ جما سکتی تھی ؀

سقویوں کو خیال تو یہ تھا۔ کہ سمت مشرقی میں مزاحمت ہوگی۔ اور ان کو جگدلک سے آگے ایک محاذ قائم کرکے لڑنا پڑے گا۔ مگر توقع کے عین برخلاف انہیں محاذ قائم کرکے لڑنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور وہ سردار محمد ہاشم خان کی شخصیت کو وہاں سے نکالنے میں بہت ہی جلدی کامیاب ہوگئے۔ سقوی سپہ سالاروں نے اس کامیابی کو سمت مشرقی کے آخری نقطہ تک پہونچانا چاہا۔ اور اسی لئے وہ بجائے سمت جنوبی کی طرف لوٹنے کے جلال آباد اور ڈکہ کی طرف بڑھنے شروع ہوگئے۔ تاکہ ساری سمت پر قبضہ کرکے وہ اطمینان کے ساتھ ایک تنگ درے سے ہوتے ہوئے جاجی کی طرف بڑھیں۔ مگر ایسا کرتے ہوئے انہوں نے اپنی فوج کو پھیلا دیا تھا۔ اور گو انہیں کابل سے مزید کمک کے پہونچنے کی امید اور توقع تھی۔ مگر اتنے ہی میں کھیل کا پانسہ پلٹ گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وزیریوں کی کمک پاکر شاہ ولی خان کابل کی طرف بڑھنا شروع ہوگیا۔ جس نے صرف تیسرے ہی دن کابل کو تین اطراف سے محصور کرلیا ؀

بچہ سقاؤ نے سمت جنوبی میں اپنی فوجوں کو خوست کی جانب بڑھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ چنانچہ وہ گردیز سے بہت آگے خوست کی جانب نکل چکی تھیں۔ اور گو راستہ میں ان کو قبائل سے بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں۔ مگر قبائل ہی لوٹ مار کا مرض ان کی مسلسل کامیابیوں کے باعث ہوتا رہا۔ انہی لڑائیوں کے دوران میں قبائل نے کئی دفعہ بچہ سقاؤ کے لشکریوں کو فاش شکستیں بھی دیں۔ مگر ہر ایسی فتح کے بعد سقوی فوج سے جو لوٹ مار کا سامان ان کے ہاتھ آتا۔ وہ انہیں محفوظ کرنے کے لئے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ اور اتنے میں سقوی پھر اپنی کھوئی ہوئی جگہوں کو اشتغال کرلیتے۔ اگر یہ نقص اور عیب ان میں نہ پایا جاتا تو یقیناً نہ تو گردیز ہی ان کے ہاتھوں سے نکل سکتا۔ اور نہ ہی محمد نادر خان کو سقاوی افواج کے مقابلہ میں اس قدر مدت درکار ہوتی ؀

انہی کوتاہیوں کی بنا پر محمد نادر خان حاجی کے علاقہ کی طرف چلے جانے پر مجبور ہوا تھا اور اب خوست کی طرف ان کے اقدام نے محمد نادر خان کی وضعیت بالکل ہی مخدوش کر رکھی تھی۔ اور اگر وزیریوں کا لشکر بروقت مدد پر آ کر صورتِ حالات کو یک لخت تبدیل نہ کر دیتا۔ تو یقیناً محمد نادر خان کو بہت ہی جلد بھاگ کر ہندوستان میں پناہ لینی پڑتی لیکن جس طرح غازی امان اللہ خان کا بچہ سقاؤ کے ہاتھوں بھاگ جانا ایک اچنبھا کی بات تھی۔ بعینہٖ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بچہ سقاؤ کے بالمقابل محمد نادر خان کی کامیابی بھی ایک اچنبھا بن گئی تھی۔ اور اگرچہ وزیریوں کی طرف سے امداد کی توقع مدت سے کی جا رہی تھی۔ تاہم ابھی تک ان کو تیار کرنے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ ان کا ایسے تنگ وقت میں امداد پہ نکل آنا البتہ اس مشن کی ایک اہم کامیابی تھی۔ جو محمد نادر خان کی طرف سے اس خدمت پر مامور ہو کر ان کے پاس گیا ہوا تھا۔ اس مشن میں اللہ نواز خان مہاجر ہندی نے بڑا نمایاں کام کیا تھا۔ اور یہ ہرگز مبالغہ نہیں۔ کہ اگر اس کا وجود نہ ہوتا۔ تو شاید وزیری اب بھی نہ آتے۔ اور چونکہ وزیریوں ہی کے سر محمد نادر خان کی کامیابی کا سہرا ہے۔ اس لئے افغانستان کو بچہ سقاؤ کے ہاتھوں سے نجات دلانے کے تاریخی افسانہ میں اگر اللہ نواز خان کا نام چھوڑ دیا گیا۔ تو وہ تاریخی افسانہ نامکمل اور ادھورا ہوگا۔

غرضکہ صرف تین ہزار وزیری لشکر نے آتے ہی شاہ ولی خان کی سرکردگی میں سمت جنوبی کی سقاوی فوجوں کو اسی طرح چھوڑ کر پہاڑی دروں اور غیر آباد وادیوں کے بیچوں بیچ براہ لوگرد کابل کی راہ لی۔ اور حاجیوں کا لشکر بھی ایک دوسری راہ "خوشی" اور "کار یز درویش" سے ہوتا ہوا کابل کی طرف شاہ محمود کی سرکردگی میں روانہ ہو گیا۔ اور شاہ جی مہاجر جس نے چند ایک کام کر کے محمد نادر خان سالار پر اپنی قابلیت ظاہر کر دی تھی۔ مختلف قبائل کے مجموعۂ فوج کے ساتھ محاصرۂ گردیز کی نیت سے کوتل تیرۂ کی طرف بھیج دیا گیا۔ اب جو فوج شاہ ولی خان کی ماتحتی میں تھی۔ اس نے بھین لوگرد

جا کر سر نکالا۔ اور راستہ میں بچہ سقاؤ کے ایک قوی سپہ سالار کو شکست فاش دے کر اپنے سامنے کا راستہ کابل تک صاف کر لیا۔ بچہ سقاؤ نے کابل کی پہاڑیوں کو پہلے ہی سے مضبوط کر رکھا تھا۔ وہ بذات خود اس دن جنگ میں شریک ہوا۔ اور تمام دن کابل پر ہر طرف یورش کا جواب نہایت کامیابی سے دیتا رہا۔ کابل کی جنوب مشرقی جانب سے وزیریوں نے کئی بار حملہ کر کے کابل میں پہونچ جانے کی کوشش کی۔ مگر ہر بار سختی سے پیچھے ہٹا دیئے گئے۔ اور آخری بار تو انہیں اپنے قدم نہایت ہی بے ترتیبی سے پیچھے ہٹا لینے پڑے۔ بعد میں معلوم ہوا۔ کہ ان کے پاس اس وقت کارتوس بالکل ختم ہو چکے تھے۔ سہ پہر کے قریب لڑائی تھم گئی۔ مگر رات کے وقت ان کے حملہ کر کے شہر میں گھس آنے کا یقینی خطرہ موجود تھا۔ اور اس خطرہ کے سبب سے بچہ سقاؤ نے سر شام ہی سے ارک کے تمام دروازے بند کر لئے تھے۔ اور اس کے اعلےٰ کاردار بھی اس رات ارک کے اندر ہی آ رہے تھے۔ مگر اس پاس کے پہاڑوں پر سقاوی فوج جس کی تعداد ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اسی طرح کیل کانٹے سے لیس موجود تھی۔ ارک کے اندر بھی اسی قدر تعداد میں فوج موجود تھی۔ یہ واقعات اس قدر تیزی سے رونما ہوئے۔ کہ نہ تو بچہ سقاؤ کو کوہستان و کوہدامن سے مزید زنگروٹ مہیا کرنے کی فرصت ہی ملی۔ اور نہ ہی سمت مشرقی کی طرف گئی ہوئی فوج ہی جلد واپس آ سکتی تھی۔ مزید براں نادری فوج کے ایک حصہ نے آتے ہی سمت مشرقی کی طرف سے آنے والی سڑکوں پر قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ غرضکہ رات کے بارہ بجے کے قریب وزیریوں نے اپنا حملہ شروع کر دیا۔ اور دو بجے تک لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ وزیریوں نے کابل کے جنوبی پہاڑ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اب انہیں شہر میں آنے سے کوئی چیز روک نہ سکتی تھی۔ چار بجے صبح وہ نوبت و نقارے بجاتے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں شہر میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ سقوی پہرہ دار اپنے پہرے چھوڑ کر بھاگنے لگ گئے۔ اور دن چڑھے کابل کا شہر وزیریوں کے ہاتھ میں تھا اور بچہ سقاؤ مع اپنے ہمراہیوں کے ارک کے اندر محصور ہو بیٹھا تھا۔

وزیریوں کے اس لشکر کے ساتھ کابل تک پہونچتے پہونچتے بہت سا لچاری یعنی قومی لشکر بھی مل چکا تھا۔ جس جس جگہ ان کا قبضہ و دخل ہوتا گیا۔ مقامی لوگ ان کی پیشوائی اور ہر قسم کی مدد کرنے کے لئے پہلے ہی سے تیار ہوتے گئے۔ اور جیسے مختلف انہار آس پاس سے آکر ایک بڑے دریا میں شامل ہو کر بہنے لگ جاتی ہیں۔ اسی طرح وزیریوں کا مظفر لشکر بھی ان قبائلی لشکروں سے تقویت پاتا گیا۔ اور کابل تک پہونچتے پہونچتے ان کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ ہو گئی۔ سقاویوں کے ظلم و تشدد نے ہر جگہ و ہر مقام پر لوگوں کو بے حد سراسیمہ کر رکھا تھا۔ وہ خود ان ظالموں کے برخلاف کسی قسم کی حرکت نہ کر سکتے تھے۔ مگر اب چونکہ ان کو اپنا کوئی پشتیبان نظر آنے لگا۔ تو انہوں نے جھٹ اس کی معاونت میں اپنی کمر ہمت باندھنی شروع کر دی۔ اور چشم زدن میں کابل کو فتح کر لیا۔

خود کابل میں بھی چند ایسے گروہ موجود تھے۔ جنہوں نے سمت جنوبی کی طرف سے آنے والی امداد سے مایوس ہو کر خود ہی تہوّرانہ اقدام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان گروہوں نے خفیہ طور پر شہر کو چند حصوں میں تقسیم کر لیا ہوا تھا۔ جھنڈے تیار ہو چکے تھے۔ مطلوبہ اسلحہ فراہم ہو چکا تھا۔ اور اگر وزیری دو ایک دن اور نہ آتے۔ تو سقوی فوج کا جو شہر کے اندر بہت تھوڑی تعداد میں باقی رہ گئی تھی۔ ان حریت کیشان وطن کی سربراہی میں قتل عام شروع کر دیا جاتا۔ تجویز یہ تھی۔ کہ بچہ سقاؤ کو ارک میں محصور کر کے محمد نادر خان اور اس کے اتحادی قبائل کو تسہیلات راہ بہم پہنچائی جائیں مگر یک لخت وزیری حملہ کے واقع ہو جانے نے اس امر کی ضرورت ہی لاحق نہ ہونے دی۔

گو وزیریوں کا داخلہ کابل بطور خود ایک شاندار کامیابی تھی۔ تاہم ابھی تک بچہ سقاؤ زندہ و سلامت ارک کے اندر موجود تھا۔ اور اس کی پچاس ساٹھ ہزار

جانباز فوج ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھی۔ جو یقیناً بچہ سقاؤ کی محصوری کی خبر پاتے ہی الٹے پاؤں یلغار کر کے کابل میں پہونچنے کی سعی کرے گی۔ اور اگر نتیجہ نادری موفقیت کی صورت ہی میں نکلا۔ تو بھی ایک خوفناک کشت وخون ناگزیر ہوگا۔

بچہ سقاؤ نے چابکدستی کر کے چند دن پہلے ہی سے خاندان نادری کی مستورات واطفال کو ارک میں مقید کر رکھا تھا۔ اور یہ فاتحین کے لئے اور بھی مشکل ہو رہا تھا کہ کس طرح سے اس مشکل کا سامنا کیا جائے۔

مگر یہ سب ابھی دور از کار باتیں تھیں۔ قبائلی لشکر نے کابل میں پہونچتے ہی سقاویوں اور ان کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ کابل کے جلے بھنے شہری اس امر میں خود ان کی راہنمائی کر رہے تھے۔ اور شاید وہ شہر کے اندر کسی کو نہ لوٹتے۔ اگر کابلی ان کو یہ کہہ کر کہ یہ گھر سقاویوں کا ہے۔ اور یہ ان کے طرفداروں کا ہے۔ ان کے اشتعال اور جرأت کا باعث نہ بنتے۔

قبائل کے لوگوں نے محمد نادر خان سے قرآن پر اس بات کا عہد کر رکھا تھا۔ کہ بجز سقاویوں کے وہ اور کسی کو نہ لوٹیں گے۔ اور شاید اس عہد کا مطلب یہ تھا۔ کہ کوہستان اور کوہدامن کے علاقہ میں ان کو لوٹ مار کرنے کی عام اجازت ہوگی۔ مگر انہوں نے کابل ہی میں جب لوٹنا اور مال فراہم کرنا شروع کر دیا۔ تو گویا انہوں نے اپنے حلف کو یوں سمجھا۔ کہ جو چیز بھی سقاویوں کے قبضہ میں آچکی ہے۔ اس میں چونکہ سقاوی پن آچکا ہے۔ اس لئے وہ ان کے لئے ہر طرح مباح وجایز ہے اسی تاویل کی رو سے انہوں نے بعد میں ارک میں گھس کر بیت المال اور ہر ایک سرکاری شئے کو بھی لوٹ لیا۔ حتیٰ کہ سرکاری عمارات کے فرنیچر اور اسباب کو بھی نہ چھوڑا۔ جو چیزیں مثل میز کرسی پیانو اور بڑے بڑے قیمتی اور نادر چینی ودستی ظروف وہ نہ لے جاسکتے تھے۔ ان کو توڑ پھوڑ کر ادھر اُدھر پھینک دیا۔ رہے بڑے بڑے طول وعریض

قالین جو جا بجا سرکاری عمارتوں میں بچھے ہوئے تھے۔ تو وہ بھی ان کی جدت آفریں لوٹ کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے۔ اس ضمن میں وزارت حربیہ کے بڑے ہال کے ایک قالین کا ذکر کرتا ہوں۔ جو طول میں تقریباً سو قدم اور عرض میں چالیس قدم سے کم تر نہ ہوگا۔ یہاں جب ایک قبائلی گروہ گھسا ہے۔ تو جس طرح کسی فصل پر ایک ٹڈی دل آپڑتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی اس پر چھا گئے۔ اور آن واحد میں اپنے تیز چھروں سے اس کو جگہ جگہ سے کاٹ کر اپنے ٹکڑوں کو سنبھالتے ہوئے یہ جا وہ جا نظروں سے غائب ہو گئے۔ بازاروں میں جس طرف نگاہ اٹھ جاتی تھی۔ گاڑیاں بغیر گھوڑوں کے اور موٹریں بغیر ڈرائیوروں کے ٹنوں مال سے لدی ہوئی قطار در قطار نظر پڑ رہی تھیں جن کو قبائلی گروہ ہر طرف سے کھینچ کھینچ کر سراؤں کی طرف لیے جا رہے تھے۔ قبائلی لوٹ کا یہ نظارہ بے حد عبرت آموز ہونے کے علاوہ عجیب بھی تھا۔ اور ایک بات تو خاص طور پر بصیرت افروز تھی۔ کہ گو جہل اور وحشت کے یہ مجسمے ہر طرف لوٹ اور غارت گری کا بازار گرم کئے ہوئے تھے۔ تاہم لوٹ مار کرتے ہوئے خود ان کے اپنے اندر ایک ایسی تنظیم اور ضبط موجود تھا۔ کہ کیا مجال جو لوٹ کے موقع پر کبھی ان میں باہمی نزاع واقع ہو جائے۔ اگر مالِ غنیمت کی ایک شے پر ایک سے زیادہ آدمی دوڑ پڑے ہیں۔ اور خواہ وہ آپس میں رقیب ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی جونہی کہ پہلے ایک کا ہاتھ اس چیز پر جا پڑا ہے۔ دوسرے ہاتھ وہیں تھم گئے ہیں۔ اور وہ چیز اس شخص کی ہو گئی ہے۔ جس نے پہلے ہاتھ ڈالا تھا۔ عجیب بات ہے کہ پنجاب میں سکھوں میں بھی ان کے خروج کے وقت یہی بات دیکھنے میں آئی۔ لیکن اس استثناء کے ساتھ کہ وہ باہم رقیب نہ تھے۔ بلکہ ان میں بحیثیت ایک قوم کے کلی اتفاق موجود تھا۔

لوٹ میں بہادری کا نظارہ بھی دیکھا گیا۔ ارک کی فصیلوں سے سقاوی ہر طرف

گولیوں کا سینہ برسا رہے تھے۔ اور یہ قبائلی لوگ عمارات زیر ہدف کے صحنوں اور برآمدوں میں بغیر اس امتیاز کرنے کے کہ یہ گولیوں کی سنسناہٹ ہے۔ یا کہ پاس ہی مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ اپنے لوٹے ہوئے اموال کے ڈھیروں کو کمال انہماک سے جمع کرنے میں مشغول تھے۔ اگر اس اثنا میں ان میں سے کسی کو کوئی گولی بھی آکر لگ گئی ہے۔ تو انہوں نے اپنے اس مردے کو بھی ایک گٹھڑ میں کس کر باندھ لیا ہے۔ تاکہ جاتے وقت اس کو بھی اٹھا کر لے جائیں۔

فاتحین کا لشکر لوٹ میں اتنا محو ہو چکا تھا۔ کہ انہیں محصور بچہ سقاؤ کی سرگرمیوں کا کوئی فکر و خیال ہی نہ رہا۔ شاید یہ افغانی جنگجوؤں کا تہورانہ جذبہ تھا۔ جو انہیں دشمن کی فکر سے غافل بنا چکا تھا۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ سمجھ رہے تھے۔ کہ اصل مہم کابل کے شہر میں داخلہ کی تھی۔ سو اس میں داخل ہو ہی چکے ہیں۔ اب وہ فاتح ہیں اور اب کسی طرح ان کی یہ فتح شکست سے نہیں بدلی جا سکتی۔

ارباب لشکر بہتیرا ان کو اس لوٹ و غارتگری سے باز رکھنے کے لئے سر پٹکتے پھرتے تھے۔ اور دشمن کی موجودگی کی طرف ان کی توجہ کو مشغول کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ بپھرے ہوئے سلیمانی جن" کہاں سننے والے تھے۔ برابر اموال کے جمع کرنے میں منہمک رہے۔ اور اگر اربابان لشکر میں سے کوئی انہیں ذرا سختی سے روکنا چاہتا۔ تو وہ جھٹ آنکھیں بدل لیتے۔ اس کو مارنے پر تیار ہو جاتے۔ خوانین جن کے ماتحت یہ قبائلی رضاکار تھے۔ چونکہ خود بھی اس لوٹ میں شریک تھے۔ اس لئے اس افراتفری اور ہماہمی کے عالم میں کسی سے کوئی سد باب نہیں ہو سکتا تھا۔ غرضکہ لوٹ جاری رہی۔ اور ادھر بچہ سقاؤ کو اس امر کا موقع مل گیا۔ کہ وہ سمت شمالی میں نامہ و پیام کے ذریعہ سے اس شکست خوردہ لشکر کو پھر اکٹھا کر کے کابل پر ایک چپ چاپ حملہ لے آئے۔ جو سپہ سالار شیر دل کی ماتحتی میں سمت جنوبی میں شکست کھا کر منتشر ہو چکا تھا۔ فاتحین کی

غفلت سے نہ تو ارک کی شمالی سمت کا باقاعدہ محاصرہ ہی کیا گیا تھا۔ اور نہ ٹیلیفون کے تار ہی کسی نے کاٹے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دوسرے ہی دن شیر دل سپہ سالار اپنی دو تین ہزار سپاہ کے ساتھ باغ بالا میں پہونچ گیا۔ کابل میں پھر ایک دفعہ بھاگڑ مچگئی۔ اور لوگ سراسیمہ اور پریشان ہوکر ہر طرف سے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگ پڑے۔ ادھر اربابان لشکر گھوڑوں پر سوار ہوکر قبائلی لشکروں کو سراؤں کوچوں اور بازاروں سے جمع کر کے لڑائی کے میدان کی طرف بھیج رہے تھے۔ ڈھول جگہ بہ جگہ پٹنے شروع ہو گئے۔ تاکہ جنگجو جہاں بھی ہوں۔ ڈھول کی آواز سنکر لڑائی کے لئے باہر آجائیں۔ اس موقعہ پر قبائلی عزم بہادری اور جنگی شوق کا پھر ایک پرشکوہ نظارہ دیکھنا نصیب ہوا۔ کہاں تو ہر ایک لوٹ مار میں مست تھا۔ اور اپنے لوٹے ہوئے مال کے اردگرد سانپ کی طرح حصار باندھے پھنکارے مار رہا تھا۔ اور یا اب یہ حال تھا۔ کہ ایک آدھ ساتھی کو مال غنیمت کے پاس چھوڑ کر اپنی بندوق اٹھائے اور کارتوسوں کی پیٹی سنبھالے ہوئے انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ ناچتا کودتا میدان جنگ کی طرف دوڑا چلا جاتا تھا۔ ان کی بہادری کی اس روح کو دیکھکر جی چاہتا تھا۔ کہ ہزاروں ایسے مال ان کے قدموں پر یونہی نثار کر دیئے جائیں۔ تو پھر بھی تھوڑے ہیں۔

لڑائی نے کچھ زیادہ طول نہ کھینچا۔ آن کی آن میں ہزاروں رضاکار میدان جنگ میں پہونچ گئے۔ اور ایک دو گھنٹوں کی خوفناک آتشباری کے بعد جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ فاتحین پھر فاتحین تھے۔ شیر دل سپہ سالار مارا جا چکا تھا۔ اور سقاوی لشکر تتر بتر ہو گیا تھا۔ سقاوی سپہ سالار کی لاش کو کابل میں لاکر پل خشتی پر سر کے بل اوندھا لٹکا دیا گیا تاکہ لوگوں کو اچھی طرح یقین آجائے۔ کہ بچہ سقاؤ کی قسمت اب پلٹ چکی ہے۔

گو یہ شکست کاری تھی۔ مگر پھر بھی بچہ سقاؤ ارک میں جما بیٹھا تھا۔ اور جب تک ارک میں سے اسے نکال باہر نہ کیا جائے۔ اس وقت تک خطرہ ہی خطرہ تھا۔ اور یہ امر بغیر لڑائی کے

ممکن نہ تھا۔ ارک کے اندر ناموسِ نادری مقید تھا۔ اور یہ خوف یقین کے ساتھ ہر دل میں موجود تھا۔ کہ جونہی کہ ارک پر گولہ باری شروع کی گئی۔ بچہ سقاؤ ان تمام کو تہ تیغ کر دے گا۔ معاملہ کی اہمیت و نزاکت میں کس کو کلام ہو سکتا تھا۔ جرنل شاہ ولی خان محمد نادر خان سپہ سالار کا بھائی سر لشکر تھا۔ شاہ محمود خان ان کا برادر خورد بھی جاجیوں کے لشکر کے ساتھ پہونچ چکا تھا۔ اور اگرچہ دونوں بھائی فتح کی خوشیوں سے سرشار تھے۔ لیکن یہ ایک ایسا معاملہ تھا۔ کہ اس کا تعلق براہِ راست ان کے رُوح و دل کے ساتھ تھا۔ وہ دو ایک دن سے عجب طرح کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اگر وہ گولہ باری کا حکم دیتے تھے تو ان کا ناموس تباہ و برباد ہوتا تھا۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے۔ تو بچہ سقاؤ کو ارک سے باہر نہیں نکال سکتے تھے۔ بالآخر ان بہادر بھائیوں نے اپنے ناموس کو اپنے مقصد اعلیٰ کی قربان گاہ پر چڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور حکم دے دیا۔ کہ توپیں ارک کے سامنے گاڑ دی جائیں۔ اور گولہ باری شروع کر دی جائے۔ قلعہ باہر سے بھی توپیں سر کرنے کا حکم بھیج دیا گیا۔ بہادر شاہ ولی خان نے باغ عمومی سے پہلا گولہ خود ارک پر چلایا۔ اور اس طرح آزمائش و امتحان کے میدان میں اپنی عظمتِ ایثار کا ایک نا مٹنے والا ثبوت دنیا کے پیش کر دیا۔

اب ارک پر گولہ باری ہو رہی تھی۔ بچہ سقاؤ بھی توپوں کا جواب توپوں سے دے رہا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ارک کے میگزین کو آگ لگ گئی۔ اور بچہ سقاؤ کی رہی سہی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ گو ارک پر گولہ باری جاری تھی۔ تاہم ابھی تک ارک کی شمالی سمت ویسے ہی خالی پڑی تھی۔ اور محاصرین نے اسے بالکل بے حفاظت چھوڑ رکھا تھا۔ بچہ سقاؤ نے اس طرف کو خالی دیکھ کر بھاگنے کا عزم کر لیا۔ اور اس دن خفیہ ہی خفیہ تیاری کرتا رہا۔ اس کو کامل یقین تھا۔ کہ جب تک ناموسِ نادری اس کے قبضہ میں ہے۔ محمد نادر خان یا اس کے بھائیوں کا حوصلہ نہ پڑے گا۔ کہ وہ ارک پر گولہ باری کریں۔ مگر جب اس نے اپنی توقع کے بالکل برعکس یہ دیکھا۔ کہ وہ تو اپنی ناموس کی پرواہ کئے بغیر ارک پر

پیہم گولہ باری کر رہے ہیں۔ تو طبعاً ان کی اس بہادرانہ عظمت نے اس کو خائف و ترساں کر دیا۔ اب وہ شیر دل بچہ سقاؤ بزدل بن چکا تھا۔ اس نے محمد نادر خان سپہ سالار کے ایک مقید بھانجے کو بلا کر اس کی وساطت سے شاہ ولی خان کے پاس پیغام امن و صلح روانہ کیا۔ اور اپنی اور اپنی چار بیویوں اور کنبہ اور دوستوں کی سلامتی کی شرط پر ارک کو حوالہ کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسی دن قریباً سہ پہر کے وقت احمد شاہ مذکورہ بالا پیغام لے کر ارک سے باہر آیا۔ اور اس کے ارک سے چلے جانے کے بعد بچہ سقاؤ اپنی بیویوں اور وفادار چوروں کے جھنڈ سمیت شمالی دروازہ سے نکل کر کوہستان کی طرف بھاگ گیا۔ دوسرے دن فاتحین کا ارک پر بھی قبضہ تھا۔ ارک کا جنوب مشرقی حصہ جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ اور میگزین اب تک برابر اڑ رہا تھا۔ اسی میگزین کے پاس ہی خزانہ تھا جو انقلاب کے اس قدر تصرفات کے بعد بھی اپنے اندر ایک دو کروڑ روپیہ نقد رکھتا تھا۔ قبائل نے دوسرے دن علے الصباح اس کو لوٹنا شروع کر دیا۔ میگزین پیہم اڑ رہا تھا۔ گولے اور بم دھڑا دھڑ پھٹ رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ دیواریں اور چھتیں منہدم ہو رہی تھیں۔ مگر لوٹ کے عاشق موت کے تصور سے بالکل بے پرواہ ہو کر پروانوں کی طرح خزانہ پر منڈلا رہے تھے۔ اور چار چار ہزار کی تھیلیاں ایک ایک دو دو کر کے اٹھائے لئے آ رہے تھے۔ اکثر بیچاروں کو ایک سے دس تک گننا بھی نہیں آتا تھا۔ اور جب کسی گروہ کے پاس چند تھیلیاں جمع ہو جاتی تھیں۔ تو وہ انہیں زمین پر خالی کر دیتے تھے۔ اور پھر سر سے ایک ٹوپی اتار کر اس کو روپیوں سے بھر بھر کر آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ یہ نظارہ حقیقتاً بڑا ہی پُر لطف اور قابل دید تھا۔

جب سقاویوں نے کابلیوں کو لوٹا تھا۔ تو اس لوٹ کا ایک حصہ سمت شمالی کے غریبوں اور مفلسوں کے ہاتھ لگا تھا۔ اب اس قبائلی لوٹ نے کابل کے غرباء اور عوام کو مالا مال کر دیا۔ کتنی ہی نادر اشیاء جنہیں یہ لوگ اپنے گھروں تک نہ لے جا سکتے تھے۔

یا جن کے حکومت کے ہاتھوں چھن جانے کا انہیں خوف تھا۔ بر سرِ عام کوڑیوں کے مول بک رہی تھیں۔

کابل کی فتح کی خبر سنکر لوگ جوق در جوق اطراف و اکناف سے شہر میں داخل ہو رہے تھے اور یہاں کسی قسم کی حکومت کے موجود نہ ہونے کے سبب سے شہریوں میں یہ خوف جاگیر ہو رہا تھا۔ کہ کہیں عام لوٹ مار شروع نہ ہو جائے۔ دوکانیں اور بازار تمام بند تھے۔ اور لوگ خوف و اطمینان کی ملی جلی کیفیتوں کے ساتھ محمد نادر خان کی آمد آمد کا انتظار کر رہے تھے شاہ ولی خان نے اپنے خاص ہرکارے مژدۂ فتح کے ساتھ محمد نادر خان کی خدمت میں بھیجد ئے تھے۔ جسے سن کر وہ ایک واجبی عجلت کے ساتھ دار السلطنت کی طرف چل چکا تھا۔

گو بچہ سقاؤ کابل سے بُری طرح زک اٹھا کر جا چکا تھا۔ تاہم ہنوز وہ کافی طاقتور تھا سید حسین اپنے دس ہزار تازہ دم لشکر کے ساتھ ترکستان سے پایہ تخت کی طرف کوچ کر چکا تھا۔ اور امروز فردا ہی میں پہونچنے والا تھا۔ اس کے لشکر کو اپنے ساتھ ملا کر اب بھی بچہ سقاؤ کم و بیش بیس ہزار فوج کا مالک متصور ہوتا تھا۔ اس لئے ہر دل میں یہ خوف جاگزین تھا۔ کہ اگر بچہ سقاؤ پھر ایک دفعہ کابل پر حملہ آور ہوا۔ تو ان نادری بے ترتیب لشکروں کا اس کے مقابل ٹھیرنا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ اور پھر کسے معلوم ہے۔ کہ یہ جنگ انقلاب کی آگ جس نے افغانستان کے جسدِ حیات کو جلا کر بھسم کر رکھا ہے۔ ابھی کیا کچھ رنگ نہ لائے یہاں کابل میں محمد نادر خان سپہ سالار کی آمد آمد کے لئے آنکھیں فرشِ راہ ہو رہی تھیں۔ تو وہاں کوہستان کے قلعہ جبل السراج میں بچہ سقاؤ سید حسین کے لاؤ لشکر کا بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ اب سارا کھیل اسی کی ذات پر موقوف تھا

کابل میں بچہ سقاؤ کی شکست نے سمت شمالی کے لوگوں کے حوصلے بے حد پست کر دئیے تھے۔ اب انہیں ان قبائلی فوجوں کے ہاتھوں اپنی تباہی و بربادی کا کامل یقین

ہو رہا تھا۔ وہ اپنی اجتماعی طاقت کو اب تک بیدریغ صرف کر چکے تھے۔ اور اب ان میں اتنی سکت باقی نہ رہی تھی۔ کہ وہ از سرِ نو دفاعِ قومی کی رُوح کو جوش و حرکت میں لاسکیں۔ بچہ سقاؤ نے ان کے ہزاروں نونہالوں کو بھرتی کر کے مختلف محاذات جنگ پر بھیج رکھا تھا۔ اور کوہستان و کوہدامن میں عورتوں، بوڑھوں، اور بچوں کے سوا نام کو بھی ایک جوان دکھائی نہ پڑتا تھا۔ پس قبائلی لشکروں کی آمد آمد کے ڈر سے ان کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ اور وہ اپنے اثاث البیت کو سنبھالنے محفوظ کرنے اور اپنی جانوں کو بچانے کے لئے دم توڑ کوششوں میں مشغول تھے۔

کابل میں محمد نادر خان کے ورود سے پیشتر ہی شاہ ولی خان نے سمت شمالی کے معتبرین و خوانین کو ان کے گذشتہ افعال و کردار سے باز پُرس نہ کرنے کے اعلانات و پیغامات بھیج رکھے تھے۔ مزید برآں نئی حکومت سے تعاون کرنے کے صلہ میں بخشائش و انعامات کے وعدے بھی موجود تھے۔ ان اعلانات و پیغامات کا اثر خاطر خواہ ہو رہا تھا۔ اور حسب دلخواہ جوابات متواتر موصول ہو رہے تھے۔

سید حسین نے کوہستان واپس پہونچکر قلعہ جبل السراج میں اپنی فوج اُتار دی۔ اور خود شکست خوردہ بچہ سقاؤ کے ساتھ صلاح و مشورہ کرنے میں مشغول ہو گیا مگر دوسرے ہی دن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ کہ سوائے ایک قلیل آدمیوں کی جماعت کے باقی اس کی تمام فوج قلعہ کو خالی کر کے جا چکی ہے۔

غازی محمد نادر خان نے کابل میں پہونچتے ہی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی وزیری اور دیگر قبائل کے رضا کاروں کو اپنے سرکردوں کی معیت میں سمت شمالی کی طرف کوچ کر جانے کا حکم دے دیا۔ تا کہ اگر بچہ سقاؤ کوئی شرارت کرنا چاہے۔ تو اس کا وہیں سدباب کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ بے ترتیب

فوجیں یلغار کرتی ہوئیں بلا مزاحمت چہار یکار کے مقام تک جا پہونچیں ؛
یہ خبریں جب ایک ہی ساتھ بچہ سقاؤ اور سید حسین کو ملیں۔ تو وہ بیدل ہو کر رہ گئے۔ اور انہوں نے غازی محمدؐ نادر شاہ کے ایک فوجی منصبدار کی وساطت سے نئی حکومت سے اپنی جان بخشی کے فرامین حاصل کئے۔ اور موٹروں پر سوار ہو کر دربارِ نادری میں پہونچ گئے ؛
یہاں غازی محمدؐ نادر شاہ کا شاہی پھریرا آقائے شیر احمد خان کے گھر پہ لہرا رہا تھا۔ کیونکہ ارک کے اندر میگزین میں لگی ہوئی آگ ابھی تک سرد نہ ہوئی تھی۔ اور گولے اور بم تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد پیہم پھٹ رہے تھے۔ اور پھر یہ خطرہ بھی موجود تھا۔ کہ کہیں بچہ سقاؤ نے شاہی محلات کے نیچے ڈائنا میٹ وغیرہ نہ بچھا رکھا ہو۔ لہذا جب تک ارک کی اچھی طرح دیکھ بھال نہ کر لی گئی۔ غازی محمدؐ نادر شاہ آقائے شیر احمد خان ہی کے گھر میں قیام پذیر رہا۔ اور یہیں بچہ سقاؤ اور سید حسین کو اس نے شرف باریابی بخشا ؛
یہ نظارہ بھی نہایت عبرت آموز اور کافی دلچسپ تھا۔ شاید تاریخ انسانی میں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے بالمقابل بیٹھ کر اس کو اپنے عہدۂ بادشاہت کا اس طرح چارج دے۔ بچہ سقاؤ اور سید حسین کو غیر مسلح کر کے بادشاہ کے خاص کمرے میں پہلے ہی سے پہونچا دیا گیا۔ جہاں کمرے کے نگہبان نے انہیں واجبی تکریم و احترام کے ساتھ کرسیوں پر جگہ دی۔ اور ابھی دو منٹ نہ گذرے ہوں گے۔ کہ غازی محمدؐ نادر شاہ اپنے خاص مصاحبوں کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ بچہ سقاؤ اور سید حسین اس کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر سب بیٹھ گئے۔ اور بچہ سقاؤ نے غازی محمدؐ نادر شاہ کو مخاطب کر کے کہا۔ کہ میں اسی طرح تمہارے پاس آیا ہوں جس طرح ایک بہادر ایک بہادر کے پاس آتا ہے۔ خدا نے مجھے دن

دیا تھا میں نے اس ملک پر نو مہینوں تک بادشاہت کی۔ آج اس نے مجھ سے چھین کر اسے تم کو دیدیا ہے۔ اب شوق سے تم بادشاہت کرو۔ تم نے بہادری اور شجاعت سے اس کو حاصل کیا ہے۔ اس لئے اب یہ تمہارا حق ہے۔

یہ کہکر بچہ سقاؤ خاموش ہوگیا۔ اور سید حسین نے بچہ سقاؤ کو مخاطب کرکے کہنا شروع کیا۔ کہ اولالہ! اور وہ اسی طرح بچہ سقاؤ کو پکارا کرتا تھا۔ یہ لے اپنی نائب السلطنتی کی مُہر اور یہ لے اپنی وزارت جنگ کی مُہر اور یہ تیسری ترکستان کی ریاست تنظیمیہ کی مُہر ہے۔ لے ان تینوں کو سنبھال لے۔

اس پر بچہ سقاؤ نے اپنی خاص مُہر بھی ان تینوں میں شامل کردی۔ اور اٹھکر انہیں غازی محمد نادرشاہ کے ہاتھوں میں دے دیا۔

یہ گویا اس کے نزدیک بادشاہت کے صحیح طور پر انتقال کئے جانے کا ایک دستور تھا۔

غازی محمد نادرشاہ نے ان دونوں کو اسی مکان کے ایک نچلے حصے میں جگہ دی۔ اور ان کے لئے خاص مہماندار مقرر کردیئے۔ مگر تیسرے ہی دن انہیں ارک کے ایک محفوظ برج میں منتقل کردیا گیا۔ جہاں وہ اپنی زیست کے آخری لمحوں تک بمعہ اپنے دیگر ساتھیوں کے مقید رہے۔

غازی محمد نادرشاہ نے ان کی جاں بخشی کے وعدے پر ان کو اپنے پاس بلوایا تھا۔ مگر بعد میں قبائل کے سرداروں نے کسی طرح بھی ان کا زندہ چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اپنا ایک جرگہ منعقد کرکے بچہ سقاؤ اور اس کے گیارہ ساتھیوں کو چاندماری کئے جانے کا حکم دے دیا۔

جب جرگہ ہو رہا تھا۔ تو بادشاہ کا ایک اعلان اہل جرگہ کو پڑھ کر سنایا گیا۔ جس میں مرقوم تھا۔ کہ جہاں تک اعلیحضرت محمد نادرشاہ اور اس کے خاندان کا

تعلق ہے۔ انہوں نے بچّہ سقاؤ اور اس کے دیگر رفقاء کو بخش دیا ہے۔ اب جرگہ کو اختیار ہے۔ کہ خواہ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کی تقلید کرے یا ان کو سزائیں دے ؛

مگر قارئین خود سمجھ سکتے ہیں۔ کہ یہ سب دکھلاوے کی باتیں تھیں۔ دراصل غازی محمدؐ نادر شاہ بچّہ سقاؤ کو کسی حال میں بھی زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا چنانچہ جرگہ کا فیصلہ ہوتے ہی ان سب کو ارک کی دیواروں کے نیچے گولی ماردی گئی ؛ ۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

باب نہم

حکومت امانیہ اور دول ہمجوار

اس اہم موضوع کے لئے ایک علیحدہ اور مستقل کتاب کی ضرورت ہے لیکن میرے نزدیک یہ کتاب ادھوری رہے گی۔ اگر یہاں چندان ضروری باتوں کو زیر بحث نہ لایا جائے۔ جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح غازی امان اللہ خان کی شکست وزوال سے پیدا ہو چکا ہے۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں یہ خیال خصوصیت کے ساتھ ذہن نشین کر لیا گیا ہے کہ چونکہ غازی امان اللہ خان کی خارجہ حکمت عملی انگریزی حکومت کے ساتھ معاندانہ اور مخالفانہ تھی۔ اس لئے انگریزوں نے امان اللہ خان کے زوال وابتلا میں ایک سرگرم دشمن کی طرح حصہ لیا۔ بلکہ اکثریت تو اس خیال پر آکر جم گئی ہے۔ کہ "چونکہ وہ انگریزوں کے خلاف تھا۔ اس لئے اس کی بادشاہت چھن گئی"۔

میں جو اس کتاب کو لکھ رہا ہوں خوب جانتا ہوں۔ کہ بحیثیت مصنف ہونے کے مجھ پر خدا اور اس کی خلق کے نزدیک کتنی اہم ذمہ داریاں عائد ہیں۔ میں ان ذمہ داریوں کے بوجھ تلے مجبور ہوں۔ کہ حقیقت اور صرف حقیقت ہی کو بیان کروں۔ میں لوگوں کے سیل دیدہ حسیاتی سمندروں میں نہیں کود پڑوں گا۔ اگر اس علیحدگی سے میری ہستی اپنی ہی موجوں میں آوارہ ہو کر رہ جائے۔ تو مجھے اس کی چنداں پرواہ نہ ہوگی۔ میں طالب زر نہیں ہوں۔ اور نہ

ہی مجھے اپنی تشہیر کا جذبہ (جو بلا شک ہر ایک وجود کی فطرت میں ودیعت ہے) اس باب میں چنداں ہراساں کر رہا ہے۔ میرا قلم سچائی اور راستی کے لئے حرکت میں آسکتا ہے اور میں سچائی اور راستی ہی کو بیان کروں گا۔ خواہ وہ لوگوں کے جذبات کی کسوٹی پر اپنی پرکھ پیدا کر سکے یا نہ۔ میں جسے ایک پولیٹکل آدمی سمجھا جا رہا ہے۔ اور جس کے واقعاتِ زندگی بھی کچھ اسی ایک نوعی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ انگریزوں کی طرزِ حکومت کو اس دنیا کے لئے ایک بار تصور کر رہا ہوں۔ لہٰذا پبلک مجھ جیسے آدمی سے یہی کچھ توقعات باندھ سکتی ہے۔ کہ ایسا شخص ضرور انگریزوں کی ان (مفروضہ) سازشوں کو طشت از بام کر کے رکھ دے گا۔ جن کے نتیجہ کے طور پر امان اللہ خان کو اپنے تختِ سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اور اگر اس راہ و مسلک کا آدمی لوگوں کے قائم کردہ معیار پر پورا نہ اتر سکے۔ تو اس کے اپنے کھوٹے اور ناقابلِ چلن ہونے کے متعلق شک و شبہ نہ لانا ایک ناقابلِ معافی جرم قرار دیا جائیگا اور اس سے کسی طرح مفر نہ ہوگا ؟

اپنا بیان شروع کرنے سے پہلے میں قارئین پر نکتہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ ہندوستان کی واپسی پر گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھ پر سویٹ حکومت کے ایجنٹ ہونے کا شبہ کیا تھا۔ اسی شبہ کی پاداش میں مجھے نامعلوم مدت تک کے لئے زندان خانہ فرنگ میں جگہ دی گئی ہے۔ خواہ اس شبہ و الزام کی واقعیت و اصلیت میں کتنا ہی مبالغہ اور جھوٹ کیوں نہ ہو۔ تاہم اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ افغانستان کے ملک میں میرے اعمال کی سرگرمیاں کچھ اس قسم کے حلقوں سے وابستہ رہیں۔ جن سے ظاہر بین آنکھ بڑی آسانی سے دھوکا کھا سکتی تھی۔ مجھے اس واقعیت کے چھپانے میں ذرا بھی پس و پیش یا ہچکچاہٹ نہیں۔ کہ میں کابل میں روسیوں اور بلادِ خارجہ کے دیگر سیاست دانوں سے لگاتار ملتا جلتا رہا ہوں۔ اور اس حقیقت

کو میں نے گورنمنٹ آف انڈیا کے ان آفیسروں کے منہ پہ بھی کہہ رکھا ہے۔ جواب تک مجھ سے زندان میں آکر مل چکے ہیں۔ میں نہ تو یہاں اپنی مدافعت پیش کرنی چاہتا ہوں۔ اور نہ ہی مجھے اپنی اہمیت کی نمائش درکار ہے۔ لیکن اس حقیقت کو تم کہاں لے جا کر دفن کرو گے۔ کہ ان علقوں میں گردش کرتے ہوئے مجھے واقعات کی جس اصل و غایت کا علم ہو سکا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ پس اس ضمن میں میں جو کچھ بھی کہوں گا۔ وہ سرتاپا حقیقت ہو گی۔ اب یہ انگریزی حکومت کی خوش قسمتی یا میری اپنی بد قسمتی سمجھئے۔ کہ میری تحقیق سراسر انہی کے حق میں ہے"

ہم لوگوں نے نہایت غلطی سے سیاست اور ڈپلومیسی کو خلط ملط کر دیا ہے۔ درحقیقت یہ دو جدا اور مستقل چیزیں ہیں"

"سیاست" اس تدبیر مدن کا نام ہے۔ جو کسی ملک و قوم کے ارتقائی و اصلاحی اسلوب کے متعلق سوچی جاتی ہے۔ اس میں دسیسہ کاری فریب اور جھوٹ کی ذرہ بھر ملاوٹ نہیں ہوتی۔ یہ عقل انسانی کے فطری علو کا ایک مظاہرہ ہے محض "طاقت" شرف انسانی کی دلیل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ یہ ہر جائز و ناجائز طریق سے پیدا ہو سکتی ہے۔ پس اگر عقل انسانی میں ملکۂ تدبیر کا وہ جوہر موجود نہ ہوتا۔ جو ہماری مشکلات و حیرانیوں میں ہماری صحیح صحیح راہنمائی کر سکتا۔ تو شرف انسانیت کے مقدس تخیل کی بھی کوئی ہستی و حقیقت نہ تھی۔ فلہذا پالیٹکس یا سیاست کی یہ تعریف ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کہ ہم ہر طرح کی فریب آلود چالوں سے اپنا مقصد حاصل کریں۔ بلکہ اس کے برعکس حالات و وضعیت موجودہ کا حل کچھ اس طرح سے سوچیں کہ ہماری تدبیرات ہمارے بالمقابل کے گرداگرد ایک ایسا پاکیزہ ماحول تیار کر دیں جو اس کے ہاں اپنے نفیس و پائدار اثرات چھوڑتا ہوا ہماری مقصد برآری کا ضامن بن سکے"

ظاہر ہے۔ کہ ڈپلومیسی جس میں خدع و فریب کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ یہ خاصیت و وصف پیدا کرنے سے قاصر و تہیدست ہے ڈپلومیسی تدبیر کی اس منزل کا نام ہے۔ جہاں مقصد پیش نظر کی تکمیل کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلہ و وسیلہ کو کام میں لایا جاتا ہے۔ گویا یہ ایک فن ہے جس سے دوسروں کو ہر ممکن طریق سے مغالطہ و فریب دے کر اپنے مفاد کو حاصل کیا جاتا ہے۔ یہاں قارئین کے بطور یادداشت ذہن نشین رہے۔ کہ کسی دوسرے سے سیاست برتتے وقت یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ اس کے آگے سارا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا جائے۔ اور اپنی تدبیر کی ان راہوں سے اسے واقف کر دیا جائے جن پر اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے چلنا لازمی ہوگا۔ بلکہ یہ صریحاً حماقت اور ابلہی ہوگی۔ احتیاط تو صرف اتنی لازمی ہے۔ کہ دیدہ و دانستہ فریب و مغالطہ دہی کی کوشش نہ کی جائے۔ اگر فریق مقابل بھی سیاست دان ہے۔ تو یقیناً اس کی اختیار کردہ تدابیر بھی ایسی ہونگی۔ جو جوابی کہلا سکنے کی مستحق سمجھی جائیں۔ اور اگر وہ از خود فریب کھا جائے۔ یا اس سیاست کو جو اس کے خلاف برتی گئی ہے۔ سمجھ ہی نہ سکے۔ تو اس کا ضعف و اضمحلال عین فطری ہوگا[1]۔ یعنی فطرت اور قدرت کے منشاد کے عین مطابق کسی کو دیدہ و دانستہ فریب دیا جانا اور کسی کا از خود فریب کھا جانا یا عقلی ارتقاء کے مدارج میں پیچھے رہ جانے کے سبب سے دوسرے کی سیاست و حکمت عملی کو نہ سمجھ سکنا ان دونوں میں بین فرق موجود ہے۔

یقیناً ہم اس کو شاطر نہیں کہیں گے۔ جو شطرنج کے کھیل پر اپنے بالمقابل کی اچانک بھول یا سہو نظر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کو شہ مات دیدے۔ بلکہ علو تدبیر کا تقاضا تو یہ ہے۔ کہ وہ اسے اپنے فکری اساس پر جیت جائے۔ کیونکہ اس

[1] ان مسائل کی گہرائی تک پہونچنے کیلئے میری تصنیف "خدا انسان اور مذہب" کا انتظار کیجئے۔

طرح مغلوب قانع و مطمئن ہو جائے گا۔ حالانکہ پہلی صورت میں وہ اصلیت معلوم کرنے پر غالب فریق کے اس بُرے طرزِ عمل کا شاکی بن بیٹھیگا۔ اور اسے خود بھی یہ خیال پیدا ہو جائے گا۔ کہ وہ دوسروں کی خطا و فراموشی سے اسی طرح ناجائز فائدہ اٹھایا کرے۔ شدہ شدہ یہی چیز عادت بن جاتی ہے۔ اور ہمارے سامنے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ جس کی تاثیرات ہم میں اس فن کو ترویج دیتی ہیں۔ جسے ہم **ڈپلومیسی** کہتے ہیں۔ یہاں سیاست سیاست نہیں رہتی۔ بلکہ ڈپلومیسی کی حاکمیت میں یہ ایک دوسرے درجہ کی شے بن جاتی ہے۔

پس میرے نزدیک "**سیاست**" براہ راست عقلِ انسانی کی مظہر ہے۔ مگر "ڈپلومیسی" حیلہ گری عقل کا نام ہے۔ اقبال بھی غالباً ایسا ہی کچھ سمجھ رہے ہیں ؎

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

اس فرق و امتیاز کے واضح ہو جانے کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے۔ کہ آیا دورِ حاضر کی دولتیں سیاست کے اصول پر کاربند ہیں۔ یا اپنی مطلب برآری کے لئے ڈپلومیسی برتنے کی عادی ہو چکی ہیں۔ اولین صورت میں اقوام و ملل کے ارتقاءِ عقلی کا آپس میں مقابلہ ہوگا۔ اور ہر وہ قوم جو اپنے درجۂ عقلی کے اعتبار سے دوسری سے بڑھ چڑھ کر ہوگی۔ اپنی سیاست میں کامیاب و منصور رہے گی۔ اور "بقائے اصلح" کے قانون کا حربہ قومِ مغلوبہ پر جاری ہو جائے گا۔ حتےٰ کہ وہ صفحۂ دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی۔ اس کی نہایت ہی زبردست توجیہہ یہ موجود ہے۔ کہ مغلوب قوم اس سیاست کے بالمقابل جو اس کے برخلاف برتی گئی ہے۔ اپنی کہتری کو چشمِ حقیقت سے مطالعہ کرے گی۔ اور اپنی شکست خوردہ

حالت پر قناعت کرے گی۔ اگر بعض صورتوں میں وہ زندہ بھی رہ گئی۔ تو اس کا وجود اس تنظیمِ عالم میں خوشامدانہ ہوگا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اگر اس ماحولِ سیاست کے اپنے اندر جو اس کے برخلاف برتا جا رہا ہے کسی قسم کا خلل پڑ جائے۔ تو اس کی حیات "تنازع للبقا" کے قانون کے ماتحت پھر مصروفِ تگ و دو نظر آئے گی۔ یہاں یہ واضح رہے۔ کہ یہ خلل مغلوب قوم اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیتوں کے پیدا کر لینے سے بھی وارد کر سکتی ہے۔

دوسری صورت میں اگر اقوام و مللِ عالم کا عام انحصار ڈپلومیسی پر ہے۔ تو بقائے اصلح کا قانون فطری طور پر اپنے اثرات و نتائج ظاہر نہیں کرے گا۔ یہ تو ہو سکتا ہے۔ کہ ایک قوم اپنی وسیع طاقتوں اور وسیلوں کو کام میں لاتے ہوئے ایک مدت تک کے لئے کسی دوسری قوم کو اپنی محکومیت میں لے آئے۔ یا اس پر اپنا تسلط و تفوقِ سیاسی قائم کرے۔ لیکن وہ کبھی اس کو مٹا نہیں سکے گی۔ یہاں طرفین پر ایک ہی قانون "تنازع للبقا" کا عمل و دخل جاری ہوگا۔ ہر دو طرف اپنی زندگی و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہیں گے۔ اور یہ ان کی آپس کی کھینچا تانی کسی ایک کو دوسری کی تقدیر کا مالکِ کل نہیں بنا سکے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو کوئی محکوم قوم اپنی غلامی و عبدیت سے کبھی نجات حاصل نہ کر سکتی۔ "تنازع للبقا" کے قانون کے ماتحت نئی قومیں یا حکومتیں جنم تو پا سکتی ہیں۔ لیکن مٹائی نہیں جا سکتیں۔

مقصدِ زیرِ بحث کو زیادہ صاف صورت میں سمجھنے کے لئے فرض کر لیجیئے۔ کہ ا۔ ب۔ ج۔ د اور ہ پانچ مختلف دولتیں یا قومیں ہیں۔ یہ سب کی سب مستقل اور آزاد ہیں۔ اور ان سب کا اصول ڈپلومیسی سے اپنی زیست کو برقرار رکھنا ہے۔ اب چونکہ اصولِ حیات ڈپلومیسی ہے۔ اس لئے ہر واحد دولت دوسری دول کے بالمقابل جو پالیسی یا تحریک بھی جاری کرے گی

ا۔ Parasitic

اس میں ایسی جزئیات ضرور شامل ہونگی - جو اپنی مقصد برآری و مفاد کی غرض سے اس طرح استعمال میں لائی جائیں - جن کی "اخلاقِ انسانی" کسی طرح بھی اجازت نہ دیتا ہو - گویا اس طرح ہر دولت و حکومت کی پالیسی اپنے حق میں فائدہ مند مگر دوسروں کے حق میں ضرر رساں - یا اپنے لئے زیادہ فائدہ مند اور دوسروں کے لئے کمتر ہو گی - یہ آخری صورت الف حکومت اس وقت اختیار کرے گی - جبکہ (۱) ب حکومت کو اتنا فائدہ پہونچانے سے اسے ج - د یا ہ کو نقصان پہونچانا مقصود ہو - یا (۲) خود ب سے استفادہ کرنے کی مزید توقعات لگ رہی ہوں - اور اپنی دوستی و صمیمیت کا اسے یقین دلایا جانا مدِ نظر ہو - اور یا (۳) الف کی اپنی اختیار کردہ پالیسی ہی ایسی ہو جس سے ب کو خود بخود فائدہ پہونچ جائے ۔

اب الف کی اختیار کردہ پالیسی کا علم جب دوسری دول ب - ج - د اور ہ کو ہو گا تو یہ پالیسی چونکہ کسی نہ کسی طرح ان میں سے ہر ایک پر اثر انداز ہو گی - اس لئے دول ب - ج - د اور ہ تعلقات پیشینیہ اور اپنے اپنے مفاد کے پیش نظر چند حلقوں میں تقسیم ہو جائینگی جس دولت کے مفاد الف سے موافقت کریں گے - وہ اس کے ساتھ موافقت کرنے لگ جائے گی - اور جس کے مفاد اس کی ضد پر ہوں گے - وہ اس کے برخلاف ہو جائینگی - پھر یہی حلقے اپنے اجتماعی رنگ میں اپنی ذات کی مدافعت اور اپنے مخالف حلقوں کے اثر و اقتدار کو کم کرتے رہنے میں مشغول نظر آئیں گے - اور اس طرح آپس میں ایک دوسرے کی تائید و قوت پا کر اپنے اپنے اعضاء کی انفرادی ہستی و زندگی کے ضامن بن جائیں گے - بلکہ مسئلۂ متعلقہ کے باب میں میری تحقیق تو مجھے یہاں تک کہنے پر مجبور کر رہی ہے - کہ اگر کسی ایک واحد دولت کے برخلاف دوسری متخاصم دول متحد بھی ہو جائیں - تو پھر بھی ان کی آپس کی باہمی رقابت اس واحد دولت کی زندگی کی دلیل بن جاتی ہے - کیا موجودہ ترکی سلطنت اس کی زندہ مثال نہیں ہے ؟

ترکوں نے جنگ عظیم میں شکست کھائی - اور اس کے ساتھ ہی ان کی حکومت میں

ایک تغیر عظیم واقع ہوا۔ حکومت کے کرتا دھرتا قسطنطنیہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اتحادی فوجیں پایہ تخت میں آکر جم گئیں۔ عساکر وطنی کو بزور منتشر کر دیا گیا اور رعیت کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ نئی حکومت جو اتحادیوں کے آلۂ مطلب برآری کے طور پر قائم کی گئی۔ اس کا عدم و وجود برابر تھا۔ اس طرح کے مایوس کن حالات میں ایشیائے کوچک میں بمقام انقرہ چند بھگوڑے نوجوانوں کی ایک حکومت تشکیل ہوتی ہے۔ جس کی تاسیس کے وقت میری اطلاعات کے بموجب ان حریت نواز نوجوانوں کے پاس جو خزانہ دولت موجود ہوتا ہے۔ اس کی مجموعی رقم پینتیس ۳۵ پونڈ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اتحادی جو اپنی دانست میں ترکی قوم و سلطنت کو کب کا مٹا چکے ہوتے ہیں۔ اس تازہ خطرہ سے چونکنے ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض فوراً یونان کو ہر طرح کے ساز و سامان سے مسلح کر کے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی حکومت کے برخلاف میدان میں اتار دیتے ہیں۔ پھر جو ہوتا ہے۔ وہ دنیا بھر کو معلوم ہے۔

پس قارئین محترم! میرا علم و تجربہ مجھے اس بات پر مجبور کر رہا ہے۔ کہ میں اس امر کو صاف صاف طور پر جھٹلا دوں۔ کہ غازی امان اللہ خان کے زوال کا باعث انگریز تھے۔ انگریزوں میں یہ قدرت کہاں تھی۔ کہ غازی امان اللہ خان کی حکومت کو اس طرح سے محو کر سکتے۔ یہ جو کچھ ظہور میں آیا۔ خود غازی ممدوح کے غلط افکار و تدبّر کا نتیجہ تھا۔

کیا فی الواقعی انگریزی سیاست اتنی قدرت اپنے اندر پیدا کر چکی ہے۔ کہ وہ ایک دوسری مملکت میں جس طرح چاہے۔ دراندازی کرے جس سے چاہے۔ حکومت چھین لے اور جس کو چاہے حکومت بخش دے۔

میرے نزدیک ایسا خیال قائم کر لینا ایک ایسی کوتاہ فکری ہے۔ جس سے زندگی گھٹ کر ایک بے جان شئے رہ جاتی ہے۔

انگریزوں سے اپنے ڈیڑھ سو سالہ قیام و دوام سلطنت میں اب تک یہ تو ہو نہ سکا۔

کہ وہ ماورائے سرحد ہندوستان کے آزاد قبائل کو براہ راست اور باقاعدہ طور پر اپنی سلطنت میں ملحق کر لیتے۔ حالانکہ ایسا کرنے میں نہ تو ان کو کسی قسم کی قانونی دشواریاں درپیش تھیں اور نہ ہی ان پر کسی خارجی سلطنت کا دباؤ ہی موجود تھا۔ پھر بھی نہیں۔ کہ انہوں نے ہمت اور قسمت آزمائی نہ کی ہو۔ بلکہ بیسیوں مرتبہ ان قبائل کے برخلاف مہمیں بھیجی گئیں۔ جن کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ نکلا۔ کہ حکومت ہندوستان سر بار کثیر مصارف فوجی کی زیربار ہو جاتی رہی۔ صرف طاقت و نمائش کے استعمال پر ہی بس نہیں کی گئی۔ بلکہ انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ وہ ڈپلومیسی بھی برتی گئی۔ (اور اب تک برتی جا رہی ہے) جس کے متعلق لوگوں کو وہم سا ہو گیا ہے۔ کہ وہ جس قوم یا حکومت کے برخلاف برتی جائے۔ اس کا محو و نابود ہو جانا مقدرات کا ایک فیصل شدہ جزو ہوتا ہے؛

جب اس قدر طویل عرصہ میں اتنا کچھ بھی انجام نہ پا سکا۔ تو یہ کیسے ممکن تھا۔ کہ صرف دس سال کے قلیل عرصہ میں وہ امان اللہ خان کی ایک مستقل حکومت کا تختہ الٹ دینے میں کامیاب ہو سکتی۔ لہذا جہاں تک یہ کہا جاتا ہے۔ کہ انگریزی ڈپلومیسی نے افغانستان کے تاجدار کو یہ روز بد دکھلایا۔ یہ سراسر غلط اور گمراہ کن ہے؛

جو کچھ گذشتہ ابواب میں بیان ہو چکا ہے۔ قارئین کے پیش نظر ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ افغانستان کا ملک اپنی عمرانی زندگی کے کس دور میں سے گذر رہا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہے۔ کہ اس عمرانی دور کی خصوصیات کے ماتحت کسی ملک میں بغاوتوں شورشوں اور انقلابات کا وقوع میں آنا اٹل اور مقدر تھا۔ ان کو اس بات کا بھی پتہ چل گیا ہے۔ کہ ایسی شورشیں اور بغاوتیں کن حالات میں دب جایا کرتی تھیں۔ اور کن حالات کے ماتحت یہ ایک کامیاب انقلاب کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ لہذا ان تمام حقائق کی موجودگی میں صرف ایک ہی بات ممکن القیاس رہ جاتی ہے۔ (اور اسے ہی ہم نے یہاں پر دیکھنا ہے۔) کہ ایسے اوقات میں جب کہ کسی ملک میں اس قسم کے فتنہ و فسادات واقع ہو رہے

ہوں۔ کسی ہمسایہ دولت کا جس کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ ہوں۔ معاندانہ و مخالفانہ طرزِ عمل اُسے کیا کچھ نقصان پہونچا سکتا ہے؟

غازی امان اللہ خان کے عہد میں بغاوت کی آگ مُلک میں دوسری بار بھڑکی تھی۔ اور جو اسباب اس بغاوت کے دوبارہ مشتعل ہونے کے لئے فراہم ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک بھی براہ راست برطانوی ڈپلومیسی کا پیدا کردہ نہ تھا۔ فلہذا یہ امر کہ انقلاب کے شروع کرنے میں برطانوی ہاتھ کسی طرح بھی متحرک و کارفرما نہ تھا۔ بالکل صاف ہے اب رہی یہ بات کہ بغاوت کی ابتدا سے لیکر بچہ سقاؤ اور پھر غازی محمد نادر خان کی کامیابی تک انگریزی ڈپلومیسی کا کیا رنگ رہا۔ سو اُسے ہم یہاں ایسی ترتیب و التزام کے ساتھ دیکھینگے جس سے مذکورۃ الصدر بیان پر بھی مزید روشنی پڑتی جائے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ امر تحقیق کرنا پڑے گا۔ کہ آیا برطانوی حکومت کے ساتھ حکومت امانیہ کے تعلقات دوستانہ تھے یا مخالفانہ۔ اور دوسری بات یہ کہ اگر وہ فی الواقعی معاندانہ یا مخالفانہ تھے۔ تو آیا وہ اس حد تک تجاوز کر چکے تھے۔ جہاں برطانوی حکومت کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی باقی نہ رہ جاتا تھا۔ کہ وہ جس قیمت پر بھی میسر آسکے۔ حکومت امانیہ کا تختہ الٹ کر رکھ دے۔ اور تیسرے یہ کہ اگر برطانوی ڈپلومیسی اس بارہ میں اُسی ایک مقصد کو سامنے رکھ کر قائم ہو چکی تھی۔ تو اسے اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لئے کس طریق عمل کو اختیار کرنا چاہئے تھا۔

ان ساری باتوں کو تحقیق کر لینے کے بعد جو کچھ باقی بچے گا۔ صرف وہی الزام کی صورت میں حکومت برطانیہ کے سر تھوپا جا سکے گا۔

یوں متخاصم اور مخالف گروہوں کا ہر جگہ یہ قاعدہ ہے۔ کہ وہ اپنی کمیوں کو اپنے حریفوں کے سر چڑھ کر پورا کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں۔ تو خود ان کی پوزیشن سخت نازک ہو جائے۔ کیونکہ پھر انہیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑ جائے۔ کہ جو کچھ ظہور میں آیا

ہے۔ اُن کی اپنی ہی غلط کاریوں اور لغزشوں کا نتیجہ ہے ۔

اور یہی اعتراف آج کی دنیا میں سخت مشکل ہے ۔

میری دانست میں غازی امان اللہ خان سے اگر کوئی یہی سوال کر بیٹھے۔ تو وہ بھی شاید دنیا میں برطانیہ کے مخالف عنصر کی ہمدردی وحمایت حاصل کرنے کے لئے یہی کہہ دینگے۔ کہ یہ برطانوی ڈپلومیسی ہی تھی جس نے انہیں اس روز بد سے دوچار کیا۔ حالانکہ اس جواب کے اس طرح ادا ہوتے ہی حقائق بین عنصر ان کے عہد کے اعلانات و عزائم کی روشنی میں انہیں ایک سادہ لوح بیوقوف سے زیادہ وقعت نہ دے گا ۔

میں غالباً پیشتر بھی لکھ چکا ہوں۔ کہ جہاں تک غازی امان اللہ خان کی خارجی حکمت عملی کا تعلق تھا۔ وہ گو اغلاط سے پاک نہ سہی۔ تاہم ایسی بُری نہ تھی۔ جس کی صدائے بازگشت اس داخلی انقلاب میں کوئی گونج پیدا کر سکتی۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ غازی امان اللہ خان کا رجحان طبیعت زیادہ تر روسیوں کی جانب تھا۔ تاہم اس کے دو سبب تھے۔ پہلا سبب افغانوں کا طبعی میلان جو ہمیشہ سے انگریزوں کے برخلاف رہا کیا۔ اس میں غازی امان اللہ خان ٹھیک اسی طرح مجبور تھے۔ جس طرح ایک ادنٰے اور عامی افغان۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا۔ خود امیر عبدالرحمٰن اور امیر حبیب اللہ خان بھی باوجود انگریزوں کے طرفدار اور دوست شمار ہونے کے اس جذبۂ مخالفت سے پاک نہ تھے۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ کہ جب امیر عبدالرحمٰن خان کے عہد میں اس کا بڑا بیٹا سردار نصر اللہ خان انگلستان جاتے ہوئے ہندوستان سے گذرا ہے۔ تو اس کی یہ کیفیت تھی۔ کہ جب کبھی وہ انگریزوں سے مصافحہ کر کے فارغ ہوتا تھا۔ اسی وقت طشت میں صابون سے ہاتھ دھو کر پونچھ لیا کرتا تھا۔ کیونکہ اس کے نزدیک انگریزوں کے ہاتھ نجس اور ناپاک تھے۔

حالانکہ وہ اپنے مذہب کی رُو سے یہ امر اچھی طرح جانتا تھا کہ انگریز عیسائی اور اہل کتاب بھی ہیں۔ اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تک جائز ہے۔ مگر وہ کسی طرح بھی اپنی افغانی عصبیت کا مظاہرہ کرنے سے باز نہ رہ سکتا تھا۔ ایسی عصبیت کے مٹنے کے لئے مدتیں درکار ہوتی ہیں۔ فلہذا امان اللہ خان کو جو چیز قومی اور نسلی وراثت میں ملی ہوئی تھی۔ وہ موافق مواقع پا کر کیونکر اپنے اظہار سے قاصر رہ سکتی تھی ٭

دُوسرا سبب مُلکی تھا۔ افغانستان دو رقیب سلطنتوں کے درمیان واقع تھا۔ جسے انگریزوں کی سلطنت بفر سٹیٹ (Buffar state) کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ اور متمنی تھی۔ کہ یہ ہمیشہ اسی طرح سے قائم رہے۔ غازی امان اللہ خان نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی اپنے استقلال اور آزادی کا اعلان کر کے ان کی اس تمنا کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا تھا۔ لہذا امان اللہ خان کے لئے یہ ایک طبعی امر تھا۔ کہ وہ انگریزی سلطنت کی پالیسی متعلقہ افغانستان کو ایک خاصی مدت تک تردد و اشتباہ کی نظروں سے دیکھتا رہے۔ چنانچہ اس تردد و اشتباہ کی جھلک صاف اور نمایاں طور پر اس کی بیشمار تقریروں میں پائی جاتی تھی ٭

اس کے برعکس جہاں تک روسیوں کا تعلق تھا۔ ایسی کوئی بات موجود ہی نہ تھی افغانوں کی پوری قوم ملک کے جنوب و مشرق میں آباد تھی۔ اور من حیث الکل انہیں روسیوں سے کبھی سابقہ ہی نہ پڑا تھا۔ وہ قلیل ترین افغانی قبائل جو ترکستان و ہرات کی طرف آباد تھے۔ وہاں کے ترکی النسل باشندوں کے خلط ملط سے جن کا پیشہ زیادہ تر کھیتی باڑی کرنا اور ریوڑ پالنا تھا۔ امن پسند واقع ہو چکے تھے۔ اور اپنی افغان عصبیت کو کھو بیٹھے تھے۔ وہ روسیوں کے متعلق برسوں سے صرف یہی کچھ جانتے چلے آتے تھے۔ کہ وہ انگریزوں کے دشمن ہیں۔ اور ہندوستان پر چڑھائی کرنے کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اتنا اور جانتے تھے۔ کہ انگریزوں کی طرح وہ بھی کافر ہیں۔

بس اس سے زیادہ وہ ان کی نسبت اور کچھ نہ جانتے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر افغانی قوم روسیوں سے اب تک بیگانہ و ناآشنا ہی تھی۔ اور وہ تعصب و جذبۂ ملی جو بوجہ قربتِ آبادی کے ان میں انگریزوں کے برخلاف پیدا ہو چکا ہوا تھا اس کا عشر عشیر بھی روسیوں کے برخلاف موجود نہ تھا۔

تاہم سنہ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد جب بالشویکوں کے متعلق طرح طرح کی باتیں ان کے سننے میں آئیں۔ تو وہ ان کو مذہب کا دشمن خیال کرنے لگ پڑے تھے۔ افغانوں کے ایک حصہ کو ان سے انگریزوں سے بھی بڑھ کر نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

پس جہاں تک افغانی ذہنیت کا تعلق ہے۔ اس باب میں غازی امان اللہ خان کو نسلی و قومی اعتبار سے روسیوں کے برعلیہ یا ان کی موافقت میں کوئی خاص ورثہ نہیں ملا تھا۔ بلکہ وہ اپنے عہد کے آغاز میں چونکہ ٹھیٹھ مذہبی رنگ میں اپنی ہر دلعزیزی کی فتوحات میں مشغول تھا۔ اس لئے کچھ تو مذہبی تاثرات کی بنا پر اور زیادہ تر اس خوف کی وجہ سے کہ مبادا اس کے ملک کا حشر بھی بخارا کی طرح نہ ہو جائے۔ وہ روسیوں کو بھی نہایت ہی مشکوک اور مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ غازی جمال پاشا کا بیٹا ترکیہ کا وزیر بحری جب چالیس پچاس افسروں کی جمعیت کے ساتھ سنہ ۱۹۲۰ء کے موسم سرما میں روس کی سرحد کو عبور کر کے افغانستان میں پہونچا ہے۔ تو گو اس کی عزت و توقیر میں افغانی حکومت نے فروگذاشت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ پھر بھی وہ اپنے قلیل دورانِ قیام میں اس الزام سے نہ بچ سکا۔ کہ وہ روسیوں کا تنخواہ دار اور ان کا فرستادہ ایجنٹ ہے۔

لہ غازی جمال پاشا نے افغانی فوج کو ترکی فوج کے اساس پر تیار کرنے کی ایک سکیم پیش کی تھی۔ جسے حکومت امانیہ نے بطور تجربہ آزمانے کیلئے اول الذکر کو پانچ ہزار رنگروٹ مہیا کر دئے تھے۔ اور ان کو قطعۂ نمونہ کا نام دیا تھا۔

اور اگر خوش قسمتی سے خود غازی امان اللہ خان ترکی زبان میں بہرۂ کامل نہ رکھتا ہوتا۔ تو ان دو شخصیتوں میں کسی طرح مفاہمت ممکن نہ تھی۔ اور کچھ تعجب نہ تھا۔ کہ غازی جمال پاشا کو بُری طرح افغانستان سے نکلنا پڑتا ٭

میں ان دنوں قطعۂ نمونہ میں غازی جمال پاشا کی سرکردگی میں فوجی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ ایک شام تمام ترکی افسروں کو جمع کر کے ان کے کمانڈر رضا بیگ نے انہیں دوسرے ہی دن افغانستان سے کوچ کر جانے کا حکم سُنا دیا تھا۔ اور چونکہ اس حکم میں مجھے بھی شامل سمجھا جا رہا تھا۔ اس لئے میں نے متعجب ہو کر اس دفعتہً کوچ کر جانے کی وجہ دریافت کی۔ تو ضیا بیگ نے مجھ سے کہا۔ کہ مجھے معلوم نہیں۔ ابھی ابھی ٹیلیفون پر حضرت لری جمال پاشا نے ایسا حکم دیا ہے۔ اور ساتھ ہی تمہیں بھی فوری اپنے حضور میں طلب کیا ہے۔ چنانچہ جب میں غازی جمال پاشا کے ہاں پہونچا۔ تو ان کے اسٹاف میں بھی ہر طرف بھاگڑ سی مچی ہوئی تھی۔ میں نے پاشا کے سکرٹری سے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ کہ آخر یہ کیا بات ہے۔ تو اس نے مجھے جواباً کہا۔ کہ گھبراؤ نہیں۔ تمہاری سیاحت اروپا (یورپ) کا بندوبست ہو رہا ہے۔ اس سے ملکر میں مولانا[1] برکت اللہ صاحب مرحوم و مغفور کے کمرے میں گیا۔ تو وہ ہنستے ہوئے گویا ہوئے۔ کہ لو بھئی تیار رہو۔ کہ اب ہمارا یہاں سے کوچ ہے۔ میں نے عرض کی۔ کہ آخر ہوا کیا گیا۔ تو وہ کہنے لگے کہ " پاشا نے اعلیحضرت کی خدمت

---

[1] آپ بھوپال کے رہنے والے تھے۔ اور سب سے پہلے ہندوستانی تھے۔ جو آزادئ وطن کی تڑپ سے بیتاب ہو کر ہندوستان سے یوروپ کی طرف ہجرت کر گئے ہوئے تھے۔ آپ ساری عمر یوروپ اور امریکہ میں پھرتے رہے۔ جہاں کی حکومتیں اور لوگ یکساں طور پر ان کا احترام کرتے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران میں آپ اس وفد میں شامل کئے گئے۔ جسے قیصر ولیم اور ترکی سلطنت نے افغانستان کو اپنے ساتھ ملانے کی خاطر امیر حبیب اللہ خان کے دربار میں روانہ کیا تھا۔ اس وفد کا صدر راجہ مہندر پرتاب تھا۔ اور اگرچہ اس وفد کو کسی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا۔ کہ افغان نوجوانوں کی رگ حمیت ترکوں اور خلافت کیلئے ضرور پھڑک اٹھی تھی۔ مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی ۱۹۲۷ء میں بمقام سان فرانسسکو فوت ہوئے۔

میں عرض کردی ہے۔ کہ انہیں رخصت کردیا جائے۔ اور غالباً کل تک تمام بندوبست ہوجائیگا
اس کے ساتھ میں جمال پاشا کی خدمت میں پہونچا۔ تو وہ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ کہ
"عزیز آفندی" اینہا نیک و بد خود را نمے شناسند۔ من میروم۔ ترجمہ "یہ لوگ اپنے
نیک و بد میں تمیز نہیں کرسکتے۔ میں جارہا ہوں"

قارئین کی سمع خراشی کرنے سے صرف اسی قدر جتلانا مقصود تھا۔ کہ غازی امان اللہ خان
اپنے ابتدائی عہد میں روسیوں کو بھی کسی طرح اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ جمال پاشا جیسی زبردست
شخصیت سے بھی محض اس وجہ سے بگاڑ بیٹھا تھا۔ کہ اس کی نسبت اسے شبہ ہوگیا تھا۔ کہ
وہ افغانستان میں بالشویکوں کے خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے آیا ہے۔ اور گو یہ غلط
فہمی آپس کی بالمشافہ گفتگو سے بہت حد تک رفع ہوگئی تھی۔ تاہم یہ ہنوز اسی کا اثر تھا
کہ صرف تھوڑے ہی عرصہ بعد غازی جمال پاشا کو کسی حیلہ سے یوروپ کی طرف رخصت
کردیا گیا۔ جہاں سے اسے پھر واپس لوٹنا نصیب ہی نہ ہوا[سلہ۵]۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ کہ باایں ہمہ کہ غازی امان اللہ خان کا دلی میلان انگریزوں
کی طرف نہ تھا۔ پھر بھی حکومت کی ذمہ داریوں اور ملک کی اقتصادی و تجارتی ترقیات کے
لئے وہ مجبور تھا۔ کہ روسیوں سے بیشتر انگریزی سلطنت کی طرف تعاون و مواخات کا ہاتھ
بڑھائے۔ مگر یہ سب کچھ اس احتیاط کے ساتھ عمل میں آئے۔ کہ افغانستان انگریزوں کے
ہاتھ میں محض ایک کٹھ پتلی بن کر نہ رہ جائے۔

غازی امان اللہ خان اس بات کو خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ انگریزی سلطنت کو
زمانۂ امن سے کہیں زیادہ حرب و ضرب کی حالت میں اس کی دوستی محبوب و مطلوب ہے۔
تاکہ وہ افغانستان کی بشری طاقت (Man Power) کو اپنے مدعی و غنیم
کے برخلاف استعمال کرسکے۔ یہ اہم مسئلہ بارہا افغان مدبرین کے زیر بحث رہا۔ کہ جس صورت میں

سلہ۵ غازی جمال پاشا باطوم میں چند نامعلوم اشخاص کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔

انگریزوں اور روسیوں کے مابین جنگ واقع ہوجائے۔ اس صورت میں افغانستان کا اپنا طرزِ عمل کیا کچھ ہوگا۔ آیا وہ غیر جانبدار رہ سکے گا؟ اگر نہیں۔ تو پھر وہ روسیوں اور انگریزوں میں سے کس کا طرفدار بنے گا؟ روسیوں کا یا انگریزوں کا؟

دونوں حالتیں افغانستان کے لئے قاطع حیات تھیں۔ اگر وہ انگریزوں کا طرفدار بنکر روسیوں سے جنگ کرتا ہے۔ تو اس صورت میں انگریزی فوجیں افغانی فوجوں سے دوش بدوش روسیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے مملکت افغانستان میں آ ڈیرے ڈالتی ہیں۔ اور پھر یا جنگ ان کی فتح کی صورت میں اختتام پذیر ہوتی ہے۔ یا ان کی شکست و اضمحلال کی شکل میں۔ پہلی صورت میں ہزیمت یافتہ روسی اس بین الاقوامی اثر کو ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ جو انگریزوں کے ہاتھ سے وسط ایشیا کی حکومتِ افغانستان کی حیات و زندگی کے لئے ایک ضامن تھا۔ اب انگریزوں کو روسیوں کا کوئی ڈر باقی نہیں رہ جاتا۔ وسط ایشیا میں صرف وہی اکیلے رہ جاتے ہیں۔ افغانستان پر ان کا عملاً قبضہ ہوتا ہے۔ وہ روس میں بالشویکوں کے پھر سر نہ اٹھانے کی احتیاط و تدابیر اختیار کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ کہ براہ راست افغانستان و بخارا کی راہ سے اپنی نگرانی قائم رکھیں۔ لہٰذا ان حالات میں افغانستان کسی طرح بھی اپنا استقلال قائم نہیں رکھ سکتا۔ اور شاید اپنی سابقہ حالت پر آجاتا ہے؟

لیکن اگر بدقسمتی سے روسی غالب رہے۔ تو اس صورت میں یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ فاتحین کا سلوک افغانستان سے بہت بُرا ہوگا۔ وہ شاید اس کو کچل کر رکھ دیں گے اور اپنے عزائم کے ماتحت یہ بھی عجیب نہیں۔ کہ وہ اسے سویٹ روس کے ساتھ ملحق کرلیں؟

بعینہٖ اگر افغانستان انگریزوں کے برخلاف روسیوں سے اتحاد کرتا ہے۔ تو روسی فوجیں افغانستان میں آ داخل ہونی ناگزیر ہیں۔ تاکہ وہ افغانی فوجوں کے ساتھ مل کر ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے سینکڑوں میل لمبا محاذ قائم کرسکیں۔ اور ادھر انگریزی فوجیں افغانستان میں گھس کر "کوہ سیاہ (Black Maun Taine)

کے ساتھ ساتھ اپنا محاذ قائم کرنے کی کوشش کرینگی۔ اس جنگ کا نتیجہ بھی یہی کچھ ہوگا۔ کہ یا روسی وافغانی فتحیاب نکلینگے۔ اور یا انہیں شکست وذلت نصیب ہوگی شکست کی صورت میں انگریزوں کے ہاتھوں افغانستان کی تباہی وبربادی لازمی اور یقینی ٹھہرتی ہے۔ لیکن فتح کی صورت میں جبکہ بالشویک فتح وظفر کے پھریرے ہندوستان میں لہرا رہے ہوں گے۔ افغانستان کے استقلال وحیات کے لئے وہی مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ جو انگریزی وافغانی فتحمندی کی صورت میں پیش آیا تھا ؎

پس افغانستان کا بادشاہ یہ خوب جانتے ہوئے تھا۔ کہ ان ہر دو صورتوں میں اس کا ملک ہی خطرہ میں ہے۔ اس لئے اس کے لئے ایک ہی راہ موجود تھی۔ کہ اسے امن کا جس قدر طویل اور دراز زمانہ ہاتھ لگ سکے۔ اسے وہ ہر طرح سے اپنے آپ کو مضبوط اور طاقتور بنانے میں صرف کرتا رہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ ہر دو حکومتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے بغیر ممکن نہ ہوسکتا تھا۔ لہذا یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ کہ افغانستان انگریزوں کے برخلاف روسیوں سے اس قسم کا کوئی اتحاد قائم کرسکتا تھا۔ جس سے انگریزی حکومت اس قدر خطرہ محسوس کرنے لگ جاتی۔ کہ وہ اس ملک کے تاجدار کو تخت سلطنت سے محروم کروانے کے سوا اور کوئی اپنا چارہ کار رہی نہ پاتی ؎

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ کہ ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں کو زمانہ امن سے کہیں زیادہ جنگ وحرب کے دوران میں افغانستان کی دوستی کی ضرورت واقع ہو سکتی تھی۔ تاکہ وہ اس کی "قوت بشری" کو اپنے اپنے طور پر استعمال کرسکیں۔ لہذا ان ہر دو سلطنتوں کے لئے بھی یہ امر بمنزلہ لزوم کے تھا۔ کہ وہ اپنے اپنے سفرار کی وساطت سے افغانی حکومت کو اپنی صمیمانہ دوستی کا یقین دلاتے رہیں سفرار ایسے کرنے سے ہرگز نہ چوکتے تھے۔ بڑے سے بڑے معاملہ سے لے کر

نہایت ہی چھوٹی چھوٹی اور حقیر باتوں تک کے لئے افغانستان کی وزارت خارجہ ان کی باہمی رقابت و ہچشمی کا اکھاڑہ بن جایا کرتی تھی۔ مثلاً اگر انگریزی سفیر کو کہیں سے یہ اطلاع ملی ہے۔ کہ حکومت افغانستان روسیوں کو مزار شریف سے کابل تک سڑک تعمیر کرنے کا کام سونپ رہی ہے۔ تو جھٹ انگریزی سفارت کی طرف سے بھی اسی قسم کا پیش نہاد (Proposal) حکومت امانیہ کے سامنے رکھدیا گیا ہے۔ اور اگر کبھی روسیوں کو خبر لگ گئی ہے۔ کہ افغانی حکومت نے انگریزی سفارت کو یہ مراعات دی ہیں۔ کہ سفارت کی خاص موٹریں کسٹم ہوس کے افسروں کا معائنہ کئے بغیر آمد و رفت کر سکیں گی۔ تو وہیں روسیوں نے بھی اسی قبیل کا ایک مطالبہ وزارت خارجہ کے پاس بھیجدیا ہے۔

اور اگر کسی خاص موقع پر وزارت خارجہ ان دولتوں کے اس قبیل کے پیش کردہ مطالبات میں سے بعض کو منظور نہیں کر سکی۔ تو جس دولت کی طرف سے ایسے مطالبے کئے گئے ہیں۔ اس نے گویا یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ حکومت امانیہ کا رویہ اس کے متعلق دوستانہ نہیں ہے۔ مگر باایں ہمہ اس نے اپنی مزید کوششوں سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بلکہ مختلف ذرائع سے وزارتِ خارجہ کی توجہ کو اپنی طرف پھر جذب کرنے کی سعی لگاتار جاری رکھی ہے۔

چنانچہ افغانستان میں انگریزی اور روسی سفارتیں مدام اسی قسم کی کشمکش میں مبتلا دیکھی گئی ہیں۔ اور بین الاقوامی "بساطِ سیاست" پر افغانستان کو اپنے اپنے پلّے پر دکھلانے کے لئے خود افغانستان کے اندر اپنے اپنے جنبہ دار گروہ پیدا کئے جاتے رہے ہیں۔ تاکہ ان کی وساطت سے حکومت امانیہ کی توجہ کو مدام اپنی طرف مائل و راغب رکھا جائے۔

اس ضمن میں شروع ہی سے افغانستان میں دو گروہ موجود تھے۔ ایک وہ جو

انگریزوں کا طرفدار اور دوست گروہ شمار ہوتا تھا۔ اور دوسرا ان کا دشمن و مخالف۔ عہد امانیہ سے پہلے یہ دشمن یا مخالف گروہ کسی تیسری خارجی سلطنت کا پیدا کردہ نہیں تھا۔ بلکہ براہ راست افغان عصبیت اس کی تخلیق کی ذمہ وار تھی۔ اب عہد امانیہ میں چونکہ ملک کو استقلال نصیب ہو چکا تھا۔ اور اس کے بین الاقوامی تعلقات دیگر دول عالم بالخصوص روسی حکومت سے قائم ہو چکے تھے۔ لہٰذا بدیہی تھا۔ کہ یہ "مخالف برطانیہ گروہ" برطانیہ کے ایک قوی ترین رقیب کو موجود پاکر اپنی مخالفت کے اظہار میں اور بھی شدت ظاہر کرتا اور اس کا یہ فعل عالم سیاسیات میں روسیوں کی شہ کا نتیجہ سمجھا جاتا۔ روسی بھی اس واقعیت سے فائدہ اٹھانے سے محروم نہ رہ سکتے تھے۔ اور اب جبکہ وہ خود میدان میں تھے۔ وہ بھی اپنا جنبہ دار گروہ پیدا کرنے کے لئے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی۔ کہ امان اللہ خان کی جدید خیالی نے انہیں اس باب میں کافی سہولتیں بہم پہونچا دی تھیں۔ نوجوان طبقہ میں ایسے افراد کثرت سے پیدا ہو رہے تھے۔ جو مذہب کی دو بھر زنجیروں کو توڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ اور اس ضمن میں روسی تائید ہمہ وقت ان کی پیشوائی کے لئے حاضر رہتی تھی۔ وہ کمال فرحت و انبساط کے ساتھ ان سے میل جول کرتے تھے۔ اور کابل میں روسیوں کی بہتات و کثرت نے اس میل جول کو عام کر رکھا تھا۔ بیسیوں روسی ہوا باز افغانستان کے محکمہ ہوائی میں مستخدم تھے۔ جو اپنے اہل و عیال سمیت مختلف جگہوں اور ہوٹلوں وغیرہ میں قیام کرتے تھے۔ اور اس لئے یہ افغانی نوجوانوں کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ کہ وہ اس تہذیب جدید کے اثرات کو اور بھی جلد قبول کر لیتے۔ اس طرح کوئی شک نہیں۔ کہ عہد امانیہ میں روسیوں نے بھی اپنا ایک با اثر حلقہ پیدا کر لیا ہوا تھا ۔

شاید ان کو اس میں اس درجہ کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ لیکن یہ ان کی خوش قسمتی تھی۔ کہ انگریزوں کی ضرب المثل سوشل کنارہ کشی[1] انہیں بلا روک ٹوک اس میدان میں اپنے پاؤں پھیلانے کے موقع بہم پہونچا رہی تھی۔ انگریز اس لحاظ سے بہت پست ہمت واقع ہوئے ہیں۔ ان میں اس کنارہ کشی کا جذبہ افراط کی ان منزلوں پر پہونچا ہوا ہے۔ کہ وہ مشرق کے لوگوں کے ساتھ میل جول کرنے میں عار سمجھتے ہیں۔ یہ کنارہ کش خودداری جہاں دوسروں پر اپنے عامل کا رعب طاری کئے رکھتی ہے۔ وہاں اس کے برخلاف لوگوں میں مغائرت و حقارت کے جذبات کی بھی تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے۔ کہ یہی نفرت وحقارت دشمنی سے بدل جاتی ہے۔ اور اس کے برعلیہ ایک ایسا ماحول تیار کر دیتی ہے جس کے اندر وہ اپنی زیست کو برقرار رکھنے سے بھی عاجز و درماندہ ہو جاتا ہے۔

میرے خیال میں یہ بھی ایک خاص وجہ ہے۔ کہ کیوں افغانی طبائع میں انگریزوں کے برخلاف اس شدت کے ساتھ ان کی دشمنی اور مخالفت کا جذبہ موجود ہے۔

بہرکیف مندرجہ بالا بیان سے یہ بات بدیہی طور پر ثابت ہے۔ کہ غازی امان اللہ خان کی پالیسی کسی طرح بھی انگریزوں کے حق میں معاندانہ نہیں کہی جا سکتی اور نہ اس کی ملکی سیاست کا اس سے یہ تقاضا ہی تھا۔ کہ وہ کسی ایک طرف کا ہو رہے۔ اس کے شخصی جذبات خواہ کتنے ہی انگریزوں کے خلاف سہی۔ تاہم بحیثیت ایک ملک کا بادشاہ ہونے کے وہ ان کے دبائے رکھنے پر مجبور تھا۔

اور میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں۔ کہ یوروپ کی سیاحت نے اس باب میں اسے بالکل ہی بدل ڈالا تھا۔ اس نے انگلستان میں عظیم الشان ملت انگریزی کے طرز عمل کو اپنے بادشاہ کے متعلق مشاہدہ کیا تھا۔ اور چونکہ وہ

---

[1] میں دراصل Reservedness کا مفہوم ادا کرنا چاہتا ہوں۔

خود بھی ایک بادشاہ تھا۔ اس لئے طبعاً وہ بھی اپنی ملت سے اسی قسم کی عقیدت کیشی و وفا شعاری کا خواستگار تھا۔ وہ بارہا انگریزوں کی شاہ پرستی کی تعریف کرتا ہوا سنا گیا۔ اور وہ اس نظام حکومت کا بھی شیدا بن آیا تھا۔ جس کے ماتحت اہل انگلستان اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ وہ اپنی شخصیت کے تحفظ و بقا کے لئے انگلستان کے طرز حکومت کا چربہ اپنے ہاں اتارنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ یوروپ میں پھر کر دیکھ آیا تھا۔ کہ دنیا کے اور کسی نظام حکومت میں بادشاہت کو بقا و استحکام نصیب نہیں ہے۔ اور جیسا کہ قارئین پر واضح ہو چکا ہے۔ کہ وہ یوروپ سے واپس آتے ہی اپنی ان کوششوں میں مشغول ہو گیا تھا۔ لہذا میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا۔ کہ انگریزوں کی باریک بیں نظر کس طرح ان حالات کے مشاہدہ کرنے سے قاصر رہ سکتی تھی۔ اور ان کا حد کمال پر پہونچا ہوا تحمل سیاست کیونکر امان اللہ خان کو ایک ناقابل شفا مریض سمجھ کر فوراً ہی اس کی موت کا فتویٰ لے صادر کر سکتا تھا۔ اور اگر بقول بعض انگریزی سلطنت غازی امان اللہ خان کی ذات کو فی الواقعی ایک ایسا ہی خطرہ تصور کرتی تھی۔ تو کیا ان کے لئے افغانستان سے امان اللہ خان کی کامل آٹھ مہینے غیر حاضری اس کے برخلاف کسی بغاوت یا انقلاب کے برپا کر دینے کے لئے کافی نہ تھی۔ غازی امان اللہ خان کے برخلاف بغاوت جدید اصلاحات کے بزور نافذ کرنے کی بنا پر پھوٹی تھی۔ کسی سیاسی یا خارجی اسباب کی بنا پر نہیں"

اور اگر یہ کہا جائے۔ کہ غازی امان اللہ خان کی اسی غیر حاضری کے دوران میں انگریزی سیاست نے در پردہ اس کے برخلاف کوئی ماحول تیار کر رکھا تھا تو سوائے اس کے کہ یوروپ سے اس کی بیگمات کی ستر کشائی کی چند تصویریں قبائلی افراد کے ہاتھوں میں آئی ہوں۔ اور ایک بھی نشان نہیں ملتا جس کی بنا

پر ایسا ظن وگمان کیا جا سکے۔ اور جہاں تک اس کی بیگمات کی ستر کشائی کا تعلق ہے،
میں اس کے متعلق کتاب کے شروع ہی میں افغانوں کے درگذر اور بے پروایانہ کیف سے
اپنے قارئین کو آشنا کرا آیا ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا فی الواقعی یہ انگریزی حکومت ہی
تھی جس نے اس قسم کی تصویریں افغانی طبائع کے جنوں خیز اشتعال کے لئے
سرحدات میں نشر و تقسیم کروائی تھیں۔ تو امان اللہ خان کی ذات سے لوگوں کی بڑھی ہوئی
دلچسپی و اشتیاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیوں اخبارات و تجارتی
ایجنسیاں اس باب میں زیاں کارانہ و مجرمانہ غفلت برتتیں۔ اور پبلک کو بروقت وہ
دلچسپ مواد مہیا نہ کرتی رہتیں۔ جو ایک بڑی شخصیت سے متعلق ہو رہا تھا۔ اور کیوں ہر
پھر کر اپنے آپ کو ہی کچھ سمجھنے کی اذیت دی جائے۔ کہ ان عکسی تصویروں کے انتشار
میں خود انگریزوں کا سفید ہاتھ ہی کار فرما تھا۔ حیرت ہوتی ہے۔ کہ انگلستان میں تو انگریز
ایڑی چوٹی کا زور محض اس بات پر صرف کر رہے ہوتے ہیں۔ کہ کسی طرح امان اللہ خان
ان کے پرشکوہ خیر مقدم سے متاثر ہو کر ان کے دامِ تو لے کا صید و اسیر بن جائے۔
اور یہاں اس کی غیابت میں حق الیقین کے ساتھ یہ نہ جانتے ہوئے کہ اس قسم کے طرز
عمل سے وہ امان اللہ خان کا تختِ حکومت چھین بھی سکیں گے یا نہیں محض تصویروں کے
قبائل میں بانٹنے کی ایک نامعقول اور رکیک حرکت سے اپنی سیاست پر خود ہی پانی بھی
پھیر رہے ہوں۔ کم از کم کوئی سلیم الطبع شخص اس کو تسلیم نہیں کریگا۔

ہم نے اوپر اس امر کو وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ اول تو
حکومت امانیہ اور حکومت برطانیہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت کسی طرح مخالفانہ نہ تھی
اور دوم یہ کہ اگر غازی امان اللہ خان کی پالیسی کو تھوڑی دیر کے لئے معاندانہ ہی فرض
کر لیا جائے۔ تو یہ اس حد تک متجاوز نہ ہو سکتی تھی۔ کہ برطانوی ڈپلومیسی اس کی کسی طرح
متحمل ہی نہ ہو سکتی۔ اسی ضمن میں تیسری بات یہ کہ اگر اسے بھی فرضاً تسلیم کر لیا

جائے۔ تو پھر برطانوی حکومت نے غازی امان اللہ خان کے نیست ونابود کرنے
کے لئے جو پالیسی اختیار کی۔ وہ اس امر کی کسی طرح ضمانت نہیں گردانی جا سکتی تھی
کہ یہ ضرور ہی کامیاب رہیگی۔ بلکہ برخلاف اس کے یہ خطرہ موجود تھا۔ کہ اگر افغانستان
میں ان تحریکات نے کوئی نتیجہ پیدا نہ کیا۔ تو حالات کی طاقتیں اور بھی تیزی کے
ساتھ افغانستان کو برطانیہ سے دور کر کے روسیوں کی طرف دھکیل دیں گی۔
اور پھر واقعات اس کو بھی ثابت نہیں کرتے۔ کہ شنواریوں کی بغاوت یا بچہ سقاؤ
کی سرکشی براہ راست کسی خارجی دولت کی تحریکات کا نتیجہ تھیں۔ پس ہم کسی طرح
بھی انگریزوں کو اس بات کا ملزم نہیں ٹھیرا سکتے۔ کہ ۱۹۲۹ء کے انقلاب
افغانستان میں ان کا کسی طرح ہاتھ تھا۔

مسئلہ مذکورہ کا اب صرف یہی پہلو دیکھنا باقی رہ گیا ہے۔ کہ آیا بغاوت
کے دوران میں انگریزوں نے کوئی ایسا طرز عمل اختیار کیا۔ جو کسی نہ کسی طرح امان اللہ
خان کے حق میں مضر ثابت ہو سکتا تھا۔ اس پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے سب
سے پہلے یہ دیکھنا لازم آتا ہے۔ کہ ایسا مخالفانہ طرز عمل مؤثر طور پر کہاں اختیار
کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے۔ کہ افغانستان کے اندر یا ان مقامات کے نزدیک جہاں
بغاوت ہو رہی ہو۔ بغاوت جلال آباد کے صوبہ میں رونما ہوئی تھی۔ اور اس کے
شروع ہونے کے فوراً ہی بعد کابل اور جلال آباد کا درمیانی راستہ مسدود ہو گیا
تھا۔ جس کے سبب نہ تو سفارت برطانیہ ہی اپنے قونصل جلال آباد سے خط وکتابت
جاری رکھ سکتی تھی۔ اور نہ ہی ہندوستان کی گورنمنٹ ہی اس کی کوئی خبر لے سکتی
تھی۔ لہذا ان حالات میں یہ بالکل ممکن نہ تھا۔ کہ جلال آباد میں جو قونصل تھا۔
وہ از خود کوئی کارروائی کر سکتا۔ اور پھر خصوصاً ایسی فضا میں جس میں اسے خود
اپنی جان کے لالے پڑ رہے تھے۔ چنانچہ حالت کے ناگفتہ بہ ہوتے ہی اسے وہاں

سے پشاور بھاگ جانا پڑا۔ اب بغاوت زدہ علاقہ میں کم از کم سفارت کابل خود کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اگر حکومتِ ہندوستان نے باقی قبائل سے کچھ معاملہ کیا ہو۔ تو اس کے متعلق مجھے تحقیق کے ساتھ معلوم کرنے کی توفیق ہی نہیں ملی ؛ شاید ہندوستان کے سیاستدان حضرات اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں ؛

جہاں تک سمت شمالی کے باغیوں کا تعلق ہے۔ سفارت برطانیہ کا ان سے بھی کسی قسم کا رابطہ ثابت نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر گورنمنٹ برطانیہ کا اس بغاوت میں فی الواقعی کوئی ہاتھ ہوتا۔ تو یقیناً بچہ سقاؤ اور اس کے ساتھیوں کی معاونت کرنے سے وہ ہرگز نہ چوکتی۔ بچہ سقاؤ کے تیرہ دنوں کے حملہ کے وقت کابل اور سفارت انگریزی کے درمیان ہر قسم کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہوا تھا۔ سفارتِ برطانیہ کی حفاظت خود بچہ سقاؤ کے سپاہی کر رہے تھے۔ سفارت برطانیہ کے لئے اس سے بہتر اور موزوں موقعہ اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ بچہ سقاؤ کے ساتھ معاملاتِ آئندہ کی نسبت ہر قسم کی بات چیت طے کر لے۔ لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے۔ کہ جونہی کہ بچہ سقاؤ فاتحانہ کابل کے تخت و تاج کا مالک ہوتا ہے۔ سفارتِ برطانیہ وہاں سے کوچ کر آتی ہے۔ اور جب تک بچہ سقاؤ افغانستان میں حکومت کرتا رہتا ہے۔ حکومتِ برطانیہ اس طرف کا رُخ ہی نہیں کرتی ؛

اس نے محمد نادر خان کی بھی کوئی مدد نہیں کی۔ اس کے پاس جو تھوڑا سا مال و متاع تھا۔ وہ احمد زائیوں کے داؤ سے بھاگتے وقت چھن گیا تھا۔ اور میں نے بچشم خود اس کی وہ چٹھیاں پڑھی ہیں۔ جو اس نے جاجیوں کے علاقہ میں بیٹھ کر کمال اضطرار و اضطراب کے ساتھ پشاور میں اپنے چند دوستوں کو لکھی تھیں کہ اس کی جس قدر روپیہ سے ہو سکے۔ مدد کی جائے ؛

اگر برطانیہ کے نزدیک محمد عالم خان شنواری ایک غیر ذمہ دار شخص شمار ہوتا تھا

اگر بچہ سقاؤ کو وہ ایک چور اور ڈاکو سمجھتے تھے تو کم از کم محمد نادر خان کی ذمہ دارانہ پوزیشن کے متعلق تو انہیں کوئی کلام نہ تھا۔ پھر کیوں انہوں نے اس کی سمت جنوبی میں کوئی مدد نہیں کی۔ جہاں وہ آٹھ نو مہینوں تک بیٹھا دم توڑ رہا تھا۔ اور جہاں بعض اوقات اس کے پاس کھانے تک کو موجود نہ ہوتا تھا۔

واقعات تقریباً یہی کچھ ہیں جنہیں میں نے نہایت اختصار کے ساتھ اوپر جمع کر دیا ہے۔ اب یہ قارئین کے اپنے اپنے ذوق و فکر پر موقوف ہے۔ کہ وہ ان سے کیا کچھ اخذ کریں۔

میری رائے ہے۔ کہ انگریزوں نے اس تمام دوران میں (Wait and see) "انتظار کرو اور دیکھو" کی حکمت عملی کو اختیار کئے رکھا کیونکہ انہیں بھی یہ یقین نہ تھا۔ کہ

غازی امان اللہ خان

کا

آفتاب اقبال

یوں غروب ہو جائیگا

غازی امان اللہ خان

کی

ہندوستان میں ہر دلعزیزی کے اسباب

میں نے انقلاب افغانستان کے عنوان سے شروع ہی میں جو مختصر سی تمہید لکھی تھی اس میں میں نے وعدہ کیا تھا۔ کہ اس کتاب کے آخری باب میں میں اس امر کی تشریح کروں گا۔ کہ ہندوستانی غازی امان اللہ خان کو کیوں اس قدر محبوب رکھتے تھے۔ اور انہیں افغانستان کی ترقی سے کیوں اس قدر زیادہ مسرت حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ ایسا کرتے ہوئے میں اس احتیاط کیساتھ اقدام کر رہا ہوں۔ کہ میری یہ کوشش کسی طرح بھی تشریحی و توضیحی دائرہ سے خارج نہ ہونے پائے۔

(۱) اس حقیقت باہرہ سے کسی کو بھی انکار نہ ہوگا۔ کہ غازی امان اللہ خان کے تخت سلطنت پر متمکن ہونے سے پہلے افغانستان اور اس کے اندرونی کوائف و حالات سے بہت کم لوگوں کو دلچسپی تھی۔ بلکہ برخلاف اس کے عامتہ الناس کا تو یہ عالم تھا۔ کہ انہیں افغانستان کے نام ہی سے تپ لرزہ چڑھ آتا تھا۔ اس ملک کو دنیا کے بدترین وحشی ممالک میں سے سمجھا جاتا تھا۔ جہاں کے لوگ اپنی خونخواریت و سفاکی میں کسی طرح

درندوں اور بہائم سے کم نہ تھے۔ سرحدات پر آئے دن کی قتل و نہب کی داستانیں اس عقیدہ و خیال کی پختگی میں اور بھی ساز گار اور معاون تھیں۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ حکومت برطانیہ کا سیاسی تفوق جو اس ملک اور اس کی ملحقہ سرحدات پر قائم تھا۔ اس موجودہ شدہ ذہنیت کے لئے ہر لحظہ سامان اشتعال فراہم کرنے کا سبب بن رہا تھا۔ اور عام طور پر یہ یقین پختگی کے ساتھ قائم تھا۔ کہ اگر ذرا سی دیر کے لئے بھی سیاسی تفوق اٹھا لیا جائے۔ تو سرحد پار کے یہ مدنیت سے دور اور وحشی قبائل ہندوستان کے امن و امان کو جلا کر بھسم کر ڈالیں گے۔ یہ خیال حقیقت پر مبنی ہو۔ یا دور از کار سیاسیات سے متعلق۔ بہر حال یہ ماننا پڑیگا۔ کہ ہندوستان کی بیشتر آبادی کے لئے غازی امان اللہ خان کے ورود سلطنت سے پہلے افغانوں کا نام بہت کچھ معنی خیز تھا۔

غازی امان اللہ خان نے تاج و تخت پر قبضہ کرتے ہی سب سے پہلا دلپذیر کام جو انجام دیا۔ وہ افغانستان کی سیاسی آزادی کا حصول تھا۔ اس استقلال و آزادی کے حاصل کر لینے کے بعد افغانستان کی راہ میں اب کوئی سد یا روک نہ رہ گئی تھی۔ جو اسے دیگر دنیا کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرنے سے روک سکتی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ایک نہایت ہی قلیل عرصہ میں افغانستان نے اپنی بضاعت سے بڑھ چڑھ کر قدم مارا۔ اور تقریباً دنیا کے ہر متمدن اور مہذب ملک سے اپنے روابط استوار کر لئے۔ اب افغانستان کی راہیں ہر کس و ناکس کے لئے کھل گئی تھیں اور پہلی دفعہ دنیا کا یہ بے آئین اور وحشی ملک (جیسا کہ عام طور پر اسے کہا جاتا تھا) مختلف تہذیبوں کے آپس میں گلے ملنے کا مرکز بنا۔ تہذیبوں کے اس اختلاط کا جو فوری نتیجہ برآمد ہوا۔ وہ یہ تھا۔ کہ "افغان" کے نام سے جو ہیبت اور لرزہ اندام عالم پر چھایا ہوا تھا۔ وہ دور ہوتا گیا۔ اور تہذیب ہیچ لوگ یہ خیال کرنے لگ پڑے۔ کہ درحقیقت افغانستان کے باشندے وحشی اور درندہ صفت

نہ تھے۔ بلکہ محض گمنامی کی وجہ سے ان کی صورت کو اس درجہ مسخ و بھیانک کر کے بتلایا جا رہا تھا۔ البتہ اس میں کوئی شک نہ تھا۔ کہ دنیائے تمدن سے الگ تھلگ رہنے کے سبب وہ دیگر اقوام سے صدہا منازل پیچھے تھے۔ لوگوں پر یہ حقیقت بھی بہت جلد روشن ہوگئی تھی کہ اگر انکی ترقی کے مواقع میں مزاحمت نہ ہوتی۔ تو یہی وحشی و خونخوار قوم آنکھوں دیکھتے ہی دیکھتے ترقی کے وہ جملہ مدارج طے کر جائیگی۔ جو عام طور پر اولوالعزم قوموں کا ما بہ الامتیاز خاصہ و معیار رہا کئے ہیں؛

اگر غازی امان اللہ خان کی بجائے افغانستان کی سلطنت کی باگ ڈور کسی کمزور دل و دماغ رکھنے والے شخص کے ہاتھوں میں ہوتی۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا تھا۔ کہ افغانستان کا ملک اتنی جلدی دیگر ممالک سے متعارف و مانوس ہو جائیگا۔ اسی مانوسیت و تعارف میں وہ کشش تھی۔ جو ہندوستانی دلوں کو غازی امان اللہ خان کا گرویدہ بنا رہی تھی۔ اور وہ خوف و دہشت جو کبھی افغانوں کا نام سنکر ان پر طاری ہو جاتی تھی اب بسرعت تمام زائل ہو رہی تھی میں افغانستان کی آزادی کو اس کا واحد سبب قرار دیتا ہوں؛

(۳) افغانستان کی داخلی و خارجی آزادی دوسرے طریق پر بھی ہندوستانیوں پر اثر انداز ہوئی اور وہ اس طرح کہ جنگ عمومی کے خاتمہ پر جبکہ ہر ایک افتادہ و محکوم قوم اپنی عبدیت و غلامی کے طوق و سلاسل سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی ہندوستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا یہاں کے باشندوں میں بھی وہی تڑپ موجود اور پیدا ہو گئی تھی۔ ٹھیک ایسے وقت میں ان کا ہمسایہ ملک افغانستان جو اس وقت تک محض گمنامی کی حالت میں اپنے زندگی کے ایام بسر کر رہا تھا۔ اپنی آزادی کے حصول و دفاع کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ اور برطانیہ جیسی پرعظمت و ہیبت طاقت سے جو ابھی ابھی ایک خوفناک عدو پر غلبہ اور فوقیت حاصل کر چکی تھی۔ ٹکراتا ہے۔ اور اپنے مقصد میں نائل و کامیاب نکلتا ہے۔ اس غیر متوقع و آن ہونی کامیابی کا ہندوستانی دل و دماغ پر جتنا

بھی اثر پڑتا تھوڑا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں حکومت برطانوی کی ضد پر مختلف قسم کی پرجوش تحریکات انہی ایام میں پورے زور شور سے رویکار لائی گئیں۔ افغانستان کو اس وقت ضرورت تھی۔ کہ وہ جس طریق پر بھی بن پڑے۔ ہندوستانی حسیات وافکار کی ترجمانی وحمایت کرے۔ تاکہ ہندوستان کی عام پبلک اس کے دعوئے استقلال میں حارج ومزاحم نہ ہونے پائے۔ ادھر ہندوستان کی پبلک کو بھی ایسے ہمسایہ واجنبی ممالک کی ضرورت تھی جو اگر عملاً نہ سہی عنواً واخلاقاً ہی اس کی کشمکش آزادی میں اس کا ساتھ دیں۔ تاکہ برطانوی حکومت اس وسیع بین الاقوامی پراپیگنڈا کے اثر تلے آکر ان کے واجبی حقوق ورعایات کا لحاظ کرنے لگ جائیں۔ اور ملک کی حکومت میں انہیں وافر حصہ عطا کرے۔ ایسا کرتے ہوئے دونوں ممالک کی مانوسیت اور لگاؤ کا بڑھ جانا یقینی تھا۔ اور چونکہ سلطنت افغانستان کا اہتمام اس وقت امان اللہ خان کے ہاتھوں میں تھا۔ اور وہ ایک شخصی بادشاہ بھی تھا۔ اس لئے لازمی تھا۔ کہ اسے ہندوستان کے محکوم باشندوں کا اعلےٰ غمگسار وغمخوار تصور کیا جائے۔ ہندوستانی پبلک اسے ایسا ہی خیال کرتی تھی۔ اور اس لئے اس کی عزت واحترام ہندوستانی قلوب میں سب مشرقی تاجداروں سے بڑھ کر اور بیشتر تھی۔

(۳) افغانستان کے آزاد ہو چکنے کے بعد یقینی تھا۔ کہ برطانوی حکومت ہند کے تعلقات کی نوعیت اس ملک سے بالکل ہی بدل جاتی۔ اور وہاں کا حکمران طبقہ اس اجنبی سیاسی تفوق کے اثر ماندہ کے امحاء کی کوششوں میں ایک مدت تک برابر مصروف ومشغول رہتا۔ ایسا کرتے ہوئے افغانستان کی حکومت کے لئے یہ ایک قدرتی امر بن جاتا تھا۔ کہ وہ جہاں تک برطانوی سیاست کا تعلق ہے۔ اس سے رم کھاتی رہے۔ چنانچہ ہم ملاحظہ کرتے ہیں۔ کہ شروع عہد امانیہ میں حکومت کی روش اس بارہ میں ایک رقیبانہ انداز لئے ہوئے تھی ایسی روش وقتی حالات کے ماتحت ہندوستانی حریت کیشوں کے لئے

بالطبع دل خوشکن تھی۔ اور چونکہ ملک کے مطابع پر بھی انہی کا طوطی بول رہا تھا۔ اس لئے ہندوستان میں غازی امان اللہ خاں کی شخصیت کو ایک قابل رشک اور لازوال شہرت نصیب ہوگئی تھی ۔

(۳) افغانستان عہد قدیم ہی سے ہندوستان کے لئے ایک فاتحانہ اولوالعزمیوں کا گہوارہ اور مرکز تھا۔ اور اس کیف کو افغانوں کے مذہبی اور قومی تعصب نے اور بھی دوبالا کر رکھا تھا۔ انگریزی حکومت کے ہندوستان میں قیام و دوام کے وقت سے لیکر اس تعصب نے باقاعدہ اور بیقاعدہ جنگوں کی شکل میں بیسیوں مرتبہ اپنی نمائش کی تھی۔ اور افغانوں کی نسلیں اپنے آبائی اثر کے ماتحت مجبور تھیں۔ کہ وہ کسی وقت بھی اس خصومت و عداوت کا مظاہرہ کرنے سے نہ چوکیں۔ جو انہیں انگریزوں سے اب بالطبع حاصل ہو چکی تھی۔ جنگ استقلال بھی انہی مجنونانہ مظاہرات کی ایک کڑی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے ماحول افغانستان کے سازگار تھا۔ اور اس کا حکمران جس نے محض اس لئے یہ جنگ چھیڑی تھی۔ کہ وہ اپنی جلد مشتعل ہو جانیوالی ملت کو اپنے برخلاف داخلی ترغیبات و تحریکات سے باز رکھ سکے۔ تاکہ اس کی بادشاہت جس کو اس نے اپنے چچا سے چھینا تھا۔ اسی حیلہ سے اچھی طرح جم جائے۔ اس مقصد عظیم میں کامیاب ہو گیا جس نے نہ صرف اس کے نام کو ہی چار چاند لگا دئے۔ بلکہ افغانستان کے ملک کو بھی ہمیشہ کے لئے قعر ذلت و گمنامی سے نجات دلا دی۔ اس طرح گویا اپنے باشندگان ملک کی نظروں میں امان اللہ خان کی ذات اس تعصب ملی و مذہبی کی راہنما قرار پا گئی تھی۔ جو مدتوں سے انگریزی اثر و اقتدار کے برخلاف ان کے دلوں میں جگہ پائے ہوئے تھا۔ پس ہندوستانیوں کے نزدیک امان اللہ خان اپنے ملک و ملت کے ساتھ اس روح کا مظہر بن چکا تھا۔ جس کی پرستش و عبادت کرنا جسد محکومیت کے لئے فرض اولین قرار پاجاتا ہے۔ یہی وہ اسباب و وجوہ تھے۔ جن کے نتائج سے متاثر ہو کر ہندوستانیوں نے مترقی افغانستان کے حالات سے گہری دلچسپی لینی شروع کر رکھی تھی۔ اور خود امان اللہ خان کو وہ مشرق وسطی کا ایک ہونہار و بیدار مغز

تاجدار تصور کرنے لگ گئے تھے۔ جس کی ذات سے انہیں شاید یہ امید تھی۔ کہ وہ کسی وقت اخلاقاً و معنواً ان کی اپنی اسارت و عبدیت کی زنجیروں کو توڑ دینے میں ان کا ساجی و مددگار ثابت ہوگا۔

میں مذکورہ بالا صفحات کو لکھ چکا تھا۔ کہ غازی محمد نادر خان موجودہ فرمانروائے افغانستان کے قتل ہو جانے کی خبر موصول ہوئی۔ مجھے اس حادثۂ فاجعہ سے حقیقتاً بے حد رنج پہونچا ہے۔ مجھے ان کی دوستی و قرب کا فخر حاصل رہا ہے۔ اور میرے نزدیک یہ ایک کبیرہ گناہ سے کم نہ ہوگا۔ اگر میں ان کے دیانت و خلوص کے متعلق یہاں چند کلمات بیان کئے بغیر اس کتاب کو ختم کردوں۔ مگر میں ساتھ ہی اپنے قارئین سے استدعا کرونگا۔ کہ وہ میرے مفہوم کو اس کی "قدر حقیقی" کے معیار سے پرکھیں۔ اور اپنے آپ کو کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ ہونے دیں۔

اس دنیا میں عالم سیاسیات کا جہاں تک تعلق ہے۔ انسان بیک وقت دو اہم فرائض سے دوچار ہوتا ہے۔ پہلا فرض ملک وملت کی مسئولیت سے متعلق ہے اور دوسرا اس جماعت سے جس کے ساتھ ہو کر وہ اس پہلے فرض کی ادائگی سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے اور ایک دنیا اس امر میں میری ہمنوا ہوگی۔ کہ غازیٔ مقتول کی روح پر جہاں تک ملک وملت کی مسئولیت کا تعلق ہے۔ کوئی بار نہیں رہ گیا۔ جس ماحول و فضا کی سازگاری میں اس کے وجود و شخصیت کی بناء و تشکیل ہوئی اگر اسی معیار کی رو سے اس کی زندگی کے مختلف کارناموں کو پرکھا جائے۔ تو ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے۔ کہ کیوں اس بارہ میں اس کے خلوص و دیانت کو اشتباہ و شک کی نظروں سے دیکھا جائے۔ اور کیوں نہ اس فرض اولین کے شناسا و محرم کو اس کی خدمات ملکی و ملی کے بوجہ احسن انجام دینے پر تبریک و تحسین ادا کی جائے۔ ہاں ہو سکتا ہے

کہ دنیا اس امر پر متحد ہونے سے قاصر ہے۔ کہ اس نے اپنے جماعتی فرض و مسئولیت
سے دیدہ و دانستہ کوتاہی و گریز برتا ہے۔ گو وہ خود بھی شاہی خاندان سے علاقہ
رکھتا تھا۔ تاہم اس کی شخصیت کے قصر کی تعمیر و اٹھان میں غازی امان اللہ
خان کی ذات نے اس کی راہنمائی کی تھی۔ وہ غازی امان اللہ خان
کی جماعت کا ایک فرد تھا۔ اس کی اس جماعت کے ساتھ
انتہائی وفاداری کا یہی تقاضا تھا۔ کہ وہ غایت درجہ کے
اشتعالی و ترغیباتی حالات میں بھی اسی جماعت کا وفادار
بنا رہے۔ مگر ہمیں یہاں یہ امر بھی یاد رکھنا
چاہئے۔ کہ وہ آخر ہم جیسا ہی ایک
انسان تھا فرشتہ نہ تھا۔